کتب خانہ انجمن ترقی اردو

اردو بازار جامع مسجد دہلی

مجلسِ مشاورت

- پروفیسر مسعود حسین خاں
- پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی
- پروفیسر مختار الدین احمد

مجلہ غالب نامہ

اُردو میں علمی ادبی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مجلہ

غالب نامہ نئی دہلی

جنوری ـــــــــ ۱۹۹۰ء

جلد ۱۱ ـــــــــ شمارہ ۱

قیمت: ۴۰ روپے

ناشر و طابع ـــــــــ شاہد ماہلی

مطبوعہ ـــــــــ عزیز پرنٹنگ پریس دہلی

خط و کتابت کا پتا:-

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون ۳۳۱۶۵۱۸

فہرست

اداریہ

غالب نامے کا نیا شمارہ حاضر خدمت ہے، اس شمارے کے مضامین غالب سمینار میں پیش کیے جا چکے ہیں، صرف دو مقالے نئے ہیں، ایک پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا جنھوں نے غالب کے ایک عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کی "تضمین گلستان" سے مقالہ لکھا ہے، تفتہ فارسی کے کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر تھے، دستگاہ پیدا کر رکھی تھی، اور فارسی کے اساتذۂ قدیم کی پیروی میں بڑی مشاقی دکھائی تھی، ان کے بعض منظومے فارسی کے بڑے بڑے شعرا سے ٹکر کھاتے ہیں، ان کے کلام میں فارسی و عربی کے بعض ایسے الفاظ جن کے مفہوم کے سمجھنے میں کبھی کبھی دھوکا ہو جاتا نہایت برمحل استعمال ملتا ہے، انھیں میں ایک لفظ "تظلم" ہے جس کے معنی دادخواہی، فریادرسی کے ہیں، یعنی "ظلم و ستم کے خلاف فریاد کرنا":

خواہم دگر ز خود بہ تظلم در آمدن
با چشم خوں فشاں بہ صف محشر آمدن

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ غیر مسلم فارسی شعرا اپنا کلام حمد و نعت سے شروع کرتے ہیں، تفتہ کے کلام سے بھی اس کی توثیق ہو جاتی ہے، اور حمد و نعت میں ان کے قلم کا زور کسی بھی مسلم شاعر سے کمتر نظر نہیں آتا تفتہ کی تضمینِ گلستان چار ہزار سے زاید اشعار پر مشتمل ہے، یہ تقریباً دو ماہ کی قلیل مدت میں نظم ہوئے، اس سے ان کی زود گوئی ثابت ہوتی ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تضمینِ گلستان ان کے بیٹے کی یاد کے طور پر مرتب ہوئی جس کی بے وقت انتقال کی وجہ سے وہ ٹوٹ سے گئے تھے، ان کے بیٹے ہتمبر کو

گلستان از بر تھی، اس مناسبت سے یہ نظم بیٹے کی یادگار کا بہترین نمونہ اور گلستان سعدی کی ہندستان میں غیر معمولی مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر اکبر حیدری کا ہے جس میں غالب کے تین نئے خطوط سے بحث کی گئی ہے، یہ مکتوبات جو غالب کے خط میں ہیں، اب تک خطوط غالب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں، اس بنا پر ان کی بڑی اہمیت ہے، ڈاکٹر صاحب نے غالب کے متعلق حیدر آباد میں کچھ دلچسپ مواد حاصل کر لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قصیدہ بھی ملا ہے، کتابخانۂ آصفیہ میں انھوں نے دیوان غالب کا ایک مطبوعہ نسخہ (۱۲۷۸ھ) دیکھا ہے جو میرزا کی نظر سے گذرا تھا، اس کے نمبر خود غالب کے قلم ہیں، آخر میں غالب کا ایک خط چھپا تھا، میرزا نے اسے قلمزد کر کے اس کی عبارت حاشیے میں اپنے ہاتھ سے لکھی۔ ان پر وہ مضامین لکھنے والے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے مقالے کے لیے غالب نامے کے صفحات حاضر ہیں،

نذیر احمد

پروفیسر آل احمد سرور

غالب کی اردو شاعری کے انگریزی تراجم

اب تک غالب کی اردو شاعری کے جن تراجم تک میری دسترس ہوئی ہے، وہ حسب ذیل ہیں۔ یہ سب آزادی کے بعد کے ہیں اور زیادہ تر غالب صدی کے موقع پر سامنے آئے۔ میری تلاش جاری ہے۔ اس لیے اس مختصر مقالے میں صرف انھیں تراجم پر بات ہوگی، مکمل جائزہ بعد میں ہو سکے گا۔

پہلا ترجمہ جیا لال کول کا ہے یہ کشمیر کے ایک ممتاز ادیب ہیں اور انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ اردو سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی کتاب کا نام معنی خیز ہے یعنی غالب کی توجیہات INTERPRETATIONS OF GHALIB کتاب پر مولانا آزاد کا مختصر پیش لفظ ہے اور یہ ۱۹۵۷ء میں چھپی ہے۔ دراصل یہ ترجمے نہیں ہیں۔ کول نے یہ محسوس کیا کہ صرف ترجمے سے اصل کی روح تک رسائی نہ ہو سکے گی اس لیے انہوں نے خیال کو واضح کرنے کے لیے اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ مگر آخر میں اصل شعر کا ترجمہ بھی ضرور کیا ہے۔ ترجمے کی زبان صاف اور رواں ہے اس لیے غالب کے خیال اور اس کے سیاق و سباق تک رسائی ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد کے مختصر پیش لفظ میں کئی اہم اشارے ہیں۔ مولانا نے مشرقی زبان کی شاعری کو ایک مغربی زبان کا جامہ پہنانے کی مشکل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر فرمایا ہے۔ "ہر زبان کی شاعری اپنے شاعرانہ تخیل کی ایک مخصوص دنیا رکھتی ہے۔ لفظوں کا ترجمہ کر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ دنیا ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ لیکن باوجود ان مشکلات کے پنڈت جی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کے تین سو چھپن ۳۵۶ شعر ترجمے کے لیے منتخب کیے تھے۔ ان سب کو انھوں نے انگریزی کا لباس پہنا دیا ہے اور اس طرح پہنایا ہے کہ اس نئی وضع میں کسی طرح کی اجنبیت اور غیر مانوسیت

محسوس نہیں ہوتی اور ترجمے کی بڑی سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ کتاب میں ایک تمہید کے علاوہ سوال، فن، زندگی، محبت، مایوسی اور افسردگی اور مبہم سوالات کے تحت اشعار کا ترجمہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ غالب کے پورے خیال کی وضاحت ہوگئی ہے۔ لفظی ترجمے پر اصرار کرنیوالوں کے نزدیک یہ کوشش ترجمے کے ذیل میں آتی ہی نہیں مگر میرے نزدیک غالب کے فکر و فن کی ترجمانی کی یہ کوشش پھر بھی قابلِ قدر ہے۔ کول نے ترجمے کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ تخیل کی شاعری ترنم کی شاعری کے مقابلے میں ترجمے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ جہاں انھوں نے منظوم ترجمے کیے ہیں وہاں قافیے کا احترام بھی رکھا ہے۔ دیوان کے پہلے شعر کے ترجمے کے لیے پہلے انھوں نے اٹھارہ سطروں میں انسان کے سوال کرنے کی عادت کا ذکر کیا ہے اور پھر شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

TO ME ALL CREATION IS AN INTERROGATION ALL OBJECTS QUERY MARKS, SYMBOLS OF WAILING AND LAMENTATION, QUESTIONING THE WISDOM OF THY CREATION.

ایک اور مشہور شعر؛ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا، کے ترجمے میں پہلے پانچ سطروں میں مسئلے کی وضاحت کے لیے ہیں پھر یہ آزاد ترجمہ ہے۔

HOW MANY HOPES AND DESIRES JOSTLE IN MANS BREAST

AND CROWD WITHIN THE BRIEF SPAN OF HIS LIFE!

ایک اور نمائندہ شعر کے ترجمے میں میرے نزدیک غالب کے فکر و فن کی اچھی ترجمانی ہے۔ شعر یہ ہے۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

اس کا ترجمہ صرف چار سطروں میں ہے اور منظوم ہے قافیے کا التزام بھی ہے۔

DESIRE INSPIRES THE COWARD HEART WITH VALIANT ASPIRATION;
DESIRE DRIVES THE LITTLE DROP OF WATER; TOWARDS THE OCEAN;
DESIRE NERVES THE HUMBLE MAN TO SHOOT HIGH AT A STAR;
DESIRE MOVES A SPECK OF DUST TO DESERT SANDS AFAR.

چوتھی مثال ایک مشہور قصیدے کے ایک مطلع کی ہے جس کے ترجمے میں پہلے چار سطروں کا مقدمہ ہے پھر آزاد ترجمہ۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

HADEST THOU NOT WILLED TO SEE THY SELF IN THY

CREATION'S MAGIC MIRROR HE'D NOT BE HERE TO

WONDER AT IT "IT IS THY BEAUTY SEEN BY THEE"

AND YET NOT KNOWN FOR THINE

کول کی ترجمانی کو خواہ ترجمہ کہا جائے یا نہیں، یہ واقعی ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ کول اکثر غالب کی فکروفن کی روح تک پہنچ گئے ہیں۔ اشعار کی درجہ بندی میں بھی ایک ہوش مندی ملتی ہے۔ ان کی انگریزی کچھ قدامت رکھتی ہے، مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

دوسری اہم کوشش جس کا ذکر ضروری ہے، احمد علی کی ہے جو ۱۹۶۹ء میں روم کے مشرقی علوم کے ادارے کی طرف سے منظرِ عام پر آئی۔ اس کا نام "غالب کی منتخب نظمیں۔ ترجمہ مع تمہید"

GHALIB SELECTED POEMS, TRANSLATED WITH AN INTRODUCTION BY AHMAD ALI.

احمد علی انگریزی کے بہت ممتاز معلم رہے ہیں۔ ترجمے میں بھی ان کی مہارت مسلّم ہے۔ انھوں نے پانچ جلدوں میں اردو افسانوں کا اردو، اطالوی، ذولسانی ایڈیشن، بلبل اور گلاب کے نام سے اردو شعراء کے انتخابات کا ترجمہ اور ارضِ آتشیں کے نام سے انڈونیشین شاعری کا ترجمہ اس سے پہلے شائع کیا تھا۔ غالب کا انتخاب نسخہ حمیدیہ سے کیا گیا ہے فقط دو شعر نسخہ عرشی سے لئے گئے ہیں۔ انتخاب میں ابتدائی شاعری کی خاصی نمائندگی ہے۔ ۳۴ غزلوں کے پانچ یا اس سے زیادہ اشعار ہیں۔ ایک مشہور قصیدے کی تشبیب پوری لے لی ہے۔ کل اشعار کی تعداد ۲۸۸ ہے۔ بیس صفحے کی تمہید میں غالب کے فکروفن کی خصوصیات کا بہت خوبی سے جائزہ لیا گیا ہے اور جابجا اشعار کے تراجم سے اپنی بات کو واضح کیا گیا ہے۔ ان کی زبان کول کی زبان سے زیادہ جدید اور جاندار ہے۔ بلاشبہ اسے غالب کا بہت کامیاب ترجمہ کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس کا بھی التزام کیا ہے کہ ترجمہ فکروفن دونوں کی ترجمانی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ لفظی اور مطابق اصل ہو چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ دیوان کے پہلے شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

OF WHOSE GAY WORKMANSHIP DOES THE PAINTING COMPLAIN THAT

EVERY PORTRAIT WEARS A PAPER DRESS.

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا کا ترجمہ اس طرح ہے:

AMBITION IS BUSY WEAVING DREAMS OF HAPPINESS

YET THERE IS DEATH WITHOUT WHICH LIFE WOULD

BE DULL IT SELF.

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں کا ترجمہ یوں ہے۔

THE WORLD IS FULL OF THE EFFULGENCE OF THE ONE-NESS OF THE WELL, BELOVED; WHERE WOULD WE BE IF BEAUTY DID NOT POSSESS SELF LOVE.

اس ترجمے میں مجھے خود بینی کے ترجمے کے لیے POSSESS SELF-LOVE کمزور معلوم ہوتا ہے اس کے بجائے شاید SELF REGARDING بہتر ہوتا۔ ان دو اشعار کے ترجمے میں احمد علی بہت کامیاب ہیں۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

I AM NEITHER SOUND WITHIN THE SONG NOR TUNE

WITHIN THE MELODY: THE VOICE OF MY OWN DEFEAT AM

WHILE YOU ARE BUSY ARRANGING THE CURLS AND

LOCKS OF YOUR HAIR I AM LOST IN FAR AWAY

THOUGHTS AND OTHER CARES

غالب کے شعر میں اندیشہ خیال کے لیے نہیں بلکہ وسوسوں کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے احمد علی کا FAR AWAY THOUGHTS کے بعد لانا سمجھ میں آتا ہے پھر بھی شاید FAR AWAY CARES کافی تھا۔ ایک شعر کا ترجمہ بھی قابلِ توجہ ہے۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا   واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

WEARIED, DESIRE INVENTS AND SEEKS REFUGE IN

TEMPLE AND MOSQUE, WERE REFLECTIONS IN THE

MIRROR, HOPES' IMAJES MULTIPLED

ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیے۔ شعر ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولا برق خرمن کا ہے خونِ گرم

ترجمہ لفظی ہوتے ہوئے شعریت رکھتا ہے۔

IN MY CONSTRUCTION LIES CONCEALED A FORM OF

RUIN THE LIGHTNINGS' FLASH THAT STRIKES THE

GRAIN-FILLED GRANARY IS THE BURNING BLOOD OF

THE PEASANTARY

مجھے یہاں صرف لفظ CONSTRUCTION پر اعتراض ہے MAKE-UP. یا MAKING شاید بہتر ہوتا۔ میں نے ترجموں کے جو انتخاب دیکھے ہیں ان میں سے کسی میں سوائے احمد علی کے انتخاب کے میری زمین میں وہ غزل نہیں لی گئی جس کا مطلع یہ ہے۔

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا

رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا

انگریزی ترجمہ یہ ہے:

HOW THE WANTON HUNTER TAMED US THE AFFLICTED,

ASSUMING THE FORM OF A WILD BEAUTY,

USING THE THRED FROM THE LOVERS RENT

TATTERED HEART TO WEAVE THE SNARES' MESH

۱۹۶۹ء ہی میں ایک اور اہم ترجمہ سامنے آیا۔ یہ پروفیسر مجیب کا ہے جو ساہتیہ اکاڈمی نے ہندوستانی ادب کے معماروں کے سلسلے میں شائع کیا ہے۔ اسی صفحے کی اس کتاب میں ۲۸ صفحے کا تعارف ہے جس میں شخصی، ادبی روایت اور غالب بہ حیثیت شاعر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک صفحہ تراجم کی نوعیت پر ہے۔ ۲۸ صفحے تراجم کے لیے وقف ہیں باقی دو صفحے

خوالوں اور منتخب بلوگرانی کے لیے ہیں اشعار کی تعداد ۲۴۰ ہے۔ ترجمے کے لیے اشعار کے انتخاب کے سلسلے میں مجیب کا کہنا یہ ہے کہ غالب کے جو اشعار زیادہ مشہور ہیں ان میں یا تو زبان کا حسن ہے یا روایتی جذبات کا ایک چونکا دینے والے انداز میں بیان ہے۔ اس لیے انہیں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ زیادہ مشہور اشعار کے بجائے ایسے اشعار کا ترجمہ کیا جائے جن میں فکر اور امیجری کی زیادہ اہمیت ہے۔ چنانچہ بیشتر غزلیں اور اشعار ابتدائی دور سے لیے گئے ہیں مجیب نے اشعار موضوع کیفیت اور پیکر کے لحاظ سے انتخاب کیے ہیں اس انتخاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ غالب کے ابتدائی دور کی ایک غزل سے شروع ہوتا ہے جسے مجیب نے حمد کہا ہے اور اس کے متعلق یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ "اس کا جواب مجھے کسی اور زبان میں نہیں ملا ہے"۔ اس کے پہلے اور آخری شعر کے ترجمے سے بات واضح ہو جائے گی مطلع یہ ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے — کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

مقطع: اسد طلسم قفس میں رہے قیامت ہے — خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

THE TONGUE MUST BEG THEE FOR THE OF SPEECH

FOR SILENCE HAS ITS WAY TO CATCH THY EAR

SAD AND BEYOND BELIFE.

ASAD SHOULD BE AS IN A MAGIC CAGE CONFINED

WHEN GRACE OF MOVEMENT, GARDEN MORING BREEZE

ARE THINE TO GIVE.

مطلع کا ترجمہ تو میرے نزدیک اچھا ہے مگر مقطع میں "قیامت ہے" کے لیے SAD AND BEYOND BELIFE کے بجائے IT IS TERRIBLE شاید بہتر ہوتا۔

ابتدائی دور کے ایک اور شعر کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔ شعر ہے۔

اسد اُس سوائے سر سبزی ہے ہے تسلیم رنگیں تر — کہ کشتِ خشک اس کا ابر بے پروا خرام اس کا

ترجمہ:

MORE THRILLING THAN WILD DREAMS OF
PASTURES GREEN IS RESIGRATION TO THE WILL
OF GOD HIS ARE THE FIELDS THIRSTING FOR
RAIN AND HIS
THE CAREFREE RAIN-CLOUDS FULLY WAY

غالب کے اسی شعر کا جیالال کول کا ترجمہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ مجیب کی کوشش بھی دیکھیے
شعر: شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

LOVES PASSION TO THE LOVELY GIVES

MEANS TO HALT THEMSELVES

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز' کا یہ ترجمہ
بھی میرے نزدیک قابلِ قدر ہے، گو اسے لفظی نہیں کہا جاسکتا۔

I AM NOT MELODY BURSTING LIKE A FLOWER FOR A STRING WITH TUNES REPLETE I AM A CHORD THAT HAS JUST SNAPPED SOUND OF MYOWN DEFEAT.

غالب کے اس شعر کا ترجمہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گو اس میں شعر کی کیفیت
نہیں آپائی۔ ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

WHERE IS SOARING DESIRE TO SET ITS OTHER FOOT, O GOD
THE IMPRINT OF ONE FOOT HAS COVERED THIS DESERT OF A WORLD

مجیب نے اپنے انتخاب میں غالب کی پہلی غزل کا صرف یہ شعر رکھا ہے سیتش گجرال
نے غالب کی تصویر بناتے وقت اس شعر کو اپنے پسندیدہ اشعار میں شمار کیا تھا۔
جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
مجیب کا ترجمہ واقعی قابلِ تعریف ہے:

BEHOLD HOW PASSIONS' UPSURGE MAKES ALL CREATION REEL

THE KEEN NESS OF THE SWORD BURSTS FROM ITS BREAST OF STEEL

کہیں کہیں مجیب نے ترجمے میں اپنی طرف سے الفاظ بڑھائے بھی ہیں۔ اس طرح
مطلب تو اور واضح ہوگیا مگر ترجمہ تشریح ہوگیا۔ یہ شعر دیکھیے:
گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

ترجمہ:

IF YOU HAVE FAITH THAT GOD WILL
GRANT YOUR PRAYER
THEN DO NOT ASK FOR ANY THING AT ALL;
AND IF YOU DO, ASK ONLY FOR A HEART
THAT HAS NO FEAR, NO AIM AND NO DESIRE

یہاں THAT HAS NO DESIRE کافی تھا۔

چوتھا ترجمہ پہلے تین ترجموں سے زیادہ جامع ہے۔ یہ ڈاکٹر یوسف حسین نے کیا ہے اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی طرف سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ غزلوں کی ترتیب نسخۂ عرشی نقش ثانی کے مطابق ہے۔ نیز نسخۂ حمیدیہ کے منتخب اشعار اور دیوان کے خطوط اور بیاضِ علائی کے چند منتخب اشعار کا بھی ترجمہ ہے بقول بیگم عابدہ احمد اس میں ستر سے زیادہ اشعار کا ترجمہ ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں یوسف صاحب کا کہنا یہ ہے کہ میں نے غالب کے الفاظ کا صحیح ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، نہ کچھ چھوڑا ہے نہ کچھ بڑھایا ہے۔ سوائے ایسے مقامات کے جہاں قابلِ فہم ہونے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد انھوں نے نثر یا نظم کے ترجمے کی بات چھیڑی ہے۔ ان کے نزدیک نثر میں شاعری کا فکری مواد تو باقی رہ جائے گا مگر اصل کا جادو بیشتر غایب ہو جائے گا۔ یوسف صاحب نے قافیے RHYME کو چھوڑ کر آہنگ RHYTAM کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ آہنگ کے ذریعہ سے ہی جذبے کی ترجمانی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے سہولت کے لیے دو مصرعوں کا چار سطروں میں ترجمہ کیا ہے۔ کوئی خاص بحر اختیار نہیں کی ہے۔ لیکن فطری بہاؤ کا التزام رکھا ہے۔ جو بیس صفحے کی تمہید پیش لفظ کے بعد ہے، جس میں غالب کی شاعری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ آخر میں وہ تمام اشعار دیئے گئے ہیں جنکا ترجمہ ہوا ہے۔ ترجمے کی خوبی یا خامی کا اندازہ حسب ذیل مثالوں سے ہوگا۔

دیوان کے پہلے شعر کا ترجمہ یہ ہے

AGAINST WHOSE COQUSTTISH ART

IS THE PICTURE A COMPLAINANT
EACH IMAGE ROBED IN PAPER

LAYS CHARGE TO ITS CREATOR

ترجمہ لفظی ضرور ہے، مگر CONCISE THIS ART شوخیٔ تحریر کا اچھا ترجمہ نہیں۔ اسی
رح آخری سطر کی زبان کمزور ہے۔ لیکن ایک اور مشہور شعر۔ جذبۂ بے اختیارِ شوق کا ترجمہ
مجھے بہت بہتر معلوم ہوا۔

THE INTENSITY OF PASSION BEYOND CONTROL

IS A SIGHT WORTH SEEING;
THE SWORDS' HARD LUSTRE
SHINES SWORDS' HARD LUSTRE

SHINES BEYOND THE SWORD

گو یہ مجیب کے ترجمے کو نہیں پہنچتا۔

شوق ہے سامانِ طرازِ

LOVE PROVIDES THE NECESSARY MEANS

FOR THE EXALTATION OF THE HUMBLE

EACH PARTICLE IS A POTENTIAL DESERT

EACH DROP OF WATER TO THE SEA IS FRIEND

یہاں بھی ترجمہ لفظی ہے، مگر آخری سطر کھٹکتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ صرف
لفظی ترجمے میں اکثر شعریت غایب ہو جاتی ہے اس لیے یہاں چیزے دگر کی بھی ضرورت
مسلم ہے۔

ایک اور مشہور غزل کے ان دو اشعار کا ترجمہ دیکھیے۔

نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور نہ آرایشِ خمِ کاکل　　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

NEITHER THE BLOSSOMING OF SONG

NOR THE NOTE OF MELODY, AM I

I AM NOTHING BUT THE SOUND

OF MY OWN HEARTS' BREAKING

THOU ART BUSY

EMBELLISHING THY CURLS

I AM FILLED WITH APPREHENS

OF THE FAR AND NEAR

پہلے شعر کا ترجمہ یوں تو مناسب ہے مگر شکست کے لیے ایک لفظ لانا چاہیے تھا HEARTS BREAKING کی ضرورت نہ تھی۔ دل کا تو شعر میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ہاں دوسرے شعر کا ترجمہ بے عیب ہے۔ اگرچہ اندیشہ ہائے دور دراز کی پہلوداری پوری طرح منتقل نہیں ہوئی۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مجیب کے علاوہ یوسف حسین خاں نے بھی گدا اے طاقتِ تقریر ہے۔ زباں تجھ سے انتخاب کیا ہے اس کا ترجمہ دیکھیے۔

THE TONGUE IS BEGGING

THE POWER OF SPEECH FROM THEE
AND SILENCE HAS ITS OWN WAY

OF COMMUNICATION FROM THEE.

مقطع کا ترجمہ بھی دیکھیے: HOW SAD THAT IN THE SPRING SEASON

ASAD IS CONFINED IN ONE CORNER

OF AN ENCHANTED CAGE

WHEN THE GRACE FULL WALK, THE FLOWER GARDEN
AND THE GENTLE BREEZE ARE ALL FROM THEE

یہاں بھی قیامت کا ترجمہ HOW SAD قیامت کی قامت پر موزوں نہیں ہے۔ یوسف حسین نے صرف غالب کے اردو اشعار کا ترجمہ ہی نہیں کیا، انہوں نے غالب کے منتخب فارسی اشعار کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ ان کا یہ امتیاز بہر حال لایق ستائش ہے۔

۱۹۷۰ء میں چودھری محمد نعیم نے غالب کے پچیس اشعار کا ترجمہ WRITERS WORKSHOP CALCUTTA سے شائع کیا۔ اس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسٹنلی برنس شا کی مشہور کتاب THE POEM IT SELF کا تتبع کیا گیا ہے۔ شروع میں چودھری محمد نعیم نے کہا ہے کہ ان کا مقصد صرف ترجمہ نہیں بلکہ ان اشعار کو اس طرح اور ایسی تشریحات کے ساتھ پیش کرنا ہے کہ پڑھنے والا اصل شعر کی طرف متوجہ ہو جو رومن رسمِ خط میں دیا گیا ہے اور دیکھے کہ شاعر کے فکر و فن تک اس کی کتنی رسائی ہوتی ہے۔ یہ مقصد ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ دو مثالوں سے ان کے ترجمے کی خصوصیت کچھ واضح ہوگی۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

ALL THE ELEMENTS OF CREATION
ARE INCLINED TOWARDS DECAY
THE SUN IN THE HEAREN IS A CAMP
IN THE PATH OF WIND

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا ، واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

THE CHURCH AND THE MOSQUE REFLECT A REPITITION OF DESIRE

THE TIRED ZEEL IS CARVING OUT SHELTERS FOR IT SELF.

دیر کے لیے CHURCH کا استعمال میرے نزدیک صحیح نہیں، غالب کی مراد یہاں مندر سے ہے۔ نعیم نے مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے ہیں اور آخر میں شعر کی تشریح بھی کی ہے۔ اس کی وجہ سے ترجمہ غیر اردو داں لوگوں کے لیے زیادہ مفید ہو گیا ہے۔

اس زمانے میں نوائے سروش WHISPERS OF ANGLE کے نام سے غالب کے چودہ انگریزی ترجموں کا انتخاب، غالب اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوا۔ اس میں ہاشم امیر علی، سید اوصاف علی، محمد فرحت اللہ، قرۃ العین حیدر، پریا جوہری، جیالال کول، اندرجیت لال، رفیق خاور، مالک رام، محمد اختر مرزا، محمد مجیب، شہاب الدین رحمت اللہ، ایچ، سی سرسوت اور عمر زیتون کے تراجم کے نمونے دیے گئے ہیں۔ کول اور مجیب کے تراجم کے نمونے اوپر دیے جا چکے ہیں۔ اندرجیت لال، سرسوت ، پریما جوہری اور عمر زیتون کے تراجم کے نمونے درج ذیل ہیں :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۔ لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں ۔

BEAUTEOUS AND COLOURFUL REYEIRIES FOR LONG THEY GLOWED FRESH
OF THEIR KIND AH, TO MERE PICTURE IMAGES THEY ARE REDUCED NOW
IN THE REMOTE RECLSSES OF MY MIND (INDER)

SINS LIFES PAGEANT I TWO KNEW

OF BEAUTY RARE, OF GLORIOUS THE.

NOW LIKE PICTURES ON A PAINTED ALCOVE.

LIFE LIES STILL.

دونوں منظوم ترجمے ہیں، مگر میرے نزدیک پریما جوہری کا ترجمہ بہتر ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

ITS DEAD IMAGES, THE ALCOVESOP MY MEMORY

FELT WHAT IS THE SPRING (PREMA JAUHAR)

IN ALL ITS SHORH-LIVED FLOWEROY GUISE

THE LASTING SERMONS IN DISGUISE (H.C. SARASWAT)

باوجود قافیے کے التزام کے، اس ترجمے میں اصل کے ساتھ انصاف ہوا ہے۔
زیتون عمر کے ترجموں میں بے جا تفصیل ہے، مگر جہاں انہوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ ترجمے میں اصل کی کیفیت آگئی ہے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

نوائے سروش کی اشاعت کے بعد ہی کلام غالب کے انگریزی ترجمے کے نام سے محمد خاں، سابق لیکچرر میسور یونی ورسٹی نے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں ۴۷ صفحے ہیں فراق، خواجہ احمد عباس، الف سل، وی شنکر، اندر جیت لال، لچھمن پال، مجیب، آمنہ خاتون، قرۃ العین حیدر، جیا لال کول، صوفی اے، کیو، نیاز، اور زیتون عمر کے بعض ترجموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دراصل یہ کتابچہ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے غالب کے اردو اور فارسی کے ایک سو پانچ اشعار کے ترجموں کے تعارف کے لیے لکھا گیا ہے۔
محمد خاں نے یہ درست کہا ہے کہ پہلے ترجمہ، پھر شرح یہی اصول غالب کی شاعری کو دوسری زبانوں میں منتقل ہو کر مرکھپ جانے سے بچا سکتا ہے۔ ورنہ غالب کی یہ پیشین گوئی پوری ہو جائے گی کہ مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور۔ فراق اور آمنہ خاتون دونوں کے غالب کے اس شعر کے ترجمے کا موازنہ کر کے انہوں نے آمنہ خاتون کے ترجمے کو بہتر قرار دیا ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

HE WHOM I WORSHIP LIVEOS BEYOND THE
BOUNDS OF COMPRE HEANSION

TO THE SEEING EYE THE TEMPLE OF WORSHIP

IS ONLY A SYMBOL OF THE REAL TEMPLE (FIRAQ)

آگے جاکر قبلہ اور قبلہ نما کی تشریح ہے۔ محمد خاں نے فراق کے پہلے مصرعے کے ترجمے کو
ست قرار دیتے ہوئے دوسرے مصرعے کے ترجمے پر جو اعتراض کیا ہے وہ صحیح ہے۔ مگر
ق کا ترجمہ پھر بھی رواں اور شگفتہ ہے۔

لکھن پال اور قرۃ العین کے غالب کے اس شعر کے ترجمے کا موازنہ قابلِ توجہ ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

ASLEEP, I WAS ALL JOY WITH YOU AWAKE,

HAVE NON TO LOOK TO.
DREAMING MY THOUGHTS HAD AFFAIRS WITH THEE AWAKE, THERE I
NO GAIN NOR LOSS.

قرۃ العین کا ترجمہ مختصر اور مکمل ہے۔

محمد خاں کے نزدیک مجیب اگر اپنے خیالات کو غالب کے الفاظ میں مخلوط نہ کرنا چاہیں
الب کے اشعار کا بہترین اور بے عیب ترجمہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ لکھن پال
بعض ترجمے اصل سے بہت مطابق ہیں۔ لکھن پال اور مجیب کے غالب کے اس شعر کے
جمے سے ان کی بات واضح ہو جاتی ہے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

O GOD CALL ME NOT FOR MY SINS TO ACCOUNT
FOR HEART BURNS OF DESIRES UNFULFILLED
I DO RECOUNT (LAKHAN PAL)
I THINK OF ALL THE SCARS LEFT BY SMOTHERED
DESIRES, AND TEMPTATIONS RESISTED
ASK ME NOT, O GOD
FOR AN ACCOUNT OF SINS I HAVE COMMITTED
(MUJIB)

محمد خاں نے رسل کے غالب کے اُس شعر کے ترجمے کی داد دی ہے اور اسے قابلِ رشک کہا ہے

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز راہ کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

I GO SOME WAY WITH EVERY MAN I SEE ADVANCING SWEETLY

SOFAR I SEE NO MAN WHOM I CAN TAKE TO BE MY GUIDE.

لیکن رسل اور خورشید الاسلام کا غالب کی نثر کا ترجمہ تو منظرِ عام پر عرصہ ہوا آگیا تھا لیکن ان کے منتخب اردو اور فارسی اشعار کا ترجمہ ابھی شائع نہیں ہوا۔ رسل لفظی ترجمے کے قائل ہیں۔ اس لیے ان کی کتاب کی اشاعت کا انتظار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ قریب قریب مکمل ہو گیا ہے۔

DISTRACTING WORDS ۱۹۷۴۔۱۹۷۶ء میں محمد ذاکر کا غالب کے ۱۳۲ اشعار کا ترجمہ کے نام سے دہلی سے شائع ہوا۔ محمد ذاکر نے کہا ہے کہ جو اصل متن کو جانتا ہے یا اس کا شیدائی ہے، وہ لفظی ترجمے کو پسند نہیں کرے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ترجمانیاں ہیں لیکن انہیں ترجمہ کہوں گا۔ انہوں نے انگریزی میں متبادل محاورے کی تلاش کی ہے مگر اصل متن سے وفاداری کی کوشش بھی کی ہے۔

مجیب نے جن اشعار کا ترجمہ کیا ہے ان میں سے دو کا ذاکر کا ترجمہ دیکھیے۔

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

THE TONGE BEGS THEE THE POWER TO SPEEK

FOR BY THY GRACE ALONE

SILENCE SOUNDS THE DISTRESSED CRY TO THEE

FOR THINE IS THE LAMP FAINTING IN MORN

AND THINE THE FLOWER.
WHICH IN AUTUMN DOTH LANGUISH

یہ ترجمے قابلِ قدر کہے جا سکتے ہیں۔ اس طرح غالب کے اک مشہور شعر کا ترجمہ

سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

ART LESS ART FULL CARELESS CAREFULL

BEAUTY IN A FEIGNED ABANDON

IS A CHALANGE FORMS INDEED.

مگر بے خودی کا ترجمہ CARELESS کمزور ہے۔

آخر میں ایک خاص کوشش کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اعجاز احمد نے ۱۹۶۹ء میں کی تھی۔ انہوں نے کچھ ممتاز امریکن نوجوان شعرا کو غالب کی دس غزلوں کے ترجمے مشکل الفاظ کی شرح کے ساتھ بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ ان کو اپنی زبان میں پیش کریں۔ انہوں نے کچھ امریکن شعرا کے ساتھ چند امریکن یونی ورسٹیوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے غالب کے اشعار پڑھے اور امریکن شعرا نے ان اشعار پر مبنی اپنی تخلیقات سنائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمے نہ تھے یا ایک اور تخلیق تھے TRANSCREATIONS۔ پھر بھی ADRIENE RICH ایڈرین رچ اور رابرٹ بلائی کی تخلیقات قابلِ قدر تھیں۔ بلائی نے مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے کو ایک نظم کی صورت دے دی تھی جو اپنی جگہ خوب تھی۔ ایڈرین رچ کے یہاں غالب کے فکر و فن دونوں کا اثر جھلکتا تھا۔ شکاگو یونی ورسٹی کے اس جلسے میں میں نے غالب اور جدید ذہن پر اپنے مقالے میں غالب کے اس شعر کا ترجمہ کیا تھا۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

NONE KNOWS THE INNER NATURE
OF THE OTHER
EVERY INDIVIDUAL IN THIS WORLD IS
AN UN CYPHERED LEAF.

ایڈرین رچ کو یہ شعر اتنا پسند آیا کہ انہوں نے یہ ترجمہ لکھ لیا۔ اعجاز احمد کی کوشش کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد ایڈرین رچ نے انگریزی میں غزلیں بھی لکھیں اور ایک غزل میں کہا اے غالب تو کون ہے۔ جو یہاں نیویارک کی عمارتوں کے جنگل میں مجھے یاد آتا ہے۔

اعجاز احمد کی یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

میں نے عطاء اللہ درّانی کی فرمائش پر ۱۹۶۱ء میں انھیں دیوانِ غالب اردو کا لفظی ترجمہ بھیج دیا تھا۔ اب نظرِ ثانی کے بعد اسے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر چونکہ ابھی یہ غیر مطبوعہ ہے اس لیے صرف اس کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

اوپر کے تراجم کی مثالیں مکمّل نہیں۔ لیکن ان کی روشنی میں ترجمے کے سلسلے میں کچھ باتیں تو کہی جا سکتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ترجمہ بہت مشکل ہے کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ شعر میں صرف خیال نہیں ہوتا، بلکہ الفاظ کا ایک خاص استعمال ہوتا ہے جس میں استعارہ، علامت، پیکر تراشی، پہلوداری، ابہام سبھی کچھ ہوتا ہے اسی سے اس کا جادو عبارت ہے۔ اس لیے ایلیٹ نے یہاں تک کہہ دیا کہ شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مگر ترجمے کی کوشش برابر ہوتی رہی ہے اور یہ کوشش ضروری بھی ہے جس طرح نو جس پر ایزرا پاؤنڈ نے زور دیا تھا، تراجم سے بھی وجود میں آتی ہے جیسا کہ مشرقی شاعری کے مغرب کے رومانی شعراء پر اثرات اور چینی شاعری کے پاؤنڈ پر اثرات سے واضح ہے۔ اردو شاعری کے انگریزی تراجم میں مشکل اس وجہ سے بھی پڑتی ہے کہ ترجمے میں وزن اور بحر کا آہنگ، قافیے کی تکرار اور توقع اور ادبی روایت سب مختلف ہیں۔ اس لیے خیال کے ساتھ وفاداری برتتے ہوئے، قافیے کی پابندی کے ساتھ منظوم ترجمہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، انگریزی میں غالب کے اردو شاعری کے جو تراجم ملتے ہیں ان میں قافیے کی پابندی اکثر ایک ہفت خواں ثابت ہوئی ہے۔ صرف کہیں کہیں ہی اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ نثر میں ترجمے کو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا، حالانکہ اس میں اصل کی روح کو برقرار رکھنا آسان ہے، ہاں اس نثر میں ایک آہنگ ضرور ہوگا۔ لفظی ترجمے پر سب نے زور دیا ہے، مگر یہ بات بھی ہے کہ صرف لفظی ترجمہ جس میں مکھّی پر مکھی ماری جائے، یا تو پھیکا اور بے کیف ہو جاتا ہے یا لفظوں کا گورکھ دھندا اس لیے میرے نزدیک صرف لفظی ترجمہ ہی آئیڈیل نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر ترجمہ ایک تخلیقِ نو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے صرف اردو زبان کے مزاج، اس کی ادبی روایت اس کے اسالیب سے واقفیت کافی نہیں، انگریزی جیسی سرمایہ دار زبان پر بھی گہرا عبور

ہونا چاہیے۔ ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے ترجمے زیادہ کامیاب ہیں جنہیں انگریزی پر کول، مجیب، احمد علی، کی طرح قدرت ہے۔ آج انگریزی میں بھی شاعری کی زبان بہت کچھ بدل گئی ہے۔ اس لیے اٹھارویں صدی یا انیسویں صدی کے اسالیب کی پیروی سے ترجمہ مصنوعی اور بوجھل معلوم ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ شاعری جس میں زیادہ تر محاورے برتے گئے ہیں دوسری زبان میں لفظی طور پر منتقل ہو کر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا راس مسعود مرحوم نے سروجنی نائیڈو کی فرمائش پر مجھ سے ثاقب لکھنوی کے منتخب اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے ثاقب کے اس شعر کی مثال دے کر معذرت کرلی۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

لیکن، جہاں فکر یا تخیل کی کارفرمائی ہو، وہاں مترجم کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اقبال کا ترجمہ غالب کے ترجمے سے آسان ہے۔ کیونکہ غالب کے یہاں صرف فکر ہی نہیں، اس کا مخصوص استعاراتی نظام اور پیکر تراشی ہے اور وہ اقبال سے زیادہ پہلودار شاعر ہے۔ میرے خیال میں میر کا اردو ترجمہ اور مشکل ہوگا کیونکہ میر کی زبان بڑی بول چال کی زبان ہے اور اس کی سادگی بڑی پرکار۔ میرے نزدیک اس وقت تک سب سے اچھے ترجمے احمد علی کے ہیں، مگر وہ بھی ہر جگہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ غزل کے ترجمے میں ردیف کو تو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔ صرف ابتدا یا آخر میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ قافیے کو انگریزی قافیے میں ڈھالنا بہت مشکل ہے اس لیے میرے نزدیک غالب کے اچھے انگریزی ترجمے ایک طرح کی نثری نظم میں ہو سکتے ہیں۔ جو جدید انگریزی زبان کے اسرار و رموز پر نظر رکھنے کے بعد، ابلاغ کے مقاصد پورے کر سکتی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں موضوع کو ضرور رہنما بنایا جا سکتا ہے۔ گنجینۂ معنی کے طلسم اور شمشیر کے مانند مے میں تیزی سے عہدہ برآ ہونا بہت بڑا کام ہے۔ اور اپنے طور پر یہ بھی تخلیق ہے۔

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالب
یہاں ہے کاسۂ گردوں بھی ایک خاک انداز

غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات

یادگارِ غالب

مولانا حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اردو میں اسی کتاب سے غالب شناسی کا آغاز ہوتا ہے۔ تحقیق اور تنقید نے بہت کچھ ترقی کرلی ہے، مگر یہ کتاب اپنے موضوع پر آج بھی بے مثال حیثیت کی مالک ہے۔ مولانا حالی مرزا غالب کے شاگرد بھی تھے اور انھوں نے دہلی کی اس عہد کی ادبی محفلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب "حوالے کی کتاب" کا بھی درجہ رکھتی ہے۔
یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کان پور میں چھپی تھی۔ یہی اس کتاب کا واحد مستند اڈیشن ہے۔ اب یہ اڈیشن کم یاب، بل کہ نایاب ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اسی اولین اڈیشن کو فوٹو آفسٹ کے ذریعے بہت اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے، عمدہ سفید کاغذ پر مضبوط جلد او دل کش سرورق کے ساتھ۔

صفحات : ۴۳۸

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲ . . .

ظ۔ انصاری

مثنویاتِ غالب

— اور —

ترجمے کے مسائل

جس زبان و ادب کا اردو زبان و ادب شروع سے گہرا اثر رہا ہے، اس میں شعری روایت مثنوی سے شروع ہوتی ہے۔ فردوسی سے بھی کوئی سنو سال پہلے مسعودی مروزی (وفات ۹۳۰ء) پھر رودکی اور ابوشکور بلخی اور فردوسی سے ذرا پہلے (تقریباً معاصر) دقیقی سے جو کلام یادگار رہ گیا ہے، اس میں مثنوی کی ابتدائی بلکہ کسی قدر تربیت یافتہ شکل اُس وقت موجود ہے جب عربی میں اس کا ظہور نہ ہوا تھا۔

رودکی (وفات ۹۴۰ء) نے ایک طویل اور لازوال نظم "کلیلہ و دمنہ" کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تو ظاہر ہے کہ تب تک، (آج سے گیارہ سنو سال پہلے) مثنوی کی شعری شکل صورت اس درجے کو پہنچ چکی ہو گی کہ منظوم ترجمے کا بار اُٹھا سکے۔ اس میں قصہ بھی کہا جا سکے اور شاعری کا لطف بھی برقرار رہے۔ یوں دیکھیے تو صنفِ مثنوی صدیاں گزرنے کے ساتھ وسیع اور رنگا رنگ اور پہلو دار ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے عالمی ادب کو سات آٹھ صدیوں کے دوران درجن بھر بڑے مثنوی نگار دیے جن کے کلام سے ہمیں ان کے دور کی مادی، تہذیبی، فکری معیشت اور معاشرت کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ خود ان کی ذاتی زندگی

کے ایسے گوشوں پر، اُن مسائل اور مصائب پر بھی نظر جاتی ہے جنھیں دیکھے سمجھے بغیر ہم خود اُنھی کے پسندیدہ استعاروں، علامتوں، پیکروں اور اشاروں کی تہ میں نہیں اُتر سکتے۔ اُترنا چاہتے ہیں تو ٹھوکر کھاتے ہیں۔

رودکی کے بعد — جس کی پوری مثنوی ہمارے سامنے نہیں — فردوسی، سنائی، عطار، رومی، نظامی، خسرو، جامی، علی شیر نوائی، میر حسن، نسیم لکھنوی، میر تقی میر، مرزا بیدل اور غالب —

گیارھویں سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک | صنف مثنوی کے بہترین کارناموں یا

اُن نمونوں کی، جو برابر اس کا دامن معنوی اور تکنیکی حیثیت سے وسیع کرتے گئے یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخری زمانے میں اور اس کے بعد کثرتِ غزل گوئی اور غوغائے غزل گری نے مثنوی کی پیش قدمی کے سامنے بیری کیڈ کھڑے کر دیے۔

ترجمے کے تعلق سے آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ خود عربی اور فارسی شاعری کے شاہکار بھی اردو میں پورے کے پورے وارد نہیں ہوئے (ہم اس کی وجوہ پر نہ جائیں بدیہی ہیں)، اردو شاعری نے مصرعے اور ترکیبیں اور اسماء وصفات کے جوڑ تو اُن سے لے لیے لیکن کسی عظیم فارسی شاعر کا پورا کلام منظوم کرنے کا حوصلہ نہ دیا۔ مشکل سے تین، چار نمونے اس قبیل کے ملیں گے جن میں خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی کا "مظہر العجائب" کے نام سے مکمل اور اعلا درجے کا ترجمہ شامل ہے۔

غالب کے دورِ آخر میں اہل قلم کو اندازہ ہو گیا اور خود غالب کو براہ راست عربی یا فارسی سے لطف اُٹھانے والی نسل چند برسوں کی مہمان ہے۔ اب آسان پیرِ چلت اردو کے رواج کے ساتھ ہی ترجموں کا رواج بھی بڑھے گا۔ (غالب نے "دعاءِ صباح" کا منظوم ترجمہ، عجب نہیں کہ کچھ یہی سوچ کر کیا ہو)۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اور اس کے بعد سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی، انجمن پنجاب لاہور، دہلی کالج، دہلی سوسائٹی، اور کچھ سال بعد حیدر آباد کے دار الترجمہ اور ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد — یا دوسرے

اداروں نے سائنسی علوم کے پھیلاؤ کی خاطر ترجموں کی سائنسی دُرستگی اور علمی شان پر زور دیا۔ شاعری کے ترجموں کا خیال آگے کے لیے اٹھا رکھا گیا۔

غالبؔ کو اصرار تھا کہ شاعرانہ وَزن اور وِژن (Vision) اُردو کے بجائے فارسی کلام میں جلوہ فرما ہے۔ مولینا حالیؔ نے اس کی تائید میں "یادگارِ غالب" کا پورا باب لکھا تھا ـــــ حالیؔ نے، جو غالبؔ کے فکری مَشرب اور فنّی دشوار پسند مَسلک کے آدمی نہ تھے، نہ صرف یہ کہ غالبؔ کے فارسی کلام کی عظمت کا سِکّہ بٹھایا بلکہ اس کلام میں بھی خاص مثنوی "ابرِ گہر بار" کی معنویت ہمارے ناپختہ ذہنوں پر کھولی۔ [قال اللہ و قال الرسولؐ، حدیث، فقہ و تفسیر عربی کا طالب علم، یہ خاکسار تبھی حیرت زدہ رہ گیا کہ] آج تک جتنی مناجاتیں عربی فارسی اُردو میں نظر سے گزری ہیں ان میں تو بندہ اپنے رَب کے آگے ناک رگڑ کر دونوں جہان کی نعمتیں یا مغفرت طلب کرتا ہے ؎

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار
مری بار کیوں دیر اتنی کری ؟

ـــــ وغیرہ ـــــ

اور یہاں یہ ماوَرا النّہری شاعر حَمد اور مناجات کے وقت دونوں ہاتھ دعا کے لیے بلند کرنے کے بجائے اپنی ٹیڑھی ٹوپی سنبھالے ہوئے ہے۔

ہم اس شاعر کے طلسم میں اسیر ہو گئے اور دو چار برس میں کلاسیکی فارسی کا ذخیرہ پی چکنے کے بعد کوشش کی کہ "ابرِ گہر بار" کا منظوم ترجمہ کریں۔ سخت ناکامی ہوئی۔

غالبؔ، آخر، اُردو کا شاعر ہے۔ اس کے فارسی کلام کو اردو شعر کا لباس دیا جائے تو غالبؔ اندازِ کلام سے میل کھائے، اُس کی دھوَن نہ بن جائے۔ اس کام سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ بعد میں اسے پاکستان کے قابل قدر شاعر اور اڈیٹر رفیق خاور نے قسط وار شائع کیا اور حق یہ ہے کہ اُن کا کیا ہوا منظوم ترجمہ کلام غالب کے اُن مطبوعہ ترجموں میں سب سے بہتر ہے جو کتابی شکل میں اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

کچھ تو حالی کا وہ بیان، جو نو عمری میں ذہن پر نقش ہوا، کچھ دوسری ملکی غیر ملکی زبانوں کے اچھے، مربوط ادب کا مطالعہ اور اس کی دی ہوئی نظر اور ہمت کہ ہم نے سب سے پہلے غالب کے کلام فارسی میں سے مثنویات کو ترجمے کے لیے چُنا۔

غالب کی (۱۹) اُنیس مثنویوں میں سے "گیارہ" فارسی میں ہیں اور ان "گیارہ" کے اشعار کی تعداد تقریباً اتنی ہے جتنی کُل دیوانِ غالب اُردو کی۔ اور ان میں کم و بیش ۵۰۰ پانچ سو اشعار، حمد، مُناجات، نعت، منقبت، ساقی نامہ اور مُغنی نامہ کے ذیل عنوانات میں ایسے ہیں کہ (پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کروں) فارسی کے پورے شعری ذخیرے میں ان سے پہلے کا نمونہ نہیں ملے گا۔

پہلے تقریباً دو ہزار اشعار فارسی مثنویات کا ترجمہ اردو نثر میں کیا، پھر ان کی غزلیات، قطعات اور رباعیات کا۔ اور اشاعت کی تیاری سے پیشتر وہ قدم اُٹھایا جو باہر کی علمی دنیا میں ہوتے دیکھا تھا۔ ملک کے آٹھ دس مُستند فارسی اساتذہ کو خط لکھے۔ درخواست کی کہ کلام غالب میں جہاں جہاں التباس، ابہام، اِشتباہ یا الجھاؤ نظر آتا ہے ——— وہ اسے دُور کرنے میں میری رہنمائی فرمائیں۔

ان حضرات میں فی الحال دو بزرگ حیات ہیں اور دونوں، ہم سب کی خوش قسمتی سے یہاں تشریف رکھتے ہیں، ایک پروفیسر نذیر احمد، دوسرے پروفیسر امیر حسن عابدی۔ اور انھوں نے رہنمائی کا حق ادا کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ناواضح یا مُشتبہ یا گُنجلک مقامات کی نقلیں تیار کر کے ان بزرگوں کی صوابدید کے لیے روانہ کیں۔ جواب آئے۔ بعض لسانی اعتبار سے، تلمیحی لحاظ سے قابل قبول نکلے، مگر غالب کی مُشکِک (AGNOSTIC) یا معتزلانہ عقلیت پسندی کے برخلاف کوئی معنی نکالنے کی کوشش۔ وہ محفوظ تو کر لیے، ان سے کام نہیں لیا۔ حاصلِ کلام یہ کہ غالب کو جو اپنے فارسی کلام کا غرہ تھا، وہ ان فارسی مثنویات کے بعض اہم حصوں سے ثابت ہے مثنوی "چراغِ دیر" اور "تقریظ آئین اکبری" پر گزشتہ بیس پچیس سال کے دوران ہر پہلو سے لکھا جا چکا ہے، اور دونوں ہی ان کی بڑھتی ہوئی قدرت کلام کے ساتھ ذہنی بالیدگی، نظر کی وسعت کا پتہ دیتی ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالب تک ہزار برس کے دوران فارسی مثنوی میں اس طرح

کی حمد یا مناجات نہیں لکھی گئی تھی۔ بڑے بڑے دیندار شاعروں نے، جیسے سعدی، نظامی، خسرو، جامی نے صرف دو چار شعر میں حمد لکھی اور آگے بڑھ گئے۔

سعدی نے حمد کے ایک ہی شعر میں معجزہ دکھادیا ہے ؎

حمد بے حد مر خدائے پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را

اور خسرو کو حمد کے ایک شعر پر سات صدیوں سے داد مل رہی ہے ؎

قطرۂ آبے نخورد ماکیاں
تانہ نہد رو بسوئے آسماں

غالب نے شروع میں مسلسل نو ۹ شعروں میں مبتدا اور دسویں میں خبر کا جوڑ بٹھایا ؎

سپاسے کز و نامہ نامی شود
سخن در گزارش گرامی شود

خدا راسزد کز دروں پروری
بدیں شیوہ بخشد شناساوری

یہاں ترجمے میں بھی اس ترتیب کی تعمیل کرنی ہوگی ـــــ خواہ اس میں لطفِ زبان کو گزند پہنچ جائے۔ شاعر خدا کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کے اعمال نہ تولے جائیں ـــ کیوں؟ کیوں کہ:

کہ من باخود از ہر چہ سنجد خیال
ندارم بغیر از نشانِ جلال (ص ۱۶۹)

یہاں ترجمے میں "نشانِ جلال" کے سبب معنی دو طرف جھکتے ہیں ـــــ ترجمے میں دونوں میں سے کسی ایک معنی کو رد کرنا ہوگا، یہاں "حمد" کے تمہیدی اشعار کو غالب نے مجوسیوں، آتش پرستوں، سنیاسیوں، بیراگیوں اور ہر طرح کے مسلکیوں کو شمولیت کے دائرے میں کھینچ لیا اور یوں حمد کو وحدۃ ادیان کے نظریے پر تمام کیا۔ حمد میں ہی مناجات کو آنا تھا۔ اگلے سبھی بزرگوار دو چار چار شعر کہہ کر گزر گئے ہیں۔ سعدی نے کیا خوب دعا مانگی ؎

مرا شرمساری بہ روئے تو بس
دگر شرمساری مکن پیشِ کس

اور خسرو نے ایک قدم اور آگے رکھا ؎

چناں برعیبِ خویشم دیدہ کن باز
کہ از عیبِ کساں بَرنارم آواز

غالب کے ہاں یہ مناجات ہی ہنگامہ خیز ہے۔

بیانِ معراج میں غالب نے تخیل کی پرواز، آرائشِ الفاظ اور اگلوں سے پنجہ کشی میں وہ اپنے کے ارمان نکال لیے ہیں۔ نظامی نے اور ان کے بعد جامی نے نعت میں معراج کا ذکر رکھا تھا خسرو نے اسے ایک حد میں مختصر اختیار کیا۔ غالب نے ۸۲ شعروں میں معراج کے سارے مراحل ایسے طمطراق اور سائنسی تفصیل کے انداز میں لکھے ہیں گویا وہ آج کے IBM یا خلائی پرواز کے پورے سفر کو اپنے راڈر پر دیکھ رہے ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

بُراق حاضر ہے۔ پیغامِ طلب آچکا ہے۔ ؎

چنیں لنگرِ ناز سنگیں چرا؟
نہ طور اظہارِ تمکیں چرا؟

کساں جلوہ برطور، گر دیدہ اند
ز راہِ تو آں سنگ برچیدہ اند

بہ دَورِ تو شدان ترانی کہن
فصاحت مکرر نسنجد سخن

یہاں ترجمہ کا حق، الفاظ بڑھائے بغیر ادا نہیں ہوسکتا۔ اور "نہ طور..." اور "لنگر ناز" میں اگر دو پہلو نکلتے ہیں تو لازم ہے کہ دونوں کی نشاندہی کی جائے۔

جہاں آفریں را خود خواب نیست
تو فارغ بہ بستر چہ خسپی، بہ ایست

کا ترجمہ کرنے میں الفاظ کا انتخاب، دوُرخا مفہوم نکلنے کی گنجائش باقی رکھنا بہت اہم ہے۔
سو وہ یوں کیا گیا : دنیا بیدا کرنے والے خدا پر کھانا اور سونا حرام ہے : .....(خدا کی صفات
میں سے ہے کہ اسے نہ نیند آتی ہے، نہ بھوک لگتی ہے اور یہ کہ آپ کی طلب میں ایک
بے چینی ہے) اور ایک مقام تو ایسا ہے خلا کے سفر میں جسے ہندستانی کے سوا کوئی فارسی داں
سمجھ ہی نہیں سکتا ہے

تو گوئی براہِ خداوندِ دور
سپہر از نمودِ ثریا و ثور

گدائیست ہندی کہ سرتا بہ پا
بجز مہرہ آراستہ گاؤ را

بہ دریوزہ گستاخ پویدہمی
ز رہرو بہ رہ وایہ جویدہمی

ہندستانی رسم کے مطابق گویا برج ثور کے رکھوالے نے آمدِ شاہ کے وقت بھکشا
مانگنے کی سبیل نکالی ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اِس رسم کو قوسین میں ظاہر کرنا لازم تھا۔
پھر غالب کے ترجمے میں وہ یونی ورسل مسئلہ بھی بار بار پیش آیا ہے تلمیحات کا۔ مثلاً نعت میں ہی ہے

بحکم تقاضائے حُبِّ ظہور
تنزّل درِ اندیشہ آورد زور

ترجمہ سمیت سے : لفظ "تنزّل" اور "حُبّ ظہور" کا مفہوم سچے اور با محاورہ ترجمے میں غارت
ہو جائے اگر اس کے ساتھ متعلقہ حدیث کی تلمیح [اپنے یونانی فلسفہ عقل اوّل والے] پس منظر کے
ساتھ ظاہر نہ کی جائے۔

اب تک کی چند مثالوں سے واضح ہوا ہوگا کہ سچا اور اچھا ترجمہ، اصل متن کے الفاظ کے
سائے میں راستہ نکالنے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ ٹھوس قدرتی سائنسوں کے صفحات ترجمہ کرنا

جس قسم کی لاُہلیٔ ترجمہ کرنے والے سے طلب کرتا ہے، انسانی علوم، تاریخ، فلسفہ، عمرانیات،
جمالیات کے مضامین کا ترجمہ اس سے کچھ زیادہ وسعت طلب ہے اور ادبی شہپاروں کا ترجمہ
ایک سمت میں لفظ کے سائے، تحت اللفظ، اشاریے کنایے، یہاں تک کہ کسی خاص
ربط پر زور دینے کا تقاضائی ہے تو دوسری سمت میں وہ TARGET لنگویج میں وہی
SOURCE لینگویج کی کیفیت اور فضا لانے کی خاطر، موسیقی کے اُتار چڑھاؤ کی سی پابندی اور
آزادی بیک وقت عطا کرتا ہے۔ ایک مثال:

اسی مثنوی میں غالب خدا سے شکایت کرتے ہیں ؎

نہ بخشندہ شہ کہ بارم دہد
بہر بار زر ببیل بارم دہد

یہاں بار کا لفظ تین مختلف معانی میں تین مختلف جوڑوں کے ساتھ آیا ہے۔ ترجمہ اُردو میں اُسے
دُہرانا نہیں پڑا:

نہ وہ دریا دل بادشاہ جس کے دربار میں میری رسائی ہوتی اور ہر باریابی پر ہاتھی بھر
کے سونا دیا جاتا۔

ترجمے کے مراحل

ترجمہ اُردو سمیت کسی بھی زبان میں ہو لفظ کے اس خاص پہلو کو پیش نظر رہنا چاہیئے۔
جن ترقی یافتہ زبانوں میں ادبی ـــــ بلکہ منظوم ترجمے کے معیار اور پیمانے مقرر ہو چکے ہیں ان میں یہ
کام پانچ ورنہ چھ مرحلوں سے گزرتا ہے: اوّل ذو بھاشیہ (مترجم) سورس لینگویج سے اپنے طور پر ٹارگٹ
لینگویج میں ڈھال لیتا ہے۔ اور اسی قماش کی چیزیں ترجمے کے لیے چنتا یا قبول کرتا ہے جو اُس کے علمی
ذہنی پس منظر یا مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں۔

پہلا مرحلہ تمام ہوا۔
دوسرا مرحلہ ٹارگٹ لینگویج کے اڈیٹر کا ہے۔ وہ دیکھتا ہے ترجمہ کیسا ہوا۔ بلا اصل جانے لطف
دیتا ہے یا نہیں۔ جہاں وہ اٹکے گا، ترمیم پیش کرے گا۔

تیسرا مرحلہ : سورس لینگویج کے فاضل کا کام ۔ وہ دیکھے گا کہ ترجمہ اصل کے کس حد تک مطابق ہے، وہ اپنی ترمیمیں اور تجویزیں حاشیئے پر درج کرے گا۔

چوتھا مرحلہ : اسٹائل اڈیٹر کا ——— وہ دونوں ترمیموں، اصلاحوں، تجویزوں کو اصل عبارت سے مقابلہ کرکے آخری رائے دے گا۔

پانچواں مرحلہ : مصنّف یا مترجم آخری صاف شدہ (FAIR) کاپی کو اول تا آخر پڑھ کر، اصل سے بے نیاز ہو کر ٹارگٹ لینگویج کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرخ روشنائی کا نہایت محتاط استعمال کرے گا۔

آخری مرحلہ : جسے چھٹا اسٹیج کہنا ہے، شاعری کے منظوم ترجموں کا ہوتا ہے۔ ایسے ترجموں کے فائنل ہونے میں کشمکش بھی سخت ہوتی ہے، دیر بھی لگتی ہے۔ کام کھٹائی میں بھی پڑ جاتا ہے۔

آخری مرحلہ

ادبی تراجم کے سلسلے میں آخری مرحلہ منظوم ترجمے کا ہے جو TARGET زبان کے شاعر کو سر کرنا ہوتا ہے عموماً ایسے شاعر اور وہ بھی پختہ کار، قادر الکلام شاعر کم رہے ہیں جو SOURCE لینگویج کو بھی یکساں باریکیوں کے ساتھ برت سکتے یا اس کا پورا لطف اٹھا سکتے ہوں۔ اگر انھوں نے یہ قدرت حاصل کرلی ہے جیسے طباطبائی، اثر لکھنوی یا فیض احمد فیض، شان الحق حقی تو وہ خود کو ترجمے پر کم ہی صَرف کرتے ہیں۔ یہاں جرمن، انگریز اور روسی شاعروں کی مثال برعکس ہے۔ اُن کے تو ایک سے ایک پختہ کار اور قادر الکلام، نامور شاعر نے ان زبانوں سے منظوم ترجمے کیے ہیں جن پر عبور حاصل تھا اور جنھیں وہ اپنی زبان کے پسندیدہ ادب کے ذائقے میں شریک کرنا چاہتے تھے۔

زیادہ تر ہوتا یہ ہے ——— اور غالب کے اُردو فارسی منتخب کلام کے ساتھ بھی یہی ہوا ——— کہ سچا ترجمہ، اچھا ترجمہ، شعری زبان سے قریب تر متن، ضروری حاشیوں کے ساتھ شاعر کے سپرد کیا گیا ——— اب اس کی فنی نظر ہے جو طے کرے گی کہ کس شعر کو خود اپنی

شعری صلاحیت سے نوازے اور کس کو نظر انداز کر دے۔ کس کو کم آنچ دے، کسے پوری آنچ۔ کہاں وہ اپنے تخیل سے خالی جگہ بھرے، اور کہاں شاعر کے لفظوں کو اس کے معانی اور اشاروں کے سامنے ثانوی حیثیت دے نکلے۔

عملی مثال

غالب کے اردو کلام کا انتخاب اعلا درجے کی اُردو شناس اور شعری ذوق رکھنے والی نوعمر خاتون لودمیلا وسی لیونا نے کیا، اس پر سینئر روسی ساتھیوں نے رندا پھیرا۔ اسے آخری نثری صورت دے کر اپنے وقت کی قادر الکلام روسی شاعرہ بیتا یووا کے حوالے کیا گیا اور مجھ کو یہ عزت نصیب ہوئی کہ موصوفہ کو بہ زبانِ روسی، غالب کے فکری اور فنی پہلوؤں سے اس حد تک باخبر کر دوں کہ وہ ٹیگور کے ڈکشن میں (جو پہلے سے اِن پر حاوی تھا) اسے جذب نہ کریں بلکہ اس کی امتیازی شان برقرار رکھیں۔ ایک ایک شعر پر اور اس کی لفظی و معنوی خصوصیت پر وہ غیر زبان شاعرہ کی حیثیت سے کُرید کُرید کر سوال کرتی جاتی ہیں مثلاً:

کل کے لیے کر آج نہ خِست شراب میں
یہ سُوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

لفظ "ساقیِ کوثر" کی پوری وضاحت ہو چکنے کے بعد دوسرا سوال: کیا کوثر پر ہر ایک کو بے تحاشا پلانے والے کا تصور علی سے وابستہ ہے؟ آج کے ساقی اور کوثر کے ساقی میں کوئی مماثلت ہے؟ یُوں کہ یہاں کا ساقی تو سافن بھی ہو سکتی ہے۔

"کل کے لیے" اور "آج" میں عیشِ امروز اور فکرِ فردا کی نسبت تو نکل آئی اور سوئے ظن، ساقی، کوثر کی باہمی صوتی مناسبت یا نغمگی بھی پیشِ نظر ہے لیکن اِن تینوں پہلوؤں کا یکجا اور محتاط طریقے سے سمونا ___ تقریباً ناممکن۔

آگے کے شعر،

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

بُدھسٹ اور ہندو فلاسفی کے عام مطالعے کی بدولت اور رابندر ناتھ ٹیگور کے صوفیانہ کلام کو شعری قالب دینے کی مشق نے شاعرہ پتا پودا پر یہ شعر نہ صرف واضح کر دیا، بلکہ وہ اس پر جھوم اٹھیں اور انھوں نے اس کے کئی روسی وَرژن (VERSION) کئی مُتبادل تراکیب کے ساتھ سنا دیے۔ اب غالبؔ کی اِس گہری مگر مقبول عام غزل کے تین چار شعر تو ایسی خوبی سے، روسی قالب اختیار کر گئے ہیں گویا وہ براہِ راست اسی زبان میں کہے گئے ہوں :

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر........

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے........

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام....

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود.....

اُردو کے بہ نسبت غالب کے فارسی کلام کا ترجمہ زیادہ کامیاب رہا۔ فارسی سے روسی میں ترجمے کا چلن دو سو برس پرانا ہے۔ فردوسی، سعدی و حافظ و خیام و نوائی کے ترجمے اُن شعرا نے کیے جو روس میں بھی اپنے وقت کے برگزیدہ شاعر مانے جا چکے تھے۔ الفاظ، تراکیب، اشارے، استعارے اجنبی نہ تھے۔ ساقی، خدا، غزل کے متعلقات جوں کے توں رکھ دینے سے بھی کام چل جاتا ہے۔ چناں چہ اگلوں کی برسوں کی کمائی یہاں کام آئی۔ تاہم کلام اُردو کے انتخاب کو روسی شاعری کے قالب میں اُتارنے کا عمل اتنا دشوار رہا تھا کہ غالبؔ کے اُردو فارسی کلام کا جو بڑا انتخاب [میں نے یہاں سے کر کے، اور عمدہ کتابت کرا کے تحفہ کے طور پر اکادیمی کے انسٹی ٹیوٹ خاور شناسی کو ۱۹۶۹ء میں بھیجا اور پھر سال بھر بعد جب پروہاں اُردو شناس نکولائی گلیبوف، الیکسی سخاچیوف اور ماہر اقبالیات نتاشا پری گارینا نے جدا جدا سر کھپایا اور] دس سال گزار کر شائع کیا جا سکا۔ اسے علمی حیثیت سے متن کے سائے کی طرح ایسی نثر میں ہی پیش کرنا طے پایا جو شاعرانہ زبان کی چاشنی بھی برقرار رکھے اور اصل سے زیادہ بے تکلفی برتنے نہ پائے۔

مثال کے طور پر اسی غزل کے دو شعر ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں ....

دونوں مصرعوں کے درمیان بڑھاکر اُردو شعر کا لہجہ برقرار رکھا گیا ہے۔

(مگر آج یہ کیا!)

غالب چُھٹی شراب ـــــ والے شعر میں "پر اب بھی کبھی کبھی" کو پورا حذف کر دیا گیا تاکہ بالکل ہی اخباری نثر نہ ہو جائے۔ اس کے بجائے

.....

یعنی اَبر آلود دنوں اور چاندنی راتوں کو بغیر شراب کیسے بسر کیا جائے۔

"چُھٹی"، "پر"، "اَب بھی" میں جو شوخی ہے، آوازوں کا دَروبست ہے وہ ترجمے میں جاتا رہا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔

اسی طرح کئی آدھے مصرعے چھوڑنے پڑتے ہیں تاکہ کلام ـــ کلامِ غالب ہی رہے، کلامِ گلزار نہ ہو جائے۔

خاتمہ

مجھے قدرت سے ایسا موقع ملا کہ چار (فارسی، عربی، انگریزی، روسی) مختلف زبانوں سے اور زبانوں میں نثر و نظم کا ترجمہ کرنے یا شرح کرنے کا جتن فارسی سے اُردو کرتے وقت (غالب و اقبال کے سلسلے میں) کلامِ غالب فارسی کے بارہ[۱] ہزار اشعار کا اُردو ترجمہ کرتے اور اسے بار بار مانجھنے میں یہ مشق بہم پہنچی، پھر اُردو سے فارسی۔ یہ بھی غالب و اقبال کے تعلق سے سوویت یونین میں ایسے ہم پیشہ رفیقوں ـــ نتاشا پری گارنیا اور غضنفر علییف (مرحوم) کی خاطر، تاکہ وہ اسے اپنے مطابق ڈھال لیں۔ پھر فارسی وار دو مفہوم بیان کرنے اور اسے شعری چاشنی کے قریب لانے میں یہ عمل کوئی چار[۱] ہزار اشعار کے ساتھ کیا گیا اور نتیجہ تین[۲] جلدوں میں آیا۔ پھر اسی کیفیت میں، جب روس کے شاعرِ اعظم پوشکن نے مجھے نرغے میں لیا۔ (یہ ۶۳ - ۱۹۵۹ء کے چار[۳] پانچ برس کے دوران) تو یہاں کی مشق وہاں کام آئی۔ پوشکن اور غالب ایک دوسرے سے قطعی ناواقف، مختلف ملکوں، حالتوں، مزاجوں اور ماحول کے باوجود ـــ خدا جانے کونسی پُراسرار قوت یا روحِ عصر کے اثر میں ـــ ایک ہی

بات ایک سے لہجے میں اور فنکارانہ بصیرت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ایسے کئی مواقع ہیں سے آخر میں، صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

الیکساندر پوشکن (وفات ۱۹۳۷ء) کی ایک مختصر نظم سے جو گویا اس نے موت کو ٹھینگا دکھانے کے لیے کہی ہوگی۔ عنوان ہے "یادگار"۔

یہ نظم اَمر ہوگئی ہے اور پوشکن کے مُجسّموں پر نقش کی جاتی ہے۔ تقریباً اسی ذہنی کیفیت میں غالبؔ کی وہ نظم ہے "خواہد شدن" ردیف والی اور بات بھی وہی کہی ہے۔ زمانہ زمانۂ تصنیف بھی تقریباً وہی ہے۔ اسے میں نے پوشکنؔ و غالبؔ کے الفاظ سے جوڑ کر پورا کیا ہے ؎

میں زمانے کو دے چلا ہوں ایسی یادگار
دستکاری کے نمونوں میں نہیں جس کا شمار

سبزۂ بیگانہ جس کی راہ میں اُگنے نہ پائے
قصرِ شاہی کا منارہ جس کے آگے سر جھکائے

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ مَن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ اند

PERSIAN GHAZALS
OF
GHALIB

English Translation of Selected Persian Ghazals

of

MIRZA GHALIB

translated by

Dr. YUSUF HUSAIN KHAN

غزلیاتِ غالب

(فارسی)

مرتبہ : ڈاکٹر یوسف حسین خان

غالب کی فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ ترجمے میں انگریزی ترجمے ساتھ فارسی متن بھی شامل ہے۔

قیمت : ۸۰ روپے

پروفیسر کلیم سہسرامی

کلامِ غالب کے بنگلہ تراجم

عہد حاضر میں غالب اور اقبال دونوں شاعروں پر بہت کام ہوا ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ غالب کا تعارف بنگال میں انیسویں صدی عیسوی کے اوایل ہی سے ہوا، اور جب وہ کلکتہ گئے تو اہلِ بنگال میں ان کی شخصیت اور کلام سے واقفیت میں اور بھی اضافہ ہوا، موافقین اور مخالفین کے دو گروپ ہو گئے یہی نہیں بنگال میں ان کے معتقدوں کے علاوہ ان کے شاگرد بھی پائے جاتے ہیں،

تشکیل پاکستان کے بعد، مشرقی پاکستان میں اقبال کے بنگلہ تراجم اکثر و بیشتر ہوئے اور کتابی صورت میں شایع کئے گئے، اس طرح اقبال کی مقبولیت خاص و عام ہر طبقے میں ہوئی، غالب کا کلام نہ صرف اقبال کے مقابلے میں بلکہ ویسے بھی مشکل ہے، بظاہر اسی لیے اس کے تراجم عہد پاکستان اور اس کے بعد کم ہوئے، لیکن اس سلسلے میں کوئی امتیازی صورت نہیں برتی گئی یعنی غالب کے کلام کے بنگلہ ترجمے ہندو اور مسلمان دونوں ادیبوں اور شاعروں نے کئے۔ ان میں کچھ مضمون کی صورت میں اور کچھ کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوئے، ایک اور بات قابلِ توجہ ہے کہ بنگالی اہلِ قلم نے منثور و منظوم تراجم کے ساتھ ساتھ غالب کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تنقیدیں بھی لکھی ہیں اور ان کے فلسفیانہ خیالات اور عمیق جذبات سے بحث بھی کی ہے، اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تفہیمِ غالب کے سلسلے میں بنگالی ادیب، اردو

اہلِ قلم سے کتنے قریب ہیں۔ اس لیے کلام غالبؔ کے بنگلہ تراجم کے ساتھ ساتھ، غالب کے بنگلی مترجمین کے خیالات کا خلاصہ بھی پیش کرنا بیجا نہ ہوگا۔

سب سے پہلے میں رشید فاروقی کا تذکرہ کرتا ہوں جنھوں نے ماہنامہ بنگلہ "ماہ نو" مطبوعہ ڈھاکہ اگست ۱۹۶۷ء میں "اردو ادب اور ٹیلنٹ" کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا اور غالب کی زندگی اور شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غالب ایک ذہین شاعر تھے، ان کی شاعری نے انھیں امر بنا دیا ہے۔ ان کے خیال میں غالب کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

دورِ اول : ابتدا سے ۲۵ سال کی عمر تک، اس عہد کی شاعری میں جذبات و احساسات زیادہ ہیں، دیوان غالب سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ غالب جذبات میں اس دور کی شاعری میں فارسی زبان کا اثر زیادہ ہے کیوں کہ اس زمانے میں فارسی کا اس قدر چرچا تھا کہ غالب کیا کوئی بھی شاعر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، فارسی الفاظ و محاورات کا اتنا غلبہ تھا کہ اردو بالکل فارسی آمیز ہو گئی تھی۔

دوسرے دور میں فارسی کا اثر، پہلے دور کے مقابلے میں کم ہو جاتا ہے، اس عہد کی زبان اور طرز بیان آسان اور سلیس ہو گیا تھا اور عام طور پر قابل فہم تھا۔

تیسرے دور میں غالب کی زبان اور اسلوب بیان اتنا بہتر ہو گیا تھا کہ غالب کو اول درجے کا شاعر سمجھا جانے لگا تھا،

غالب کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے بہت سے فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال کئے ہیں یہ طرز عمل ان کی صلاحیت سے بالاتر نہ تھا، غالب جس طرح سوچتے تھے، اسی طرح مفکرانہ انداز میں شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کے اشعار تشریحی ہونے کے بجائے تخلیقی ہوتے تھے، ان کی شاعری میں فلسفہ ہے انھوں نے کبھی عام انداز میں یا مختصر پیمانے پر زندگی کا جائزہ لینے کی کوشش نہ کی، وہ انسان کو جہاں تک انسانیت اور اس کی عظمت کا تعلق ہے، دل سے پسند کرتے تھے

رشید فاروقی کے بنگلہ تراجم اب پیش کئے جاتے ہیں، انھیں سماعت فرماتے

وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اصل مفہوم سے کس قدر قریب ہیں، زبان بہت سیدھی سادی استعمال کی گئی ہے اور انداز بیان میں سادگی ہے جسے ہندی سمجھنے والا کم و بیش آسانی سے سمجھ سکتا ہے :

(۱) ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

পৃথিবীতে আরো অনেক ভালো শিল্পী আছেন
Prithibite Āro Onek Bhalo Shilpi Achen

কিন্তু বলা হয় যে গালিবের বলার ধরণই আলাদা
Kintu Bola Hoe Je Ghaliber Bolar Dhoron-i Alada

(۲) رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

মানুষ যদি দুঃখ সইতে অভ্যস্ত হয়ে যায় তবে তার দুঃখ মিটে যায়।
Manush Jodi Dukkho Shoite Obbhasto Hoe Jae Tobe Tar Dukkho Mite Jae.

আমার উপর এত মুশকিল এসেছে যে তা সহজ হয়ে পড়েছে।
Amar upor Eto Mushkil Esheche Je Ta Shahaj Hoe Poreche.

(۳) ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

উত্তপ্ত কল্পনার আনন্দে আমি গান গেয়ে চলেছি
Uttapto Kalponar Anande Ami Gan Gaye Cholechhi

আজো যার সৃষ্টি হয়নি আমি সেই বাগানের বুলবুলি ,
Ajo Jar Sriśhti Hoeni Ami shei Baganer Bulbuli

(৪) ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

আমি তার প্রতি আকৃষ্ট কিন্তু সে অসন্তুষ্ট
Ami Tar Proti Akrishto Kintu She Oshantushto

হে খোদা এসব কি ব্যাপার !
He Khoda Eshab Ki Baipar !

(৫) میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

আমিও মুখ খুলে রেখেছি
Imio Mukh Khule Rekhechi

আর যদি কেউ জিজ্ঞাসা করত কি তার আকাঙ্ক্ষা
Ara Jodi Keo Jiggasha Korto Ki Tar Akankha

(৬) عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

প্রেমের ছোঁয়ায় এই জনমেই পান করেছি জীবনসুধা .
remer Chhoae Eyi Janamey Pan Kore—chi Jibonshudha
زیست کا مزہ

সকল ব্যথার প্রলেপকে মোর শান্তিবিহীন সে
Sakal Bethar Prolepke Mor Shantibihin She

(৭) آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

দুঃখ ভারাক্রান্ত মনের অশান্ত বেদনার কথা
Dukkho Bharakkranto Moner Oshankho Bedonar Kotha

মনে আছে।
Mone Ashche.

হে খোদা, আমার পাপের হিসাব আমার কাছে চেয়ো না
He Khuda, Amar Paper Hishab Amar Kachhe cheo Na

چھٹے شعر کے پہلے مصرع میں مترجم نے "طبیعت" کا ترجمہ درست نہیں کیا، اس کا متبادل اِئی جِنمے "(نشان کشیدہ) کیا ہے جس سے صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اسی طرح پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں زبان کا ترجمہ نہ ہوسکا۔ منہ کھلا ہوا رکھنے سے زبان کا مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

دوسری شخصیت جناب ابو سعید ایوب کی ہے جنھوں نے غزلیات غالب کا انتخاب تعارفی اور تنقیدی مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں ڈے پبلشنگ، کلکتہ سے جنوری ۱۹۷۶ء میں شایع کیا۔ جناب ابو سعید کی مادری زبان اردو ہے لیکن بنگلہ زبان میں انھوں نے رفتہ رفتہ دستگاہ حاصل کرلی کہ سرزمین بنگال میں فلسفہ اور بنگلہ ادب خصوصاً ٹیگور پر درجۂ استناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب کی طرف ان کی توجہ یقیناً ایک فال نیک ہے کیوں کہ عام بنگالی طبقہ اور بائیں بازو کے ادیب ان کے ترجمے کی طرف خصوصیت سے متوجہ ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ غالب کے منتخب اشعار کا ترجمہ ہے، موضوعات کے لحاظ سے انتخاب کرنے کا ارادہ تھا لیکن غزل میں یہ کام مشکل ہے کیوں کہ شاعر کے مختلف رجحانات و میلانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشعار کو ایک ہی لڑی میں پرونا دشوار ہے غزل جاپانی ہائیکو سے ملتی جلتی ہوتی ہے لیکن اس سے طویل، غزل میں کم سے کم الفاظ کے وسیلے سے شاعر اپنے خیالات و احساسات کو بیان کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنی خوبیوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ انھوں نے لفظی ترجمے سے احتراز کیا ہے تاکہ اصل مطلب واضح ہوسکے، مترجم اگر قادر الکلام شاعر ہو تو شعر کا ترجمہ زیادہ بہتر طور پر کرسکتا ہے، ہاں اس میں شک

نہیں کہ منظوم ترجمے کو اصل مفہوم سے قریب تر لانے میں دشواری ہوتی ہے۔

بہر صورت، منثور ترجمے میں انھوں نے کوشش کی ہے کہ بنگالی کو اُردو شعر کی دل کشی اور شاعری کی روح سے روشناس کیا جائے تاکہ غالب کے فکر و فن اور شاعرانہ اہمیت کا اندازہ لگ سکے۔ ابوسعید ایوب نے اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ بعض جگہ غالب کی مخصوص ترکیبوں اور دل کش استعاروں کے متبادل بنگلہ الفاظ نہ ملنے کے باعث انھیں آزاد ترجمہ کرنا پڑا ہے تاکہ شاعر کے شعری احساسات، دلی جذبات اور نازک خیالات کو قاری کے ذہن تک صحیح طور پر منتقل کیا جاسکے۔ غالب اردو کے مشکل گو شاعر ہیں انھوں نے بعض ایسے اشعار کہے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے لیکن بہت سارے آسان شعر بھی کہے ہیں، بعض ایسے اشعار کہے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں ذہن پر زور دینا پڑتا ہے لیکن غالب کے پر شکوہ الفاظ اور دل کش انداز بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ غالب کی شاعری ان کی شخصیت کے اردگرد گھومتی ہے یعنی اپنے شخصی رنج و غم کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے ہیں جسے ناقابل اعتنا نہیں سمجھا جاسکتا، غالب نے جہاں اپنے غم والم کا تذکرہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا غم ان کے شعر میں جھلکتا نظر آتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نقادوں کا خیال ہے کہ اردو میں دو ہی بڑے شاعر گزرے ہیں، ایک غالب اور دوسرے اقبال، دونوں کا نقطۂ نظر اور انداز فکر اگرچہ مختلف ہے لیکن بعض امور میں مماثلت ہے مثلاً دونوں کا بیشتر کلام فارسی میں ہے اور دونوں نے پسندیدہ مضامین فارسی ہی میں ضبط کئے ہیں۔ غالب نے ۱۵/۱۶ سال کی عمر سے اردو میں شعر گوئی شروع کی اور ۳۰ سے پچاس سال کی عمر تک فارسی زبان میں شعر کہے، جب غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے تو انھیں شاعر الملک یعنی (راشٹروکوبی) کے خطاب سے نوازا گیا، غالب نے ابتدائی اور آخری دور میں جو شعر کہے ان کی زبان، بیان اور لب و لہجہ میں خاصا فرق ہے لیکن فارسی الفاظ کا استعمال ان کے

بہاں بدستور جاری رہا اور فارسی طرز کلام کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اب ابوسعید نور
کے بنگلہ تراجم سے مثالیں پیش ہیں :

(۱) ہم نے وحشت کوہ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

দুনিয়ার এই ভয়ানক উজাড় মজলিসে প্রদীপের মত আমি
Dunyar eyi Bhoyanak Ujar Majlise Prodiper Moto Ami

প্রেমের শিখাকেই আমার সর্বস্ব জ্ঞান করলাম
Premer ShiKhaKeyi Amar Sharboshsho Geyan Korlam

(۲) یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

সর্বনাশের স্ফুলিঙ্গ তুমি, মানুষের ঘর উজাড় কর
Sharbonasher Esfulingo (فتنہ) Tumi, Manusher Ghar Ujar Ke

একাই কাম কিসে
EKai Kam Kishe

তুমি যার বন্ধু হলে, আকাশ আবার তারও শত্রু হবে চে
Tumi Jar Bandhu Hole, AKash Abar Taro shotru Hote che

(۳) خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

খুশীর কি আছে ক্ষেতের উপর যদি একশো বার মেঘ আ
Khushir Ki Achhe KHeter upar Jodi EKsho Baro Megh A

আমি তো জানি এখন থেকেই বিদ্যুৎ খুঁজছে আমার
Ami to Jani EKhun Thekeyi Biddut Khujchhe Amar

ধানের গোলার ঠিকানা।
Dhaner Golar Thikana.

(۴) ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

আমি কি এমন জ্ঞানী ছিলাম, কোন গুণেই
Ami Ki Emon Geyani chhilam, Kon Guneyi

বা শ্রেষ্ঠ ছিলাম;
Ba Shera Chhilam

অকারণে, গালিব, আসমান আমার শত্রু হলো,
OKarone, Ghalib, Asman Amar Shotru Holo

(۵) بے داد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

প্রেমের নিষ্ঠুরতাকে ভয় করি না, কিন্তু আসাদ
Premer Nishthurotake Bhoy Kori Na, Kintu Asad

যে হৃদয় নিয়ে গর্ব ছিলো, সে হৃদয় আর নেই
Je Riday Niye Garbo chhilo, She Riday Ar Ney

(۶) وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

সে মিলন আর, সে বিচ্ছেদ কোথায়?
She Milan Ar She Bich chhed Kothay?

সেই রাত, দিন, মাস, বছর কোথায়?
Shey Rat, Din, Mash, Bachhar Kothay?

کلامِ غالب کے تیسرے مترجم جناب منیر الدین یوسف ہیں جن کا خانوادہ خالص بنگالی ہے لیکن ان کے یہاں ابتدا سے اردو پڑھنے، بولنے اور لکھنے کا چلن تھا۔ ان کے چچا جناب محمود الرب صدیقی خالد بنگالی کے نام سے نقادر (آگرہ) میں غزلیں اور نظمیں لکھا کرتے

تھے اور نظام شاہ دلگیر سے ان کے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے گویا اس طرح انھیں اُردو ورثے میں ملی، انگریزی کے علاوہ اردو، بنگلہ اور فارسی پر یکساں قدرت رکھتے تھے، انھوں نے بنگلہ زبان میں تاریخ ادب اردو ۱۹۶۸ء میں مرتب کر کے بنگلہ اکیڈمی سے شایع کرائی اور غالب کی پچاس منتخب غزلوں کا منظوم ترجمہ دیوانِ غالب کے نام سے کیا جسے اسلامک فاونڈیشن ڈھاکہ نے ۱۹۶۵ء میں شایع کیا، اس کا دوسرا اڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۰ء میرے پیش نظر ہے۔

وہ غالب کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب نے میرؔ اور سوداؔ کی شاعرانہ روایت میں انقلاب برپا کیا ان کا تعلق کلاسیکی عہد شاعری سے تھا لیکن ان کی طبیعت میں جدت طرازی تھی، ان کی وفات پر ایک صدی گزر جانے کے بعد ان کی شاعرانہ عظمت برقرار ہے، انیسویں صدی کے مسلم تمدن اور معاشرے کی بدحالی کی عکاسی انھوں نے اپنے کلام میں پیش کی ہے، وہ اپنی آنکھوں سے ایک طرف مٹتی ہوئی تہذیب کا نظارہ کر رہے تھے اور دوسری طرف آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے، ان کا کلام اپنے دور کی تصویر بھی ہے اور مستقبل کی بشارت بھی اس لیے غالب کے دور کو اردو شاعری کا نشاۃ ثانیہ کہنا نامناسب نہ ہوگا بنگال میں غالب کے معاصر مدہوسودن تھے لیکن انھوں نے طویل نظمیں لکھی ہیں اس لیے ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں، البتہ غالب اور ٹیگور دونوں برسات کے منظر کو پیش کرتے ہیں لیکن غالب نے برسات سے متاثر ہو کر اپنے جذبات و تاثرات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے، غالب کے یہاں ٹیگور کے مقابلے میں زیادہ گہرائی اور گیرائی ہے، ٹیگور فطرت سے زیادہ قریب ہیں اور غالب اپنے جذبات میں غرق رہتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا فلسفیانہ انداز فکر بھی ان کی جدت پسندی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہاں غالب کے شعر کا ترجمہ نثر میں ویسا دلکش روپ پیش نہیں کرتا جیسا نظم میں۔ منیر الدین یوسف نے کلام غالب کے تراجم نثر اور نظم دونوں میں کئے ہیں اور اصل مفہوم سے بہت قریب ہی نہیں، قابل فہم بھی ہیں، زبان میں سادگی اور صفائی ہے اس کے علاوہ انھوں

بیشتر مشکل اشعار کے تراجم کئے ہیں۔

علم کیمیا کے سابق پروفیسر ڈاکٹر مفیض احمد چودھری نے بنگلہ دیش میں اور مسٹر چٹو پدھیا نے کلکتہ میں غالب کے تراجم کئے ہیں لیکن وہاں تک میری رسائی نہ ہو سکی اس لیے ان کے بارے میں کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ منیر الدین یوسف کے تراجم کی مثالیں پیش ہیں: (منظوم تراجم)

(۱) قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

যদিও ইয়াকুব লয়নি খবর, তবু তার আকুলতা
Jodio yaqub Loyni Khabor, Tobu Tar Akulata
پریشانی

ইউসুফ কারায় চোখ পেতে রাখে আলোক ছিদ্র যথা
yusuf Karay chok Pete Rakhe Alok Chhidro Jotha
قید

(۲) جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

অশ্রুজল ধারা বইতে দাও গো বিরহের কালো রাতে
Inkhijal Dhara Boite Dao Go Biraher Kalo Rate

এ দুটি উজ্জ্বল বাতির আলোক জাগুক আমার সাথে
Ey Duti ujjal Batir Alok Jaguk Amar Shathe

غالب کے یہاں جوئے خوں کی ترکیب کا ترجمہ آنکھی جل دھارا کیا گیا ہے جو درست نہیں یعنی اشک چشم۔ یوں کہا جا سکتا تھا "آنکھی ہوتے روکتیر دھارا"۔

(۳) نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ঘুমটি যে তার, তারি তো স্বপ্ন, রাত্রিও তারি দিন
Ghumti Je Tar, Tari To Shapno, Ratrio Tari Dhan

যার বাহু পরে তোর কালো চুল এলায়েছে ও গো মন
Jar Bahu Pore Tor Kalo chul Elayechhe O Go Mon
اے دل

پہلے مصرع میں مترجم نے غالب کے مفہوم کو دوبالا کر دیا ہے یعنی دوسرے
ٹکڑے میں دماغ کا ترجمہ خواب کیا ہے اور ظاہر ہے کہ نیند کے بعد خواب ہی کی توقع
ہے۔ دوسرے مصراع میں اوگومن یعنی اے دل قافیے کی ضرورت کی وجہ سے
فاضل لایا گیا ہے۔

(۴) جلوۂ گل نے کیا تھا، واں چراغاں آبِ جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

রঙ্গীন কত না ফুল ফুটে তীরে করেছে নদীর স্রোত উ
Rangin Koto Na Phul Phute Tire Korechhe Nodir srot Uj

দু'চোখে আমার রক্তের ধারা বইছে এখানে অনর্গল।
Du chokhe Amar Rokter Dhara Boichhe Ekhane Anorgal

(منثور تراجم)

(۵) پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

বনের বৃক্ষলতা এমন মাতাল কেন জিজ্ঞাসা করো না
Boner BrikKholata Emon Matal Keno Jiggasha Koro Na

সজল হাওয়ার ঢেউ আঙ্গুর লতার কুঞ্জ ছুঁয়ে গেছে
Shojal Hawar Dheo Angur Latar Kunjo chhunye Gechhe

(۶) ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

এ বর্ষাকাল এমন এক মৌসুম যে,
Ey Borshakal Emon EK Moushom Je

তার মদমত্ত হাওয়া যদি অস্তিত্ব নাকাল
Tar Modomitto Hawa Jodi Ostitto Natal

করে দিয়ে যায়,
Kore Diye Jaye

তবে তাতে আশ্চর্য হওয়ার কিছু নেই
Tobe Tate Achchorjo Howar Kichhu Neyi

(২)

خزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

হেমন্ত কি? বসন্ত ঋতু কা'কে বলে?
Hemonto Ki Boshonto Ritu. Kake Bole

পিঞ্জরাবদ্ধ বুলবুল আমি, আমার এখানে তো শুধুমাত্র পাখার বিলাপ।
Pinjorabodhho Bulbul Ami, Amar Ekhane To Shudhumatro Pakhar Bilap.

(٨)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

কার রচনায় শিল্পরীতির শেকায়েত করে চিত্রদল;
Kar Rochonay Shilporitir Shekayet Kore chitrodal;

প্রতিটি ছবির অঙ্গ-সজ্জা জানায় করুন মিনতি তায়।
Protiti chhobir Ango-Shajja Janaye Korun Minoti Taye.

منیر احمد شیخ

کلام غالب کے پنجابی تراجم

(پاکستان میں)

ترجمہ کیوں؟

اس موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت میرے ذہن میں چار سوالات اُٹھے: پہلا سوال یہ کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟ دوم یہ کہ شاعری کا ترجمہ کیوں ضروری ہے؟ تیسرے یہ کہ اُردو زبان کے شعرا میں غالب کا ترجمہ کیوں ضروری ہے؟ اور چوتھے یہ کہ کلام غالب کا پنجابی میں ترجمہ کرنے کی اہمیت کیا ہے؟

پہلا سوال کہ ترجمے کی کیوں ضرورت ہوتی ہے، تو اس کے بارے میں مَیں یہ کہوں گا کہ زبانوں پہ انسان کی قدرت بہت محدود ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی زبانیں بول یا سمجھ سکے۔ اس مختصر سی عمر میں یہ ایک ناممکن عمل ہے۔ انسان کوشش کے باوجود مادری زبان کے علاوہ صرف چند زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ اس معاملے میں اس کی صلاحیتیں بہت محدود ہیں۔ لہذا اپنی زبان کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں کے علم و ادب اور ان کی فکر تک رسائی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ترجمہ ہے۔

یہ ذریعہ کامیاب ہے یا کمزور، اچھا ہے یا بُرا، جو بھی ہے، دنیا تک پہنچنے اور اُسے سمجھنے کا اس

سے بہتر اور کوئی ذریعہ ایجاد نہیں ہو پایا۔ اگر ہم اس ذریعے کو نا کافی جانتے ہوئے اسے مسترد کرتے ہیں تو پھر ہمارے پاس بے خبری اور آگاہی کے درمیان اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر ایک لسانی قومیت اپنی زبان کے اندر دوسری زبانوں کے خیالات کے در آنے کے راستے نہیں کھولتی تو وہ نہ صرف جہالت کا شکار ہو کے رہ جاتی ہے بلکہ وہ باقی تمام دنیا سے کٹ کر کنویں کا مینڈک بن جاتی ہے اور فکری ترقی کے تمام راستے اُس پہ مسدود ہو جاتے ہیں۔ جہالت اور آگاہی کے درمیانی فاصلے کو پاٹنے کے لیے ترجمے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ترجمہ لسانی قومیتوں کے درمیان رابطے کے پُل کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ اُس زبان کو بھی وسعت بخشتا ہے جس میں ترجمے کے راستے دوسری زبان کے خیالات اور افکار سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ یورپ کی لسانی قومیتوں نے اپنے لسانی تفوّق کے جذبے کو تعصب میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔ اور ایک یورپی زبان میں دوسری زبانوں کے مشاہیر علم و فن کے تراجم اس کثرت سے ہوئے کہ یورپ کے فکر و فن کے دُنیا بھر میں چرچے ہوئے اور یوں یورپ نے دنیا میں ایک اعلا تہذیبی مقام حاصل کر لیا۔

شاعری کا ترجمہ کیوں ؟

دوسرا سوال یہ کہ شاعری کا ترجمہ آخر کیوں ضروری ہے جبکہ ناقدینِ ادب کی اکثریت کم و بیش اس بات پہ متفق ہے کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک زبان کی شاعری کا مفہوم دوسری زبان تک پہنچایا جا سکتا ہے مگر شاعری جیسے نازک فن کی نزاکتیں، اُس کے لہجے، اُس کے انداز اُس کی چاشنی ترجمے میں منتقل نہیں ہو سکتی شاعری انسان کے نازک جذبوں کا اظہار ہے اور ان جذبوں کے حسن کو پہچاننے کے لیے اُس زبان کا جاننا ضروری ہے جس میں وہ شاعری کی گئی ہے۔ ناقدینِ ادب کی اس رائے میں بہت حد تک صداقت موجود ہے۔ فنِ ترجمہ اُس معراج پہ تو نہیں پہنچ سکا کہ ایک زبان کی شاعری کو زبان و بیان کے تمام حسن اور باریکیوں کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کر دے اور

اور ایسا ممکن بھی نہیں کہ ترجمہ محض الفاظ کو بدل دینے کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک مخصوص تہذیب کو ایک دوسری تہذیب میں منتقل کرنے کا کام ہے ہر تہذیب کے اپنے مخصوص سانچے ہوتے ہیں جو ایک قوم کے اندر صدیوں کی باہمی معاشرت سے وجود میں آتے ہیں۔ ان سانچوں کو جب دوسرے مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کوشش میں صرف بیان ہی نہیں، ہیئت بھی بدل جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جس قدر اختلاف دو قوموں کی تہذیب میں ہوتا ہے اسی قدر بیان و ہیئت کے سانچے مختلف ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ترجمہ اصل سے اس قدر مختلف ہوتا ہے کہ اس میں اصل کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آپاتی۔ ان مشکلات کے باوجود شاعری کا ترجمہ اہلِ فن اس لیے کرتے آرہے ہیں کہ فنِ ادب کی اصناف میں سے شاعری ایک ایسی صنف ہے جو کسی زبان کے لسانی ہنر و کمال کے امکانات کا سب سے اعلا فارم ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ کسی زبان کی شاعری مکمل طور پہ لطف اندوز ہونے اور اس کے کمالِ فن کو پہچاننے کے لیے اس زبان کو جاننا اور سیکھنا ضروری ہے جس میں شاعری کی گئی ہے، مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ دنیا کے کسی بڑے شاعر ہوئے بھیجے اس کی شاعری کے محاسنِ فن اور ان کی تہوں میں اترنے کے لیے پوری عمر درکار ہے۔ یہ صرف ترجمے سے ممکن ہوا کہ ہومر، دانتے، ملٹن اور گوئٹے جیسے عظیم شعرا کا فن اور ان کے فکر کی بلندی دوسروں تک پہنچی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جن زبانوں میں ان دیو قامت شعرا نے شاعری کی، اس زبان کی وسعتوں کا، اس کے استعمال اور اس کے فنی امکانات کا اندازہ بھی پہلی مرتبہ ہوا کہ جس میں اتنی بڑی شاعری ممکن ہو سکی۔ لہٰذا نثر کے ترجمے کی نسبت شاعری ہی کے ترجمے سے دوسری زبان کے ہنر اور فنی کمالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں بھی زبان کے ادب کو اس کی شاعری پڑھے بغیر جاننے کا دعوا ایسا ہی ہے جیسے محبوبہ کے بغیر عورت ذات کو جاننے کا دعوا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہاں سے فرانس گیا اور وہیں ایک فرانسیسی عورت سے شادی کر لی۔ بیوی نہایت خدمت گار اور خوبیوں والی تھی۔ بیس برس کی رفاقت کے بعد جب اس شخص سے اس کی بیوی کی تعریف کی گئی تو اس نے جواب میں کہا کہ بس یوں لگتا ہے کہ بیس برس سے میں محبت نہیں، محبت کا فرانسیسی زبان میں

ترجمہ کر رہا ہوں۔ تو شاعری کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ یہ نازک جذبوں کی زبان ہے اور نازک جذبوں کے اظہار کا بہترین سانچا صرف شاعری ہے۔

غالب کا ترجمہ کیوں؟

تیسرا سوال جو میرے ذہن میں اٹھا، یہ تھا کہ اُردو شعرا میں غالب کا ترجمہ کیوں ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب خاصا تفصیل طلب ہے مگر یہاں اختصار کے پیشِ نظر میں یہ کہوں گا کہ اُردو زبان اور اس کی شاعری کے تخلیقی کمال کو جاننے کے لیے غالب کی شاعری کا جاننا از بسکہ لازم ہے۔ غالب دنیا کے اُن دس بارہ عظیم شعرا کی صف کا رکن ہے کہ دنیا کا کوئی ادب اسے جانے بغیر شعری فکر کی بلندیوں اور عظمتوں کا ادراک حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ غالب کا اُردو کلام اور اس کے فارسی کلام کے مقابلے میں غالب کی اپنی نظر میں "بے رنگِ من است"، تھا مگر غالب اُردو شاعری کی معراج ہے اور اُردو زبان کی تہذیب کی اعلاترین صورت۔ اُردو زبان کے استعمال میں جو SOPHISTICATION غالب کے یہاں ہے وہ اس کے ہم عصر اور شاہ کے استاد ذوق کی زبان میں نہیں ملتی۔ غالب اُردو زبان کی تہذیب کی سب سے عمدہ مثال ہے اور اس کے استعمال پہ اُسے ایسی قدرت تھی کہ وہ اس زبان کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ لہٰذا غالب سے آشنائی اُردو زبان کی تہذیب کی اعلاترین صورت سے آشنائی ہے اور غالب سے محرومی نہ صرف اُردو شاعری سے محرومی ہے بلکہ دنیا کی اعلاترین شاعری سے محرومی ہے اور شاید اسی لیے غالب ترجمہ کرنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور اس چیلنج سے نبرد آزما ہونا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اُس کے ہم عصر اور ہم زبان شعرا اور سخن شناس شاکی تھے کہ وہ ایک مشکل پسند شاعر ہے اور سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ اہل فن جانتے ہیں کہ یہ شکایت ادب، فلسفہ اور علوم کی تاریخ میں ہر اُس شخص کے بارے میں کی گئی جس نے کسی میدان میں اجتہاد کی نئی راہیں نکالیں۔ غالب صاحب ایجاد شاعر تھا اور فکر کی بلندیو کے ساتھ ساتھ زبان کے فنی استعمال پہ اسے خالقانہ قدرت حاصل تھی۔ پس غالب کی

شاعری کو دُنیا کی دوسری زبانوں میں منتقل کرنا دراصل شاعری کے کمالات کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی امکانی وسعتوں اور عظمتوں سے دنیا والوں کو روشناس کرانا ہے۔

غالب کا پنجابی میں ترجمہ کیوں؟

چوتھا اور آخری سوال یہ ہے کہ کلام غالب کا پنجابی زبان میں ترجمہ کرنے کی کیا اہمیت ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ اُردو شاعری یا نثر کا پنجابی میں ترجمہ کرنا، مترجمین کے نزدیک اس لیے اہم ہے کہ اُردو زبان بہ نسبت دوسری زبانوں کے پنجابی زبان کے بہت قریب ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی "ترجمے کا فن اور پنجابی شکوہ" کے عنوان کے تحت اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں "۔ اُردو زبان کا وجود جن عناصرِ اربعہ سے تیار ہوا، پنجابی زبان ان میں سے ایک ہے۔ پنجابی زبان کا مزاج، لب و لہجہ اور گھن گرج سب اُردو زبان میں موجود ہے اور اُردو زبان کی تمام باریکیاں اور اظہار و بیان کے تمام اسلوب پنجابی زبان کی دسترس میں ہیں[1]۔" اُردو اور پنجابی شاعری کے باہمی رشتے کی شہادت اُردو زبان کے قدیم تذکروں میں سید انشاء اللہ خاں انشا کے اس شعر سے بھی ملتی ہے۔

سُنایا رات کو قصّہ جو ہیر رانجھے کا   تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

حافظ محمود شیرانی کا تحقیقی مقالہ "پنجاب میں اُردو" اُردو اور پنجابی کے باہمی رشتے پر علمی سطح پہ روشنی ڈالتا ہے۔ جسے علامہ شیرانی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان دونوں زبانوں کی یہی باہمی قربت ہی پہلی سطح پہ مترجمین کی تحریک کا سبب بنی ہے اور وہ اُردو سے پنجابی اور پنجابی سے اُردو میں تراجم کا بیڑا اُٹھا لیتے ہیں۔ کلام غالب کا پنجابی زبان میں ترجمہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ غالب جیسا قد آور شاعر پنجابی بولنے اور پڑھنے والے ایسے طبقے میں، جو اُردو زبان و ادب سے ناآشنا ہے، متعارف ہوگا اور غالب کی شاعری جب پنجابی زبان کی دسترس میں آئے گی تو اس سے خود پنجابی زبان الفاظ و بیان

---

[1] پنجابی شکوہ مترجم پیرزادہ فضل احمد فاروقی۔ مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی پنجابی اکیڈیمی لاہور ۱۹۶۴ء

کے ساتھ ساتھ نئے لہجوں اور مزاج سے روشناس ہوگی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ غالب کے پنجابی ترجمے سے پنجابی زبان، اظہار و بیان کی ایک نئی جہت سے مالامال ہوگی دوسری جانب پنجابی زبان کے ادب میں دنیا کے ایک عظیم شاعر کی فکر بھی شامل ہو جائے گی اور یوں پنجابی ادب کے سرمایے میں بے بہا اضافہ ہوگا۔

ہمارے ہاں تو پنجابیوں کی دو زبانیں ہیں۔ ان کی بول چال کی زبان تو پنجابی ہے مگر ان کی تہذیبی اور قومی زبان اُردو ہے۔ دیہات کے رہنے والے جو زیادہ تر پنجابی فوک ادب کے قصے سنتے اور پڑھتے تھے، وہاں اب نسیم حجازی پہنچ گیا ہے۔ لہٰذا ایسے کثیر آبادی والے طبقے کے لوگوں کے لیے غالب کو ان کی زبان میں پیش کرنا، پنجابی زبان ہی پر احسان نہیں بلکہ دیہات کے رہنے والوں میں اعلیٰ اور معیاری ادب سے روشناس کرانے کے مترادف ہے۔

اچھا ترجمہ کسے کہتے ہیں؟

اس بحث کے بعد ذہن قدرتی طور پہ چند اور سوالوں کی طرف جاتا ہے کہ اچھے ترجمے کا معیار کیا ہے اور اسے کیسے پرکھا جا سکتا ہے؟ کیا ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے یا خالصتاً تکنیکی؟ اچھے ترجمے اور اچھے مترجم میں کس قسم کی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے؟ کیا ترجمہ، استفادہ اور تشریح میں کوئی حد قائم کی جا سکتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات پر ناقدینِ ادب کی طویل بحثیں ہو چکی ہیں۔ بعض ناقدین کی رائے میں ترجمہ اصل کے الفاظ کی بجائے مفہوم کی طرف زیادہ جھکا ہوتا ہے۔ ظ۔ انصاری لکھتے ہیں: "ترجمہ اگر کامیاب ہو جائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے احتساب کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا۔"[1] ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا کہنا ہے کہ "ایک زبان سے دوسری زبان میں تجربہ یا مفہوم کو منتقل کرتے ہوئے جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے

---

[1] ظ۔ انصاری۔ زبان و بیان۔ دلّی فروری ۱۹۵۹ء

کہ ترجمہ ایک خالص شعوری اور اکتسابی عمل ہے جس کو انجام دینے کے لیے باقاعدہ ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت ہے۔[1]

فن ترجمہ اور اس کی پرکھ کے تمام مباحث کو پڑھنے کے بعد مختصر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس زبان میں جو کوئی ادب پارہ ترجمہ ہوا تو اُسے اُس کے خالق سے الگ ہٹ کے دیکھنا چاہیے یعنی جس زبان میں ترجمہ ہوا ہے اس میں کیا وہ ایک معقول اور حساس تحریر بنی ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ عمل دیکھنا چاہیے کہ غالب کا پنجابی ترجمہ غالب سے الگ ہٹ کے پنجابی زبان میں بجائے خود ایک ایسی نظم یا غزل ہے جو اس کے پڑھنے والے کو اُسی طرح MOVE کرتی ہے جس طرح غالب کے ایک حساس اُردو قاری کو۔ اگر ترجمے کی صورت میں ظاہر ہونے والی تحریر اپنے پڑھنے والے پہ کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکتی تو وہ ترجمہ اپنے بنیادی مقصد یعنی شعری ابلاغ میں ناکام رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترجمے کی پرکھ کا یہ معیار ترجمے کی کامیابی یا ناکامی کو جاننے کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور اسی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کلام غالب کے پنجابی ترجموں کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

غالب کے پنجابی تراجم

پاکستان میں غالب کی اُردو غزلوں اور نظموں کے منظوم ترجمے کتابی صورت میں ابھی تک صرف دو ہی ہیں۔ البتہ کئی ایک شعرا نے ان کی چیدہ چیدہ غزلیات یا ایک آدھ غزل کے کچھ ترجمے کیے جو منتشر کوششوں سے زیادہ نہیں۔ پاکستان میں اس کا باقاعدہ آغاز صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مرحوم نے غالب کے فارسی کلام کے پنجابی تراجم سے کیا۔ ان کے یہ تراجم پنجابی زبان میں پہلی کامیاب کوشش کہی جاسکتی ہے لیکن صوفی صاحب نے غالب کے ترجمے کو صرف ان کی فارسی شاعری تک محدود رکھا اور کسی اُردو غزل کا ترجمہ ہمیں ان کے ہاں نہیں ملتا۔ صوفی صاحب کے علاوہ ماجد صدیقی، منشی لطیف گجراتی، احمد حسین اور

---

[1] ڈاکٹر گوہر نوشاہی "ترجمے کا فن اور پنجابی شکوہ" پنجابی اکیڈمی لاہور

دلپذیر شاد نے ایک دو غزلوں کے ترجمے کیے لیکن اُردو غزلیات کا پہلا ترجمہ ۱۹۶۹ء میں پروفیسر دلشاد کلانچوی نے کیا جسے مکتبہ میری لائبریری نے لاہور سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ غالب کی ۲۴۴ غزلیات کے منظوم ترجمے پہ مشتمل ہے اور" غالب دیاں غزلاں " کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ دلشاد کلانچوی ۱۹۱۶ء میں بہاول پور میں پیدا ہوئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔" غالب دیاں غزلاں " کا ترجمہ سرائیکی زبان میں کیا گیا ہے جو پنجابی زبان ہی کا ایک لہجہ ہے اور یہ زبان ملتان، بہاولپور، خیرپور، رحیم یار خان، سندھ اور بلوچستان کے سرحدی اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ مشہور صوفی شاعر سچل سرمست اور خواجہ فرید کا کلام سرائیکی ہی میں ہے۔ مسعود حسن شہاب اس ترجمے کے دیباچے میں ترجمے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:" غالب کی اُردو غزلوں کو بھاولپوری ملتانی زبان میں منتقل کرنے کی سب سے بڑی تحریک یہی ہے کہ وہ (مترجم) اُردو غزل کی اعلا اقدار سے ان لوگوں کو محظوظ و مستفید کرنا چاہتے ہیں جن کے لیے اُردو زبان اجنبی نہیں تو اپنے نکات و معارف کے اعتبار سے سریع الفہم بھی نہیں ہے"۔

دلشاد کلانچوی نے فارم کے لیے جو" التزامات" رکھے ہیں۔ ان میں اصل غزلیات کے اوزان و بحور اور ردیف و قوافی کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ جو مشترکہ طور پر دونوں زبانوں میں مستعمل ہیں، انہیں بھی ملتانی بھاولپوری میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف اسما، افعال اور صفات وغیرہ میں ردّ و بدل کیا ہے مثلاً" کا " کی بجائے " دا "۔ کی، کی بجائے " دی" " ہوتا " کی بجائے " ہوندا " آگے کی بجائے " اگوں " اور بہت کی بجائے " بہوں " وغیرہ وغیرہ[1]

واقعہ یہ ہے کہ مترجم نے اس ترجمے میں " کا "" کے "" کی " بدلنے کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر کام کیا ہی نہیں۔ غالب کے اشعار کو جوں کا توں اُٹھا کے رکھ دیا ہے اور جہاں کہیں ایک آدھ جگہ ترجمے کی کوشش کی ہے وہاں مفہوم اصل سے دور ہو گیا ہے۔

---

[1] مسعود شہاب ۔ مقدمہ غالب دیا غزلاں۔ مکتبہ میری لائبریری ۱۹۶۹ء

معلوم ہوتا ہے کہ مترجم میں شاعری کے ترجمے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ غزلیات کے ان تراجم میں نہ تو وہ غالب کی فکر کو پنجابی زبان میں منتقل کر سکے ہیں اور نہ ہی ترجمے میں سرائیکی زبان کا جسے وہ ملتانی بھاول پوری کہتے ہیں۔ کوئی روپ یا فضا پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں غالب کے ان تراجم کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں کہ ان میں ترجمے کے دعوے اور مدان کے باوجود ترجمے کے فن کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ترجمے کے اس پہلے مجموعے کی اہمیت محض ایک ریفرنس سے زیادہ نہیں۔ آپ صرف چند مثالوں سے ملاحظہ فرمایئے کہ اصل اور ترجمے میں کتنا فرق ہے۔

۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ترجمہ

نقش فریادی ہے کیندی شوخی تحریر دا — کاغذی چولے دے وچ کیوں تن ہر تصویر دا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا
اتنی ہے غالب اسیری وچ وی بھاہ پیراں تلے — واں سڑے وانگ ہے کڑا مینڈی زنجیر دا

یا

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

ترجمہ

عشق میکوں نئیں تاں وحشت ہی سہی — مینڈھی وحشت، تینڈھی شہرت ہی سہی
اساں دشمن تے نسے ہیں تینڈھے — غیر کوں تینڈڑی محبت۔ ہی سہی

آپ نے دیکھ لیا کہ ترجمے کے نام پر مترجم نے صرف اسما، افعال اور صفات کو بدلنے کی زحمت کی ہے اور ردیف، قافیے اور بحر کو بھی جوں کا توں رکھا ہے۔ ایسے ترجمے کو دیکھ کر صرف ایک ہی خیال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ اگر یہ ترجمہ ہے تو پھر اس سے بہتر ہے کہ اصل ہی کو پڑھ لیا جائے۔

کلام غالب کے پنجابی ترجمے کا دوسرا منظوم ترجمہ دیوان غالب کے عنوان سے

اسیر عابد نے بارہ برس کی محنت کے بعد مکمل کیا اور جسے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اسیر عابد معلمی کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں اور ترجمے کی اشاعت کے وقت وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج (جو پہلے خالصہ کالج تھا) گوجرانوالہ میں شعبۂ اردو میں استاد تھے۔ مترجم کے بقول ترجمے کا خیال انھیں غالب کی شاعری کی تدریس کے دوران آیا۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ پڑھی پڑھائی تشریحیں اور گھڑے گھڑائے جملے بول کے طالب علموں کو بظاہر مطمئن تو کر دیتا تھا مگر میرا دل کہتا تھا کہ غالب ان نوجوانوں تک نہیں پہنچ پایا۔ ہاں البتہ جب کبھی اپنی مادری زبان پنجابی کا سہارا لے کے غالب کے شعر پر گفتگو کی تو یوں لگا کہ آج مجھے بھی اس شعر کی سمجھ آ گئی اور پڑھنے والوں کو بھی۔ چنانچہ اسیر عابد نے جون ۱۹۷۳ء کی ایک رات غالب کی مشہور غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا" ریڈیو پہ سن کے ترجمہ کر ڈالی اور جب دوستوں کو سنائی تو انھوں نے اس کوشش پہ بے تحاشا داد دی اور یوں شوق کا یہ قافلہ رواں ہوا۔ اسیر عابد کے اس ترجمے کے بارے میں احمد ندیم قاسمی دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "اسیر عابد کے اس طرح کے سچے اور اچھے تراجم سے میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ جس طرح شعر کہنا قدرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی قوتوں کا اظہار ہے، اُسی طرح اچھے شعر کا اچھا ترجمہ بھی قدرت کی اس ودیعت خاص کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اسیر عابد اس سے پوری طرح آراستہ ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

> "اسیر عابد کا ترجمہ دیکھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے غالب کو پانی کی طرح پی لیا ہے اور اُسے اپنے خون میں رواں کر لیا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی کے بقول اسیر عابد غالب کی سلیس اور بظاہر سادہ اشعار کی سادگی و پرکاری کو بھی اپنے تخلیقی ترجمے کی گرفت میں لے آیا ہے اور یہ کہ

"اسیر عابد کے اس ترجمے نے روزِ روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ

اور پنجابی تو جیسے اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ ترجمے کا یہ معجزہ اسی لیے ظہور پذیر ہوا ہے۔"

پنجابی زبان کے نامور شاعر اور نقاد شریف کنجاہی نے اسیر عابد کے تراجم پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا ہر تیشے والے کے بس کی بات نہیں ہوتی مگر غالب کے کلام کو پنجابی میں ڈھال کر اسیر عابد نے یہ کام کر دکھایا ہے۔"

ناقدین کی یہ آرا، اسیر عابد کے تراجم کے بارے میں مبالغے سے پاک ہیں۔ بلاشبہ اسیر عابد نے کلام غالب کو پنجابی زبان کی کٹھالی میں ڈھال کر غالب کو پنجابی زبان کا شاعر بنا دیا ہے۔ ایسا شاعر جس کا اصل روپ مسخ نہیں ہونے پایا۔ جیسا کہ میں نے اس مضمون کے آغاز میں کہا تھا کہ غالب ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی بھی زبان کا مترجم اس پر ہاتھ ڈالتے وقت کانپ جاتا ہے، مگر اسیر عابد نے بارہ برس جس لگن اور خلوص کے ساتھ غالب کے ساتھ دن رات بسر کئے، وہ بالآخر غالب کو اردو کے کوچے سے نکال کر پنجابی زبان کے کوچے میں اس طرح لے آئے کہ دلی کے مرزا نوشہ، پنجاب کے باسی لگنے لگے ہیں۔ میرے نزدیک اسیر عابد کے ترجمے کا یہی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ پنجابی زبان کا چولا پہن کر غالب کی شاعری سرزمین پنجاب کی چیز لگنے لگی ہے اور اردو سے نابلد پنجابی اسے پڑھ کر بہت حد تک غالب کے فکر کی گہرائیوں، خیال کی نزاکتوں، اور زبان و بیان کے حسن کا تجربہ کر سکتا ہے۔

اسیر عابد کا ترجمہ نہایت بامحاورہ ہے۔ پنجابی زبان پہ ان کے عبور اور دسترس کا ثبوت انھوں نے اپنے ترجمے میں دے دیا ہے۔ ایسے ایسے خوب صورت محاورے اور لفظی تبدیلیں انھوں نے استعمال کی ہیں کہ اس سے خود پنجابی زبان کے حسن اور اس کی وسعت پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مترجم نے ترجمے کو محض لفظوں کی تبدیلی نہیں سمجھا بلکہ ایک تہذیب سے جنم لینے والے تخلیقی عمل کو ایک دوسری تہذیب کے اندر ڈھال

بدل کے رکھ دیا ہے کہ غالب کے تراجم اپنی الگ حیثیت میں ایک تخلیقی عمل کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اسیر عابد نے غالب کے اشعار کے مفہوم کو نہایت دیانتداری سے ترجمے میں منتقل کیا ہے اور یہ التزام برقرار رکھا ہے کہ مفہوم کی ترسیل میں لہجہ اور طرزِ بیاں مجروح نہ ہو۔ میرے نزدیک یہی وہ نازک اور مشکل مرحلہ ہے جہاں مترجم کی صلاحیت کا کڑا امتحان ہوتا ہے۔ اسیر عابد اس امتحان میں سرخرو ہوئے ہیں اور کلام غالب کے ان تراجم میں لہجہ اور طرزِ بیان کو اس سے پنجابی لہجے میں بدلا ہے کہ پنجابی آہنگ کے اندر سموئے جانے کے بعد اس میں اصل لہجے کی روح باقاعدہ جھلکتی ہے۔

اسیر عابد نے ترجمے میں بیشتر اوقات، قافیے اور بحروں کو بدل دیا ہے مگر اس کے باوجود یہ ترجمے اصل کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پہ مترجم نے لفظی اضافے بھی کئے ہیں مگر اس طور پہ کہ ان سے شعر کے حسن میں اضافے کے ساتھ مفہوم کی صحت برقرار رہی ہے۔ بلکہ ان الفاظ کے اضافے سے مطالب کی تفہیم میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔ پنجابی ہونے کے ناطے سے اسیر عابد کے ترجمے نے میری غالب فہمی میں بڑی مدد کی ہے اور ایسے ایسے مشکل مقامات مجھ پہ آسان کر دیئے جن کو میں نے بھاری پتھر جان کر چوم کے چھوڑ دیا تھا۔ بحیثیتِ مجموعی اسیر عابد کے اس ترجمے میں غالب کی شاعری کا حسن بھی دکھائی دیتا ہے اور پنجابی دیوان انفرادی حیثیت میں اپنی اکائی کو برقرار رکھ پایا ہے۔

بایں ہمہ اس کامیاب کوشش کے باوجود مترجم کہیں کہیں اصل متن سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو اصل متن کا پتہ نہ ہو تو وہ محض اس ترجمے سے شعر کے حسن اور مفہوم دونوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اتنے بڑے ترجمے میں اس طرح کی لغزشوں کا احتمال قابلِ فہم ہے اور ایسی لغزشیں اس وقت سرزد ہوتی ہیں جب مترجم ایک خاص طرح کی بے بسی اور لاچاری کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر اس مجاہدے میں جس ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے اجتناب کرنے لگتا ہے۔ بہرحال دوسرے ایڈیشن میں ایسے تمام اشعار جو غالب کے طرزِ شاعری اور طرزِ بیان سے دور ہو گئے ہیں ان پہ نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور انہیں

اصل کے قریب لاکر ترجمے میں پیدا ہونے والے ابہام کو دور کیا جا سکتا ہے۔
میری ان آرا کی وضاحت کے لیے اسیر عابد کے تراجم سے کچھ مثالیں ضروری ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے اور کہاں کہاں اس کے قدم کمزور پڑے ہیں۔
دیوان کی اولین غزل ہی کو لیجیے، دلشاد کلانچوی نے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کا ترجمہ یہ کیا تھا:

نقش فریادی ہے کیندی شوخی تحریر دا　　　کاغذی چولے دے وچ کیوں تن ہے ہر تصویر دا

اسیر عابد کا ترجمہ دیکھیے:

چتر چیکدا اے چترکار کہڑے ، کھنگن گنھیا وچ تحریر سائیں
چولے کاغذی ساریاں مورتاں دے ، بے وسیاں نے تقصیر سائیں

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا　　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دلشاد کلانچوی:

اسیری وچ وی بھا پیراں تلے　　　وال سڑے وانگ ہے کڑا مینڈھی زنجیر دا

اسیر عابد:

غالبؔ پنکھڑاں وچ نہ رہواں ٹھلّیا پیراں ہیٹھ چواتیاں بجھیاں نیں
کنڈل سیکیا وال ہے سنگلی دا جیہڑی سنگلی آساں اسیر سائیں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　　میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

اس شعر کا دلشاد کلانچوی کا لفظی ترجمہ تو آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں، اب اسیر عابد کو دیکھیے:

مینوں عشق نہ ہویا جھلّ کھلارا سہی　　　میرا جھلّ کھلارا تیری چرچا سہی

ل پاؤں باندھنے کی زنجیر یا رسی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے، کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ساڈے نالوں لگ لگاتے تروڑیں نہ کجھ وی نئیں بھلیاں ٹھکر کا ہی

مثالیں تو دونوں مترجمین کے تقابل کے لیے تھیں، اب ذرا وہ تراجم دیکھیے جہاں اسیر عابد کا
ترجمہ اپنے کمال پر ہے:

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ   اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

ترجمہ

گلہ تیرے آتے میرا پھبدا نئیں، نرا توں نئیں مڈھ بربادیاں دا
میرے رُلن رُلان دے رَولیاں وچ، میرے اپنے لیکھاں دی ہاروی سی

غالب:-
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اسیر عابد:
ہویا کیہ جے چم کے اکھیاں نوں لشکاں مار کے ہوئی اڈار بجلی
چنگی گل ہے سی جے کوئی گل کردے، میرے لکھاں دی تریہہ گھاروی سی

غالب:
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اسیر عابد:
پھڑے جانے آں اسی نحق بندے سیں قلماں تے تھم فرشتیاں دے
لکھے گئے سن جدوں اعمال نامے کول ساڈا وکیل قماروی سی

غالب: ہستے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام   ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

اسیر عابد: کسے کاروبار نوں نئیں ویہنا کاہنوں نندیئے پے فرہادنائیں
جنھوں چڑھی جوانی سر موت آئی اساں عاشقاں پر سرداروی سی

غالب کی ایک سلیس غزل کے چند اشعار کا ترجمہ دیکھیے جس کے ہر دوسرے مصرعے میں ایک لفظ کا ایک لفظ کا اضافہ مترجم نے کیا ہے اور اس اضافے سے معانی کا حسن بڑھ گیا ہے:

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ترجمہ

پکّی گل اے، مرنا اک دن متھیا اے نیندر کاہنوں راتی جھلّی آوندی نئیں

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

ترجمہ

آگے دل دے حالوں ہاسا آوندی سی ہون کسے دی گلّوں بھیڑی آوندی نئیں

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ترجمہ

نیکیاں متھے ٹیکیاں اجر وڈھیرے نیں ایسے پاسے طبع کپتی آوندی نئیں

ان ترجموں میں نیند کے لیے جھلّی، ہنسی کے لیے بھیڑی، طبیعت کے لیے کپتی کی صفات کے اضافے کی داد کوئی پنجابی ہی دے سکتا ہے۔

ایک اور مشہور غزل کا ترجمہ بھی اسیر عابد کے اس کمال کا نمونہ ہے کہ وہ اُردو لہجے اور بیان کو کس خوبصورتی سے اُسی انداز میں ترجمہ کرتا ہے اور پنجابی محاورے کو کس چابک دستی اور ہوشیاری سے استعمال کرتا ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ترجمہ

گل گل تے آہنا ایں کہیہ ایں؟ ساتوں تیرا کیہہ اے
آپے دس مجاں تیرا ایہہ بولن دا چالا کیہہ لے

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا   کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

ترجمہ

جتھے سارا جثہ بلیا دل کتھے بچیا سی   سواہ نوں یار پھرولن بیٹھا چھوپھلا کیہہ اے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ترجمہ

شاہ دی بہنی بہنداے تے اڈی نیئں سو لگدی

نیئں تے دسو شہر اندر غالب دی واہ واہ کیہہ اے

ان مثالوں میں اندازِ گفتگو کے لیے بولن دا چالا اور اترانے کے لیے اڈی نہ لگنا کا محاورہ مترجم کے حسنِ انتخاب اور پنجابی زبان پر دسترس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جہاں جہاں اضافے اچھے نہیں لگے اور وہ متن کو پھلانگ گئے ہیں، اس کی ایک مثال یہ مقطع ہے؛

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی   گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ترجمہ

کیوں ریختہ ڈنگدا فارسی نوں جے کوئی پچھے اسیر پنجابیاں نوں

اک وار بٹھا کے کول اوہنوں غالب خاں دے بول سنا کہ انج

اس ترجمے میں "جے کوئی پچھے اسیر پنجابیاں نوں" ایک ایسا اضافہ ہے جس کا شعر کے اصل متن میں کوئی وجود نہیں اور اس پہ مزید ستم یہ کہ مترجم نے ترجمے میں اپنا تخلص بھی ڈال دیا، اور "پنجابیوں" کو بھی خواہ مخواہ بیچ میں لے آئے ہیں اور پھر غالب کو غالب خاں بنا دیا ہے۔
یقیناً یہ ترجمہ کمزوری ہی نہیں، متن کو مسخ کر کے اسے مبہم بنا دیا گیا ہے ایسی اور بھی کئی مثالیں ترجمے میں موجود ہیں۔ بہر حال اسیر عابد کی یہ کوشش پنجابی زبان میں غالب کا ایک عمدہ تعارف ہی نہیں بلکہ غالب کی شاعری کے تراجم میں اسے ایک کلیدی حیثیت حاصل رہے گی۔

محمد یوسف ٹینگ

کلامِ غالبؔ کے کشمیری ترجمے

مرزا غالبؔ کا کشمیر سے تعلق صرف ایک سطح پر نہیں، وہ کشمیر کے قدرتی حُسن، اس کے پریرویوں کے جمال اور اس کی شراب کے خواص کے قدرداں ہی نہیں، مدح خواں بھی تھے۔ کبھی کشمیر نہیں گئے، لیکن انھوں نے اپنے ایک ممدوح میر تقی میرؔ کو ان الفاظ میں خراج ادا کے کشمیر کے ظاہری حُسن کو معنوی سطح پر لے جا کے اپنی خلّاقی کا مظاہرہ کیا:

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

چونکہ اس وقت میرا موضوع ذرا مختلف ہے، اس لیے زیادہ مثالیں پیش کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن غالبؔ کشمیر کی مٹّی سے اُٹھے ہوئے شاعر مُلّا طاہر غنی سے اِکتساب جس طرح کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ کرتے ہیں، اُس کی طرف اِشارہ کرنے کی ترغیب سے دامن بچانا مشکل ہے۔ اختصار کے لیے میں اُن کے صرف ایک ایک شعر کو پیش کرنا چاہوں گا۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ مرزا نے کس طرح غنی کے فارسی شعر کو اُردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا ہے۔ غنی کا شعر ہے:

شُد روشنم از شمع کہ در بزمِ حریفاں
خاموش شُدن، مرگ بود اہلِ زباں را

اور غالبؔ نے اِسے تقریباً انھی الفاظ میں اُردو میں یوں کہا:

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

بہرکیف، کشمیری زبان میں غالب کا اثر اس صدی کی ابتدا ہی میں ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا۔ جدید کشمیری شاعری کے پیش امام غلام احمد مہجور (۱۸۸۷—۱۹۵۲ء) کے مختصر سے کلام میں غالب سے اخذ و استفادے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے غالب کے مشہور مقطع :

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

کو اپنی روایتی سلیقہ مندی کے ساتھ تقریباً جوں کا توں کشمیری میں منتقل کر دیا۔ البتہ اپنی پسماندہ معاشرت کی رعایت میں ملحوظ رکھ کر یہ احتیاط کی کہ شراب نوشی کا ذکر نے کی بجائے اپنے پیشے کو اپنی ولایت کی راہ میں حائل گردانا :

چانہ کتھ مہجورہ چاوان عارفن آبِ حیات
مانہ ھت درویش کامل آسہ بکھ نے حلقہ دار

(مہجور! تیرا عارفانہ کلام عارفوں کے لیے آبِ حیات نوش کرنے کے برابر ہے۔ ہم تجھے درویشِ کامل سمجھتے اگر تو پیشہ ور پٹواری نہ ہوتا۔)

مہجور کے اِس نوع کے اشعار تعداد میں بہت ہیں۔ میں صرف چند ایک ہی نقل کرنا چاہوں گا، جن میں غالب کی چھاپ سطح پر ہی نمایاں ہے۔ غالب کا شعر ہے :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

مہجور اس عالم آشوب کو اپنی ذات کی آرسی میں یوں محدود کر دیتے ہیں :

ژ یے حیون غم خوار، ژ ئے حیون ستمگار
ژ یے چھو کھ بتہ ژی ملبغار مدہ نو

یاد رہے کہ مہجور کے کلام میں یہ مثالیں بکھری ہوئی صورت میں ملتی ہیں اور اس نے کہیں

پر غالب کا حوالہ نہیں دیا ہے، لیکن صاف ظاہر ہے کہ غالب کا کلام اُسے ازبر تھا۔ اور اُس کی آوازیں مہجور کے اختیار سے باہر ہو کر کشمیری اشعار میں ڈھل جاتی تھیں۔

ماسٹر زندہ کول، مہجور کے ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ وہ کشمیری زبان میں ساہتیہ اکادمی اوارڈ حاصل کرنے والے پہلے شاعر ہیں۔ اُن کا کلام کیفیت میں مہجور کے کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر غالب اُن کے اعصاب پر بھی سوار تھے۔ جس کا اندازہ اُن کے ایک کشمیری شعر سے ہو سکے گا:

یُتھ اثر کرِہ غالبنٖ اکھ شعر نیوتھ سپد یاہ اثر
واعظٕ کرِہ منبرس پیٹھ تیر وعظا کر خمآ لیے

(واعظ منبر سے وعظ کے ہزار تیر چلائے مگر غالب کے ایک شعر کی تاثیر کبھی پیدا نہ کر پائے گا)

عبدالاحد آزاد، مہجور کے کم عمر ہم عصر تھے۔ اُن کے شعر کا مزاج غالب سے بہت دُور ہے۔ وہ ہنگامے اور نعرہ بازی کا شاعر ہے مگر اِس کے باوجود غالب کے اثر کی طاقتور زنجیر سے دُور نہیں بھاگ سکتا۔ اُس نے غالب کے بعض اشعار کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، میں صرف ایسے دو اشعار پیش کروں گا: غالب کا شعر ہے:

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عُذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

آزاد نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور حق یہ ہے کہ پُر زور ترجمہ کیا ہے:

نیرہ بہ سینہ وآرِ داغ زندہ یہ پان مانٕہ مانٕہ
تیر کمان چانہٕ و چانٕہ، میر شکار کیاہ کرے

آزاد کی اسی غزل کا مطلع:

باغ سہ ہے جِہ یسہ فامیون اماریتن کیاہ کرے
سورہ ولنس محتس زور تہ زار کیاہ کرے

غالب کے اِس مقطع کی صدائے بازگشت ہے مگر ذرا کمزور قسم کی صدائے بازگشت:

نِکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تُجھ پر مہرباں کیوں ہو

اِس کے بعد موجودہ دور کے شعرا آتے ہیں، جو اس وقت بھی شعر گوئی میں مصروف
ں۔ اِن کے یہاں غالب سرائی کا زمزمہ کمیّت کے لحاظ سے نہ سہی کیفیت کے لحاظ سے غالب کے
ں کمال کے زیادہ نزدیک آتا ہے۔ اُن کے یہاں اشعار غالب کے شعروں کا عکس تو پیش کرتے
ہیں لیکن اِس سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کا طرزِ فکر اور اندازِ نگارش غالب کے بہت نزدیک
۔ اسی لیے بعض اوقات اُن کے اشعار کے بالمقابل براہِ راست غالب کا شعر بھی رکھا جا سکتا ہے۔
اِن اشعار کو غور سے آنکا جائے، تو اِن میں غالب کا کوئی نکتہ، اُس کی کوئی ترکیب جھلملاتی ہوئی
آئے گی۔ یہ کیفیت کے اعتبار سے کشمیری شعر کا بلند تر منزلوں کی طرح سفر کا غماز ہے اور غالب
اں ایک خضرِ راہ کی طرح حاوی نظر آتے ہیں۔

رحمان راہی موجودہ کشمیری شعرا میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ وہ غالب کا قاری ہی
یں بلکہ فریفتہ بھی ہے۔ راہی کے مجموعہ کلام میں اُس کی ایک پوری غزل غالب کی بے مثال
زل :

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ں بازگشت ہے اور اُس نے غزل کو "نذرانۂ غالب" قرار دے کر شامل کیا ہے۔ اِس غزل کو
لب کی اصل غزل کے بعض اشعار کے ساتھ رکھ کر دیکھ لیجے :

یار صبرس راضی ، دِل دیوانہ ستے
زندگی نارس اندر نورانہ ستے

اِس شعر میں خیال تو غالب کے مندرجہ ذیل شعر کا ہے، لیکن اس کی تمثیل اور استدلال راہی
اپنا ہے :

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

البتہ غالب کے اِس شعر کا جواب راہی سے نہیں بن پڑا۔ اور شاید یہ اُن اشعار کی فہرست
یں ہیں جن کو ترجمے کی چھلنی چھاننے کی استعداد ہی نہیں رکھتی۔ یہ غالب کی عظمت کے وہ لمحے ہیں،

بجلی کے کوندوں کی طرح لپکتے ہیں اور صرف اس کی تخلیقی بھٹی میں ہی پنپ سکتے ہیں ۔ غالب کا
ایک شعر ہے :

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
آسودگی شوق تراشے ہے سار میں

راہی بجلی کے کوند سے تو خیرہ ہو گیا، لیکن اُس کی بازگشت بس ایک بے لطف ورزش ہی
ن پائی ہے :

آدس انے پیوٗ حسنک طلب
منزٕ لودن کعبہ، گوٗرن بُت خانہ تے

راہی صاحب نے غالب کے ایک بے پناہ شعر کا اپنی بساط کے مطابق خوب ترجمہ کیا ہے :
لب کہتے ہیں :

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

ی نے اصل کا حوالہ دیے بغیر یوں کہا ہے :

شانہ کدہ تک شوق کتھ کنز گوگو ناہ
ترادِہ یودوے زُلف کاہنہ پچانہ تے

تفصیل میں جانے کا موقعہ نہیں، موجودہ شعرا میں محمد امین کامل ۔ غلام رسول نازکی مرزا عارف
یسے صف اول کے شعرا تو غالب سے متاثر ہیں اور کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور سے کشمیری اشعار
ں اشعار غالب کی بازگشت سنائی دیتی ہے کشمیری کے ایک اور مقتدر اور خوش گو شاعر عبدالقدوس
سا جاودانی کے کلام پر بھی غالب کا اثر گہرا ہے ۔ میں اُن کے کلام کے نمونے پیش کرنے کی بجائے
لب کے متعلق اُن کا ایک تاثر پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا ۔ جو میرے خیال میں بہت
ے دوستوں کے لیے بھی دلچسپ ثابت ہوگا ۔ میں رسا سے بات کر رہا تھا سلسلۂ کلام غالب اور
ال کے تقابلی مطالعہ تک جا پہنچا تو میں نے اُن سے سوال کیا کہ آپ غالب اور اقبال میں سے

کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

رسا کے جواب سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ بڑی آہستگی سے بولے :

" اقبال —— ارے اقبال کا کیا کہنا۔ وہ تو ایک بحرِ زخار ہے۔ بیکراں سمندر لیکن ہم جیسے مسافروں کی پیاس اِس سمندر کے کھارے پانی سے کیا بجھے گی۔ ہم غالب کے چھوٹے سے چشمے پر پہنچ کر ہی دو گھونٹ میٹھا پانی پی لیتے ہیں "۔

غالب کے کلام کا رسمی اور باقاعدہ کشمیری ترجمہ غالب صدی یعنی ۱۹۶۹ء میں ہوا، جب جموں کشمیر کلچرل اکادمی کے کشمیری رسالے "شیرازہ" نے اپنا غالب نمبر شائع کیا۔ اس میں غالب شناسی پر کشمیری میں مضامین کے علاوہ ایک الگ حصہ اُن کے اشعار کے کشمیری تراجم پر بھی مشتمل تھا۔ ان میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر کشمیری زبان کے ایک نہایت ممتاز اور ساہتیہ اکادمی اوارڈ پانے والے شاعر محمد امین کامل کے غالب کے سَو اشعار کے کشمیری تراجم ہیں، جو اِس سطح اور پیمانے پر کشمیری میں غالب سرائی کی پہلی کوشش ہے۔ حق یہ ہے کہ کامل نے غالب کے اکثر قدرِ اول کے اشعار کو ہی ترجمے کے لیے چُنا ہے۔ اگرچہ اُن کے کشمیری ترجمے کی کامیابی کے متعلق یہی بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی۔ یہ تراجم دکھاتے ہیں کہ غالب کے تراجم میں کونسی خندقیں یا کھائیاں پیش آسکتی ہیں اور بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہو سکتا ہے۔ کامل کے ترجمہ غالب کو دیکھ کر کسی مغربی ادیب کا یہ قول یاد آتا ہے کہ :

جہاں کامل نے غالب سے لفظی وفاداری نبھائی ہے وہاں جو صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اُس کی مثال دیوان غالب کے پہلے شعر :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سے دی جا سکتی ہے۔ جسے کامل نے یوں دس نچوڑ کے ایک چھلکا بنا دیا ہے :

نقش چھہ نا بر دواں کہندہ شوخ تصویرک
[illegible]

البتہ جہاں کامِل نے تخلیقی آزادی کا استعمال کیا ہے۔ وہاں اُس نے غالب کے تاثر کو مجروح نہیں کیا ہے۔ مثلاً اِس شعر کے ترجمے کو لیجیے:

رات دِن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

کامِل اس کو یوں اُلٹتے ہیں:

یُتھ نہ گژھک، یُتھ نہ گژھک بدگماں
وُنہ چھ پھیراں، وُنہ چھ پھیراں آسماں

اِس نمبر میں غلام نبی خیال، غلام نبی فراق، مِشعل سُلطان پُوری، چمن لال چمن، روسل پوتپیر، غلام نبی ناجی کے غالب کے تراجم بھی ہیں اور کہیں کہیں ان میں غالب کے فن کا اچھا خاصا پرتو بھی نظر آتا ہے۔

لیکن کشمیری میں ترجمۂ غالب کا سب سے اہم اور شاندار کام سال رواں یعنی ۱۹۸۸ء ہوا اور اِس کا سہرا اُسی انسٹی ٹیوٹ کو حاصل ہے، جس کے اہتمام سے آج میں اور آپ اس مقام پر محوِ گفتگو ہیں۔ کلامِ غالب کا ردیف وار اور ترتیب وار کشمیری ترجمہ اِس سال جاری کردیا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے شائع کردہ اِس ترجمے کے مترجم کشمیری زبان کے زود نویس مگر سلیقہ مند شاعر غلام نبی ناظر ہیں۔ کشمیری جیسی پسماندہ زبان کے کچے کوزے میں کلامِ غالب کی آتشیں شراب اُنڈیلنا خطرات سے پُر تھا کیونکہ ہر مرحلے پر یہ اندیشہ درپیش تھا کہ:

آبگینہ تُندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

لیکن یہ کارنامہ انجام پذیر ہوا۔ راقم الحروف نے اُس ترجمے کے پیش گفتار میں رائے ظاہر کی تھی کہ یہ دیوانِ غالب کا کشمیری زبان کا پہلا مکمل ترجمہ ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ یہ آخری اور سب سے اعلا ترجمہ بھی ہو۔ میں نے اُس وقت لکھا تھا کہ دراصل اہمیت اس بات کی ہے کہ کشمیری ادب میں اِتنا اعتماد اور اعتبار پیدا ہو گیا ہے کہ اُس کا کوئی کوہ پیما ہندوستانی ادبیات کی اُس ایورسٹ چوٹی کو تسخیر کرنے کے لیے کمر باندھ لے، جس کو دُنیا مرزا غالب کے نام سے جانتی ہے۔ میں نے اُس وقت لکھا تھا کہ کشمیری زبان کی سرخروئی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اُس میں دیوانِ غالب

ایک مکمل ترجمہ ہے ۔میں نے اپنے عندیے کو واضح کرنے کے لیے اقبالؔ کا یہ شعر استعمال کیا تھا :

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ور کہا تھا کہ فرق یہ ہے کہ غالبؔ کوئی تن آساں کبوتر نہیں بلکہ ایک تیز پرواز شاہین ۔جس کے
ہپر کی جھپٹ سے بڑے بڑے شکاریوں کے پُتے لگ سکتے ہیں لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں
لہ ناظرؔ کا ترجمہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ممتاز نہیں ہے ۔واقعہ یہ ہے کہ بہت سے مقامات پر
اُس نے غالبؔ کو کشمیری میں منتقل کرتے ہوئے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے ۔مثلاً غالبؔ کے
اِس شعر کو لیجئے :

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی

ناظرؔ جیسے غالبؔ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے :

وُچھتو ہتر اتھ ہندیو ساکنو
عالمس پأر آوسپدن اتھ ونان

غالبؔ کا ایک سہلِ ممتنع شعر ہے :

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

ناظرؔ نے اِس میں ہلکی سی شوخی پیدا کر کے کشمیری میں اس کا لطف دوبالا کر دیا ہے اور
یہ کوئی معمولی بات نہیں :

خط لیکھو مطلب کہنر حتہ آسر تن
آسر چھہ عاشق چانہ ناوک ژور چھا

یہ دُرست ہے کہ ایسے مقامات بہت زیادہ نہیں ہیں اور کہیں کہیں ناظرؔ اصل کا بوجھ سہار
نہیں سکے ہیں ، مگر ترجمے کی دُنیا میں اور وہ بھی غالبؔ کے ترجمے میں ایسا کتنی بار ہوا ہے ۔
میرے خیال میں ناظرؔ کا ترجمۂ دیوان کشمیری زبان کا ایک تاریخ ساز واقعہ ہے اور اس کی

حرارت اور تابش سے کشمیری شعر میں آنے والے برسوں میں تخلیقی سطح پر بہت سے دھما کے
سنائی دیں گے اور بہت سے کوندے لپکیں گے اِس دیوان کے حوالے سے کشمیری شاعر
غالب کی زبان میں بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ :

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
میرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

URDU GHAZALS
OF
GHALIB

ENGLISH TRANSLATION OF SELECTED URDU GHAZALS

translated by

Dr. YUSUF HUSAIN KHAN

غزلیات غالب (اُردو)

مرتبہ: ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب کی غزلوں کے انتخاب کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہوچکے ہیں لیکن یہ ترجمہ ایک اسکالر کا ہے، جو غالب کا مزاج شناس ہے۔ اسی لیے ہمارا یقین ہے کہ اب تک کے تمام انگریزی ترجموں میں یہ ترجمہ سب سے زیادہ بہتر اور مستند ہے۔

ترجمے کے ساتھ اصل غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

قیمت : ۹۶ روپے

غلام نبی ناظر

ترجمہ کاری اور اردو غزلیاتِ غالبؔ کا میرا کشمیری ترجمہ

کہا جاتا ہے کہ "شاعری ترجمے سے بالاتر ہے"۔ شیلے (SHELLEY) کا کہنا ہے:

"IT WERE AS WISE TO COST A VIOLET IN TO A CRUCIBLE THAT YOU MIGHT DISCOVER THE FORMAL PRINCIBLE OF ITS COLOUR AND ODOUR, AS SEEKS TO TRANSFUSE FROM ONE LANGUAGE TO ANOTHER THE CREATION OF A POET"

آئی۔ اے۔ رچرڈ کے نزدیک جذباتی زبان کے استعمال کی عظیم ہیئت شاعری ہے۔ اس کے اصل الفاظ یوں ہیں:

"THE SUPREME FORM IF EMOTIVE LANGUAGE IS POETRY"

وہ شاعری کو EMOTIVE اور نثر کو سائنسی زبان کے ساتھ متعلق کر دیتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ عام ناول یا کہانی میں زبان سائنسی استعمال کے قریب ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ناول یا کہانی ایک شعری تخلیق کی نسبت زیادہ قابل ترجمہ ہوتی ہے۔ شیلے اس نکتے کو "A DEFENCE OF POETRY" میں اس طرح واضح کرتا ہے۔

ایک نظم واقعی زندگی کی نقل ہے جو اس کی لافانی صداقت میں نمایاں ہے۔ ایک کہانی اور شعری تخلیق میں یہ فرق ہے کہ کہانی ایک فہرست ہے۔ منقطع حقائق (DETACHED FACTS) کی جو زمان و مکان، حالات، وجہ اور اثر کے بغیر کوئی دوسرا رابطہ نہیں رکھتی ہے اور دوسری چیز (یعنی شعری تخلیق) ناقابلِ تبدیلی فطرت کی ہیئت کے مطابق اعمال کی تخلیق ہے۔ جیسا کہ تخلیق کار یا خالق کے ذہن میں موجود ہے جو خود بھی دوسرے تمام اذہان کی نقل ہے۔

نثر اور شعری تخلیق میں یہ امتیاز ہے کہ نثر الفاظ کی اصل دلالت اور معنی جتانے کی خاصیت رکھتی ہے، جب کہ شاعری ان کے رمزیاتی معنوں کو بھی اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ نثر لازمی طور پر

باقاعدہ ہے جب کہ شاعری بحر، وزن، ردیف وقافیہ اور لفظوں کی موسیقیت وغیرہ کی وساطت سے بے قاعدہ نمونے تخلیق کرتی ہے۔

یہ سوال کہ کیا شاعری کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے، یا کس قدر حصّہ ترجمہ ہوسکتا ہے، ایک بحث طلب مسئلہ ہے مگر اس کے باوجود شاعری کا ترجمہ وسیع بنیادوں پر ادبی اور تہذیبی رشتوں کو دنیا کے باشعور لوگوں میں پھیلانے اور استوار کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر تمام ہندوستانی زبانوں میں شعوری طور پر آپسی تبادلۂ خیالات وتصوّرات کے لیے ترجمے کیے جاتے ہیں تاکہ تمام ہندوستان کے علم دوست لوگ اس صورتِ حال سے مستفید ہوسکیں۔

ایک ترجمہ کار باوجود کہ وہ چاہتا ہے کہ اگر وہ اصل تخلیق کی زبان یعنی SOURCE LANGUAGE کا ماہر ہے، اس کے پڑھنے والے پر وہی اثر مرتب ہو جو اصل تخلیق نے خود اس پر ڈالا ہے۔ گو پوری طرح اس کوشش میں وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ تہذیبی اور علمی حد بندی سے ایک اچھے ترجمہ کار کے لیے قدرے مشکل ہوجاتا ہے۔ PAUL VERCHESE لکھتے ہیں:

"حالانکہ بہترین ترجمہ بھی اصل کے ساتھ صرف اسی قدر رشتہ رکھتا ہے جتنا ایک مخمل کے اُلٹے طرف کو اپنے سیدھے طرف کے ساتھ ہوتا ہے۔"[۱۲]

اب سوال یہ ہے کہ ترجمہ کار کس طرح کام بطور احسن انجام دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ کار کو اصل تخلیق کا اثر اپنے ذہن میں تازہ کرنا چاہیے تبھی تو اس کا ترجمہ دیانتدارانہ اور منفرد ہوگا۔ حالانکہ تب بھی قطعی نہیں ہوسکتا لیکن اس میں وہی زور اور تازگی ہوگی جو اس نے اصل تخلیق میں خود محسوس کی ہوگی، پھر بھی ترجمہ بعینہٖ نہیں قریبی ترجمہ ہوگا۔ یا ایک ترجمانی تخلیق (TRANSCREATION) کی صورت تیار ہوگی کیونکہ کوئی ترجمہ کار اپنی شخصیت اور اپنے ہمعصروں کے ذہنی شعار کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

اس صورتِ حال میں کہ اپنے محسوسات کو دوسروں کے حق میں بھی منتقل کرنا ترجمہ کا منصوبہ ہوگا۔ اسے اصل نسخہ (ORIGINAL TEXT) کے حق میں وفادار رہنا ہوگا

اور اصل خیال کو قاری یا سامع تک پہنچانے کے لیے۔ وہ ایسے کچھ الفاظ کا اضافہ بھی کرسکتا ہے جو مناسب ہوں۔ اس سلسلے میں C PAUL VERCHESE لکھتے ہیں :

"IN VERSE TRANSLATION PERHAPS THE TRANSLATER IS JUSTIFIED IF HE ADDS SOME THING OF HIS OWN WHICH NECESSARILY EMBELLISHES AND IMPROVES UPON THE ORIGINAL TEXT BUT HE IS CERTAINLY NOT JUSTIFIED IN ADDING SOME THING OF HIS OWN TO THE THOUGHT CONTENT"

مندرجۂ بالا ان چند بیانات کو پیشِ نظر رکھ کر اب میں اپنے ترجمے کی کچھ اہم باتوں کو لیتا ہوں :

"آناں کہ وصلِ یار ہمی آرزو کنند
باید کہ خویش را بگداز ندوا وکنند"

بہر حال اس اصول کے پیشِ نظر میں نے اپنی طرف سے یہ کوشش کی ہے اور غالب کو بیس سال سے اپنے خاص انداز سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش جاری رکھی ہے جس کے نتیجے میں میں نے غالب کے بہت قریب جانے کا مقصد اس حد تک پالیا کہ میں نے اس معرکے میں اپنے آپ کو جھونک دیا۔ یہ CLIMAX تھا میرے اس عمل کا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا ہر پہلو کو سامنے رکھا اور ترجمہ شروع کیا۔

زبان کا جہاں تک مسئلہ ہے کشمیری زبان کئی پہلوؤں سے اردو اور فارسی زبان کے بالکل قریب ہے۔ اس کے ان گنت الفاظ اسلام کی کشمیر میں آمد کے ساتھ ساتھ فارسی سے منتقل ہوئے ہیں یعنی یہ لین دین چار پانچ صدیوں سے جاری رہا۔ اور فارسی نصف صدی سے قبل تک یہاں کی سرکاری زبان بھی رہی ہے اور اس کے بعد اردو کا لین دین بھی ایک صدی سے زیادہ کے زمانے پر محیط ہے لہٰذا فارسی اور اردو کے بہت سے الفاظ اس کے اب اپنے ہو گئے ہیں اور اس زبان میں فارسی اور اردو الفاظ کو ہضم کرکے اپنا بنانے کی خاصیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے لہٰذا اس سلسلے میں غالب کا کلام ترجمہ کرنے میں کچھ آسانیاں بھی میسّر رہیں۔ اسی طرح فارسی غزلوں کی بحروں اور اوزان کو بھی کشمیری زبان اپنے اندر جذب کرنے کی خاصیت صدہا سال سے حاصل کرتی رہی ہے اور اگر پوری طرح

سے دیکھا جائے تو کشمیری غزل نے فارسی غزل سے ہی جنم لیا ہے۔ سب سے پہلا تسلیم شدہ غزل گو شاعر محمود گامی (۱۷۶۵ء۔ ۱۸۵۵ء) فارسی کا زبردست عالم تھا اور اس نے فارسی سے کئی مثنویاں ترجمہ کیں اور فارسی اوزان و بحور کو استعمال کر کے کشمیری غزل کو وجود بخشا۔ اس سے پہلے شہمیری دورِ حکومت میں اور پھر حبہ خاتون (وفات ۱۶۰۵ء) کے دور میں تو فارسی شعر و شاعری اور موسیقی کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لیے فارسی الفاظ، اوزان و بحور کشمیری زبان و شاعری کے لئے غیر نہیں تھیں۔ یہی چیزیں میرے لیے حوصلہ افزائی کا موجب ہوئیں اور میں یہ شعر گنگناتے ہوئے میدانِ عمل میں اترا۔

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دام خالی قفسِ مرغ گرفتار کے پاس

آپ ترجمہ دیکھیں، کم سے کم بیس فیصد الفاظ اصل کلام سے کشمیری میں معمولی صوتی آہنگ (PHONETIC) کی تبدیلی کے ساتھ براہِ راست آئے ہیں۔ پہلی ہی غزل کو لیجئے اس میں ۸۰ الفاظ ہیں اور ترجمہ ۸۹ الفاظ میں ہوا ہے، جس میں بیس کے قریب الفاظ ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل متن سے آئے ہیں اور وہ یہ ہیں:
شوخی، نقش، فریادی، پیکر، کاغذ، تنہائی، صبح، شام، جذبہ، شوق، شمشیر، دم، عالم، عنقا، مدعا، اسیری اور موے۔ یہ تو بہت پہلے سے کشمیری ادبی اور عام زبان میں بھی استعمال ہوتے آئے ہیں۔ اور اسی کے ہو گئے ہیں۔

یہاں اور کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو کشمیری زبان نے پہلے ہی اپنا لیے ہیں لیکن اصل میں وہ بھی فارسی وغیرہ سے لیے گئے ہیں۔ مثلاً قلم، صورت، عذاب، بالکل، خوش، گفتار، اور، تار وغیرہ۔ معلوم ہونا چاہیے کہ کشمیری زبان کس قدر قریب ہے غالب کی زبان کے یا فارسی زبان کے۔

اسی طرح بحروں کا حال دیکھیے! ۲۳۵ غزلوں میں سے ۱۴۵ غزلیں قریب قریب اپنی ہی زمینوں میں رکھی گئی ہیں اور نوّے غزلیں ایسی ہیں جن میں کہیں آدھا کہیں ایک یا کہیں اس سے کچھ زیادہ ارکان کا اضافہ ہوا ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ غالب کے کلام میں جو اضافتیں استعمال ہوئی ہیں اور کئی اشعار اضافتوں کی وجہ سے فارسی کے

جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ کشمیری زبان اس قدر ان اضافتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔
زمین یکساں ہونے کی مثال :

اصل	ترجمہ
ستائیش کر رہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	چھُہ تھُر کھالاں یہ زاہد بیشتر مُدِ یتھ باغِ رضوانس
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خوروں کے طاقِ نسیاں کا	چھُہ سے اکھ پوشہ گو مداسہ بیخودن مُجہتھ کُشی تھس طاقس

دونوں صورتوں میں "بحر ہزج مثمن سالم" یعنی مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن"
استعمال ہوئی ہے۔

۲۔ زمین میں معمولی تبدیلی کی بھی ایک مثال دیکھیے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

بحرِ رمل مثمن مشکول سالم مضاعف" یعنی "فعلات، فاعلاتن، فعلات، فاعلاتن"

ترجمہ :- اوس نی نے اسہ سُہ قسمت سپدہے کتہ وصلِ یار
بُلیہ اگر اسور وزِ بھو زندہ آسہ ہے تُمے انتظار

بحرِ رمل مثمن مقصور الآخر" "فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات"

۳۔ ذرا زیادہ تبدیلی زمین کی مثال بھی ملاحظہ ہو :

ع مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

بحر" ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف محذوف" : مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن"

ترجمہ: معشی دِ سالیس تل کر گوڑہ میخانہ آسُن سوے چھُہ کتھ
اُچھ رین تل حاجتن ہند قبولہِ آسُن سوے چھُہ کتھ"

بحرِ رمل مثمن محذوف الآخر : فاعلاتُن، فاعلاتُن، فاعلاتُن، فاعلُن

۴۔ سب سے بڑی تبدیلی کی مثال :

ع ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

بحر" ہزج مثمن سالم : مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن مفاعیلن

ترجمہ :
چھُ یتھ حدس تاں مۂ غم کرجمہٕ گتھ گنی نمن ٹیمیہ کلک تہ چاِل
زٕ منگ پن تہٕ نظرِ ہمتہٕ پن فرق کرٕ تھ یون کِڈنی چھُ مشکل

بحر ہزج مسدس مقبوض اشتر محذوف :
"مفاعلن، فاعلن، فعولن، مفاعلن، فاعلن، فعولن"

کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہے کہ کبھی کوئی لفظ بڑھانے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ اصل خیال قاری یا سامع تک صحیح رنگ میں پہنچے کئی جگہوں پر ایسی صورت حال بھی پیش آئی ہے ایک مثال :

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ترجمہ — خط لیکھو مطلب کہنی میہ اُسی تن
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے — اُسی چھ عاشق چانہِ ناوِ کی ژور چھا"

یہاں میں نے ترجمے میں جذبے اور خیال کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے دو مختصر الفاظ کی ایک ترکیب کا اضافہ کیا ہے "ژور چھا" اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "کیا ہم چور ہیں؟" دوسرے یہ کہ "کیا یہ کوئی چوری ہے"۔ کشمیری میں ان دو لفظوں کے مشترکہ استعمال سے کئی بار مقصد کو تیز آنچ دے کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی پر جناب محترم ٹینگ صاحب نے اپنے پیش گفتار میں لکھا ہے کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو یہ ترجمہ سن کر وہ بھی "چٹخارے بھرتے"

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب کے زمانے میں اعلیٰ خاندانی وجاہت کے اظہار لیے یہ بھی ایک نشانی تھی کہ پینس میں اِدھر اُدھر جانے کے لئے بڑے بڑے لوگ سوار ہوتے جس کو کہار اٹھاتے یہاں کشمیر میں اب بھی کئی دیہات میں دلہن کو میکے سے سسرال میں لیجانے کے لیے پینس یا پالکی استعمال کی جاتی ہے اور کہار اسے اٹھاتے ہیں اور کبھی کبھی جوان کے کندھے تھک جاتے ہیں تو ذرا ٹھہر کر کندھے بدلتے رہتے ہیں تو ترجمے کے وقت اس میں بہت آسانی ہوئی اور یہ شعر ایسا ہوا کہ جیسے کشمیری زبان میں ہی کہا گیا ہو۔

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

ترجمہ: ڈولہِ متر تیراں چھ کُنہِ وِزِ ییلہِ سُہ میانِس کوچس کُن

پھیوک تہِ چھِتہِ کہر بن دواں ہرگز آسِن بدلاونے

اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں بیس فیصد کے قریب الفاظ اصل متن سے اگر ترجمے کا ہی حصہ نہیں بلکہ زبان کا حصہ بنے ہیں ۔ جیساکہ پہلی غزل پیش کرکے میں نے وضاحت کی ہے مگر عموماً ترجمے کا شعر میرے نزدیک صاف اور خالص کشمیری معلوم ہونے لگتا ہے یعنی جیسے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق ہے ۔ مثالیں تو بہت ہیں ۔ تین یہاں کافی ہیں

(۱) مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ! یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت ؟

ترجمہ: وُٹنہٕ مژروان غالبؔ ! آیہ اُچھ

دوستو اونہم سُہ شاندس بیٹھ مگر کمہ ساتہ وچھ ؟

○

(۲) گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ترجمہ: سون گرِ یو ودے نہ اُسو ودِ ہوتہِ وٲران آسہ ہے

سدرِ یو ودنے آسہ ہے سدرے بیابان آسہِ ہے

○

(۳) پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

ترجمہ: لیکھنس پیٹھ رٹنہ اُسی کلکن ہندس ناحقہ یوان

سون کانہہ انسان ماتہِ لیکھنس پرنس تہِ اوس ؟

○

کچھ دوست اس ترجمے کو نثر میں دیکھنا پسند کرتے تھے ۔ کہ وہ غالبؔ کے اشعار کو سمجھ سکیں لیکن میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرے ترجمے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ غالبؔ کے اشعار کی تشریح بیان کروں ۔ اگر یہ بات ہے تو بہتر ہے کہ آپ دیوانِ غالبؔ کی آج تک شائع شدہ تشریحات کو پڑھیں ۔ نثری ترجمہ تو میرے لیے ایک آسان کام تھا لیکن میرا مقصد تو یہ تھا کہ غالبؔ کی اردو غزل اپنی پوری کیفیت ، آنچ ، شدت ، گہرائی اور جذبے سے بھرپور طمطراق ، شعریت کے بیش بہا حسن اور سج دھج کے ساتھ کشمیری زبان میں آئے ۔

سو فیصدی کامیابی تو کہاں ممکن تھی مگر میرا یہ دعوا شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ اردو غزلیات غالب کا سب سے پہلا مکمّل منظوم ترجمہ ہے اور کشمیری زبان کی ہئیت، ساخت اور ذخیرۂ الفاظ نے جس قدر اجازت دی، میں نے کوشش یہ کی ہے کہ غالب خود کشمیری زبان میں جلوہ افروز ہو کر اس کا رتبہ بلند کرے۔ صرف ایک بات ہے کہ میں نے غالب کی کئی شعری تصویروں سے عام قاری کے لیے ناممکن الحرکت پردے کو سرکانے کی کوشش کی ہے کہ حسین اور دلکش پیکرِ شعر کے ساتھ آنکھیں چار ہو سکیں۔ لیکن اس کے باوجود ذہنی کدو کاوش سے قارئین کو سہل انگاری کی طرف مائل کرنا اور اس کا عادی بنانا میرے لیے ناقابل معافی جرم کے مترادف ہوگا۔

دو شعروں والی ایک غزل مع ترجمہ سماعت فرمائیے ؎

"سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے"

ترجمہ: اَتہِ کنہِ اچھ روٹ یوان ووہ تو کرنہ مُبتھ سیماب زن
اسو چھنہ ٹھاران کرئی تھا وی متی بے سوکھ دلن؟

کھون تھمبہِ پوشن چھ شرِرِتھ کیازِ؟ روہ خست چھُس گرمن
بُلبلا ووہ تو نیر اگئےُ تم ووہ بہار کوتھا وکن"

ترجمہ کرتے کرتے کئی نئی ترکیبوں اور اصطلاحوں کو جنم لینا پڑا جو کشمیری زبان کے لیے بیش بہا دولت کے مترادف ہے۔ مثلاً۔ "دامِ شنیدن" کے لیے "بوزن زال" "کاوکاوِ" کے لیے "کھئی کھئی"، "آتش زیر پا" کے لیے "پدیہ نارِ ٹری" "نواہائے راز" کے لیے "سِرادی آو" "آغوش وداع" کے لیے "روہ چھسنہ کوچھ" اور "محمل باندھنا" کے لیے "ڈیرِ گنڈن" وغیرہ وغیرہ ایسی بے شمار ترکیبات و اصطلاحات اس ترجمے کی برکت سے وجود میں آگئی ہیں۔

ترجمہ کرتے ہوئے میں کئی مراحل سے گذر کر منزلِ مقصود کی جانب رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ ایک غزل سامنے آئی جو یوں تو پہلے کئی بار پڑھ کر ذہن میں تمام معنوی پہلوؤں کے ساتھ محفوظ ہے اب ان تمام تاثرات کو مستحضر کر کے پھر اچھی طرح مطالعہ کرتا اور اس کے مختلف اشعار کے مختلف امکانات و تاثرات اور خیالات کو لے کر مجموعی معنوی لطف و انبساط کے ساتھ اپنی ذہنی وسعت کے مطابق حاصل کردہ نتائج و کیفیات سے مسرور ہو جاتا اور پھر اسی جذبے کے تحت اس کا ترجمہ شروع کرتا۔ چاہتا کہ غالب کے آتشیں الفاظ کے انگارے کشمیری زبان اپنے دامن میں جل بجھ کے ہی سہی تھام کر سمیٹے۔ کوشش یہ ہوتی کہ کشمیری پڑھنے والا یہ محسوس کر سکے کہ شاید غالب نے آج بذاتِ خود ارضِ کشمیر کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

سب سے اہم اور مشکل مسئلہ یہ ہوتا کہ کیا میں غزل کی بحر اصل ہی رہنے دوں کہ ترجمے کے لیے نئی بحر منتخب کروں؟ قافیے اور ردیف کا مسئلہ سامنے آتا۔ بہر حال بہت سوچ سمجھ کر کام شروع کرتا کبھی بحر قائم رکھتا کبھی تبدیل کر دیتا اسی طرح کبھی مردّف غزل کا مردّف میں ترجمہ ہوتا اور کبھی اس کے برعکس۔ "دیوانِ غالب" کی (۲۳۵) غزلوں میں چار یا پانچ غزلیں خالص مقفی ہیں باقی سو اور غزلوں کی ردیفیں اکہری ہیں مثلاً کا، ہے، کیا، مجھے وغیرہ ۶۲ غزلوں کی ردیفیں دہری ہیں مثلاً تجھ سے، نہیں ہے، نہ ہوا، کیا ہے، اچھا ہے وغیرہ اور باقی سات غزلوں میں تہری (تگنی) اور چوگنی بھی ہیں مثلاً کوئی دن اور، نہ ہوا تھا، یا "ہی کیوں نہ ہو" وغیرہ ترجمہ کرتے وقت میں نے ردیف ہوتے ہوئے بھی کبھی ردیف کا استعمال نہ کیا ہے بلکہ صرف قافیے سے ہی کام چلایا ہے اور بحر اصل ہی رہنے دی۔ مثلاً

"بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا"

فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلن

ترجمہ: شارِ دفتر آو مُژ رتھ بادشاہ مجلسہ اندر
یا الٰہی لار گنجینس ییلے وہ تو تھوی زبر"

کبھی ردیف نہ رکھتے ہوئے بحر بھی بدل دی ہے

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا"

فعلات ، فاعلاتن ، فعلات ، فاعلاتن ،

ترجمہ: "اوس ییہ نے اسہِ سہٕ قسمت سیدِ ہے کتہٕ وصل یار
بیہ اگر اُ سوروز ہوزند آسہ ہے سے انتظار"

"" فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلات"

کبھی ردیف و قافیہ بھی قائم اور بحر بھی اصل غزل کی

" نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

مفاعیلن ، مفاعیلن ، مفاعیلن ، مفاعیلن

ترجمہ: "کیہنہ نہ اوس ، اوس اکھ خدا کیہنہ نے خدایا آسہِ ہے
آستن مورس تہٕ بتہٕ نے آسئ ہاکیہٕ آسہِ ہے؟"

فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلاتن ، فاعلن

کبھی اصل غزل کی ردیف کے الفاظ بدل کر نئے معنوں والی ردیف باندھی ہے اور معنوں میں حتی الامکان کوئی فرق نہیں آیا ہے ۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

ترجمہ: "نتہ بزمہٕ مترِ ییتھ مترِ یکھ با ناز گفت ریں اندر
زوُ اژِ کر بنزِ س یا نے تہٕ صورتھ دوہ برِ دیوارس اندر"

اسی طرح ترجمے کے سلسلے میں کئی اور بھی پہلو بہت دل چسپ ہیں جن سب پر اس نشست میں بحث مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہاں پر جناب محترم محمد یوسف ٹینگ صاحب جیسے بلند پایہ ادیب اور نقاد کے اس "پیش گفتار" سے جو انھوں نے اس کشمیری ترجمہ دیوانِ غالب کے لئے لکھا ہے، ایک۔

پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

"غالبہ سنز وُن چھیہ لتس توُینہ مہرنہ ہنزیس ستیہ راژ ہند بن ستن ژوہن
ستھ نومو رخیت گژہن لاگنہ پی پتھ اُمس چھاون وول اُمو پنڈ حُسنہ کین بیون بیون
وہن تہ اُمی سنِدِ جسمہ چِہن رنگارنگ لطافتن تہ ژھبیہ ژھارن پےُ ہیکہ

ترجمہ: "غالب (کا کلام) اُس نئی نویلی دُلہن کے مشابہ ہے جس کو سہاگ کی ستاراتوں کو سات تنےُ پہناوں سے آراستہ کرنا چاہیئے تا اس سے لذت یاب ہونے والے (شخص) پر اس کے حسن کے الگ الگ رنگوں اور جسم کی مختلف نزاکتوں اور چمک دمک سے بھرپور پرچھائیوں کے راز منکشف ہو جائیں"

"ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلیے

اس ترجمے کے کئی پہلو ہیں جن پر کھل کر بات کی جاسکتی ہے اور ضرور وہ تمام پہلو قارئین کے سامنے وقتاً فوقتاً آتے جائیں گے۔

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

حوالہ جات:

1. JONES EDMUND D. (ED) ENGLISH CRITICAL ESSAYS; THE 17TH CENTURY, O.U.P 1943, P, 127.

2. ENGLISH CRITICAL ESSAYS . P. 129

3.4.indian literature v.12 (1) 1969 D.P. 89

زیرِ طبع

غالب اور انقلاب ۱۸۵۷ء

مصنّف : ڈاکٹر معین الرحمان

غالب نے انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے متفرق تحریروں کے علاوہ اس موضوع پر فارسی میں ایک مستقل کتاب دستنبو بھی لکھی تھی مشہور غالب شناس ڈاکٹر معین الرحمان نے ایسی سب تحریروں کو اس کتاب میں یک جا کر دیا ہے۔ دستنبو کی پہلی اشاعت کا متن فوٹو آفسٹ کے ذریعے شامل کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس نہایت مشکل فارسی متن کا اُردو ترجمہ جناب رشید حسن خاں نے کیا ہے مصنّف نے اپنے نہایت مفصّل اور عالمانہ مقدمے میں دستنبو کے زمانۂ تحریر اور وجوہِ تحریر کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔

نوّاب معتمد الدّولہ آغا میر

مصنّف : ڈاکٹر انصار اللہ

تاریخِ ادب سے دل چسپی رکھنے والے نوّاب آغا میر کی شخصیت اور کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مصنّف نے اُن کے حالات اور ان سے متعلق جملہ معلومات کو نہایت سلیقے کے ساتھ اس کتاب میں یک جا کر دیا ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی۔

پروفیسر مختار الدین احمد

تفتہ کی تضمینِ گلستاں

منشی ہرگوپال تفتہ (۱۲۱۴ - ۱۲۹۶ھ)، مرزا غالب کے نامور اور چہیتے شاگردوں میں ہیں اور ان کا شمار ان کے مخصوص احباب میں ہوتا ہے۔ غالب کے سب سے زیادہ خطوط انھی کے نام ملتے ہیں۔ وہ فارسی کے نغز گو شعرا میں ہیں ان کے معاصرین میں کوئی شاعر پُرگوئی اور زود نویسی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے آثار میں چار ضخیم فارسی دواوین ہیں جن میں اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے۔ فارسی دواوین کے علاوہ تین منظوم کتابیں بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ تضمین کریما، تضمین گلستاں اور سنبلستاں۔ تضمین گلستاں میں تفتہ نے سعدی شیرازی کے ان تمام فارسی و عربی اشعار کی تضمین کی ہے جو گلستاں میں آئے ہیں اور سنبلستاں، بوستاں کی اتباع میں لکھی گئی ہے[1]۔ پیشِ نظر مضمون میں تضمین گلستاں کا تعارف مقصود ہے۔

کتاب کے محتویات پر گفتگو سے پہلے اس کی وجہ تصانیف بتا دی جائے۔ تفتہ کی اولاد میں دو لڑکے امراؤ سنگھ اور پیتمبر سنگھ اور ایک بیٹی کا ذکر جناب مالک رام صاحب[2] اور تفتہ

---

[1] کتاب کریما کے ہر شعر پر تفتہ نے تین مصرعوں کا اضافہ کر کے مخمس کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ یہ مطبع مفید خلائق آگرہ سے ۱۸۵۹ء/۱۲۷۵ھ میں شائع ہوئی، تعداد صفحات ۲۸۔ سنبلستان، پہلی مرتبہ مطبع مرآت الصحائف میرٹھ سے ۱۲۷۷ھ میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع نولکشور سے ۱۲۸۲ھ میں شائع ہوا۔

[2] [illegible]

کے دوسرے سوانح نگاروں نے کیا ہے ہیتمبر سنگھ کی وفات (۱۲۷۱ھ) کے بعد جلد ہی تفتہ کی بیٹی بھی فوت ہوگئیں، ان کا نام نہ معلوم ہو سکا لیکن یہ معلوم ہے کہ یہ عمر میں ہیتمبر سے بڑی تھیں۔ بڑے بیٹے امراؤ سنگھ کا ذکر تفتہ نے سنبلستان میں کیا ہے، یہ ان کی وفات ۱۲۷۱ھ کے بعد تک زندہ رہے۔ لیکن مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کی تین نہیں چار اولاد تھی جیسا کہ ہیتمبر کے ذکر میں ان کے ایک مصرع :

چہارم مصرعے بود از رباعی

سے مترشح ہوتا ہے۔

ہیتمبر سنگھ، تفتہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور وہ کم عمری میں وفات پا گئے۔ تفتہ انھیں بے حد عزیز رکھتے اس لیے ان کی وفات پر انھیں بہت صدمہ ہوا۔ "نوحۂ لالا ہیتمبر سنگھ پسر خرد تفتۂ مظلوم" کے عنوان سے انھوں نے ۲۲۲ شعروں کا جو طویل دردناک مرثیہ لکھا ہے وہ ان کے دیوانِ دوم میں دیکھا جا سکتا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے[۱]:

خواہم دگر ز خود بتظلم بر آمدن
با چشم خونفشاں بصفِ محشر آمدن

یہ بڑا پُر درد مرثیہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے اسے روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھا ہے۔

غالب اور تفتہ کے گہرے تعلقات کی بنا پر یقین ہے کہ مرزا نے لالا ہیتمبر سنگھ کی وفات پر انھیں تعزیت کے خطوط ضرور لکھے ہوں گے[۲] لیکن اس قسم کا کوئی خط اب تک دستیاب

---

[۱] دیوان تفتہ ص ۵۱۱۔ ص ۵۳۰ مطبع کوہ نور (لاہور، ۱۲۷۷ھ)۔

[۲] تفتہ چاہتے تھے کہ غالب تفتہ کے دیوان اول کی طرح دیوان دوم پر بھی تقریظ لکھیں، انھوں نے انکار کیا اس پر تفتہ، غالب سے آزردہ ہوئے۔ غالب نے جس خط میں "دیباچہ و تقریظ" لکھنے سے انکار کیا ہے اس پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن یہ ۲۵ مئی ۱۸۵۵ء کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد مکاتیب غالب میں ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کا تحریر کردہ خط ملتا ہے۔ اس طرح دو سال سات ماہ کی ان دونوں کی آپس کی خط کتابت کا پتا نہیں چلتا۔ اس میں طرفین کی ناراضی کو بھی دخل ہے اور "رستخیز بیجا" کے ہنگاموں کو بھی۔ ورنہ یہ بات ناممکن تھی کہ میرزا ہیتمبر سنگھ کی وفات پر تعزیت کا خط نہ لکھتے۔ اور اس بات کا تو بہر حال امکان ہے کہ اس زمانے کے خطوط ضائع ہو گئے ہوں یا گوشۂ گمنامی میں اب بھی کہیں پڑے ہوئے ہوں۔

نہیں ہوا ہے۔ صرف ایک جگہ، اس حادثے کے کچھ بعد، سرسری ساذکر تفتہ کے نام ایک خط میں ملتا ہے جو ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کا تحریر کردہ ہے[1]:

"ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اوس نے اپنی حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر، قوم کا کھتری، خوب صورت، وضعدار، نوجوان ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ گیا۔ اب اوس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اوس کے مرنے کی لکھوں، ایسی کہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اوس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے، سو بھائی ..... یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے۔ جو خونچکاں شعر تم نکالو گے، وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے؟"

تفتہ کے نام غالب کے ۱۲۳ فارسی و اردو خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں جیسا کہ ابھی ذکر آیا غالب کا کوئی خط ہیتمبر سنگھ کی تعزیت میں نہیں ہے لیکن اس کچھ تلافی غالب کے ان دو خطوں سے ہو جاتی ہے جو انھوں نے اپنے اور تفتہ کے مشترک دوست منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی (م ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) کو لکھے ہیں[2]

ایک خط مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء (مطابق ۱۱ ذوالقعدہ ۱۲۷۱ھ) میں لکھتے ہیں:

"یہ تو سب کچھ ہے مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے، ہیتمبر سنگھ اس کا لاڈلا بیٹا مر گیا، ہائے اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی:

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را
چہ کند گوی کہ تن در ندہد چوگاں را

انھیں کو ۴ جون ۱۸۵۶ء کو لکھتے ہیں[3]

---

[1] غالب کے خطوط (۱: ۲۷۴) مرتبہ خلیق انجم (دہلی، ۱۹۸۴ء)

[2] نادرات غالب ص ۸۰، مرتبہ آفاق حسین (کراچی) ، غالب کے خطوط (۲: ۱۱۶۵)۔

[3] نادرات غالب ص ۸۴، غالب کے خطوط (۳: ۱۱۷۲)

حضرت تم تفتہ کا حال کیا لکھتے ہو، اب تفتہ تفتہ نہیں، از خود رفتہ ہے۔ خدا
اس کو جیتا رہے (رکھے) یہ شخص بھی غنیمت ہے بڑا صدمہ اٹھایا ہے۔"
خود تفتہ کا کیا حال تھا ان کا حال زار ان سے سنیے[1]:

هنوزش بود جاں برلب که مردم — سخن بودش نہاں برلب که مردم
بسر دیدی اگرچہ جسم بے جان — مراہم بین که من خود بوده ام آں
حزینے تفتہ جانی مشتِ خاکی — غلیمی بیدلی اندوہناکی
ز جان سیری غمِ فرزند خواری — غریبی بیکسی بدروزگاری
چہ گویم تا کجا ضعفم رسانید — رسد گر گویمت تواں مرا دید
کنوں برلب نہ حرفی دیگر آید — دگر آید ہماں پیتمبر آید
تو گوئی برق بود آں کو مرا سوخت — نہ خود را بر سرِ ہر کو مرا سوخت
بظاہر تفتہ ام اما ہماں خاک — کیم اے بر سرِ من یک جہاں خاک
مرا صورت نماند و معنیم من — ازیں پیش انچہ بودم آن نیم من
جو من مشتاق مرگ اندم دگر کیست — تکلف برطرف کو من کجا زیست

غرض تفتہ اپنے کم عمر بیٹے کی بے وقت موت پر نیم جان ہو کر رہ گئے، اس کی یاد انھیں بار
بار آکر ستاتی رہی، ایک دن کیا ہوا اس کا ماجرا سنیے[2]:

غرض روزی ہماں کز ماتمِ او — چنینم وین چنیں دارم غمِ او
دم درسِ گلستاں بر زبان داشت — کہ رحمت اے پدر بر من تواں داشت
نہ مقصودِ من از درزِ ثمین است — مرادِ من اگر یابی ہمین است
کہ عمرِ خود دریں فن صرف کردی — دو صد دل خون بیک یک حرف کردی
نہ بخشیدی ازین دولت مرا ہیچ — نمیرم چون کہ شد قسمت مرا ہیچ

---

[1] مرزا تفتہ: تضمین گلستاں ص۲۔ ص۳۔ مطبوعہ نول کشور۔

[2] مصدر سابق ص۶۔

ب یتیمبر کی یہ بات انھیں یاد آئی تو انھیں خیال ہوا کہ ایک ایسی کتاب لکھ کر اس کے نام انتساب
یں جو اس کی یادگار ثابت ہو اور جس سے اس کا نام باقی رہے۔ چونکہ گلستاں اس کے درس میں
ہی تھی اور اسے گویا حفظ تھی[1]، پھر یہ کہ گلستاں کی ہر بیت زبان زد عوام و خواص ہے[2] اس لیے اس
ابیات کی تضمین کرنی چاہیے انھوں نے اس کام کا آغاز کیا اور ساتھ آٹھ ہفتوں کتاب میں تضمینِ
لستاں تیار ہو گئی۔

اس کتاب کی ترتیب اس طرح ہے :

مد میں نو ۹ شعر ہیں پہلا شعر یہ ہے ؎

خدا باشد نہان و آشکارا | نگویم از چہ منت مر خدا را

عت محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں بھی نو ۹ شعر ؎

بس از حمدِ خدا نعت محمدؐ | کہ ساز د کارہا نعتِ محمد
محمدؐ آنکہ خوانند آفتابش | فلک زخش ست وماہِ نورکابش
محمد آنکہ وصّافش ملائک | خود او جان و تنِ صافش ملائک
محمد آنکہ باشد سر بسر نور | زمشرق تا بمغرب سایہ زو دور
محمد کان بود عاشق خدایش | خدا را تا چہ خواہد بود ادایش
جزایں دیگر چہ آیت ہا بشانش | کلام اللہ سر زد از زبانش
شفیعِ ماہماں شافع دل افروز | نماید انچہ فردا دائم امروز
بہشت از من کترین پس عہد کردم | بہشتی روضہ اش را گرد گردم
غرض گفتن نیارم ہر چہ بود است | کنوں بر آں واصحابش درود است

س کے بعد سبب تالیفؔ کتاب میں پہلے یتیمبر کا ذکر ہے ؎

زفرزندانم آں فرزند کوچک | کہ یتیمبر ہمی خوانندش ہر یک

---

[1] دم درس گلستاں بر زبان داشت" (تضمین گلستاں صلا)

[2] جو ہر بیت گلستاں بر زبانہاست خدا ے لفظ و معنیہاش جانہاست (تضمین گلستاں صلا)

چہ پیتمبر درامر خیر ساعی — چہارم مصرعے بود از رباعی
چہ پیتمبر چراغ خانۂ من — دل من جان من جانانۂ من
چہ پیتمبر دوائے درد ہایم — اگر من مضطر او تسکین فزایم
چہ پیتمبر بہر حال الفت آئین — اگر من رنجہ خاطر او غم آگیں
چہ پیتمبر سر نیکو نہا داں — ادا فہم و ادا سنج و ادا داں
چہ پیتمبر فدائش جانِ تفتہ — نثار تفتہ و قربانِ تفتہ
چہ پیتمبر فصیح و خوش بیاں نیز — گلستاں بر زبان و بوستاں نیز

ان اشعار کے بعد اس کی وفات، صدمۂ غم سے تفتہ کا حال زار اس کی یاد میں تضمین گلستاں کی ترتیب کا خیال، پھر اس کی تکمیل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تفتہ لکھتے ہیں کہ جس نے بھی یہ کتاب دیکھی پسند کی۔ ان کے استاد مرزا غالب نے بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اس کا ذکر تفتہ ہی کی زبان قلم سے سنیے:

خصوصاً میرزائے نکتہ زائے — چمن طبعی گل رنگیں ادائے
نیستانِ سخن را طرفہ شیری — اسد یعنی بہ میدان دلیری
قصائد زو چناں کش دید باید — گل از باغِ غزلہا چید باید
رباعی آنکہ شورش چار سو ہست — دگر باور نداری رو برو ہست
مپرس از قطعہ اش گرود زباں قطع — اگر گویم بہشت آمد بآں قطع
ز نثر او ظہوری را جگر خون — ابو الفضل ست اندر خاک مدفون
سخن انیست و بس من ہیچ نبوم — برآں نکتہ رس من ہیچ نبوم
بود تا میرزا غالب زمن شاد — خرابِ من سراسر باشد آباد
فدای میرزا غالب دل و جان — کدانی میرزا غالب دل و جان

یہاں سے مرزا غالب کی مدح شروع ہوتی ہے:

چہ غالب ہم نوای قیصر و جم — چہ غالب میرزائے قیصر و جم
باہل فرس غالب غالبِ ما — بہ از عرفی و طالب غالبِ ما

دُری از دُرجِ توران چشم بددور مگو از سایہ کانجا سر بسر نور
وگر از بند گفتن روسیاہی است گواہِ تفتہ از مہ تا بماہی است

پھر وہ مرزا سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں :

چہ گویم تا چہ رحمت کرد بامن وگرنہ کو جنابِ او کجا من
رسد نازش چہا بر فرقدانم رسانید از زمین بر آسمانم
بود ہر ذرہ او آفتابی درش را خواندہ ام روشن کتابی
اگر صد دفتر از مدحش نگارم یکی باشد یکی از صد بزارم
الٰہی بر سرِ من سایہ اش باد زہر پایہ فزوں تر پایہ اش باد

تین شعروں میں باقر علی خاں کا ذکر ہے :

بماند تا ابد باقر علی خاں[1] کہ از پورانِ او پورِ خوش ست آں
کند عمرِ خضر حق روزیِ او بود تا خیر خیر اندوزیِ او
چساں در شکر گویانش درآیم کجا از عہدۂ شکرش برآیم

آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے سات آٹھ ہفتوں میں تضمین گلستاں مرتب کرلی تھی :

غرض در ہفت یا در ہشت ہفتہ رقم ایں نسخہ زد بے مایہ تفتہ

تاریخ اتمام ۱۲۷۲ھ ہے جیسا کہ تفتہ کے کہے ہوئے دو تاریخی قطعات سے معلوم ہوتا ہے۔ پہلے قطعے کا آخری شعر یہ ہے :

شود تاریخ ختمش اے نکورا ے زتضمین گر برآرے لفظ اے وائے

"تضمین" کے اعداد ۱۳۰۰ میں سے "اے وائے" کے اعداد ۲۸ نکال لیے جائیں تو ۱۲۷۲ کے اعداد

---

[1] باقر علی خاں، زین العابدین خاں عارف (۱۲۲۳۔۱۲۶۹ھ) کے بیٹے متوفی یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ/۲۵ مئی ۱۸۷۶ء۔ یہاں تفتہ نے حسین علی خاں شاداں (۱۸۵۰۔۱۸۸۰ء) کو کیوں نظر انداز کیا؟ وہ کم عمر بھی نہ تھے۔ تضمین کی تصنیف کے وقت ان کی عمر بیس بائیس سال کی ہوگی۔

رہ جاتے ہیں جو سال تصنیف ہے۔

اس کتاب میں بشمول اشعارِ سعدی ۵۸۶ر۴ ابیات ہیں حمد و نعت، سبب تالیف کتاب وغیرہ کے اشعار ان پر مستزاد۔ اس لحاظ سے تفتہ کی زود گوئی کا قائل ہونا پڑتا ہے جنھوں نے دو مہینے یا اس سے بھی کم مدت میں ساڑھے چار ہزار ابیات ہی نہیں لکھے بلکہ ایک زبردست ایرانی شاعر کے اشعار کی تضمین کی جو عام شعر کہنے کے مقابلے میں ایک مشکل کام ہے۔

تفتہ کا طریق کار یہ ہے کہ سعدی کے ہر مصرع پر تین مصرعے اپنے لگائے ہیں، اسی طرح ایک شعر کی تضمین چار شعروں میں ہوئی ہے ایک شعر سعدی کا اور تین شعر تفتہ کے۔ کہیں کہیں ضرورت کے تحت اس کے خلاف بھی عمل ہوا ہے۔ یہاں سعدی کے کچھ مشہور شعروں کی تضمین درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ تفتہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں:

من مسلمان و بہر افطارم — ہمہ خونابۂ جگر داری
"ای کریمی کہ از خزانۂ غیب — گبر و ترسا وظیفہ خور داری"
ای وفاداریت بہر کہ و مہ — وی نکونامیت زرے تا روم
دشمناں را بسر زدی گر تیغ — "دوستاں را کجا کنی محروم"
ایکہ آئینہ پیش نست دازو — نیست ممکن کہ دیدہ ہر داری
افگنی چوں نہ دوست راز نظر — "تو کہ با دشمناں نظر داری"

نماید کرم لیک از حد فزوں — کند لطف اما بروں از شمار
ترا تفتہ ہم داد بینائیہ — "کرم بین و لطف خداوندگار"

دگر تا کجا بندہ راند سخن — خداوندیش ایں یکی از ہزار
خطا از تو بود دست واو عذر خواہ — "گنہ بندہ کرد است واو شرمسار"

بودم سحر از غم زمانہ　　سرگشتہ براغ، و لالہ ساں داغ
گفتند دلِ تو طرفہ باغیست　　گفتم کہ گلی بچینم از باغ
برخورد بمن براه سعدی　　خندید و بگفت کام دل جوی
زاں پس بنمود یک گلستاں　　گل دیدم و مست گشتم از بوی

آنانکہ غم عشق ندارند چہ دانند　　پیشِ منِ دلسوختہ شب ہست بہ از روز
تا سوزی و روشن شودت شمعِ تمنا　　ای مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
در ضبط غم از تفتہ تواں داند سخنہا　　یعنی چو سحر آں بتِ طناز نیامد
آں غمزده را دل ہمہ خوں گشت و ننالید　　آں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
من در غمِ آں نیستم ای تفتہ کہ او را　　اغیار شناسند و رقیباں نگرانند
معشوق من آنست کہ کس مدعیش نیست　　ایں مدعیاں در طلبش بیخبرانند
از قدرتِ حق دقت چو ذکری و کسی گفت　　بہر چہ کسی محرم ایں راز نیامد
ایں گفتم و رفتم من حیرت زده از خویش　　"کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد"
باز اکنوں در آمدن چہ درنگ　　ہر چہ میخواستی کماہی شد
عارضِ ماه روشنائی یافت　　"قرص خورشید در سیاہی شد"
تفتہ باید بچشم عبرت دید　　آنچہ از خواہشِ الٰہی شد
یوسف از بیکسی بچاه افتاد　　"یونس اندر دہانِ ماہی شد"

جائی کہ عرشیاں متأمل چہ جائی درک　　جائی کہ عقل کل متحیر چہ جائی فہم
ما و خیالِ وصفِ تو آخر دمی قیاس　　"ای برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم"
ای از ہمہ فزوں چہ بخوانیم دیگرت　　تنہا نہ فزون ز مقالی کہ رانده ایم
بل زانچہ داده اند گرفتیم و برده ایم　　"وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خوانده ایم"
ماندی بجام و بادهٔ د اصلا نیافتی　　ایں نکتہ را کہ بہر چہ از تو برید عمر

وہ ایران کو ارسال کرے گا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔"
پھر ۳۰ جنوری کے خط میں یہ سطریں ملتی ہیں[1]:
"کل آخر روز راجا امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے۔ تمہارا خط اُن کو دکھانے کو رکھ چھوڑا تھا، وہ ان کو دکھایا۔ پڑھ کر فرمایا۔۔۔ میرا سلام لکھنا اور یہ پیام لکھنا کہ آپ کا کلام بمبئی تک پہنچ گیا۔ اب طہران کو بھی روانہ ہو جائے گا:

سوادِ ھند گرفتی بہ نظمِ خود تفتہ
بیا کہ نوبتِ شیراز و وقتِ تبریز است

---

[1] غالب کے خطوط (۱: ۳۰۹)

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی

دیوان موسوی

میر معز الدین محمد مخاطب بہ موسوی خاں اور متخلص بفطرت، میر فخر زمان مشہدی جیسے بڑے عالم کے نواسے اور میرزا فخر الدین کے بیٹے نیز قم کے رضوی سادات میں سے تھے کسی وجہ سے ابتدائے شباب میں باپ سے رنجیدہ ہو کر اصفہان چلے گئے، جہاں آقا حسین خوانساری[1] سے علوم عقلی و نقلی میں پوری تعلیم حاصل کی اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

۱۰۸۲ ہجری ۷۲-۱۶۷۱ عیسوی میں آپ ہندوستان آئے۔ یہاں اورنگ زیب[2] نے آپ کو خان کا خطاب دیا اور شاہ نواز خاں صفوی[3] کی صاحبزادی سے شادی کر دی، جس سے آپ کا درجہ اور بڑھ گیا شروع میں آپ کو عظیم آباد کی دیوانی ملی، لیکن وہاں کے حاکم امید خاں سے آپ کی نہ بنی، جس کی وجہ سے آپ کو دربار میں بلا لیا گیا۔

---

[1] آقا حسین خوانساری بن محمد بن حسین اصفہانی (۱۰۱۶-۱۰۹۹ ہجری/ ۱۶۰۷-۱۶۸۸ عیسوی)

[2] ۱۰۶۸-۱۱۱۸ ہجری/ ۱۶۵۸-۱۷۰۷ عیسوی

[3] مرزا بدیع الزمان مخاطب بہ شاہ نواز خان اور مشہور بہ مرزا دکنی، مرزا رستم قندھاری کے صاحبزادے تھے، آپ کی ایک صاحبزادی کا عقد اورنگ زیب سے ۱۰۴۷ ہجری/ ۱۶۳۷ عیسوی میں ہوا، دوسری صاحبزادی کی شادی شاہزادہ مراد بخش سے ہوئی۔

اس کے بعد آپ کو دکن کی دیوانی ملی جہاں ۱۱۰۱ ہجری / ۹۰-۱۶۸۹ عیسوی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

پہلے آپ کا تخلص فطرت تھا، مگر بعد میں موسوی ہوگیا۔ اس طرح آپ کی وہ غزلیں جس میں فطرت تخلص ہے زیادہ تر نسبتاً پہلے کی ہوں گی اور جن میں موسوی تخلص ہے، وہ زیادہ تر بعد کی ہوں گی۔ ان کے علاوہ وہ معز بھی تخلص کرتے تھے۔ اس طرح ان کے تین تخلص ہو گئے۔

مؤلف منتخب اللطایف نے آپ کو "فاضل کامل، وحید عصر[1]" اور "یگانۂ دوران[2]" کہا ہے نیز آپ کے کلام کو "متین[3]" اور "نمکین[4]" بتلایا ہے۔ شاعری اور امارت کو آپ کے لیے کم درجہ کی چیز بتلائی گئی ہے۔ اس مؤلف کے پاس آپ کا مجموعۂ کلام موجود تھا، نیز اس جلد میں دیوان غنی[5] اور دیوان شوکت[6] بھی مجلد تھے۔ اس مؤلف نے آپ کا یہ شعر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نصر آبادی نے اسے قاسم نہاں کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

آنچنان زی کہ گر از حادثہ بر باد روی
حسن معنی نگذارد کہ تو از یاد روی

مؤلف نتائج الافکار نے آپ کو "سرآمد عالی طبعان[7]" بتلایا ہے نیز آپ کی نظم و نثر دونوں کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے: "کلامش در فصاحت و بلاغت بکمال طمطراق، نظم رنگینش گلشن سخن را آراستہ متینش رونق انجمن کاستہ، طبع شریفش بشاطگی عرائس نازک خیال کمک گشودہ و فکر لطیفش بلآل آبدار اشعار آویزہ گوش نازنینان خوش مقال نمودہ۔ طبع

۱۔ رحم علی خان ایمان: منتخب اللطایف (ص ۳۲۰) چاپ تابان ۱۳۴۹ ہجری / شمسی

۲۔ منتخب، ص ۳۲۰۔

۳۔ منتخب، ص ۳۲۰۔

۴۔ منتخب، ص ۳۲۰۔

۵۔ ملا محمد طاہر غنی، وفات: ۱۰۷۷ ہجری / عیسوی

۶۔ شوکت بخاری، وفات: ۱۱۰۷ ہجری / عیسوی

۷۔ قدرت اللہ گوپاموی: نتائج الافکار (ص ۶۵۲) چاپخانہ سلطانی بمبئی، ۱۳۳۶ دیماہ، ہجری شمسی

نقادش قالب سخن را بمعانی تازہ روح بخشیدہ وفکر دقتاملش بزم نظم را بمضامین برجستہ گرم گردانیدہ۔ الحق فاضلی بلند پایہ است ونامی گرانمایہ[1]"

تذکرۂ نتایج الافکار میں آپ کے ۳۸ اور منتخب اللطایف میں ۶ شعر دئے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ منتخب اشعار یہاں نقل کئے جا رہے ہیں :

سد راہ معصیتہا شد پریشانی مرا
داشت عریانی نگہ زآلودہ دامانی مرا

طایر ما را چہ داری در قفس کین ناتوان
ھر پری کاوردہ بود از آشیان در دام ریخت

جلوہ ای کردی کہ افتاد آفتاب از طاق چرخ
دست افشاندی کہ مہتاب از کنار بام ریخت

نہ تو تنگدست حسنی نہ من از نظارہ مفلس
ستم ست بر نگاھم مژہ را نقاب کردن

دیوان موسوی کا ایک قلمی نسخہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، میں موجود ہے[2]، جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے :

چنونم کوش شہرت را بدامن چون کشم پا را ؟
پریشاں نامۂ عشقم خبر کن کوہ و صحرا را

اس نسخہ میں کل ۴۴ ورق ہیں اور اس کا سائز "۱/۲ ۸ × "۱/۲ ۴ ہے۔ خاتمہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے

---

[1] نتایج، ص ۶۵۳-۶۵۲۔

[2] شمارہ : ۳۰۲۰۔

کہ یہ نسخہ محمد اکبر شاہ غازی کے پہلے سال جلوس میں ۱۵ شعبان کو لکھ کر تمام کیا گیا تھا، نیز پنڈت کنجو نے اپنے لیے جگت نراین کنجو کے لیے اسے لکھا تھا۔

یہ نسخہ خط شکستہ میں لکھا گیا ہے، نیز اس میں ۲۳۵ غزلیں اور ۸ رباعیاں ہیں، یہاں یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اس نسخہ میں پوری پوری غزلیں نہیں دی گئی ہیں، بلکہ غزلوں کا انتخاب ہے، نیز بعض غزلیں ایسی ہیں جن میں مقطع اور تخلص نہیں ہے۔ بعض غزلوں کے صرف ۱/۲ شعر دئے گئے ہیں۔

حسب ذیل شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید کسی عشق میں ناکامی کی وجہ سے ان کو ہندوستان آنا پڑا تھا:

می روم آخر بہندوستان زدست آن نگار
گرچہ از بخت سیہ یادر حنا باشد مرا

اس نسخہ کے مطالعہ سے موسوی خاں کی زندگی کے بہت سے گوشے نمایاں ہوتے ہیں، جو تذکروں میں نہیں ہیں جس کی تصدیق اس شعر سے بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی اصفہانی پر عاشق تھے۔

زندہ رودی زبن ہر مژہ افتادہ مرا
شب کہ دل تشنۂ آن شوخ صفاہانی بود

نیز معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رہ کر بھی اصفہان جیسا شہر انھیں یاد آتا تھا:

نگاہ سرمہ آلودہ زخوبان دیدہ ام امشب
اگر در ہند باشم باز مشتاق صفاہانم

ان کو یہاں تکلیفیں بھی پہنچی تھیں:

زخضر راہ شنیدم موسوی پسندی
کہ ہند تیرہ کند آب زندگانی را

پھر بھی وہ یہاں کے معشوقوں کے دلدادہ تھے:

ہلاک ہندم و خوبان خوش بناگوشش
صباح تند دل آموز و شب فراموشش

نیزان کا محبوب کوئی ھندو تھا :

رمیدہ دلبر ھندوی من خدا سازد
کہ رام رام کنان آورم در آغوشش

موسوی کو اپنے اوپر فخر اور ناز تھا :

موسوی شہرۂ آفاق شدن آسان نیست
گشت بسیار فلک تا چو منی پیدا شد

پھر بھی وہ وحید نامی شاعر کے معتقد اور ان کو اپنے سے بہتر سمجھتے تھے :

موسوی شعر تو ہیچست بر نظم وحید
چکند باشتر مست غزال چینی

آپ کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں جو بڑھاپے میں کہی گئی تھیں، اس لیے کہ وہ ان میں اپنی پیرانہ سالی کا ذکر کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں :

ھست ھر موی سفیدم بر بدن تار کفن
ھر عصا پیر مرا شمع مزار دیگر ست

عہد شباب طی شد و دل پر غبار ماند
موسم گذشت و کشتی ما در کنار ماند

موسوی خاں فطرت کے اشعار سبک ہندی کا نمونہ ہیں، نیزان کا بیشتر کلام متوسط درجہ کا ہے، کلام میں تکلف اور آورد کی کمی نہیں ہے، جیسے کہتے ہیں :

فتد گر جانب دریا نگاہ شوخ او فطرت
کند مژگان آھو ارہ ای پشت نہنگش را

بود عہد فطرت عشق را رنگینی دیگر
رگ یاقوت می سازد نگہ را چشم خونبارش

پھر بھی کچھ اچھے اور رواں اشعار اس دیوان سے انتخاب کرکے یہاں نقل کئے جارہے ہیں:

راضی شدن بوعدۂ فردا گناہ من
امشب وفای وعدہ نکردن گناہ کیست

سر بسر چون قفسم چاک گریبان کردند
کار را بر من دیوانہ چہ آسان کردند
خود چو برھم زدن ہنگامۂ تکلیف شدند
از چہ مجنوں مرا سلسلہ جنبان کردند
در شبستان ازل شمع یکی بیش نبود
بزم را از پر پروانہ چراغان کردند

ای خوش آن شب کہ بساط از می ناب اندازی
ماہ اگر دیر بر آید تو نقاب اندازی

سفالین کوزہ باش از بزم شاھان دور اگر مانی
مشو جام جم از طاق دل درویش می افتی

ز جام لالہ می نوشی بشاخ سرو ہمدوشی
برنگ گل حنابندی عجائب شوخ طنّازی

دل را ز خم طرّۂ دلدار چہ جوئی
گم کردۂ خود را ز شب تار چہ جوئی

ی کی ردیف میں دو ایسی غزلیں ہیں، جو تقریباً یہاں پوری کی پوری نقل کی جا رہی ہیں۔ ان میں سے پہلی غزل اپنی روانی اور شگفتگی کے لحاظ سے بے مثل ہے، جبکہ دوسری غزل میں ردیف میں اور دوسری جگہوں پر ایک ہندی لفظ رہے، مکرر استعمال کیا گیا ہے۔

مرا یاریست سنگین دل ستمگر سست پیمانی
قیامت قامتی زنّار دار نا مسلمانی

نگار تند خوئی شوخ چشمی عربده جوئی
خیالش خاطر آشوبی غمش ناخوانده مهمانی

جفا جو زود رنجی بی وفا نامهربان شوخی
بحسن خویش مغروری ز لطف خود پشیمانی

سمن بر شاهدی شیریں دهانی مجلس آرائی
شکر لب نکته چینی مدعا فهمی سخندانی

ظریفی پخته کاری رند عالم سوز عیاری
بوقت جنگ دانائی بوقت صلح نادانی

مهی رنگین ادائی سرو قدی یاسمن بوئی
چو لاله آتشین روئی چو سنبل مو پریشانی

سلیمی نکته پردازی ز سر تا پا همه نازی
چو گل بند قبا بازی چو شبنم پاکدامانی

بہاری سیل رفتاری خزان نادیدہ گلزاری
تبسم ریز گفتاری چو گل پیوستہ خندانی

سخن سازی غلط بازی نگاری عشوہ پردازی
بغمزہ ناوک اندازی بلب برگشتہ مژگانی

فرنگی مشربی خاطر فریبی سخت بی رحمی
بلب ہا شکر افشانی بگیسو کافرستانی

دست روز دچین ابرو بردل ناشاد ہے
تیشۂ ماظالم از طاق بلند افتاد ہے

گرد راحت سرمۂ آواز شور محشر است
ای فدای ہر خرامت صد قیامت داد ہے

سوخت زہد خشک خاموشی دماغ صبر را
شوق ہے بی طاقتی ہے گریہ ہے فریاد ہے

نبضم از شوق طپیدن جوش نشتر می زند
پیش دستی می کند خون گرمم فصّاد ہے

در جواب غزل مایل فطرتم معذور دار
موسوی را رفتہ طرز این سخن از یاد ہے

آخری غزل میں سایل نامی شاعر کا ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا قطب الدین متخلص بہ مایل ورنگ زیب کے منصبداروں میں سے تھے۔ مگر آخر میں شاہجہان آباد میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۱۳۹ ہجری/ ۲۷-۱۷۲۶ عیسوی میں آپ کا انتقال ہوا۔ تذکرۂ منتخب اللطائف[1] میں دیا ہوا ہے کہ آپ کا انتقال ناصر علی کی وفات کے بعد ہوا۔ مگر دونوں کی وفات کے تقریباً تیس[2] سال کا فاصلہ ہے۔ بہرحال اس تذکرہ میں آپ کے دو شعر بھی دئے ہوئے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

بزم ما برہم ز سنگ محتسب کی می شود
شیشۂ ما چون می گر بشکند می مر شود

موسوی خاں کی مراد غالباً انھیں مایل سے ہے۔ نیز معلوم ہوتا ہے کہ مایل نے بھی اسی ہندی ردیف میں کوئی غزل کہی تھی، جس کے جواب موسوی خاں نے یہ غزل کہی۔

یہاں یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ادبیات فارسی کے گہرے مطالعہ سے بہت سا اردو اور ہندی کلام بھی نکالا جا سکتا ہے، جو آج تک ہماری نظروں سے اوجھل ہے بہت سے فارسی دیوانوں میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی اور اردو کا کلام بھی ملتا ہے جس سے ہمارے ہندوستانی ادب میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

آخر میں دیوان موسوی سے ایک رباعی بھی بطور نمونہ کے دی جا رہی ہے:

شب کہ بدمست من از نالہ برافروختہ بود
زدہ بود آتش درخویش و مرا سوختہ بود
گرچہ چشم سیہش داد سخن داد ولی
سرمۂ نالۂ من از سخن سوختہ بود

---

[1] ص ۳۸۶، ۵۳۹ (فہرست اسامی)

[2] وفات: ۱۱۰۸ ہجری/ ۹۷-۱۶۹۶ عیسوی

غالبؔ کے خطوط (جلد سوئم)

مرتبہ: خلیق انجم

○

صفحات : ـــــ ۴۸۲
قیمت : پچھتر روپے
طباعت : ـــــ آفسٹ

اُردو کے مشہور و مُمتاز مُحقّق ڈاکٹر خلیق انجم نے غالبؔ کے تمام اُردو خطوط کا پہلی بار چار جِلدوں میں سائنٹی فک طریقے سے تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں ۔

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

نسخۂ شیرانی

غالب کے اُردو دیوان کی اشاعت اول اکتوبر ۱۸۴۱ء سے قبل ترتیب
ہونے والے قلمی اور خطی نسخوں میں نسخۂ شیرانی کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔
اور اس اعتبار سے یہ ایک نقطۂ عروج (Culmination point) کے طور
پر سامنے آتا ہے کہ اس کے بعد غالب کے شعری رجحان اور ادبی رویے میں نمایاں
تبدیلی آگئی۔ اگرچہ ان کا رنگ سخن کلیتاً نہیں بدلا۔

یہ نسخہ ہمارے محققین اور کلام غالب کے مرتبین کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور استفادہ
اور استناد کے لیے اس پر غور وفکر کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے متعلق مباحث کو
ہم خصوصیت کے ساتھ مالک رام صاحب کے مرتبہ انتخاب گلِ رعنا، مولانا امتیاز علی
خاں عرشی کے مرتب فرمودہ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) اور کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی
سطح پر جمع آوردہ نسخہ "دیوانِ غالب کامل" کے صفحات میں دیکھ سکتے ہیں۔
موخر الذکر کے یہاں یہ گفتگو نسبتاً مختصر ہے۔

مالک رام صاحب نے نسخۂ شیرانی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔

"حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم (ف ۱۹۴۶ء) کے پاس

ایک قلمی نسخۂ دیوان تھا جس میں نسخۂ حمیدیہ کے حواشی کا کلام بھی متن میں ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی کتابت نسخۂ حمیدیہ کے بعد ہوئی یہ جس شخص کی بھی ملکیت رہا ہو وہ لازماً غالبؔ کا کوئی عزیز قریب تھا۔ کیوں کہ جب وہ کلکتہ گئے تو اثنائے راہ کا کلام اس کے پاس بھیجتے رہے اور وہ اسے کاتب سے اس خطی نسخے کے حاشیے پر اضافہ کراتا رہا۔"

(مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۳۸)

یہ شخص کون تھا اور کہاں تھا اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا ثبوت کہ غالبؔ کے سفر کلکتہ کے دوران اسے بعض نئی غزلیں موصول ہوئیں ان دو غزلوں سے فراہم ہوتا ہے جن کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انھیں "باندہ" سے بھیجا گیا ہے۔ اس صراحت سے اس نسخۂ دیوان کی تحریر اور اس میں اضافوں کے زمانہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جس کی بناء پر اہلِ تحقیق نے اسے ۱۹۲۶ء کا مکتوبہ نسخہ قرار دیا ہے

جہاں تک اس میں اضافوں کا سوال ہے انھیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۱۔ وہ غزلیں جو غالبؔ نے دورانِ سفر روانہ کیں اور جنھیں اس نسخے کے حاشیوں پر درج کیا گیا ۲۔ غالبؔ کی اپنی اصلاحیں اور ترمیمات۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے مؤخر الذکر ترمیمات یا اصلاحوں کے بارے میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کو اس نادر نسخے کی اس عکسی اشاعت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے اگست ۱۹۶۹ء میں طبع کیا۔

ورق ۲ ب پر "آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا ہے عرض" مصرع میں "ہے کے" اوپر "ن" کا نشان بنا ہوا ہے لیکن اصلاح یعنی لفظ "درست" لکھنے سے رہ گیا ہے مولانا کے یہاں اصلاح سے متعلق گفتگو میں یہ لفظ موجود ہے جسے مولانا نے قیاسی طور پر اپنا لیا ہے۔

ورق ۲۸ ب سطر ۱۰ میں کاتب نے لکھا تھا۔

ع گردِ ساحل ہے بجے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

مرزا صاحب نے "مجھے دیکھے ہے" کو قلمزد کر کے اوپر "یہ زخم موجہ" لکھا اور "جس جا" کو چھیل "دریا" بنا لیا۔ [ص ۹۵]

یہاں ورق کے اندراج میں مولانا سے تسامح ہوگیا۔ یہ اصلاح ورق ۲۸ ب پر نہیں ہے، ۲۷ ب پر ہے۔ اس میں اور کتابت میں اس درجہ عدمِ مماثلت ہے کہ یہ ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ یہ اصلاح مرزا غالب کے قلم کی مرہونِ منّت ہے۔ دوسری اصلاحوں کا انداز یہ نہیں ہے۔

اس صفحے کے آخر میں یہ شعر بڑھایا گیا ہے۔

داد دیتا ہے میرے زخم جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

یہ مرزا صاحب کا اضافہ ہو یہ بالکل ممکن ہے کہ اس کا قلم اور روشنائی اصل نسخہ سے قدرے مختلف ہے۔ اسی طرح یہ سطر بھی جیسا کہ مولانا نے توجہ دلائی ہے ایک سطر کے بقدر بڑھ گیا ہے جس کا یہ مطلب بھی ہے کہ جدولیں نسخہ کی کتابت کے بعد بڑھائی گئیں ہیں ان کی اشکال سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔

ورق ۵۲ الف کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ "میں" کے اضافے کو بھی غالب سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ ورق ۶۷ ب پر کاتب نے لکھا تھا۔

ـــــ جنوں فسردہ تمکیں ہے کاش عہد وفا

لہو میں ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے

یہ کاتب کا سہو ہے کہ پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ اور دوسرے کا پہلا مصرعہ کتابت سے رہ گئے۔ مرزا صاحب نے دو مصرعوں کے درمیان خالی جگہ میں دو مصرعہ لکھ کر اور بین السطور میں پہلا مصرعہ لکھ کر قراءتوں کو مکمل کیا۔

ورق ۱۰۲ الف کے چھٹے شعر

حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر
یہاں ہے کہ صحبت خس و آتش برار ہے

یہ "ہوں" مرزا صاحب کا اضافہ ہے۔

اضافات کے سلسلے میں سب سے پہلے صفحہ الف پر حاشیہ میں یہ معروف مقطع لکھا ہوا ملتا ہے۔

؎ بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جب کہ اسدؔ تخلص کے ساتھ مصرع اولے ابتداءً یہ تھا۔

؎ وحشتِ خوابِ عدم شورِ تماشہ ہے اسدؔ
جز مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

تبدیل شدہ مقطع حاشیے پر "ص" کا نشان بنا کر درج کیا گیا ہے۔

غزل:۔

جنوں گرم انتظار و نالہ بے تابی کمند آیا
سویدا تا بہ لب زنجیریِ دود پسند آیا

اس مقطع کے ساتھ موجود ہے۔

جراحت تحفہ الماس ارمغاں نادیدنی دعوت
مبارک باد اسدؔ غم خوارِ جانِ دردمند آیا

اس کے متوازی "ن" کا نشان بنا کر داغ جگر ہدیہ" لکھا گیا ہے جو" نا دیدنی دعوت" کی جگہ پر ہے۔ اور مقطع کی متداول روایت ہے جس کے ساتھ یہ اس زمین میں کہی گئی دوسری غزل کے مقطع کی صورت میں اشاعت پذیر ہوا۔

اصلاح و اضافہ کی یہ صورتیں کچھ ایسی ہیں کہ انھیں غالبؔ کے قلم کا مرہون منت قرار دیا جانا چاہیئے۔ لیکن روشِ تحریر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے انھیں بعد کا اضافہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں اضافہ حال ہی کے کسی شخص کے ہیں۔ [ص ۹۴]

ورق تین ب پر وہ غزل آئی ہے جس کا مقطع یہ ہے۔

ے نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اس کے شروع میں "ازبانده فرستادند" لکھا ہوا ملتا ہے۔ پوری غزل بارہ شعار پر مشتمل ہے ان میں سے آٹھ شعر اسی صفحہ پر ہیں اور باقی چار شعر صفحہ متوازی پر لکھے گئے ہیں۔ قلم قدر خفی ہے۔
س نسخہ کے خط نگارش کی طرح اسے بھی نستعلیق کا ایک اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

ورق ۹ الف پر غالبؔ کی معروف غزل

ع "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" مکمل صورت میں درج ہے۔ مطلع اور مقطع کو شامل کرتے ہوئے اشعار کی تعداد ۱۳ ہے خط کو شکستہ آمیز نستعلیق کہنا چاہیے۔ اس کی اپنی کششیں بے حد دلآویز ہیں۔ یہ طرز نگارش بہت ہی خوب صورت سے لکھے ہوئے خطی نسخوں کی روش تحریر کی یاد دلاتا ہے۔ پہلے اوپر سے نیچے کی طرف "زلف خم شدہ" یا ابروئے خمیدہ کی طرح فنکارانہ انداز سے اشعار تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے بعد پھر اسی حاشیۂ جدول میں دائیں سے بائیں طرف مڑتے ہوئے باقی شعروں کا پرکشش انداز سے اندراج عمل میں آیا ہے اسے مولانا کی طرف سے غالبؔ کے اپنے قلم کا اضافہ قرار دیا گیا ہے لیکن یہ سوادِ خط واسلوب نگارش اس انداز تحریر سے بہ مراتب مختلف اور جداگانہ ہے جس میں غالبؔ کے قلم سے اس نسخہ کی غلطیوں کی تصحیح اور درستی عمل میں آئی ہے۔

ورق ۴۲ الف پر آنے والی غزل

ع آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں

اپنے گیارہ اشعار کے ساتھ موجود ہے جس کے شروع میں "ازبانده رسید" بطور اطلاع درج ہے۔ خط نسبتاً باریک اور خوشنما نستعلیق ہے۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کے آخر میں ، کا نشان بنا کر یہ شعر لکھا گیا ہے۔

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اسی حاشیے کے نیچے ایک اور خطِ فاصل کھینچ کر درج کیا گیا ہے اس خط کشی سے خوب صورتی میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا ہے۔

اس میں اور بعض دوسرے شعروں میں شاید امتدادِ زمانہ سے یا عکس گیری کے وقت روشنی کی کمی بیشی کی وجہ سے بعض حروف کے مرکز اور بعض کے شوشے غائب ہو گئے ہیں۔

ع ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں ، عنوان غزل "سے آراستہ ہے اور دس شعروں پر مشتمل ہے ، شعر اسی صفحہ پر اور باقی تین شعر دوسرے صفحہ پر بعنوان تتمہ "درج کئے گئے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان تین شعروں کے لیے قدرے جلی قلم کام میں لایا گیا ہے۔

صفحہ ۵٦ الف پر غزل " کے عنوان سے اس شعری تخلیق کا اندراج عمل میں آیا ہے جس کے مطلع کا مصرعہ اولیٰ یہ ہے۔

ع واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

اس کا خطِ نگارش بھی خفی ہے۔ لکھنو آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب مقطع کے بعد دو شعر اور بھی ہیں اور یہ تینوں قطعہ کے عنوان سے درج ہوئے ہیں۔ یہ قطعہ نو شعروں پر مشتمل ہے اور اس کے بارے میں یہ قیاس غلط نہیں ہے کہ اس غزل کی روانگی لکھنو سے عمل میں آئی ہوگی۔

ورق ٦١ الف پر ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ، ذیل حاشیہ پر درج ہوئی ہے اس کے ذیل میں قطعہ کے عنوان سے وہ سات شعر

ں آئے ہیں جن کا آغاز

ع اے تازہ واردان بساط ہوائے دل "سے ہوتا ہے اور خاتمے کا شعر

ہے۔

ع داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ان کے خاتمے پر مقطع ہے۔ یہ قطعہ بند شعر ایک خاص کیفیت کے حامل
ں اور کس مخصوص ذہنی پس منظر کے ساتھ کہے گئے ہیں اب یہ کہنا مشکل ہے کہ
ن کے محرکات کیا رہے ہوں گے۔

"کب سنے ہے وہ کہانی میری" اس غزل کا مصرعہ آغاز ہے جو اسی صفحہ
ر پائین ورق سے شروع ہوتی ہے اور نو شعروں پر مشتمل ہے۔ شروع میں "غزل"
کا عنوان موجود ہے۔ اور اگلے صفحہ پر جو آٹھ شعر تحریر ہوئے ہیں ان کے ساتھ
تمہ" لکھا گیا ہے۔ اس میں قدیمانہ انداز نگارش کی بہت سی نمایاں خصوصیات
موجود ہیں۔ مثلاً لفظوں کو ملا کر لکھنا۔ گ پر دوسرا مرکز نہ دینا۔ یائے معروف
ور یائے مجہول کو حروف اتمام کی شکل میں درج کرتے وقت الگ الگ شکلوں میں
وان کے ساتھ مخصوص بھی جاتی ہیں نہ لکھنا اور گاہ گاہ ان کے نیچے دو نقطہ درج
کرنا۔ زائے فارسی یعنی ژ کو ہر جگہ نقطہ واحد کے ساتھ لکھنا۔ ان الفاظ کو بھی ہائے
ہ کے بجائے ہائے کھنی دار سے لکھنا جن کے تلفظ میں ہائے مخلوط لازمی طور پر
داخل ہے۔ ش منقوطہ کے نقطے بہت سے مقامات سے غائب ہیں۔ سحر ہونے
تک میں کئی "جگنوں پہ سے" پر دو نقطے دیئے گئے ہیں اور اس طرح یہ "ہونے تک"
کے بجائے "ہونے تنک" پڑھا جاتا ہے۔ غالب کے قدیم غیر مطبوعہ نسخہ میں یہ
ہونے تک" کے بجائے "ہوتے تک" ہی چھپا ہے "ت" کو بیشتر دو نقطوں
اور ان پر "ط" کا نشان بنا کر ظاہر کیا گیا ہے "ن غنہ" اس کی رسم کتابت میں
شامل نہیں سواد خط روشن ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ پہلے سے موجود

کسی لفظ کو کزلکِ داغ سے چھیل دیا گیا ہے۔

مسطر گیارہ سطری ہے اور شروع سے آخر تک سہ خطی جدول میں ہے۔ جدولی خطوط کے ماسوا درمیانِ صفحہ میں بھی دو خط شنجرفی روشنائی سے کھینچے گئے ہیں۔ تخلص بھی اس شفقی رنگ خط میں لکھا گیا ہے مگر یہ التزام جیساکہ مجلس ترقی ادب لاہور کے عکسی نسخہ سے ظاہر ہوتا ہے صرف دو اوراق میں ملتا ہے۔ سرورق یا صفحہ اولیٰ کی بیاض پیشانی جسے لوح کہنا چاہیے مذہّب و مزّین ہے۔ اور اسے سنہری گلابی اور نیلے رنگ کے نازک نقوش اور بہت حسین گل بوٹوں سے سجایا گیا ہے۔ "یا فتاحُ" "تیز گلابی رنگ میں لکھا گیا ہے۔" رب یسّر و تمم بالخیر" میں بھی یہی روشنائی استعمال ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سیاہ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔ سوادِ خط روشن اور شفاف ہے۔

اس کے مبّصرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں یہ نسخہ نامکمل ہے اور اس کے بعض اوراق صرف درمیانِ کتاب سے ہی ضائع نہیں ہوئے اس کے آخر میں بھی بعض اوراق کے غائب ہونے کا قوی امکان ہے۔ جن کے ساتھ معتدبہ حصّہ کلام بھی ضائع ہوگیا۔ اس کی طرف ذہن اسی لیے بھی منتقل ہوتا ہے کہ اس کے آخر میں کوئی ترقیمہ بھی نہیں ہے جسے ہونا چاہیئے۔ نسخۂ عرشی میں مولانا امتیاز علی خاں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

> "یہ کہنا درست ہوگا کہ نسخۂ زیرِ بحث کے کچھ ابتدائی ورق جن پر قصیدے اور آخر کے کچھ ورق جن پر غزلیں اور رباعیاں تھیں۔ اوراق کی غلط ترتیب سے قبل ہی ضائع ہو چکے تھے۔ چونکہ نسخۂ بھوپال کے (نسخۂ حمیدیہ) کے قصائد اور رباعیات کا انتخاب دیوان میں موجود ہے۔ اس لیے بالیقین یہ سارا کلام نسخۂ زیرِ بحث میں بھی موجود تھا۔"

یہاں مولانا کے قلم سے امکان کی طرف اشارہ تو صحیح تھا لیکن اسے

بالیقین کے ساتھ کہنا شاید مناسب نہیں۔ اس لیے کہ متبادل دیوان سرتاسر نسخۂ حمیدیہ کے مشتملات کا احاطہ نہیں کرتا۔ اور اس کا قطعی کوئی ثبوت ہنوز فراہم نہیں ہو سکا کہ یہ اوراق نسخۂ شیرانی کے آغاز اور اس کے آخر میں بالیقین موجود رہے ہوں گے۔

شروع کے اوراق کے بارے میں جنھیں گمشدہ تصور کیا گیا ہے یہ قیاس آرائی محض اس خیال کے پیش نظر کی گئی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ میں قصائد کا حصّہ غزلیات سے پہلے تھا۔ نسخۂ زیر بحث میں ایسا کیوں نہیں ہوا۔ مولانا نے اس سلسلے میں عرشی زادہ (اکبر علی خاں) اور ڈاکٹر وحید قریشی کی امکان پسندانہ رائے کو مان لیا جسے اب امکان پرستانہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اور از راہِ شرافتِ نفس اپنی محققانہ رائے کو اس میں شامل کر دیا۔

عرشی زادہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کا قیاس ہے کہ زیر بحث نسخہ میں اصنافِ شعر کی ترتیب نسخۂ حمیدیہ کے مطابق تھی۔ یعنی پہلے قصیدے پھر غزلیات اور آخر میں رباعیات کی نگارش عمل میں آئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کے ساتھ یہ دلیل بھی دی ہے کہ نسخۂ شیرانی کی ترتیب کا زمانہ غالب کے مذہبی رجحانات کی تندی کا زمانہ ہے۔ اس لیے منق[illegible] کلام کا کتاب کے آخر میں درج ہونا کھٹکتا ہے۔ مولانا ان دلائل کو خاصا اطمینان بخش تصور کرتے ہیں۔ اور اس تاثر کے تحت اس خیال کے موید نظر آتے ہیں کہ اوّل و آخر کے متعدد اوراق اس نسخہ سے غائب ہیں۔

یہاں یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس وقت تک یہ قصائد لکھے ہی نہ ہوں۔ لیکن گل رعنا کے بارے میں تو یہ نہیں سوچا جا سکتا اس لیے کہ اس وقت تک ان کی تخلیق ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس انتخاب میں شامل نہیں۔ نسخۂ شیرانی میں نونیہ قصیدہ ناقص الاول ہے ممکن ہے کوئی قصیدہ اس سے پہلے بھی ہو۔ لیکن یہ قصائد شروع میں ہوں اور اوراق کے بے ترتیب ہونے کی وجہ سے آخر میں آ گئے ہوں یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ غزلیات کے آغاز میں جو مزیّن و منقش لوح موجود ہے

وہ اس قیاس کی نفی کرتی ہے۔

درمیانِ نسخہ سے اوراق کے غائب ہونے میں تو کوئی شک نہیں اس کا ثبوت ثابت قصیدہ نوتیہ کا شروع میں ناقص رہ جانا بھی ہے لیکن یہ قصیدہ جہاں ختم ہوتا۔ وہاں کے بعد اوراق غائب ہیں اس کا کوئی ٹھوس ثبوت مہیا کیا جانا چاہیے۔

اس میں غالب کے مذہبی جذبات کی کسی خاص زمانے میں شدت کو پیش نظر رکھنا بھی کافی نہیں یہ جذبات تو اپنی شناخت اور نظریاتی ثقافیت کے ساتھ اس وقت بھی تھے۔ جب بیاض غالب کی تسوید و تحریر عمل میں آرہی تھی۔ اور اس کی بیاض پیشانی ان کلمات سے مزّین کی گئی تھی۔ یا علی المرتضیٰ علیہ وعلیٰ اولادہ الصلوٰت والسلام۔ اور اس سے نیچے "یا حسن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حسین" درج ہے اس کے ساتھ یا فتاح بھی لکھا ہے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کے دائیں بائیں رب یسر وتمم بالخیر کے کلمات بھی آئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قصائد اس سے پہلے لکھے گئے تھے۔

غالبؔ کا منتخب و متداول دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب ہوتا ہے اس پر تقریظ بھی اس وقت تحریر کی جانی چاہیے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ کئی برس بعد معرضِ تحریر میں آئی ہے۔ اور خود یہ دیوان ۱۸۴۱ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔

یہ قیاس آرائی اس اعتبار سے بھی واقعہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس کے آخر میں ایک ورق سادہ ہے اور اس پر بالکل اسی انداز سے جو شروع سے آخر تک اس کے کاتب یا بیاض نگار کا شیوۂ تحریر رہا ہے۔ ۱۱۰ الف اور ۱۱۰ ب لکھا ہے۔ بیرونی خط بھی اسی اسلوب سے کھینچا گیا ہے اگرچہ اس میں وہ داخلی جدول نہیں ہے جو سہ خطی ہے اور جسے نگارش متن کی مواصلاتی حدبندی کہنا چاہیے۔

ایک اور بات جس کی طرف اشارہ ضروری ہے اور جس کی طرف سوئے اتفاق سے ہمارے محققین کی توجہ مبذول نہیں ہوئی وہ یہ کہ جس ورق پر نگارش متن کا یہ

سلسلہ تمام ہوتا ہے وہاں پا ورق میں کوئی کلمۂ ترک موجود نہیں جب کہ یہاں وہ
قصیدۂ منقبت ختم ہوتا ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں ہے۔
پاپان صفحہ ہے۔ اوراس کے اختتامیہ اشعار جو دعائیہ شعر ہیں اس کی تکمیل کی طرف
اشارہ سنج ہیں۔ اس کے بعد ایک مستطیل نما جدول آئی ہے جو کسی غزلوں کے
اختتام یا خاتمہ نگارش کی علامت بھی ہے۔ اور یہ بات باوثوق سطح پر کہی جاسکتی
ہے۔ کہ اس کے بعد اس قصیدے کا کوئی حصہ محروم نگارش نہیں ہاں یہ قصیدہ اپنے ابتدائی
سلسلہ اشعار سے ضرور محروم ہے یہ ورق ۱۰۰ الف کا وارده ہے جہاں پہلے یہ
شعر آیا ہے۔

یاس تمثال بہار آئینہ واستغنا
وہم آئینہ پیدائی تمثال یقیں

یہ شعر نسخۂ عرشی میں جہاں مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اسے گنجینۂ معنی
(نسخۂ حمیدیہ) کے منتخب اشعار کے ذیل میں پیش کیا ہے تیسرے نمبر پر ہے اور اس
سے پہلے دو شعر اور ہیں۔ ان میں یہ شعر مطلع کے طور پر آیا ہے۔

نوڑے ہے عجز تنک حوصلہ بروے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو یقین

اشعار کی کل تعداد یہاں کل ۲۵ ہے جب کہ نسخۂ شیرانی میں اس مطلع کے ذیل میں
آنے والے اشعار اپنے مجموعی تعداد کے لحاظ سے ۶۳ ہیں۔

گل رعنا کے انتخاب اردو میں اردو قصیدے کا کوئی حصہ شامل ہی نہیں
نسخہ حمیدیہ میں اس قصیدۂ فی المنقبت، کا مطلع یہی ہے۔ اور حسن مطلع کے طور پر
وہ مطلع ملتا ہے جو مطبوعہ روایت کا حصہ ہے۔ اسے شامل کرتے ہوئے کل پانچ شعر
اس قصیدے میں شعر مذکور سے پہلے نقل ہوئے ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ کا عکسی متن مطبوعہ اردو اکیڈمی لکھنؤ میں اشعار کی تعداد اپنے
نشانات شمار کے لحاظ سے تیئس ۲۳ ہے۔ ان میں بعض مصرعے دوگونہ اشکالِ روایۂ

کے ساتھ موجود ہیں۔

۱۔ ش۔م کی علامت لکھ کر مطبوعہ اشعار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ نسخۂ شیرانی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ورق ۱۰۶ ب پر پاورق میں آنے والے حروف ترک "غم آغوش" ہیں اور ان کے سامنے باریک انگریزی حروف میں لکھا ہے۔ اس کے نیچے کوئی نام یا اس سے متعلق انیشل ہیں اور بعد ازاں ۵۴-۸-۱۷ لکھا ہے۔ سترہ کے عدد میں کوئی قطع و برید ہوئی ہے۔ لیکن انگریزی میں آٹھ کا ہندسہ جس سے ماہ کی نشان دہی مقصود ہے۔ بالکل صاف اور واضح ہے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ پڑھنے والے کو جو اس کا کوئی مالک بھی ہو سکتا ہے یہاں پہنچکر اجزاء کی بے ترتیبی کا احساس ہوا۔ لیکن اس کے ورق پر جو نشانات شمار آئے ہیں۔ وہ ۵-۷ الف ہیں اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس نے یہ نشانات شمار اپنے قلم سے لکھے ہیں وہ اس بے ربطی اجزائے کلام سے واقف نہ رہا ہوگا۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال یہ ایک تسامح ہے۔ اور اس تاریخ کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک یہ نسخہ، ترتیب اوراق کی منزل گذر چکا تھا۔ صفحہ ۱۰۹ الف پر یہ سلسلۂ نگارشات بغیر کسی عبارت خاتمہ یا ترقیمے کے تمام ہو جاتا ہے۔ جس سے متعلق یہ سوچا گیا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور بھی ہوگا "اس ہوگا" کا قیاسی وجود تو ممکن ہے۔ وقوعی وجود کے لیے جن خارجی شواہد کی موجودگی شرط ہے وہ مفقود ہیں آخر میں جو مثلث نما جدول ہے ایسے جدول غزلوں کے خاتمہ پر مختلف اوراق میں کئی بار آئے ہیں۔ ایک موقع پر ایسی ایک جدول میں مطلع اور جدولوں میں غزل کا لفظ لکھا ہوا ملتا ہے۔ مگر یہاں ایسی کوئی علامت شناخت موجود نہیں ہے۔ یہ بات تعجب انگیز ضرور ہے کہ جس نسخہ میں حاشیوں پر نئی غزلوں کے اضافہ عمل میں آتے رہے ہوں اور جو غالب کی بعض اصلاحات اور ایک سے زیادہ موقعوں پر ترمیمات سے مزین ہو۔ وہ اپنے تکملہ سے محروم رہ جائے۔ اس کے آخر میں شامل ہونے والا

ادہ ورق بھی اس امر کی ایک علامت ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے بعد یہ گمان غالب کچھ
ی درج نہیں تھا۔ کوئی ترقیمہ یا تکملہ درج کی نوبت بہر صورت نہیں آئی۔
مجلس ترقی ادب لاہور کا جو عکسی نسخہ راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔ اس میں
زیرِ متن کی جدول ۲½ ہے۔ پہلے دو صفحوں پر حاشیہ سہ رخی جدول میں ہے۔
ی صفحات میں یہ جدول تو موجود ہے لیکن اس کی دامن داری اور وسعت کا پیمانہ
ر جگہ یکساں نہیں ہے۔ جہاں اور جن صفحات پر نئے کلام کا اضافہ ہوا ہے وہاں یہ
بدول نگاری اپنی اطرافی وسعت کے لحاظ سے دوسرے صفحات کے مقابلہ میں
کچھ زیادہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تحریر کلام کے بعد صفحات کی یہ جدولیں تیار کی گئیں
شیرانی مرحوم کو یہ نسخہ کب اور کہاں دریافت ہوا تھا۔ اس کے ابتدائیہ میں اس کی طرف
کوئی اشارہ نہیں۔ اس سے متعلق کوئی مقالہ یا نگارش نامہ مرحوم کے مقالات میں
بھی شامل نہیں ہے اس میں شامل اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

الف	۴۰۷	ع	۱۲
ب	۲۵	ف	۱۴
ت	۳۳	ک	۲۴
ٹ	۲	گ	۹
ج	۱۰	ل	۴۰
ح	۱۴	م	۳۷
د	۱۶	ن	۲۴۹
ر	۵۵	و	۴۴
ز	۶۰	ہ	۵۶
س	۲۴	ی	۹۰۹
ش	۱۴	قصیدہ	۵۳
ع	۱۳		

حواشی پر اضافہ شدہ غزلوں کی صورت یہ ہے :

الف - ۲۵ - ن ۲۹ - و ۱۲ - ی ۳۲ = ۸۸

پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری

کچھ مرزا غالب کے بارے میں

آج سے ۱۱۵ سال پہلے منشی بال گوبند ماتھر نے آگرہ سے مارچ ۱۹۶۸ء میں ایک ماہوار اردو رسالہ "ذخیرہ بال گوبند" کے نام سے اجرا کیا تھا، اس رسالے کے ۲۳ شمارے پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ مرزا غالب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوا۔ اس سانحہ کے بعد ذخیرۂ بال گوبند کا پہلا پرچہ جو مارچ ۱۸۶۹ء میں نکلا اس میں ایک مضمون غالب سے متعلق بھی شائع ہوا۔ اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جو کسی قدر دلچسپ ہے:

> ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اتار کر حلیۂ فری مسن سے آراستہ ہوا تھا ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فری مسن ہوس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی۔ پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔"

مضمون کے آخر میں ایک قطعۂ تاریخ بھی ہے جس کا عنوان یہ ہے:

"قطعۂ تاریخ طبع زاد مولوی محمد حسین صاحب آزاد شاگرد رشید محمد ابراہیم خان ذوق دہلی" وہ قطعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

۱ بلبل باغ پہلوی و دری — اسد اللہ غالب و نوشہ
۲ فکرتش جاں نواز وجانش پاک — نفسش روشن و دلش آگہہ
۳ سخنش کانِ گوہر افکار — نظم ونثرش تمام نقد سرہ
۴ غالب آں شیر بیشۂ معنی — صید مضموں شکار او چو برہ
۵ بظہورش خفا ظہوری را — اسدی در مقابلش رو بہ
۶ عنصری پیش اوست بے جوہر — عسجدی بردہ بردوش سجدہ
۷ بعروسی بکرہائے سخن — فی المثل پیر زاہدے نوشہ
۸ رخت بربست چوں زدار کہن — نظم مضمون شانت آوارہ؟
۹ جگر بحر آب شد بہ غمش — دل تقطیع گشتہ صد پارہ
۱۰ از پے سال رحلتش آزاد
ہاتف غیب گفت و زد نعرہ
۱۱ شدہ مغفور از خدائے غفور
کہ بود سال فوت او "غفرہ" ۱۲۸۵ ہجری

اخبار میں غالب کی فارسی شاعری کو اردو پر ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ مندرج ہے کہ:

"یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اُردو بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔"

"غالب کی وفات پر آزاد کا قطعۂ تاریخ" پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے "آجکل" دہلی بابت ۱۵ رفروری ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔ پروفیسر مرحوم یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"اس قطعہ میں کتابت کی کئی غلطیاں تھیں۔ جو درست کر دی گئیں۔
مگر آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں جو غلطی ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔
اس لیے وہ مصرعہ بجنسہٖ نقل کر دیا گیا۔"

فارسی اور عربی کے مشہور عالم پروفیسر ڈاکٹر قاضی عبد الستار صدیقی مرحوم الہ آباد یونیورسٹی ماہنامہ "آجکل" دہلی بابت ۱۵ رمارچ ۱۹۴۷ء صفحہ ۲۶ میں لکھتے ہیں کہ:

"جیساکہ سید صاحب (مسعود حسن رضوی) نے فرمایا یہ مصرع سمجھ میں نہیں آتا۔ نظمِ مضمون شانت آوارہ"۔ "شانت" ظاہراً کاتب کی غلطی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ "شد است" (شدہ است) اصل میں ہوگا۔ کاتب پڑھ نہ سکا۔ اور اس کی تصحیف کی صورت پیدا ہو گئی۔ "آوارہ" میں یہ شبہ نہیں ہوتا۔

"نظمِ مضمون شدہ ست آوارہ"، مضمون کا نظم جاتا رہا، تباہ ہو گیا اب مارا مارا پھرتا ہے۔ "آوارہ" کے یہ تینوں معنی ہیں"۔

ڈاکٹر آغا باقر صاحب نے لاہور سے غالب کی تاریخ وفات کے بارے میں ایک مضمون بعنوان "غالب کی وفات پر آزاد کا قطعۂ تاریخ" آجکل دہلی کی ۱۵ راپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ ص ۱۷ میں موصوف لکھتے ہیں کہ :

"آجکل کی ۱۵ رفروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں مسعود حسن صاحب رضوی نے غالب کی وفات پر مولانا آزاد مرحوم کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ شائع کیا ہے جس میں آٹھواں شعر یوں درج ہے :

رخت بربست جوزِ دار کہن — نظمِ مضمون شانت آوارہ

ذیلی نوٹ میں رضوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس قطعہ میں ..... بجنسہٖ نقل کر دیا گیا۔ الخ"۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مصرعے میں کتابت کی کوئی غلطی نہیں صرف طرزِ تحریر نامانوس ہونے کی وجہ سے دوسرا مصرعہ پڑھا نہیں گیا اور اگر اس مصرعہ پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مصرعہ یوں پڑھا جانا چاہیئے تھا ؎

نظمِ مضمونِ شانست آوارہ

یعنی "اس کے مضمون نظم پریشان ہو گیا ہے"۔ قطعہ کے نویں اور دسویں شعر سے ظاہر ہے کہ ضمیر متصل کا جو مضمونِ شان، میں رکھا گیا ہے وہی ترتیب ان اشعار میں "غمش" اور "رحلتش" کی تراکیب میں دہرائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جگر بحر آب شد بہ غمش — دل تقطیع گشتہ صد پارہ

از پے سال رحلتش آزاد٭ ہاتفِ غیب گفت و زد نعرہ

"شانت" کو "شدہ است" پڑھنے سے بھی ربط مضمون قائم رہے گا اور تقطیع میں فرق نہ آئے گا۔ ملاحظہ ہو ؎

رخت بربست چوں زِدارِ کہن نظم مضمون شدہ است آوارہ

لیکن اصل تحریر میں "شانت" کو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ قیاس درست نہیں "شانت" کی کوئی شکل بھی "شدہ است" نہیں بن سکتی۔ اس لیے صحیح صرف یہ ہے۔

(۳) جناب سید وزیر الحسن صاحب نے "آجکل" دہلی کی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں صٹ میں ایک مختصر مضمون "اپنے ترک مے نوشی پر غالب کا قطعۂ تاریخ" شائع کیا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ "غالب ترک مے نوشی کے بارے میں توبہ کیا کرتے تھے۔ لیکن بے مقصد۔ چنانچہ اس فسخ عزائم کو اس کے حساس ضمیر نے خود بیان کیا ہے ؎

یک روز بہ ترک بادہ گوئی غالب خ زرد دگر بہ بادۂ شوئی غالب

زیں توبۂ بے بقا چہ جوئی غالب توبہ تب توبہ است گوئی غالب

یہ غیر مطبوعہ رباعی بخط غالب کلیات فارسی غالب قلمی مکتوبہ ۱۸۶۱ء میں موجود ہے۔ جو رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

آخر کار غالب نے سہ شنبہ ۱۷ نومبر ۱۸۶۸ء کی توبۂ تاریخ کہی۔ جو یقیناً تا دم مرگ رہی یہ قطعۂ تاریخ "سبد باغ دو در مولفہ غالب میں موجود ہے ؎

قطعہ

ہر شب بقدح ریختے بادہ گلفام	آرے زدوسی سال مرا قاعدہ ایں بود
شش روز شد اینک کہ بہ می دسترم نیست	شد غمزدہ تر دل کہ دریں پیش حزیں بود
امشب چہ سرایم کہ شب اول گور است	شش روز بہ بیتابی و تلواسہ چنیں بود
ناگاہ درآں وقت کہ در قطع رہ عمر	از من دو قدم تا بدم باز پسیں بود
بیکرہ دو تن از شرب میم منع نوشتند	وآں منع نہ بغض بل از غیرت دیں بود

ہر چند بداں منعِ مَن از می نگزشتم — اما دم گیرائی عزیزاں بکمیں بود
دانی کہ چہ شد چوں زرِ سوداگرِ صہبا (ق) — کش داد و ستد با من ویرانہ نشیں بود
بگزشت ز اندازۂ بایست بمن گفت — دیگر نہ دہم بادہ کہ معمول نہ ایں بود
با کاسۂ خالی چہ کند کیسۂ خالی — ناخواستہ در خواستہ دل صبر گزیں بود
گزرہ بدے از جاے دگر می طلبیدم — کہ نقد در آں دست کہ پشتش بزمیں بود
در غرۂ شعبان چوں زیں بادہ گرفتند — خود غالب پژمردہ نشانے زنہیں بود

روشش بدر آر از مہ شعبان کہ دریں جا [۱۲۹۱]
مقصود من از تخرجہ البتہ ہمیں بود

۶ —— ۱۲۹۱ = ۱۲۸۵ھ

(۴) جناب سید علی ہاشم مرحوم عظیم آبادی ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کے مضامین حسرت کے اردوے معلّٰے علی گڑھ اور شیخ عبدالقادر کے مخزن لاہور کے ابتدائی پرچوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ علاوہ بریں راقم الحروف نے ان کے متعدد مضامین دیگر رسائل میں دیکھے ہیں۔ موصوف اردوئے معلّے جلد ۳، نمبر ۴ بابت ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۸ میں لکھتے ہیں کہ شاد عظیم آبادی کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ انھوں نے لفظ گیت کے مذکر و مونث ہونے میں یہاں کے بعض حضرات سے گفتگو کی۔ فریق مخالف اس لفظ کو مذکر ہونے کو نہ مانتے تھے تو شاد نے ایک خط مرزا دبیر مرحوم کی خدمت میں تحریر کیا۔ جب کئی ہفتے تک کوئی جواب نہ آیا تو ایک منظوم خط جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب مغفور کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت غالب نے اس نظم کو بہت پسند کر کے جو جواب لکھا وہ اس زمانے میں دست بدست پھرا کیا اور لوگوں کو زبانی یاد ہو گیا۔ غالب کے خط ہذا کی نقل سید علی ہاشم عظیم آبادی کے والد جناب حکیم سید احمد مغفور نے اسی زمانے میں اپنی کتاب پر لکھ رکھی تھی۔ یہ خط واقعی نادر و نایاب ہے اور غالب کے کسی مجموعے میں نہیں ملتا ہے۔ ذیل میں غالب کا یہ خط درج کیا جاتا ہے:

"اورنگ نشین فصاحت زیب و سادۂ بلاغت سلامت

نظم دلپسند یافتم و بر رسائی ذہنِ وقّادِ گرامی عش عش ہا گفتم۔ اینکہ لفظ گیت بروزنِ صیت معمول ہندوستاں را ازیں گم کردہ راہِ حقیقت تحقیق فرمودی۔ نہ آں چنانست کہ دریں مہر کوش اسد اللہ مرزا دبیر سلمہ اللہ القدیر بپاسخ آں نہ گراید .... وضیعان اینجا مذکرش خوانند۔ زیادہ عشق۔

خاکپائے اسد اللہ غالبؔ مغلوب

(۵) سید کاظم علی مسب شوکت بلگرامی کے نام سے اس صدی کی اوائل میں گلدستوں اور دیگر رسائل میں لکھتے تھے۔ فن شاعری میں وہ امیر مینائی (متوفی ۱۹۰۰ء) کے نامی شاگردوں میں تھے۔ وہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی لکھتے تھے اور یہ مضامین حسرت موہانی کے اُردوے معلّٰے علی گڑھ میں زیادہ تر چھپتے تھے۔ غالباً شوکت بلگرامی حیدر آباد بھی آئے تھے ایام عزا میں ایک اشتہار نظر سے سیاست میں "یادِ شوکت بلگرامی" کے عنوان سے گزرا۔ موصوف کا ایک مضمون اُردوے معلّٰے بابت ماہ جولائی ۱۹۱۰ء نمبر ۷ جلد ۱۱ صفحہ ۱۴ میں "غالبؔ کے ایک شعر کی شرح" کے عنوان سے چھپا تھا۔ مضمون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بیا ور یدگر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

اس شعر میں زباں دان سے ان کی غرض رازداں سے ہے۔ یعنی زباں دان تو بہت ہیں مگر کوئی ایسا سخن فہم بھی ہے جو میری باتوں سے میرا منشاء معلوم کرلے اور اس سے متاثر ہو۔ اس طومار سے غرض یہ ہے کہ شعر کی معنوی خوبی کا سمجھنا حقیقت میں نہایت دشوار ہے اور پھر شعر بھی غالبؔ کے شعر جس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ مری بات سمجھنی محال ہے

پنے اس دعویٰ کے ثبوت میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو میرے ایک بزرگ نے مجھ سے بیان فرمایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک دفعہ میں مع چند احباب دہلی میں مرزا غالب کی ملاقات کو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا قوت سماعت سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ دوات قلم کاغذ آگے بڑھا دیا اور فرمایا۔ ارشاد، میں نے لکھا کہ ہم لوگ آپ کا کلام بلاغت نظام آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے سننا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر فرمایا۔ بہت اچھا اور اس کے بعد یہ غزل سُنائی ؎

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا

اور جب یہ مقطع پڑھا ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

تو فرمایا۔ کہو کچھ سمجھے بھی ہم نے اس خیال سے کہ ہم جو سمجھے ہیں اگر وہ ان کا منشا نہ ہوا تو لکھ بیٹھیں گے عرض کیا مطلق نہیں سمجھے۔ اس پر مسکرا کر فرمایا نہیں سمجھے ہو گے۔ سنو! ایک زمانہ ہوا جب وہاں گئے تھے۔ جانتے ہو، کہاں ؟"

عرض کیا "نہیں"۔ کہنے لگے " اجی! وہیں اپنے معشوق کے پاس۔ مگر یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جیتے تھے۔ یعنی جوان تھے۔ سر پر بال تھے گھنی ہوئی ڈاڑھی تھی۔ تنا ہوا سینہ تھا۔ بھرے بھرے بازو تھے چمپئی رنگ تھا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو آنکھوں سے شعلے نکلتے تھے۔ چلتے تھے تو در و دیوار ہلتے تھے۔ اس وقت کے گئے گئے پھر کب گئے؟ اب جب کہ آنکھوں میں نور، دل میں سرور نہ رہا۔ رنگ کافور ہو گیا۔ منہ پر جھرّیاں پڑ گئیں۔ کمر جھک گئی۔ اُٹھتے ہیں تو تھرّاتے تھرّاتے ہوئے۔ چلتے ہیں تو لڑکھڑاتے ہوئے۔ زاہدوں کی طرح سر منڈوا ڈالا۔ ڈاڑھی بڑھا دی۔ اب ہم کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غالبؔ کا ایک شعر

حضرت شوکت بلگرامی صاحب اردوئے معلّیٰ نمبر ۹ جلد ۱۱ مد ۱۳ بابت ستمبر ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں :

"اکثر دیکھا گیا کہ دقت پسند طبائع مضمون کی تلاش میں کوسوں نکل جاتے ہیں اور سامنے کی باتیں ان کو نہیں سوجھتیں۔ اگرچہ دیکھا جائے تو دلنشیں وہی باتیں ہوتی ہیں جو دن رات ہم پر گزرتی ہیں اور یہی شعر کی اصل غایت ہے کہ وہ دلنشیں ہو۔ چنانچہ قدرؔ مرحوم کہتے ہیں ؎

ہم تو اسی شعر کو کہتے ہیں شعر
منہ سے وہ نکلا کہ اثر ہو گیا

یہ بات (یعنی کلام میں اثر) یا تو شعرائے متقدمین کے کلام میں دیکھی گئی ہے۔ یا دَور آخر کے سرتاج مرزا غالبؔ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جس نے ان کے کلام کو اوروں سے ممتاز بنایا ہے۔ چنانچہ ان کا مطبوعہ دیوان ہمارے اس دعویٰ کا شاہد ناطق ہے۔ مرزا کی ایک مشہور غزل ہے ؎

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بعد طبعِ دیوان اسی زمین میں مرزا نے ایک اور شعر کہا تھا۔ جو میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے۔ چونکہ یہ شعر دیوان میں نہیں ہے۔ اس لیے نذر ناظرین کرتا ہوں۔ دیکھیے غالبؔ مرحوم نے اپنی انتہائی حسن پرستی اور انتہائی بے سروسامانی کو کس انداز سے بیان کیا ہے اور کیا خوب کہا ہے ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

دیوان غالبؔ مع شرح نظامی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں کے صفحہ ۲۷۲ مطبوعہ ۱۹۲۳ء میں

نظام الدین حسین نے یہ شعر درج کیا ہے۔ اس کے حاشیے میں درج ہے کہ :

"یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے۔ لیکن اس کے اصلی مصنف کے نام سے لوگ ناآشنا ہیں۔ بعض اسے میر کا شعر بتاتے ہیں۔ بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیات میر میں اس کا پتا نہیں نہ دیوان غالب میں ہے لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابت اُردوئے معلیٰ علی گڑھ مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل "قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا" میں بعد طبع دیوان مرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا۔ عجب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان صحیح ہو۔ کیونکہ اس شعر کے تیور بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے قادر الکلام شاعر کے کلام سے نکلا ہے۔"

حسرت موہانی نے "عبارت خاتمۂ دیوان" نسخۂ امروی اپنے شرح دیوان غالب کے آخر میں شائع کی ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ مرزا نے اِسے قلمزد کیا تھا۔" غالب کا متذکرہ بالا شعر دیوان غالب تاج ایڈیشن تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور میں بھی ص۳۱۲ میں موجود ہے۔

---

(۷) مرزا غالب کی بیوی نے اپنے بھانجے زین العابدین خان تخلص عارف (متوفی ۱۸۵۲ء) کو اپنا منہ بولا بیٹا لیا تھا۔ مرزا نے ان کے بیٹے باقر علی خان کی شادی اپنی آخری عمر میں بگا بیگم (فخر الدین علی احمد خان مرحوم سابق صدر جمہوریۂ ہند کی نانی) سے کی تھی"۔ آجکل" دہلی کی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء ص۱۶ کی اشاعت میں حمید احمد خان کا ایک مضمون "غالب کی خانگی کی ایک جھلک" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے اس میں غالب سے متعلق بگا بیگم کے حوالے بھی دئے ہیں۔ ص۱۷ میں موصوف لکھتے ہیں :

"غالب ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے۔

دال، مربہ، پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن.....''

جب یہ مضمون ڈاکٹر قاضی عبدالستار صدیقی مرحوم کی نظر سے گزرا تو انھوں نے ایڈیٹر ''آجکل'' کو ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک خط لکھا جو ''آجکل'' دہلی ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں صلہ ۲۶ میں شائع ہوا۔ ذیل میں اس کی کچھ تحریریں درج کی جاتی ہیں:

''اور چیزوں کا ذکر تو غالب نے اپنے خطوں میں خود ہی کیا ہے۔ مگر حلوا سوہن ان کے خطوں میں اس سلسلے میں نہیں ملتا ــــــ جس زمانے میں بگّا بیگم نے انہیں دیکھا ہے اس سے بہت پہلے مرزا صاحب کے دانت جواب دے چکے تھے اور اسی لیے ڈاڑھی بھی چھوڑ دی تھی، مِسّی بھی۔ روزانہ تو حلوا سوہن کیا ہی کھاتے ہوں گے۔ بگّا بیگم نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ لکھدیا۔ فارسی میں ایک لفظ ''سوہن'' ہے۔ مگر وہ مخفّف ہے ''سوہان'' کا۔ ''سوہان'' ''ریتی'' کو کہتے ہیں یا سنگ فسان کو۔ ریتی وہ ہتھیار جسے لوہار کسی سخت چیز پر رگڑتا ہے۔ ظاہر ہے ''ریتی'' یا ''فسان'' کو نہ حلوے سے کوئی مناسبت نہ شراب سے۔ مگر غالب کے ایک فارسی شعر میں ''سوہن'' شراب کے لیے آتا۔

گفتمش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نباشد از سوہن

قاضی صاحب نے اس شعر میں ''سوہن'' کے معنی شراب ہی بیان کئے ہیں اور واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:

''ہندی میں ایک لفظ ''سوہن'' ہے۔ اس کے معنی ہیں جی کو بھانے (بھلا لگنے) والا، گوارا، خوشنما، خوبصورت۔ ''سوہن'' مٹھائی کو بھی کہتے ہیں چنانچہ ''سوہن حلوا'' قرینہ ہے کہ غالب نے ''ناب گوارا'' کے لیے استعمال کیا ہے۔''

اُردو کے مشہور و معروف شاعر اور غالب شکن مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے ایک مختصر مگر دلچسپ مضمون "آجکل" دہلی کی ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں ص۲۰ تا ص۲۱ میں "لفظ سوہن کی تحقیق" کے نام سے شائع کیا۔ ابتدا میں انھوں نے غالب کا ایک قطعہ درج کیا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

ساقی بزم آگہی روزے — راوقے ریخت در پیالۂ من
چوں دماغم رسید زاں صہبا — شدم از ترکتاز وہم ایمن
گفتمش چیست نشاء سفرم — گفت جور و جفائے اہل وطن
گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست — گفت جاں است و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت — شاہدے مست محوِ گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت رنگیں تراز فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد — گفت خوشتر نباشد از سوہن

حالِ کلکتہ باز جستم گفت
باید اقلیم ہشتمش گفتن

اس کے بعد یاس یگانہ لکھتے ہیں :

"یہ قطعہ غالب کی فکرِ رنگین کا ایک نمونہ ہے، جس میں مرزا صاحب نے ساقی کو مخاطب کر کے ایک مقالہ کی صورت میں سفر کلکتہ اور اثنائے سفر کے بعض تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ثابت ہے کہ دہلی سے کلکتہ جا رہے تھے تو درمیان میں بنارس اور عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے۔"

رسالہ "آجکل" ۱۵ فروری اور ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء میں غالب کی نسبت بعض اقوال نقل کر کے یاروں نے اپنی اپنی خیال آرائیوں کے تحت کچھ ایسی بے ربط باتیں چھیڑ دی ہیں کہ کیا کہوں حمید اللہ خاں صاحب نے فٹ نوٹ میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مرزا کھانا ایک وقت کھاتے تھے دوسرے وقت کباب تلے ہوئے

——— اور سوہن حلوا .....

قاضی عبدالستار پی، ایچ ڈی اپنے مکتوب مندرجہ "آج کل" ۱۵ ر مارچ ۶۴ء میں فرماتے ہیں کہ "حمید اللہ خان صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بگّا بیگم نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ کہہ دیا..... مسلمان گھروں کی بیویاں ایسے لفظوں کا منہ سے نکالنا معیوب جانتی ہیں کبھی کالا پانی کہہ دیا، کبھی دوا۔ بگّا بیگم صاحب نے اگر ذرا گاڑھا پردہ ڈالا تو بجا تھا۔

لیجیے ڈاکٹر صاحب کا خیال بھی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بگّا بیگم صاحب نے شراب پر گاڑھا پردہ ڈالنے کی غرض سے شراب کی جگہ حلوا سوہن لکھ دیا...... بیگم صاحب نے شراب کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ یہاں حلوا سوہن وہی کھانے کی چیز ہے۔ اسے شراب کا پردہ یا گاڑھا پردہ سمجھنا محض بے ربط بات ہے۔ کجا حلوا سوہن کجا شراب چہ نسبت ؟" پھر فرماتے ہیں کہ :

"فارسی میں ایک لفظ سوہن ہے۔ مگر وہ مخفف ہے۔ سوہان کا معنی ریتی۔ وہ آلہ جس سے کسی سخت چیز کو رگڑ کر ہموار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریتی کو نہ حلوے سے کوئی مناسبت ہے نہ شراب سے۔ مگر غالب کے ایک شعر میں شراب کے لیے آیا ہے ؎

گفتمش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نہ باشد از سوہن

فارسی میں سوہن کے وہی ایک معنی ہیں جو یہاں چسپاں نہیں۔ البتہ ہندی میں ایک لفظ "سوہن" ہے۔ جس کے معنی ہیں جی کو بھانے والا۔ گوارا۔ خوشنما، خوبصورت قرینہ ہے کہ غالب نے "تلب گوارا" کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔" اس کے بعد مرزا یاس یگانہ لکھتے ہیں :

"اب لوگ بے چارے غالب کے شعر کو مدرسے میں ضرور لے جائیں گے۔ صاحب یہ تو غلط ہے اور پھر عربی، فارسی لفظوں کے ساتھ

ہندی کا قافیہ کتنا بھونڈا "۔

پھر یاسؔ لکھتے ہیں کہ :

"اہلِ مدرسہ کی عقل مندی رہی طاق پر۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب سے
یہ پوچھنا۔ چاہیئے کہ آپ کا "ناب گوارا" کیا چیز ہے۔ فارسی ادب میں
تو "ناب گوارا" کا کوئی وجود نہیں۔ لفظ "ناب" رسم نہیں ہے۔
صفت ہے۔ جس کے معنی ہیں صاف اور خالص۔ جیسے مَے ناب'
"بادۂ ناب"۔ یعنی ایسی شراب جو صاف ہو، خالص ہو، بے غش ہو۔
جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ "ناب گوارا" محض بے معنی ترکیب ہے۔
ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ شاید اہلِ مدرسے "سوہن" کے قافیہ کو
بھونڈا ٹھہرائیں گے۔ مگر اس میں تو کوئی بھونڈا پن نہیں ہے۔
"سوہن" کا قافیہ بھی ویسا ہی ہے جیسے غالبؔ کے اسی قطعے میں
لندن کا قافیہ ہے ؎

گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند
گفت خوبانِ کشورِ لندن

قاضی صاحب پھر فرماتے ہیں "بظاہر اسوہن (شراب کے معنی میں) دلوں والوں کی
اصطلاح تھی اور شاید اب بھی ہے،" چہ خوش یہ شاید کیا؟ اور اصطلاح کیا؟ اصطلاح
تو وہ ہے جو کم از کم کسی طبقہ یا کسی جماعت میں رائج ہو۔ مگر کیا ثبوت ہے۔ اس امر
کا کہ "سوہن" بمعنی شراب دلی والوں کی اصطلاح تھی یا ہے؟"

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ :

"بگّا صاحب کا اسے بے تکلف استعمال کرنا خود ہی سند ہے"۔

اس کے جواب میں یاسؔ یگانہ لکھتے ہیں کہ :

"لیجئے خواہ مخواہ کی سند بھی گویا ہاتھ آگئی۔ ڈاکٹر صاحب کس ہوا پر اڑے
اڑے جا رہے ہیں۔ خیال کی گمراہی کدھر لیے جا رہی ہے۔ بے چاری بگّا بیگم پر یہ

محض اتہام ہے۔ بیگم صاحب نے ہرگز لفظ "سوہن" شراب کے معنی میں استعمال نہیں کیا۔ نہ غالبؔ نے بفرض محال بگّا صاحب نے ایسا کیا بھی ہوتا تو شراب کے متعلق ایک عورت ذات کا قول سند نہیں ہوتا۔ ہاں کوئی شرابی ان معنوں میں کہتا تو اس کا یہ فعل ایک شخصی تعریف ہوتا۔ مگر اصطلاح ہرگز نہ ہوتی۔ یہ سب بادہوائی باتیں ہیں جنھیں غالبؔ کے شعر سے بیگم صاحب کے مذکورہ بالا قول سے کوئی ربط نہیں۔

مذکورالصدر کی روشنی میں حقیقتِ حال تو یوں ہے کہ غالبؔ دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس اور عظیم آباد میں ٹھہرے تھے عظیم آباد کے قریب پہنچے ہوں گے جس کا پانی سلسبیل تو کیا چیز ہے گنگا سے بھی زیادہ صاف اور صحت بخش ہے۔ اسی آبِ صاف کی بنا پر وہاں کے لوگ دریائے سوہن کو "سوہن بھدرا" بھی کہتے ہیں عظیم آباد کے بعض روسا گنگا کے کنارے رہنے کے باوجود اس زمانے میں جبکہ ریل نہ تھی خاص اہتمام کے ساتھ سوہن کا پانی پیا ہوگا۔ جسے وہ ساقی کی سابان سے آب سلسبیل پر ترجیح دیتے ہیں۔ سوہن بمعنی شراب نہ غالبؔ کے شعر سے ثابت ہے نہ بگّا بیگم کے حلوا سوہن سے۔"

ڈاکٹر یعقوب عمر

غالب کے مذہبی معتقدات اور محققین غالب

مرزا غالب کی شخصیت شاعری اور زندگی کی طرح ان کے مذہبی معتقدات بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ ان کے محققین اور ناقدین نے اپنے اپنے طور پر ان کے مذہبی عقائد کے حقیقی اور مجازی سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر اس سے جو نتائج انھوں نے اخذ کیے ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں بحث کی گنجائش ہے خصوصاً مذہبی اور عرفانی عقائد کے بارے میں اردو اور فارسی شاعری کے علاوہ ان کی دیگر تحریرات کی روشنی میں سیر حاصل تحقیقات کی ضرورت ہے۔

مولانا حالی، شیخ محمد اکرام اور دیگر ناقدین کے بیانات سے مرزا غالب کی مذہبی زندگی اور ان کے عقائد کے جو اہم پہلو سامنے آتے ہیں انھیں سات عنوانات تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) شیعت (۲) شیعت میں غلو۔ (۳) مذہبی معاملات میں صائب انداز فکر (۴) مذہبی معاملات میں ظریفانہ انداز بیان (۵) فرمائشی مذہبی شاعری (۶) مشرب صلح کل اور رواداری (۷) نعیم جسمانی سے انکار۔

شیعت

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ عقیدے کی رو سے مرزا اثنا عشری شیعہ تھے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "اگرچہ میرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا" مولانا غلام رسول مہر نے انھیں شیعہ تفضیلی ظاہر کیا ہے۔ یہ رائیں مرزا کے اردو اور فارسی کلام کے پس منظر میں دی گئی ہیں اور بڑی حد تک صحیح

بھی ہیں مگر غالب کی شخصیت بڑی عجیب و غریب تھی وہ مذہبی معاملات میں بھی عوام و خواص دونوں سے ایک امتیاز قائم رکھتے تھے لہٰذا اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ شیخ محمد اکرام نے بالکل بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ غالب کے فلسفے کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے اس کی تردید کے لیے غالب کے کلام سے بیسیوں اشعار مل جائیں گے (غالب نامہ ص ۳۰۲) چنانچہ غالب کے فارسی کلیات میں جہاں شیعت کے بارے میں ایک عام شیعہ کی طرح اظہار خیال پایا جاتا ہے۔ رباعی

شرط است کہ بہر ضبط آداب رسوم
خیزد بعد از نبی امام معصوم
زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائی
مہ جای نشین مہر باشد نہ نجوم

وہیں ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں :

فرسودہ رسم ہاے عزیزاں فرو گزار
در سور نوحہ خوان و ببزم عزا برقص
بحث و جدل بجاے ماں میکدہ جوے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

شیعت میں غلو

شیعت میں غلو کا جہاں تک تعلق ہے وہاں سے پہلے ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ شیعہ شعرا کے ہاں خصوصاً یہ بات عام ہے اور حضرت علی کی مدح میں جو شعر کہے جاتے ہیں ان میں حدود شرعی کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے بالکل یہی بات بعض سنّی لغت گو شعرا کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ غالب کی اٹھان جس ماحول میں ہوئی اس کا اثر ان پر ہوا اور آخری دم تک یہ رنگ پھیکا نہیں پڑ سکا۔ خود غالب نے مثنوی ابر گہر بار میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ حضرت علی سے غیر معمولی محبت انھیں بچپن سے ہی ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں ان کے نام نے بھی نفسیاتی کردار ادا کیا ہے۔ بچپن میں جو مذہبی تصورات ذہن پر مرتسم ہو جاتے

ہو جاتے ہیں ان کا نقش بہت گہرا ہوتا ہے۔ صاحب شعر العجم فی الہند شیخ اکرام الحق کے ہاں اس سلسلے میں ایک حیرت انگیز بیان ملتا ہے کہ غالب آبائی شیعہ نہ تھے ثبوت میں انھوں نے یہ شعر پیش کیا ہے :

ترکانہ زدم زمزمۂ مدح و ثنایت
در منطق اجداد نہ بر مسلک آبا

(شعر العجم فی الہند ص ۳۴۳)

یہ غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ انھوں نے سیاق و سباق کا لحاظ کئے بغیر ہی یہ شعر بطور مثال پیش کر دیا۔ غالب نے اس میں دراصل مدح و ثنا سے عجز کا مضمون باندھا ہے چنانچہ حضرت علی کی مدح میں لکھے گئے اس قصیدے کے اس شعر کے بعد والا شعر اس پر دال ہے ؎

ایں پارسیٔ سادہ ز آرایش دعوا
ویں بندگیٔ پاک ز آلایش غوغا

دوسری جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ ـــــ حضرت علی کی ذات و صفات میں انھیں غلو تھا اور مرزا حضرت علی کو ربوبیت کی صفات کا حامل سمجھتے تھے۔ (شعر العجم فی الہند ص ۲۹۰)

اس سلسلے میں شیخ صاحب نے جو اشعار بطور مثال دیئے ہیں اس میں سے صرف ایک شعر دیکھ لیجیے ؎

خدایش روا نیست ہر چند گفت
علی را توانم خداوند گفت

یہ شعر اور دوسرے تمام اشعار ان کے مذکورہ بالا دعوے کی تائید نہیں کرتے۔ اس کے بعد انھوں نے تحریر کیا ہے کہ ـــــ "مرزا غالب کی علی پرستی بہ طور استنباط نہیں۔ انھیں خود اس بارے میں غلو کا اعتراف ہے " (شعر العجم فی الہند ص ۲۹۱)

کہ آرایش گفتگو کردہ ام
بہ حیدر رستائی غلو کردہ ام

یہ شعر بھی انھوں نے سیاق و سباق سے بالکل الگ کر کے پیش کیا ہے۔ غالب

یہاں بیان کر رہے ہیں کہ دراصل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میں اس سلسلے میں غلو کرتا ہوں اور ایسا سمجھنا ان کی نادانی ہے۔ دیگر اشعار اس طرح ہیں :

کشاہی کہ اندازہ پیش آو رند
سخن ہا ز آئین و کیش آو رند

بنا دانی از شور گفتار من
سگا لند ز انگو نہ ہنجار من

کہ آرایش گفتگو کردہ ام
بہ حیدر ستائی غلو کردہ ام

اسی طرح شیخ محمد اکرام نے غالب نامے میں دوراول کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ــــ "اس زمانے میں مرزا نے کئی قصیدے منقبت میں لکھے اور بہت سی اردو غزلوں میں بھی حضرت علی سے بہ غلو اظہار عقیدت کیا ہے لیکن بعد میں بالخصوص بعد کی اردو غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں " (ص ۲۱۴) غالب کے مذہب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ــــ "جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔" (ص ۳۲۲)

غالب کی علی پرستی اور غلو کے بارے میں جن ناقدین نے اظہار رائے کیا ہے انھوں نے صرف سکے کا ایک ہی رُخ دیکھا ہے دوسرا رخ دیکھنے یا دکھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

محضری آورد قاصد از علی اللّٰھیاں
پیش ازیں کز خویش بُرسم مُہر بر محضر زنم

لبم در شمار ولی الٰہیست
دلم راز دار علی الٰہیست

خدائیش روانیست ہر چند گفت
علی رابوانم خدا وند گفت

نیست زاسمای الٰہی برزبانم جز علی
بیخودم پاس محبت بزنتابم بیش ازیں

یقیناً ان اشعار کو علیحدہ علیحدہ پڑھنے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ غالب شاید نصیریوں کی طرح حضرت علی کی خدائی کے قائل تھے مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ شیخ اکرام الحق نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ غالب حضرت علی کو ربوبیت کی صفات کا حامل سمجھتے تھے یہ شعر پیش کیا ہے۔ (شعر العجم فی الہند ص ۲۹۰)

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام
ہوشیارم باخدا و باعلی دیوانہ ام

سب سے پہلے تو اس شعر میں وہ مضمون ہے ہی نہیں جو شیخ صاحب ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ان اشعار کے آگے پیچھے جو شعر ہیں اگر وہ دیکھے جائیں تو بات صاف ہو جائے گی کہ ان کا قیاس بے بنیاد ہے۔

گر صمد گویند و رحق کثرت اندر ذات نیست
ما علی گفتیم و آں ہم اسمی از اسماستی

دین حق دارم معاذ اللہ نصیری نیستم
گر نداند عیب جو بارے خدا داناستی

غالب کو خود اس بات کا احساس تھا کہ ان کے جوشیلے اشعار کا غلط مطلب لیا جائے گا چنانچہ انھوں نے حضرت علی کے بارے میں اپنے موقف کا جابجا اظہار کر کے اپنی پوزیشن صاف کی ہے ۔

علی راست بعد از نبی جائے او
ہماں حکم کل دارد اجزائے او

ہمانا پسؑ از خاتم المرسلینؐ
بود تا بہ مہدی علی جانشیں
یا
علی آں زدوش نبی رفرفش
علی آں ید اللہ را کف کفش

خدارا گزیں بندہ راز دار
خدا بندگاں را خداوندگار

غالب کو حفظ مراتب کا بڑا خیال تھا چنانچہ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ
"—— اپنی زندگی میں انھوں نے حفظ مدارج کا بڑا خیال رکھا اور
اشعار و خطوط میں بھی کئی جگہ اس پر زور دیا۔ ایک خط میں کسی شاعر کا مصرع
نقل کیا ہے کہ ؎ گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی ۔ اپنے ایک فارسی قصیدے
میں کہتے ہیں ؎ رعایت ادب آئین من بود ناچار ——" (غالب نامہ ص ۱۱۴)
شیخ محمد اکرام کی اس رائے اور گزشتہ اس تجزیے میں کہ —— "جب شاعرانہ رنگ میں
حضرت علی سے عقیدت کا اظہار کرتے تھے تو بہت کچھ کہہ جاتے تھے —" اور "—— مرزا نے
بہت سی اردو غزلوں میں بھی حضرت علی سے بہ غلو اظہار عقیدت کیا ہے لیکن بعد میں
بالخصوص بعد کی اردو غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں ۔" (غالب نامہ ص ۲۱۴) میں
تضاد واقع ہو رہا ہے جس کی بنا پر انھیں آپس میں تطبیق دینا بہت دشوار ہے۔ سب سے
پہلے تو غالب کی اردو غزلیات میں بجز اس ایک شعر کے حضرت علی سے بہ غلو اظہار عقیدت
کہیں نہیں ملتا ؎

غالب دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگئ بو تراب میں

اور یہ شعر بھی واضح طور پر غلو کی تعریف میں اس لیے نہیں آسکتا کہ یہ وحدت الوجودی رنگ

ہیں کہا گیا ہے اور لفظ "بندگی" کے صرف ایک ہی معنی نہیں ہیں۔ دوسرے اگر شیخ صاحب کی رائے مان لی جائے تو غالب کے ان اشعار کی کیا تاویل کی جائے گی جس میں انھوں نے حضور سے لے کر، حضرت علی، ائمۂ معصومین اور صحابہ کو حسب مراتب سراہا ہے ؎

شاہ نجف، وصی نبی، مرتضیٰ علی
آں از ائمہ اول و ثانی ز پنج تن

ذاتش دلیل قاطع ختم نبوت است
وقت غروب مہر، دمہ ماہ، بے سخن

مہ والی شب است و ولی عہد آفتاب
باید بروشنی مہ از مہر دم زدن

پیغمبر آفتاب و فروغش جمال دیں
بعد از نبی امام مہ و پیروان پرن

محب مرتضوی میں سرشار ہونے کے باوجود حفظ مراتب کا اتنا اہتمام تھا کہ کہتے ہیں ؎

در نجف وقت نماز آرم بسوئے کعبہ روی
قید قانون شریعت بر نتابم بیش ازیں

حضرت علی کی ذات سے ان کا یہ لگاؤ لڑکپن کی اس عمر سے تھا جبکہ انھوں نے شعور سنبھالا تھا اور ابھی دین و مذہب سے پوری واقفیت بھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علی کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی اور جب وہ اس محبت کے نشے سے سرشار ہو کر دو چار شعر کہہ جاتے تھے اور اس پر لوگ غلو کا الزام لگاتے تھے تو انھیں بعید کھلتا تھا کیونکہ جا بجا وضاحت کرنے کے باوجود لوگ الزام تراشی سے باز نہیں آتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کے متعلق وہ کہتے

ہیں کہ یہ نادان میرے جو شیلے اشعار دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں

که آرایش گفتگو کرده ام
به حیدر ستائی غلو کرده ام

حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ میرے جیسا حقیر بندہ اگر حضرت علی کی خیالی پرستش کرتا ہے تو اس سے میری یزداں پرستی میں کوئی کمی نہیں آتی۔ پھر ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

تو غافل ز ذوق ثنا گویم
سزا گویم نا سزا گویم

که تا کینه از مهر بشناختم
بکس غیر حیدر نپرداختم

جوانی برین در بسر کرده ام
شبی در خیالش سحر کرده ام

یعنی تم لوگ میرے ذوق ثنا گوئی کو کیا سمجھو اور مجھے بھی اس کی پرواہ نہیں ہے کہ تم اسے بجا سمجھتے ہو یا بیجا! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ محبت و نفرت کے فرق کو سمجھا ہے تب سے بجز حضرت علی کے کسی اور سے محبت نہیں کی جوانی بھی اسی عشق میں گزری اور آج جبکہ میں بڑھاپے میں ہوں اسی محبت سے سرشار ہوں اور تا دم آخر اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

بود گرچه ثابت که چوں جاں دهم
علی گویم و جاں به یزداں دهم

مبالغہ عجم کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ سعدیٔ شیراز جن کے متعلق تمام ناقدین بشمول مولانا شبلی کا یہ دعوا ہے کہ وہ اسے سخت ناپسند کرتے تھے اور ان میں سے اکثر نے اس سلسلے میں ظہیر فاریابی پر ان کی مشہور تنقید کا تذکرہ بارہا کیا ہے وہ بھی بادشاہ وقت کو "پیمبر صفت رحمۃ العالمین"

تک کہہ جاتے تھے۔ غالب بھی مجم پرست تھے انھوں نے جہاں لارڈ کیننگ کے متعلق یہ کہا ہے ؎

بدیں صفات مقدس دگرچہ اندیشم
مگر مسیح دریں خاکداں دوبار آمد

وہیں بہادر شاہ جیسے بیدست وپا بادشاہ کی مدح میں اتنا غلو کیا ہے کہ اُسے ہم پلۂ یزداں قرار دے دیا ہے ؎

بردعاے شہ سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد

یا

سایۂ خود بہرہ شخصست و توئی سایۂ حق
سجدہ گہ پیش توآریم نہ بیجا کہ بجاست
سایہ چون لازم شخصست دوتا یعنی چہ
نیست ہمتای تو موجود کہ ایزد یکتاست

اس مبالغے کو کسی طرح بھی شایستہ نہیں کہا جاسکتا مگر اس سے صرف غالب کا دامن ہی آلودہ ہو ایسی کوئی بات نہیں۔ بہادر شاہ سے غالب کو کیا قلبی لگاؤ ہوسکتا ہے ؟ چنانچہ انھوں نے بہادر شاہ کی مدح میں لکھے گئے ان قصائد میں بے اعتدالیوں کے باوجود کہیں بھی اپنی صفائی پیش نہیں کی ہے کیونکہ ایسی مدح عموماً شعرائے عجم کی عادت رہی ہے مگر حضرت علی کی مدح میں جہاں کہیں بھی انھیں یہ محسوس ہوا ہے کہ انداز بیان بہت جوشیلا ہوگیا ہے وہاں انھوں نے نہ صرف رہوار قلم تھام لیا ہے بلکہ ان کے دینی مراتب کا بھی جا بجا صاف صاف اظہار کیا ہے تاکہ کوئی بد باطن دینی عقائد میں ان پر بے راہروی کا الزام نہ لگا سکے۔

غالب کی مذہبی وسیع النظری نے ان کے مخالفین کو ہمیشہ اس بات پر آمادہ کیا کہ انھیں مسلمان نہ سمجھا جائے اور ظاہری رسم ورواج پر عدم عمل آوری سے ان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ غالب نے کبھی بھی زہد وورع کا دعوا نہیں کیا بلکہ اپنے خطوط میں اس سے انکار ہی کیا ہے اس

سلسلے میں وہ اپنے آپ کو شہد کی مکھی کے بجائے مصری کی مکھی قرار دیتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہوتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات ہوں یا دنیوی عیش و عشرت دونوں میں اعتدال کے قائل تھے وہ دل اور زبان دونوں سے حقیقی مذہبی عقائد کو مانتے تھے چنانچہ واجد علی شاہ کی مدح میں لکھے گئے قصیدے میں وہ کہتے ہیں ؎

غلام شاہم و حق دانم و حق اندیشم
معاد و عدل و امام و نبی و یزداں را
ز روی راے نبی گشتہ ام پذیرفتار
بدہر بعد نبی اہل بیت و قراں را

لیکن اس اظہار کے باوجود انھوں نے آخر میں یہ بیان کر دیا ہے کہ یہ سب باتیں میں مانتا ہوں لیکن عملاً عیش دنیوی ۔ جو کہ فی الحال حاصل ہے اس سے استفادہ کیجئے کچھ بھی کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے ؎

ہلاک عشرت نقدم اگر زمن باشد
بچار سوئے فروشم ریاض رضوان را

انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ لوگ ان کے مذہبی عقائد پر اور آزادروی پر گرفت کرنے میں بہت بیباک ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو نہ تو عابد، زاہد یا ولی کہلانا پسند کرتے تھے نہ انھیں عابدانہ و زاہدانہ زندگی سے کوئی دلچسپی تھی لیکن وہ اس بات پر بہت رنجیدہ ہوتے تھے کہ انھیں مسلمان نہ سمجھا جائے اس سلسلے میں انھوں نے اپنے اشعار میں دین کے ٹھیکیداروں سے نہایت گرم گفتگو کی ہے ؎

بہ پیر خانقہم در امور دیں رو داد
ستیزۂ کہ نیارم شمرد آسانش

زمن بگوی بفرزانۂ زبانہ زباں
کہ سوخت جبہۂ دعوی زداغ برہانش

بسوز غالب آزادہ را و باک مدار
بشرط آنکہ تواں گفت نا مسلمانش

چگونہ سوختنی بودہ باشد آنکہ خواند
مغان آذر برزیں قسم بہ ایمانش

صائب انداز فکر فطرت براہیمی ہر صاحب نظر میں پائی جاتی ہے۔ غالب اس سے کس طرح مستثنیٰ رہتے چنانچہ نوجوانی سے ہی ان کا ذہن ظلمت تشکیک اور نور یقین دونوں کی آماجگاہ بنا رہا جس کا آئینہ داران کا یہ شعر ہے

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اور فارسی میں ان کی اسی افتاد طبع نے وہ مشہور شعر کہلوایا جس سے آج بھی کام لے کر دین و مذہب کے نام پر مروجہ فرسودہ روایات کا پردہ چاک کیا جا سکتا ہے ۔

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

وہ فقہی موشگافیوں اور فروعی امور دین میں بحث و مباحثہ پسند نہیں کرتے تھے مگر شرع کی پابندیوں کو ڈسپلن کے لیے ضروری سمجھتے تھے چنانچہ اس پس منظر میں انھیں منصور کو سولی دینے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ شرعی نظم و ضبط کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا ۔

آوازۂ شرع از سر منصور بلند است
از شب روی ماست شکوہ عسس ما

قرب الٰہی کے حصول کے لیے یوں تو غالب کی نگاہ میں کئی طریقے تھے مگر شرعی راستے کو ان کی نگاہ میں ترجیح حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے ایک شعر میں انتہائی خوبصورتی سے یہ مضمون باندھا ہے ۔

بشرع آویز و حق میجو کم از مجنوں نہ بارے
کہ دل با محمل است اما زباں سارباں دارد

شیعہ اور سنیوں میں جو اختلاف ہے اس سے بھی مرزا کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ اسے وقت کی بربادی سمجھتے تھے ؎

بحث و جدل بجای ماں میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

ان اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی فکر مذہب اسلام کے بارے میں کتنی صائب تھی۔ شیخ محمد اکرام نے بھی اس قسم کے اشعار کے متعلق یہ دلائے ظاہر کی ہے کہ یہ ــــــ "رسمی قافیہ پیمائی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں ــــ" (غالب نامہ ص ۳۱۷) مگر اس قسم کے اشعار غالب کے کلام میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور زیادہ تر شعر اس انداز فکر کے خلاف ہی ان کے یہاں ملتے ہیں چنانچہ خود شیخ محمد اکرام نے اس بات کی شکایت کی ہے کہ غالب کے یہاں ــــــ "مختلف النوع خیالات کا ہجوم ہوتا ہے ــــــ" آپ کوئی بھی نظریہ قائم کریں ــــ" اس کی تردید کے لیے غالب کے کلام سے بیسیوں اشعار مل جائیں گے ــــ" (غالب نامہ ص ۳۰۲) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب کے متعلق یہ مان لیا جائے کہ ان کی شخصیت مذہبی عقائد میں بھی اجتماع ضدین واقع ہوئی تھی؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ صائب ہوگا کہ اس سلسلے میں غالب کی مذہبی فکر کا مسلسل ارتقا ہوا ہے اور محققین کو چاہیئے کہ اس موضوع پر تحقیق کریں تاکہ تاریخی اعتبار سے ان کے آخری افکار و خیالات کا تعین کیا جا سکے۔

فرمائشی مذہبی شاعری

مرزا کے یہاں ایک خصوصیت اور بھی ملتی ہے جو شاذ ہی کسی اور شاعر کے یہاں مل سکے اور وہ ہے مختلف عقائد کے لوگوں کی فرمائش پر ان کے مذہبی اعتقادات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے شعر کہنا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر، مولوی فضل حق حیدرآباد کے نواب محی الدولہ اور اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ (عربی مثنوی دعاء الصباح کا فارسی ترجمہ۔ غالب نامہ ص ۲۴۱) کی فرمائشات کی تکمیل کی اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا

لہٰذا ان میں سے بیشتر باتیں خود ان کے مذہبی معتقدات اور خیالات کے منافی ہیں۔ اسے ان کی رواداری کہہ لیجئے یا دنیا داری بہر حال یہ ایک حقیقت ہے مگر حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں کہ ــــ "مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو ان سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے (ص ۸۸) چنانچہ ان سے مجتہد العصر سید محمد صاحب نے فرمائش کی کہ اُردو میں سید الشہداء کا مرثیہ لکھیں ــــ بقول حالی مرزا نے کبھی اس کوچے میں قدم نہ رکھا تھا چنانچہ تین بند سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ وہ مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیئے اور صاف لکھ بھیجا کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لیے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں (ص ۸۹)

مولانا حالی کا یہ بیان آخر کس طرح مانا جائے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام حسین کے لیے فارسی میں غالب نے جو نوحے اور قصائد لکھے ہیں ان کی تاثیر اور اثر انگیزی کے بارے میں خود حالی یادگار غالب میں گواہی دے چکے ہیں کیا غالب کی قوت شعر گوئی سے واقف کوئی شخص یہ باور کر لے گا کہ غالب اُردو میں مرثیہ نگاری سے عاجز تھے۔ غالب کی اہل بیت سے غیر معمولی محبت کو دیکھتے ہوئے البتہ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ امام حسین کے بارے میں فرمائشی شعر گوئی شاید ناپسند کرتے ہوں مگر تین بند کی حد تک فرمائش کی تکمیل ہمارے اس قیاس کو بھی غلط ثابت کر دیتی ہے چنانچہ مولانا حالی کے اس تبصرے کی روشنی میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

مثنوی امتناع نظیر خاتم النبیین کے بارے میں تقریباً سبھی ناقدین متفق ہیں کہ یہ فرمائشی تھی اور مولانا اسماعیل شہید کے نظریات و وہابی خیالات کی تردید میں لکھی گئی تھی مگر شیخ محمد اکرام نے فرقۂ وہابیہ کے رد میں غالب کی ایک اور مثنوی کا بھی ذکر کیا ہے جو غالب نے حیدرآباد کے نواب محی الدولہ کو بھیجی تھی (غالب نامہ ص ۱۶۳) اس کے متعلق بھی تحقیق ضروری ہے کہ کیا یہ مثنوی بھی فرمائشی تھی یا غالب نے اپنی مرضی سے ان نظریات کی تردید کی تھی۔

مثنوی امتناع نظیر غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس مثنوی کے بارے میں حالی، شیخ محمد اکرام اور شیخ اکرام الحق نے جو تبصرے کئے ہیں وہ بجد حیران کُن ہیں مثلاً حالی لکھتے ہیں کہ مولانا فضل حق کے خیالات سے غالب کو اتفاق نہ تھا او رصرف دوستی میں انھوں نے فرمائش کی تکمیل کی چنانچہ غالب کی "راست بیانی نے مولانا فضل حق کی ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور جو بات ٹھیک تھی ان کے قلم سے ٹپک پڑی"۔ شیخ اکرام الحق نے شعر العجم فی الهند میں لکھا ہے کہ ــــ "مولانا فضل حق نے غالب سے وہابی معتقدات کی رد میں مثنوی لکھوائی مگر غالب نے ختم نبوت کے مسئلے کو دونوں فریق کے لطیف امتزاج سے حل کیا"۔ (ص ۲۹۲)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ ــــ "مولانا (فضل حق) کی قابلیت اور قوت تحریر و تقریر میں کلام نہیں لیکن کبھی وہ اس کے زور پر ایسے خیالات و عقائد کو آب و تاب دینے کی کوشش کرتے تھے جو حقیقت میں ضعیف اور بے بنیاد تھے اس کی ایک مثال وہ بحث تھی جو انھوں نے امتناع خاتم النبیین کے متعلق مولانا اسماعیل شہید سے شروع کر دی تھی" ــــ چنانچہ انھوں نے اپنے خیالات کی تائید میں مرزا غالب سے مدد لی اور ان سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی (غالب نامہ ص ۱۴۲) شروع شروع میں تو اس مثنوی میں مرزا نے امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ مولانا فضل حق سے زیادہ مولانا شہید کی ترجمانی کرتے تھے لیکن جب مولانا ناراض ہوئے تو مرزا نے چند اشعار کا اضافہ کر کے مولانا کے نقطۂ نظر کو نظم کر دیا۔

اس سے پہلے شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ ــــ "اس مثنوی کے مطالب کافی اہم ہیں لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم وہ آہنگی ہے جو شاہ اسماعیل اور مرزا کے عام اسلوب خیال میں تھی"۔ (غالب نامہ ص ۵۰)

اول تو یہ مثنوی ایک فرمائشی تحریر تھی۔ دوسرے غالب نے صرف امتناع نظیر کے مسئلے میں ایسی بات کہہ دی تھی جو شاہ اسماعیل کے خیال سے زیادہ ہم آہنگ تھی لیکن اس مثنوی کے آغاز میں انھوں نے بیسیوں ایسے عقائد کی صحت کا اظہار کیا تھا جن کے

وہابیوں کے مخالفین سختی سے قائل تھے اور جن کے متعلق شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ وہ بے بنیاد تھے۔ پھر اس مثنوی کے آخر میں غالب نے یہ کہہ کر کہ مولانا اسماعیل نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ ٹھیک ہے لیکن اس سے بہتر ایک رائے اور بھی ہے اور اس کے بعد مولانا فضل حق کے خیالات کو من وعن نظم کر دیا ــــ ان حقائق کے پیش نظر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان تینوں ناقدین کے ایسے خیالات کو کس طرح مان لیا جائے جن کا ثبوت اس مثنوی سے کسی طرح بھی نہیں دیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام کے دو تبصرے حیرت انگیز ہیں ایک تو اسی مثنوی کا ایک شعر ہے ؎

ابلہاں رازاں کہ دانش نارساست
گفتگو ہا بر سر حرف ندا است

اس شعر سے شیخ صاحب نے یہ استنباط کیا ہے کہ غالب اس قسم کے جزوی اختلافات کو غیر ضروری سمجھتے تھے"۔
تعجب اس بات پر ہے کہ جب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ مثنوی فرمائشی تھی۔ مولانا فضل حق کے بے بنیاد عقائد کی تائید میں لکھی گئی تھی اور غالب نے مجبوراً ان کے نقطہ نظر کو نظم کیا تھا۔ پھر بھی وہ اس مثنوی کے ایک شعر کو غالب کے افکار و عقائد کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ دوسری غلطی شیخ صاحب نے یہ کی ہے کہ غالب کی شعر گوئی کے بارے میں خود غالب کی اپنی رائے کی مثال میں اسی مثنوی کا ایک مصرع ؎

نغز گفتنی نغز تر باید شنفت

پیش کیا ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ ــــ "وہ مرزا نے کبھی اپنی شاعری کی اصلاح و تہذیب ترک نہیں کی۔ ان کی تمام ادبی زندگی ترقی و اصلاح کی مسلسل داستان ہے (غالب نامہ ص ۱۴۷)
یہ مصرع دراصل مولانا اسماعیل کے نظریۂ خاتم النبیین کے بارے میں ہے کہ مولانا تمہاری رائے اچھی ہے مگر اس سے اچھی رائے بھی سننی چاہئے۔ نہ جانے شیخ صاحب نے کیسے سمجھ لیا کہ غالب یہاں اپنی شاعری کے بارے میں رائے دے رہے ہیں کہ یہ اچھی ہے

مگر اس سے بھی اچھی ہو سکتی ہے۔ اس کے اگلے پچھلے شعر پڑھنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے ؎

دینکہ میسگوئی توانا کردگار
چون محمد دیگری آرد بکار

باخداوند دوگیتی آفریں
ممتنع نبود ظہور اینچنیں

نغز گفتنی نغز تر باید شنفت
آنکہ پنداری کہ ہست اندر نہفت

مذہبی معاملات میں ظریفانہ انداز بیان

ایمان بالغیب سے لے کر صوم وصلواۃ، حج وزکواۃ یہاں تک کہ حضرت علی کی ذات اور قرآن مجید بھی غالب کی شوخی وظرافت سے نہیں بچ سکے۔ حالی لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا تو پھر ان سے بغیر کہے رہا نہیں جاتا تھا خواہ اس میں کوئی ان کو کافر سمجھے، رند مشرب کہے یا بد مذہب جانے (یادگار حالی ص ۷۷)

ڈاکٹر سہیل آغا لکھتے ہیں کہ ۔۔۔ "انبیاء اولیاء حتی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تک سے شوخی کرواتے (غالب نامہ جولائی ۸۸ء ص ۱۲۴)

"وہ مذہبی رسوم وشعائر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے (بحوالہ غالب نامہ جولائی ۸۸ ص ۲۸) غالب کے مذہبی معتقدات پر بحث کرتے ہوئے صاحب شعر العجم فی الہند نے ایک بڑی دلچسپ غلطی کی ہے لکھتے ہیں ۔۔۔ "غالب مذہباً مسلمان تھے اور قرآن کے قائل ۔۔۔" (ص ۲۹۰)

حق است مصحف و بود از روے اعتقاد
در عزت کلام الٰہی غلو مرا

ہر صفحہ زاں صحیفۂ مشکیں رقم بچشم
باشد نکو تر از خط روے نکو مرا

اور مندرجہ بالا دونوں فارسی شعر ثبوت میں پیش کر دیئے۔ اور یہ بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس قطعے کے آخری اشعار بھی پڑھ لیتے جس میں قرآن مجید میں دیئے گئے احکام سے انتہائی ظریفانہ مضمون غالب نے باندھا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں جانتا ہوں قرآن میں تمام امر و نہی موجود ہیں مگر میں ان سے زیادہ استفادہ کرنے کے موقف میں نہیں ہوں ان میں سے دو حکم مجھے یاد رہ گئے ہیں اور انھی پر عمل کرتا ہوں ایک لاتقربوا الصلوٰۃ۔ دوسرا کلوا واشربوا؟ ؎

لاتقربوا الصلوٰۃ زنہیم بخاطر است
وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا مرا

ایمان بالغیب سے بھی انھوں نے کئی ظریفانہ اور شوخ مضامین پیدا کئے ہیں تھامس ماڈک کی مدح میں لکھتے ہیں ؎

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب
اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان منست

بس کہ ایمانم بغیب است استوار
از دہان دوست خواہم کام را

افتادگی نماز دل ناتوان ماست
در دسر قیام و قعودش نماندہ است

زاہدوں اور عابدوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے جسم میں کہیں سے بھی ایک خون کا قطرہ نکل آئے تو تمہارا وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن ہماری آنکھوں سے سیل خون بہنے کے باوجود طہارت برقرار رہتی ہے ؎

تو بیک قطرۂ خوں ترک وضو گیری وما
سیل خوں از مژہ رانیم و طہارت نرود

ایک جگہ کہتے ہیں کہ کاش حج و زکواۃ کی طرح روزہ اور نماز کے لیے بھی امیری کی شرط ہوتی۔

رباعی ؎ درعالم بے زری کہ تلخ است حیات
طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش زحق اشارت صوم و صلواۃ
بودی بوجود مال چوں حج و زکوات

قبر میں منکر نکیر کو فارسی سکھاتے ہیں ؎

فرشتہ معنیٔ مَن رَّبُّکَ نمی فہم
بمن بگوی کہ غالب بگو خدائے تو کیست

کہتے ہیں دنیا میں رنج و آلام کی کثرت سے میری جان ہمیشہ ہونٹوں پر رہتی تھی چنانچہ قیامت کے دن میرا جسم ہی نہیں پہچان سکی ؎

زبسکہ جا بغمش ماندہ برلبم ہمہ عمر
بوقت بعث ندانست راہ پیکر من

تصوف اور منصور پر ظریفانہ مضمون باندھنے کی دھن میں حضرت علی سے بھی وہ صرف نظر نہیں کر سکے ؎

منصور فرقۂ علی اللّٰہیم منم
آوازۂ انا اسد اللہ میزنم

کہتے ہیں — میں علی کو خدا سمجھنے والے نصیریوں کے فرقے کا منصور ہوں اس

لیے انا الحق کے بجائے میرا دعوا ہے کہ "میں علی ہوں" وحدت الوجود کو سپر بناتے
ہوئے انھوں نے ایک قصیدے میں بھی اسی طرح شوخی کی ہے کہ ——
کیا کروں خدا میری بگڑی نہیں بناتا لہٰذا میں اس کے مظہر سے کام نکالتا ہوں۔

بر منبری کہ زینہ ز پاس نفس بود
ہُوئی چو سالکان قلندر بر آورم
ناچار چوں خدایے بدا دم نمی رسد
من نیز کام خویش ز مظہر بر آورم

یہ مضمون اگر وہ سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے تو معیوب ہوتا مگر وحدت الوجود
اور تصوف کی چادر ڈال کر انھوں نے اس نازک مضمون میں بھی ظرافت پیدا کر
دی ہے۔

ایک انتہائی عاشقانہ مسلسل غزل میں جس میں وہ اپنے محبوب کے ساتھ رات گزارنے
کا مضمون باندھتے ہیں وہاں کہیں صبح نہ ہو جائے اس لیے سورج کو روکنے کے لیے حضرت علی
کے معجزۂ ردِّ شمس کے واقعے سے مضمون پیدا کرتے ہیں کہ میں اور میری معشوقہ دونوں
حیدری ہیں لہٰذا یہ ہمارے لیے ناممکن نہیں ہے

زحیدریم من وتو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

مشربِ صلحِ کُل اور رواداری

حالی نے لکھا ہے کہ مرزا کا اصل مذہب
صلحِ کل تھا۔ بجنوری لکھتے ہیں —"جہاں
عوام وخواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہے مرزا کے مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مرزا غالب بھی کسی ارضی مذہب کے پابند نہیں بلکہ ان کو ہر مذہب کا اس قد
پاس ہے کہ انھوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام کی ظاہری رسومات کو جو باعث

امتیاز میں ترک کر دیا ہے ___ ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم ___"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب میں یہ وسیع النظری اور رواداری تصوف اور مختلف مذاہب کے مطالعے کے علاوہ ہندوؤں، عیسائیوں اور مختلف العقیدہ مسلمانوں سے قریبی و دوستانہ تعلقات کی بنا پر پیدا ہوئی شیخ محمد اکرام نے اس کے علاوہ بھی ایک وجہ بتائی ہے ___ لکھتے ہیں ___ "ہندو مذہب کے عقائد کے متعلق مرزا کی جو غیر معمولی واقفیت ظاہر ہوتی ہے وہ شاید آج بھی بہت کم مسلمانوں کو ہوگی۔ دبستان مذاہب اکثران کے زیر مطالعہ رہتی تھی اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے ان کی ذاتی واقفیت تھی ممکن ہے کہ مذاہب عالم سے مرزا کی یہ دلچسپی ہرمزد کی تعلیم کا اثر ہو ___ (غالب نامہ ص ۳۱۷)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو مصیبت آئی اس کے متعلق غالب کے دل میں جو ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے تو یہ ایک انسانی جذبہ تھا۔ اس کا تعلق مخصوصاً دین اسلام یا مسلمانوں سے ہو، ایسی کوئی بات نہ تھی کیونکہ غالب ایک انتہائی دردمند اور حساس دل کے مالک تھے ایک اردو خط میں لکھتے ہیں۔

"___ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے ___"

کیا ایسے دردمند دل کا مالک کسی قسم کی عصبیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟ یہ ممکن ہی نہیں جس طرح انھوں نے مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کیا ہے اسی طرح انھیں انگریزوں اور ان کے اہل و عیال کے بے گناہ مارے جانے کا بھی شدید افسوس تھا چنانچہ ایک اردو خط میں غدر کے کئی سال بعد بھی اس ظلم وستم پر وہ اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام نے یہ سوچ کر کہ اس سلسلے میں کہیں حالی کے اس بیان سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ ___ "مرزا کو مسلمانوں کی ذلت پر سخت رنج ہوتا تھا" یہ تمام دلائل پیش کئے ہیں۔ لیکن حالی کے بیان کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ انھوں نے

خود مرزا کے ہی قول کو دہرایا ہے۔ اس کے علاوہ یادگار غالب میں مرزا کی رواداری کے بارے میں حالی نے بھی واقعات لکھے ہیں لہٰذا اس غلط فہمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ حالی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا کی خبر گیری اور ان کی غم خواری میں ان کے ہندو دوستوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ یہ واقعہ اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ مرزا نے صرف شعر گوئی ہی میں نہیں بلکہ عملاً بھی مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیا ہے۔ حالی نے مرزا کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے اس میں غالب نے نواب علاؤالدین کی تسلی کے لیے کئی مقدس مذہبی کتابوں کی قسمیں کھائی ہیں اور مرزا کبھی جھوٹی قسم نہ کھاتے تھے ——— "قرآن کی قسم۔ انجیل کی قسم۔ توریت کی قسم۔ زبور قسم۔ ہنود کے چار بیدوں کی قسم۔ دساتیر کی قسم۔ ژند کی قسم۔ پاژند کی قسم۔ نہ میرے پاس وہ قصیدہ ہے نہ مجھے وہ رباعیاں یاد ———" (یادگار غالب ص ۸۶)

شیخ محمد اکرام نے عیسائیوں سے ان کے بہترین تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے جو سلوک روا رکھا تھا وہ کسی طرح بھی قرآنی تعلیمات سے میل نہ کھاتا تھا جس میں نہ صرف رواداری کی تلقین کی گئی ہے بلکہ عیسائیوں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں سراہا گیا ہے۔ غالب نے جب اپنے ہم وطنوں کو تعصب کا شکار دیکھا تو یوں مذمت کی ؎

غالب کساں زجہل حکیمش گرفتہ اند

بے دانشی کہ طعنہ بر اہل کتاب زد (غالب نامہ ص ۳۹۴)

مرزا غالب میں رواداری کا یہ جذبہ غیر معمولی طور پر پایا جاتا تھا وہ ہر مذہب کا پاس و لحاظ ہی نہیں بلکہ احترام بھی کرتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

اگرچہ بدر وشم پاس ہر روش دارم

چراغ دیر و حرم نور چشم صرصر من

نعیم جسمانی سے انکار

غالب کے اکثر ناقدین نے لکھا ہے کہ وہ جزا، سزا اور نعیم جسمانی کے قائل نہ تھے یہ قیاس صحیح نہیں ہے اس

سلسلے میں جن اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے ان میں سے بیشتر شوخی اور ظرافت لیے ہوئے ہیں۔ حالی نے تحریر کیا ہے کہ ــــ "اگرچہ شاعر کے کلام سے اس کے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہ جس طرح اکثر حکمائے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے (یادگار غالب ص ۱۷)

بالکل یہی بات شیخ محمد اکرام نے بھی دہرائی ہے کہ ــــ "مرزا کے کئی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روز جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے۔ مثنوی ہو یا غزل، عقیدہ ہو یا رباعی جہاں کہیں انھوں نے بہشت کا ذکر کیا ہمیشہ شوخی اور تمسخر سے ہی کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دور عباسیہ کے کئی مسلمان حکما یا سر سید احمد خان نعیم جسمانی کے منکر تھے اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں عام مسلمانوں سے مختلف تھی (غالب نامہ ص ۳۲۲)

یہ تجزیہ حالی نے کیا اور اس کے بعد جتنے لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا انھوں نے پوری تحقیق کئے بغیر اسے دہرا دیا ہے۔

غالب کے کلام میں بہشت پر بہت سے شعر ملتے ہیں اور ان سب میں وہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں جس کی طرف شیخ محمد اکرام اشارہ کر چکے ہیں کہ ان کی تردید بھی اسی قسم کے دوسرے اشعار سے ہو جاتی ہے پھر یک طرفہ فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ بادشاہوں کے قصائد میں کہی گئی باتوں پر تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں حقیقت سے زیادہ مبالغہ ہوگا لیکن جو قصائد حمد و نعت و منقبت میں لکھے گئے ہیں ان میں غلط بیانی نہیں کی جا سکتی اِلّا یہ کہ ثابت کیا جائے کہ یہ قصائد بھی غالب نے صرف خانہ پری اور اپنے آپ کو صرف مسلمان ظاہر کرنے کے لیے لکھے تھے۔ اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ناقدین غالب کا قیاس کہ وہ نعیم جسمانی کے قائل نہ تھے نہ صرف یہ کہ یک طرفہ ہے بلکہ بے بنیاد بھی ہے۔

ایک حمدیہ قصیدے میں غالب نے لکھا ہے کہ ــــ میں اپنی حد جانتا ہوں اس

لیے بے حد ڈرتے ڈرتے بہشت جاوداں کی تمنا ظاہر کر رہا ہوں حالانکہ میرے اعمال ایسے نہیں پھر بھی میرے جیسا بے نوا عندلیب شاخ طوبیٰ پر آشیاں بنانے کے خیال سے مست ہے۔ اس کی تمنا اور امید کا یہ عالم ہے کہ بیوقوف یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ رضواں اس کے خیر مقدم کے لیے باغ جنت میں کسی جشن کا اہتمام کر رہا ہوگا مگر افسوس میرا عمل ایسا نہیں ہے جو مجھے ایسا شاندار انعام مل سکے لہٰذا اب صرف یہ توقع باقی رہ گئی ہے کہ تو اپنی داد و دہش اور انعام عطا کو بروئے کار لاکر اسے جنت عطا کر دے۔

دیوان غزلیات میں سب سے پہلی غزل جو حمد میں ہے اور بہت مشہور ہے اس میں تو غالب نے صاف صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ سے جنت مانگی ہے اور اس لیے مانگی ہے کہ غالب کی حمد سب سے جداگانہ اور بہترین ہے چنانچہ ایسے ہی عندلیب کو باغ جنت ملنا چاہیئے ؎

خلد بہ غالب سپار زانکہ بداں روضہ در
نیک بود عندلیب خاصہ نو آئیں نوا

ایک نعتیہ غزل میں بیحد عجز و انکسار اور رقت کے ساتھ حضور سے شفاعت کی درخواست کی ہے کہ وہ اپنے اُمتیوں کو دوزخ کی آگ سے بچا کر جنت میں پہنچا دیں ؎

بر اُمت تو دوزخ جاوید حرام است
حاشا کہ شفاعت نہ کنی سوختگاں را

عام غزلیات میں جہاں جنت کا مضمون آیا ہے وہاں شوخی بھی ہے ظرافت بھی ہے اور تمسخر بھی ہے مگر صاف صاف لفظوں میں نعیم جسمانی کا انکار کہیں بھی نہیں ہے ایک جگہ کہتے ہیں کہ پیر خانقاہ کے ساتھ بھی جنت میں گزارا ہو سکتا ہے بشرطیکہ شیخ کو شہد اور مجھے شراب دی جائے ؎

بہ پیر خانقہ در روضہ یکجا خوش تواں بودن
بشرط آں کہ ازما بادہ وز شیخ انگبیں باشد

ایک جگہ کہتے ہیں پروردگار زاہدوں کو مفت میں جنت نہ دے انھوں نے نہ حسینوں کے ستم اٹھائے ہیں نہ اپنے ارمانوں کا خون کیا ہے ؎

ایک جگہ اس بات پر بہت خوش ہیں کہ جنت میں شراب کی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے ؎

در خلد زشادی چہ رود برسرم آیا
چوں کم نشود بادہ زبسیار کشیدن

ایک جگہ رباعی میں اللہ تعالیٰ سے جنت طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدم کی یہ میراث آدم کے بیٹوں کو ہی ملنی چاہئے ؎

یارب بجہانیاں دل خرم دہ
در دعوئے جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت باغش از تست
آں مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

حالی نے نعیم جسمانی سے انکار کے لیے جو مثالیں پیش کی ہیں اس میں وہی ایک اردو کا شعر جو اس سلسلے میں بہت دہرایا جاتا ہے اور ایک فارسی رباعی پیش کی ہے۔

گردیدن زاہداں بہ جنت گستاخ
دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ
ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

اردو کے اس واحد شعر ؎ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ــــــ سے اگرچہ کہ یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ جنت مرزا کے نزدیک خواب و خیال تھی تو اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ غالب اپنے اعمال سے بخوبی واقف تھے اور انھیں یہ توقع کم ہی تھی کہ وہ سیدھے

جنت بھیج دیے جائیں گے چنانچہ اوپر جو نعتیہ فارسی شعر پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے جس میں غالب نے حضور سے دوزخی امتیوں کی سفارش کی درخواست کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کے امتی ہمیشہ جہنم میں رہیں یہ آپ کی شفاعت اور جذبۂ رحمت اللعالمینی سے بہت بعید ہے۔ ایک اردو خط میں بھی انھوں نے صاف صاف اپنے عقائد کے بارے میں لکھا ہے کہ ــــــ " اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی اور امامت مرتضوی اس میں جلیں (یادگار حالی ص ۱۷۴)

اب رہی فارسی رباعی تو اس میں زاہدوں کا ذکر اصل ہے اور جنت کا ذکر ضمنی ہے کہ دنیا میں زاہد جس طرح جنت کے بیان پر رال ٹپکاتے ہیں اگر یہ جنت میں پہنچ گئے تو وہی سین نظر آئے گا جو بھوکے مویشیوں کو بہت بڑی چراگاہ میں چھوڑنے پر دکھائی دیتا ہے۔

نقد قاطع برہان

معہ ضمائم

پروفیسر نذیر احمد

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

انیسویں صدی میں

سائنس اور سائنسی طرزِ فکر کا اظہار

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری سال میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ مقاصد جو بھی رہے ہوں، اِس کالج کی طرف سے جو کتابیں تیار ہو کر شائع ہوئیں، بیشتر داستانیں تھیں، یا شاعروں کے کلام کے مجموعے اور اُن کے تذکرے۔ کالج کی تصانیف کے زیرِ اثر یا اُن سے تحریک پا کر دوسرے علمی مراکز میں جو کتابیں وجود میں آئیں' ان میں بھی بڑی تعداد شاعری اور قصّے کہانیوں پر مشتمل تھی۔ دہلی کالج کے ایک استاد شیخ امام بخش صہبائی نے جو "معمای" بھی کہے جاتے تھے' جب حدایق البلاغت کا ترجمہ کیا تو معمّہ سے متعلق فصل کے بارے میں لکھا:

> "بوتروس صاحب پرنسپل بہادر دام اقبالہ' کا ارشاد اِس طرح پر ہوا کہ اِس فن کو ترک کرنا چاہیے۔ . . المامور معذور"

اور نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فن جو بقول صہبائی "الطف فنون کا" تھا بالآخر مر گیا۔ تاریخ گوئی اور قصیدہ نگاری کے بارے میں بھی اکثر منفی خیالوں کا اظہار کیا گیا تھا اور رفتہ رفتہ اِن اصناف کا بھی آج نہ ہونے کے برابر رواج رہ گیا ہے۔ تعصبات سے بالاتر ہو کر خیال کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ہمارا ادب سکڑ سمٹ کر کہانیوں اور عشق و عاشقی کے منظوم چرچوں تک محدود ہو چلا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ علم کی طرف سے بعد کی جو صورت

پیدا ہوئی ہے، اس کا اندازہ مروّجہ نصابوں سے غالباً بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔

زبانِ اردو کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، اُن سے یہ بات ہر گز پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ زبان علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہی وجود میں آئی تھی۔ اِس زبان کی پہلی دستیاب تصنیف مولانا داؤد کی "چنداین" ہے اور اُس کتاب میں اس زمانے تک کے علمی، تہذیبی، معاشرتی معاملوں کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ اُس کے بعد سنسکرت، تمل، فارسی، عربی وغیرہ زبانوں کے علمی سرمایے سے یہ زبان براہِ راست اور بالواسطہ طور پر کسبِ فیض کرتی رہی ہے۔ پھر جب ہمارے ملک میں یوروپی اقوام کی آمد کا سلسلہ جاری ہوا تو ان کی بول چال اور معلومات سے بھی اِس نے کماحقہٗ استفادہ کیا۔ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ انگریزوں کو، جو غیر تھے اور جو اپنے مخصوص مقاصد اور عزائم میں پوری طرح مخلص تھے، جب فورٹ ولیم کالج کے لیے صاحب علم اساتذہ کی تلاش ہوئی تو اکثریت اُسی اقلیتی طبقے میں سے نکلی جسے "جہالت اور ضلالت میں مبتلا" کہا گیا تھا۔ اِسی طرح دلّی کالج کے لیے جب اساتذہ کا تقرر ہوا تو وہاں بھی نمایندگی اِسی جماعت نے کی اور اِس میں کچھ شبہ نہیں کہ از روئے انصاف اگر دیکھا جائے تو ہماری زبان کا پلڑہ دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ بھاری ہے۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ اِس زبان میں مہرشی شیو برت لال ورمن جیسے اہلِ قلم بھی ہوئے ہیں جن کی تصنیف کے بارے میں عقیدت مندوں کا دعویٰ ہے کہ ایسی کتاب سنسکرت زبان میں بھی نہیں نکلے گی۔

انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے تک ملک میں جن علوم و فنون سے دل چسپی لی جا رہی تھی، اُن میں مذہب، فلسفہ، تواریخ و جغرافیہ، طب و کیمیا اور نجوم و رمل وغیرہ نمایاں تھے۔ اٹھارھویں صدی میں پریس کا نظام عام نہیں ہو سکا تھا۔ اس زمانے کی بیشتر کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ پھر بعد کے زمانے میں اُن کی طرف سے بے توجہی بھی برتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر ضائع ہو گئیں۔ دستبردِ زمانہ سے جو محفوظ رہ گئی ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں :

۲۔ مجرباتِ اکبری۔ مصنفۂ شاہ ارزانی، مترجمۂ شہباز خاں۔ ۱۲۰۶ھ/۹۲-۱۷۹۱ء
موضوع طب و معالجہ۔

۳۔ ذخیرۂ اسکندر خانی۔ مصنفۂ محمد باقر منجم ثانی۔ مترجمۂ محمد غضنفر علی فرزند محمد نجف علی خاں۔ ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء۔ موضوع علم کیمیا۔

۴۔ مظہر العجایب۔ مصنفۂ حکیم سید فخر الدین احمد۔ ۱۲۱۲ھ/ ۹۸-۱۷۹۷ء — موضوع تشریح الاعضا، امراض و علاج۔

جناب نصیر الدین ہاشمی نے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء سے پہلے کی درجِ ذیل کتابوں کے مخطوطات کا تعارف کرایا ہے:

ترجمۂ طبِ شہابی ، مجرب التحقیقات ، مجرباتِ طب

اس میں شبہ نہیں کہ یورپی سائنسی علوم اور اُن کے فواید شمالی ہندوستان میں، خصوصاً لکھنؤ اور دہلی تک کافی بعد میں پہنچے تھے۔ میر علی اوسط رشکؔ نواب معتمد الدولہ کے ساتھ ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء میں کانپور پہنچے، جو بقول اُن کے "ملکِ نصارا" تھا۔ اس جگہ بجلی اور پانی کا نظام بھی قائم تھا اور یہ وہ چیزیں تھیں جن سے اس وقت تک لکھنؤ اور دلی والے ناآشنا تھے۔ اِن "عجائبات" کا تعارف میر صاحب نے اِن لفظوں میں کرایا ہے:

"بجلی۔ حکما چیزے از سیماب ساختہ اند و آنچناں است کہ چند ظروفِ شیشہ بود و یک زنجیرِ طولانی دارد۔ کسانیکہ زنجیر را در دست گیرند بہ سبب گردشِ آں آلات آنچناں صدمہ بانگشتاں رسد کہ بیفتند"

"پانی بنانا۔ صاف کردنِ آب از حکمت عملی بنوعے کہ کرم ہا در آب نماند و آں آب ہاضم بود و در کوٹھی انگریز کنار گنگ در کانپور ساختہ می شود و بہ قیمتِ گراں می آید"

اسی طور پر انھوں نے انگریزوں کی مصنوعات، روزمرّہ استعمال کی، کھانے پینے متعدد چیزوں کا ذکر کرکے اُن سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ ظاہرا علاقہ بنگا

میں اِن سب کا چلن کچھ پہلے ہو گیا ہو گا لیکن لکھنؤ والوں کے لیے یہ سب انوکھی اور اہلِ دہلی کے واسطے نامعلوم اشیا تھیں۔ جنوبی ہندوستان میں جہاں یوروپی اقدام نے بہت پہلے اقامت اختیار کر لی تھی، ان سب چیزوں کا صحیح اور بہتر علم عام ہو چکا ہو گا۔ وہاں کے اہلِ قلم نے اِن سے متعلق لکھنے کا سلسلہ بھی جلد تر شروع کر دیا ہو گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ شروع زمانے میں جن لوگوں نے یورپ کے سائنسی علوم سے واقفیت حاصل کی تھی، اپنی اُس واقفیت کو انھوں نے تدریسی مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ انھوں نے اِن موضوعات سے متعلق سوال و جواب کی صورت میں رسالے تصنیف کیے۔ اُنیسویں صدی کے پہلے عشرے کے ایسے ایک رسالے کے تعارف میں لکھا ہے:

"۵ رسالہ علم ہیئت۔ تاریخِ تصنیف قریب ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء، کتابت ۱۲۲۹ء/۱۲۲۹ھ۔ ناقص الاول۔ مصنف یا مترجم نامعلوم۔ بطور سوال و جواب، علم ہیئت کے بعض مسائل کا بیان ہے۔ چوبیس ابواب میں آفتاب، چاند، جملہ سیارگانِ فلک، اُن کی رفتار کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔
آغاز۔ اور یہ لفظ انگریزی ہے۔ اِس کو اہلِ عرب قربِ شمس کہتے ہیں۔ سوال: سیّارے کا ایمرشن کیا ہے؟ جواب: یہ لفظ انگریزی ہے۔۔۔"

اس کتاب میں سیّاروں وغیرہ سے متعلق جو معلومات درج کی گئی ہیں، وہ یوروپی علم کے مطابق ہیں ان کو ہندوستانیوں کو سمجھانے کے لیے مشرقی علم کے مطابق ڈھال کر اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دعوا غالباً صحیح نہیں ہو گا کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب لکھی گئی۔

کم و بیش ایسی زمانے میں حیدر آباد میں ایک رئیس شمس الاُمرا[۹] نواب محمد فخرالدین خاں تیغ جنگ ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان میں یوروپی سائنسوں کو رواج دینے کی

نہایت پُرخلوص اور نتیجہ کے طور پر کامیاب کوشش کی۔) نصیرالدین ہاشمی نے اُن کا ذکر اس طرح کیا ہے:

۱۰ "شمس الامرا کے مورثِ اعلا ابوالخیر خاں تیغ جنگ ہیں۔۔۔ ۱۱۶۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دو فرزند تھے۔ بڑے ابوالبرکات خاں امام جنگ اور دوسرے ابوالفتح خاں تیغِ جنگ۔۔۔ (تیغ جنگ نے) شمس الدولہ، شمس الملک، شمسل الامرا کے خطابات سے سربلندی حاصل کی۔ ۱۲۰۵ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ آپ کے فرزند محمد فخرالدین خاں تیغ جنگ شمس الامرا ثانی امیر کبیر ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں برہانپور میں (پیدا ہوئے)۔ ۱۲۷۹ھ/۶۳-۱۸۶۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہِ برہنہ شاہ صاحب، حیدرآباد میں دفن ہوئے۔"

شمس الامرا محمد فخرالدین خاں کی علمی سرپرستیوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

۱۱ "اپنے صرف سے حیدرآباد میں بیسوں مدرسے قائم کیے، جن میں مدرسۂ فخریہ اب تک باقی ہے۔۔۔ مولفین و مصنفین کے نام بد منصب اور تنخواہیں جاری فرمائیں۔ فیضؔ، آفاقؔ، شہرتؔ وغیرہ آپ کی سرکار سے معقول طور پر بہرہ مند تھے۔۔۔ آپ نے ہی سب سے پہلے مغربی زبانوں سے سائنس کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ ۱۲۴۲ھ/ ۲۷-۱۸۲۶ء میں اِس کام کا آغاز ہوا۔ شمس الامرا نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں، اُن کی تعداد تقریباً پچھتر ہے۔۔۔۔ بعض یہ ہیں:

اصولِ علمِ حساب، رسالۂ علم و اعمالِ کرہ، رسالہ منتخب البصر کمسری کا رسالہ، رسالہ خلاصۃ ادویہ، رسالہ علمِ خراط۔ اندازِ بدریہ وغیرہ"

شمس الامرا کے لیے اوّلیت کا دعوا غالباً صحیح نہیں ہے، البتہ اِس بارے میں شبہ نہیں کہ انھوں نے سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت جس طور پر اور جس حد تک کی، اس کی

مثال اُن کے بعد بھی ملنی مشکل ہے۔ اقتباس بالا میں جو سنہ بتایا گیا ہے، اس سے پہلے کی ایک کتاب کا ذکر کیا جا چکا۔ ایک اور کتاب[۱۲] خلاصۃ علم الارض ہے جو ۱۸۲۴ء میں چھپی تھی۔ اِس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اِس میں اصل انگریزی متن بھی موجود ہے۔ یہ ایک نصابی کتاب ہے اور کلکتہ میں طبع ہوئی تھی۔

شمس الامرا کے دارالترجمہ سے جو لوگ وابستہ تھے، اُن میں محمد صدیق قیسؔ کا نام بھی شامل ہے جس کا انتقال ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں ہو چکا تھا۔ اس کے ذکر میں ہاشمی صاحب نے لکھا ہے:

[۱۳] "شمس الامرا نے یومیہ مقرر کر دیا تھا۔ وقایع نگاری کی خدمت سپرد تھی۔"

اِس سے یہ بات متیقن ہو جاتی ہے کہ یہ دارالترجمہ انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں کام کرنے لگا تھا، البتہ اُس زمانے میں یہاں منطق الطیر، گلستاں، گلزار دانش وغیرہ کتابوں کے ترجمے کیے گئے تھے۔

انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر مسند نشین ہو چکے تھے۔ معتمد الدولہ آغا میر اُن کے نایب تھے۔ آغا میر کے انگریزوں کے ساتھ روابط قائم تھے۔ غازی الدین حیدر کے اعلانِ بادشاہت کے بعد آغا میر کے مراتب بھی زیادہ ہوئے۔ اِس زمانے میں لکھنؤ میں علم کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ شیخ کریم الدین صنعتؔ نے علمِ ریاضی سے متعلق ایک رسالہ کو نظم کیا۔ سال نظم اِس مصرع سے برآمد ہوتا ہے ع

کہا، مخزنِ کلیاتِ حسیب

۱۲۳۸ھ ۱۸۲۳ء

اس دل چسپ علمی کتاب[۱۴] کا مخطوطہ کراچی میں موجود ہے۔ اِسی زمانے میں اسلامی قانون سے متعلق ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔ کیفیت اس طرح ہے:

[۱۵] "اصولِ نظایر شرحِ محمدی۔ مصنف میگناٹن ولیم، مترجم: مکندلال مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۲۸ء — یہ تیسری بار ۱۸۴۸ء میں چھپی۔"

غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

ہے "بہت سی انگریزی کتابوں کے فارسی تراجم کیے گئے۔ بعض یہ ہیں:
تاریخ میکسیکو، تاریخ چین، انگریزی قرابادین، سمندری اشاروں
پر ایک کتاب وغیرہ"

معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی موضوعات سے متعلق کتابیں ہندوستانی امرا کو
چوتھے عشرے میں زیادہ دستیاب ہو سکیں۔ شمس الامرا نے "ستۂ شمسیہ" کے دیباچے
میں اس سلسلے میں جو لکھا ہے، اُس کا اختصار اس طرح ہے:

ہے "نیاز مند درگاہِ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامرا،
اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم
فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں، بہ سبب میلانِ طبیعت کے نسبت
اس طرف شوق کی رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں۔۔۔ بعضے علوم فلاسفہ
زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں، چنانچہ علم جرِ ثقیل اور علم انظار
وغیرہ۔۔۔ اب اہلِ فرنگ نے اِن کو دلائل و براہین سے بدرجۂ کمال
اثبات کیا ہے، بلکہ بعض علوم اہلِ فرنگ میں ایسے رواج پاتے ہیں کہ
اُن کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سُنے چنانچہ علمِ آب اور ہوا
اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔۔۔ حسبِ مدعا چند رسالے مختصر
علومِ فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے، لکھے ہوئے ریوی رنٹ
چارلس صاحب کے، انگریزی زبان میں ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن
کے چھاپے گئے تھے، بہم پہنچے۔"

جیسا کہ نام سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے، ستۂ شمسیہ چھ رسالوں کا مجموعہ ہے اور اُن
کی کیفیت اِس طرح ہے کہ:

پہلا رسالہ — جرِ ثقیل اور ہیولا وغیرہ کے بیان میں۔
دوسرا رسالہ — علم ہیئت کے بارے میں، جس میں کواکب وغیرہ کا حال مذکور ہے۔

تیسرا رسالہ — علم آب یعنی مائیات سے متعلق ہے۔ اس میں سیالوں کے اوزان اور دباؤ وغیرہ کی کیفیت لکھی ہے۔

چوتھا رسالہ — علم ہوا کے بیان میں ہے، جس میں گیسوں کا ذکر ہے۔

پانچواں رسالہ — علم انظار سے متعلق ہے۔ اس میں نور، انعکاس نور، قوس قزح وغیرہ کے بارے میں بحثیں ہیں۔

چھٹا رسالہ — علم مقناطیس اور علم برق پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں مکمل ہوئی تھی۔ میر شمس الدین فیض نے تاریخ کہی: تالیف نواب شمس الامرا[۱۲۶۳] ترجمہ کا آغاز یقینی طور سے اس سے پہلے کیا گیا ہوگا۔ اس میں ہر رسالہ اچھی ضخامت کا ہے۔ پوری کتاب کوئی ہزار صفحہ کی ہوگی۔ اس کام میں غلام محی الدین حیدرآبادی موسیٰ تندوسی وغیرہ مترجمین شریک تھے۔

شمس الامرا نے اپنے اس دارالترجمہ کی کتابوں کی طباعت کا انتظام بھی خود ہی کیا تھا۔ انھوں نے ایک سنگی مطبع قائم کیا تھا۔ اسی مطبع میں سنتہ شمسیہ[۱] پہلی بار ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں، پھر دوسری بار ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء میں چھپی تھی۔ یہ کتاب تیسری بار مدراس میں ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں اور چوتھی مرتبہ دہلی میں ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں طبع ہوئی تھی۔ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ بعض لوگوں نے اپنے ہاتھ سے بھی اس کی نقلیں تیار کی تھیں چنانچہ اس کے نسخے کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو کراچی میں بھی محفوظ ہیں۔ انجمن کے مخطوطے کے بعض رسالوں پر اسی مصنف یعنی "ریونٹ چارلس" (کذا) کی ایک اور انگریزی کتاب کے ترجمہ موسوم بہ "علمی گفتگو" کا اشتہار درج ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ کتاب کب مکمل ہوئی تھی اور وہ چھپ سکی تھی یا نہیں۔

اسی زمانے میں شمس الامرا کی سرپرستی میں مزید جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہو کر مکمل ہوئیں، اُن میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ رسالہ حساب۔ کتب خانۂ آصفیہ کا مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ زمانۂ تالیف ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء کے بعد کا خیال کیا گیا ہے۔

۲۲ رسالہ ریاضی۔ سوال و جواب کی صورت میں۔ اُسی زمانے کا ہوگا۔

۲۳ کسورِ اعشاریہ۔ یہ "اوپر چار گفتگو کے" مشتمل ہے۔ ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۷ء میں مکمل ہوکر شمس الامرا کے سنگی مطبع میں ۱۸۳۹ء میں چھپا۔

۲۴ منتخب البصر۔ سوال و جواب کی صورت میں، یہ رسالہ علمِ دور نما یعنی انظار سے متعلق ہے۔ ۱۸۳۷ء میں مکمل ہوکر وہیں چھپا۔

۲۵ لوگارثم (رفیع الحساب) انگریزی سے شمس الامرا محمد رفیع الدین خاں نے ترجمہ کیا۔ ۱۸۳۶ء میں سنگی پریس میں طبع ہوا۔

۲۶ کتاب ہندسہ۔ ہٹر ٹاڈ کی کتاب کا ترجمہ ہے جو رائے منولال نے کیا۔ مطبعِ سنگی سے ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں چھپا۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں علم ہیئت سے دل چسپی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ وہاں اس موضوع سے متعلق کم سے کم چار رسالوں کے ترجمے کیے گئے ہیں

۲۷ علم ہیئت۔ مصنف نامعلوم۔ مترجم لفٹیننٹ ملیس۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۳۲ء

۲۸ اسٹرونامی یا رسالہ علم ہیئت۔ مصنف پنگ صاحب۔ مترجم بیل صاحب۔ بطور سوال و جواب۔ مخطوطہ نوشتۂ ۲۶۔ صفر ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء۔

۲۹ رسالہ ہیئت۔ مصنف ڈاکٹر ولسن۔ مترجمینِ شاہانِ اودھ۔ مطبوعۂ لکھنؤ، مطبع سلطانی۔

۳۰ رسالہ ہیئت۔ مصنف ڈاکٹر برنگلی۔ ″ ″ ″

کلکتہ میں علم ہیئت کے ساتھ مغربی طب کی طرف بھی توجہ معلوم ہوتی ہے۔ وہاں اِس عشرے میں جو کتابیں چھپیں، اُن میں سے دو یہ ہیں:

۳۱ رسالہ مفتاح الافلاک۔ مصنف جیمس فرگوسن۔ مترجم عبدالسلام۔ پائلیٹ مشین پریس، کلکتہ، ۱۸۳۳ء

۳۲ نظام آسمانی۔ مصنف، مترجم نامعلوم۔ کلکتہ ۱۸۳۶ء۔ یہ سیاروں سے متعلق ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پہلی کتاب کے مترجم عبدالسلام کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔

تیسرا رسالہ — علم آب یعنی مائیات سے متعلق ہے۔ اس میں سیالوں کے اوزان اور دباؤ وغیرہ کی کیفیت لکھی ہے۔

چوتھا رسالہ — علم ہوا کے بیان میں ہے، جس میں گیسوں کا ذکر ہے۔

پانچواں رسالہ — علم انظار سے متعلق ہے۔ اس میں نور، انعکاس نور، قوس قزح وغیرہ کے بارے میں بحثیں ہیں۔

چھٹا رسالہ — علم مقناطیس اور علم برق پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں مکمل ہوئی تھی۔ میر شمس الدین فیض نے تاریخ کہی: تالیف نواب شمس الامرا[۱۲۶۴] ترجمہ کا آغاز یقینی طور سے اس سے پہلے کیا گیا ہوگا۔ اس میں ہر رسالہ اچھی ضخامت کا ہے۔ پوری کتاب کوئی ہزار صفحہ کی ہوگی۔ اس کام میں غلام محی الدین حیدرآبادی موسیٰ تندوسی وغیرہ مترجمین شریک تھے۔

شمس الامرا نے اپنے اس دار الترجمہ کی کتابوں کی طباعت کا انتظام بھی خود ہی کیا تھا۔ انھوں نے ایک سنگی مطبع قائم کیا تھا۔ اسی مطبع میں سنۂ شمسیہ[۱] پہلی بار ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں، پھر دوسری بار ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۰ء میں چھپی تھی۔ یہ کتاب تیسری بار مدراس میں ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں اور چوتھی مرتبہ دہلی میں ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں طبع ہوئی تھی۔ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ بعض لوگوں نے اپنے ہاتھ سے بھی اس کی نقلیں تیار کی تھیں۔ چنانچہ اس کے نسخے کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو کراچی میں بھی محفوظ ہیں۔ انجمن کے مخطوطے کے بعض رسالوں پر اسی مصنف یعنی "ریونٹ چارلس" (کذا) کی ایک اور انگریزی کتاب کے ترجمہ موسوم بہ[۲] "علمی گفتگو" کا اشتہار درج ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ کتاب کب مکمل ہوئی تھی اور وہ چھپ سکی تھی یا نہیں۔

اسی زمانے میں شمس الامرا کی سرپرستی میں مزید جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوکر مکمل ہوئیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

[۱] رسالہ حساب۔ کتب خانۂ آصفیہ کا مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ زمانۂ تالیف ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء کے بعد کا خیال کیا گیا ہے۔

۷۲ رسالہ ریاضی۔ سوال و جواب کی صورت میں۔ اُسی زمانے کا ہوگا۔

۷۳ کسورِ اعشاریہ۔ یہ "اوپر چار گفتگو کے" مشتمل ہے۔ ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۷ء میں مکمل ہوکر شمس الامرا کے سنگی مطبع میں ۱۸۳۹ء میں چھپا۔

۷۴ منتخب البصر۔ سوال و جواب کی صورت میں، یہ رسالہ علمِ دور نما یعنی انظار سے متعلق ہے۔ ۱۸۳۷ء میں مکمل ہوکر وہیں چھپا۔

۷۵ لوگارثم (رفیع الحساب) انگریزی سے شمس الامرا محمد رفیع الدین خاں نے ترجمہ کیا۔ ۱۸۳۶ء میں سنگی پریس میں طبع ہوا۔

۷۶ کتاب ہندسہ۔ ہنٹر ٹاڈ کی کتاب کا ترجمہ ہے جو رائے منولال نے کیا۔ مطبعِ سنگی سے ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں چھپا۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں علم ہیئت سے دلچسپی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ وہاں اس موضوع سے متعلق کم سے کم چار رسالوں کے ترجمے کیے گئے ہیں

۷۷ علم ہیئت۔ مصنف نامعلوم۔ مترجم لفٹیننٹ ملیس۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۳۲ء

۷۸ اسٹرونامی یا رسالہ علم ہیئت۔ مصنف پنگ صاحب۔ مترجم ببل صاحب۔ بطور سوال و جواب۔ مخطوطہ نوشتہ ۲۶۔ صفر ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء۔

۷۹ رسالہ ہیئت۔ مصنف ڈاکٹر ولسن۔ منز جمینِ شاہانِ اودھ۔ مطبوعہ لکھنؤ، مطبع سلطانی۔

۸۰ رسالہ ہیئت۔ مصنف ڈاکٹر برنگی۔ " " "

کلکتہ میں علم ہیئت کے ساتھ مغربی طب کی طرف بھی توجہ معلوم ہوتی ہے۔ وہاں اس عشرے میں جو کتابیں چھپیں، اُن میں سے دو یہ ہیں:

۸۱ رسالہ مفتاح الافلاک۔ مصنف جیمس فرگوسن۔ مترجم عبدالسلام۔ پائلیٹ مشین پریس، کلکتہ، ۱۸۳۳ء

۸۲ نظام آسمانی۔ مصنف، مترجم نامعلوم۔ کلکتہ ۱۸۳۶ء۔ یہ سیاروں سے متعلق ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پہلی کتاب کے مترجم عبدالسلام کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد کے شمس الامرا کو جب کلکتہ کی کتابوں کا پتا چلا تو انھوں نے اپنے اشاعتی پروگرام میں ان میں سے بھی بعض کو شامل کرلیا - وہ یہ ہیں:

۲۳ رسالہ مفتاح الافلاک، شمس الامرا کے مطبعِ سنگی میں ۱۸۴۴ء میں چھپا۔

۲۴ رسالہ نافع الامراض۔ مصنف ڈاکٹر فاربر رامزے۔ مترجمین شمس الامرا۔ مطبوعہ ۱۸۴۶ء — ادویہ کے خواص وغیرہ۔ بنگالی سے ترجمہ۔ ۲۱۰ صفحے۔

شمال اور جنوب کے مابین اِس طرح پر کتابوں کے تبادلے نے علم کی ترویج واشاعت کی رفتار کو تیز کردیا۔ انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں کتابوں کی تعداد ہی میں اضافہ نہیں ہُوا، نئے نئے موضوعات اور علم کے شعبے ہی سامنے نہیں آئے بلکہ ان کے لیے نئے اشاعتی مراکز بھی وجود میں آئے اور یہ صورت خوش آئند تھی۔ یہ کہنا کہ اِس زمانے تک جتنی کتابیں چھپیں، سب ترجمہ ہیں اور اُن میں ایسی ایک بھی نہیں ہے جسے تصنیف کہا جا سکے، بیجا بات ہے۔ شروع میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس زمانے تک عام یوروپی مصنوعات، بلکہ انگریزوں کے روزمرّہ استعمال کی چیزوں سے بھی عام طور سے ہندوستانی واقف نہیں تھے۔) اِس کا اندازہ میر علی اوسط رشکؔ کے درجِ ذیل بیانوں سے بھی کیا جا سکتا ہے:

۲۵ الماری۔ صندوقی باشد اِستادہ، میانِ آں تختہ ہا مانندِ خانہ در عرض نصب کنند و براں کتابہا و شیشہ ہا و مانندِ آں دارند و در دیوار ہم تختہ ہا در عرض نصب کنند و دو پارہ در بر روے آں نصب کردہ اسباب دراں بند سازند۔"

۲۶ بوتل۔ چیزی سازند مانندِ شیشہ کہ گندہ تر از شیشہ بود و دراں شراب و شربتہا و عرق ہا دار۔"

(ان حالات کے باوجود اہلِ ہند نے نہ صرف انگریزی وغیرہ زبانوں کی کتابوں سمجھ لیا بلکہ ان کے مطالب کو کامیابی کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل بھی کردیا، یہ اُن کا قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔) پانچویں عشرے میں شمس الامرا کے مترجمین نے ڈاکٹر ولیم میکنزی

کی جن کتابوں کا ترجمہ کیا، اُن میں سے تین یہ ہیں:

۳۷ خلاصۃ الادویہ۔ ۴۰۹ صفحے

۳۸ کفایت العلاج۔ اصولِ تشریح و علاجِ امراض سے متعلق۔ ۲۱۲ صفحے

۳۹ نافع الامراض۔ مفردادویہ کے خواص وافعال کے بیان میں۔ ۱۹۲ صفحے

یہ تینوں کتابیں طب و معالجہ سے متعلق ہیں اور ۱۸۴۶ء میں چھپی تھیں۔ شمس الامرا کے مطبع سے کچھ اور کتابیں بھی چھپی تھیں۔ دو یہ ہیں:

۴۰ رسالہ کیمسٹری۔ مصنف نا معلوم، مترجمین شمس الامرا، مطبوعہ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء۔

۴۱ رسالہ چیچک۔ مصنف ڈاکٹر ڈبلو، ای، میکلین۔ مترجم ڈاکٹر محمد عمر۔ مطبع سنگی شمس الامرا، حیدرآباد ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء۔

اِن کتابوں کی اشاعت نے دوسرے مطبعوں کو بھی حوصلہ دیا، چنانچہ رسالہ چیچک مدراس سے بھی ۱۸۵۷ء میں چھپا تھا۔ ذیل کی کتاب جو لکھنؤ میں پہلے چھپ چکی تھی، دوبارہ حیدرآباد سے طبع ہوئی:

۴۲ سائنس کے فوائد واعمال۔ مصنف لارڈ براہم۔ مترجم سید کمال الدین حیدر لکھنوی۔ مطبعِ سلطانی حیدرآباد۔ ۱۸۴۳ء

دکلکتہ میں اِس زمانے میں جو کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں، ان میں بھی بیشتر طب و معالجہ سے متعلق تھیں۔ بعض یہ ہیں:

۴۳ علم حکمت۔ مصنف چارلس فنک۔ مترجم نا معلوم۔ کلکتہ ۱۸۴۳ء۔ موضوع طبِ یونانی پریس، کلکتہ۔ ۱۸۴۵ء

۴۴ معین الجراحین۔ مصنف ڈاکٹر جان مونٹ فریڈرک۔ مترجم نا معلوم۔ بشپس کالج پریس کلکتہ۔ ۱۸۴۶ء

لکھنؤ کے بارے میں اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں سائنسی کتابوں کی طباعت کا کام ہوا اور وہ سلسلہ نصیرالدین حیدر کے وقت تک کسی حد تک

جاری رہا۔ وزیر اعظم معتمد الدولہ نے جب لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے کانپور کو اپنا مستقر بنایا تو اکثر صاحبانِ علم بھی اسی شہر میں آگئے۔ یہاں انگریزوں کی سرپرستی میں مختلف نئی چیزیں تیار کی جارہی تھیں، مثلاً:

"اگن بوٹ۔ ناوِ دخانی باشد کہ از صنعتِ انگریزاں بزورِ دود در دریا رود، و برائے راندنِ آں حاجتِ ملاحاں نہ شود۔"

"بجرا۔ بروزنِ صحرا۔ ناوے باشد، مصنوعی انگریزاں کہ کوتاہ تر از جہاز باشد و سقف و مکانات دارد و مرکبِ امیراں است۔"

کانپور میں مختلف قسم کی صنعتیں قائم ہونے لگیں۔ زراعت کی ترقی کی کوششیں کی گئیں اور یہاں جو علمی کتابیں شائع کی گئیں معمولاً ان کا تعلق صنعت و زراعت سے ہی تھا، مثلاً:

دولت ہند (زراعت)۔ مصنف ہنری فنوک۔ مطبع مصطفائی کانپور ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء کانپور میں اگرچہ مطبعے قائم تھے، علم کے شوقین اور ضرورت مند کتابوں کی اپنے ہاتھ سے بھی نقلیں تیار کرتے رہتے تھے۔ احمد علی بن محمد خلیل جونپوری کی کتاب "نگاریہ" (تصنیف ۱۲۰۴ھ / ۹۰-۱۷۸۹ء) کو میرزا فدا علی مشہدی نے کانپور میں ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۶۱ھ / اکتوبر ۱۸۴۵ء میں نقل کیا تھا۔ یہ کتاب "تراکیبِ رنگ کردن و پارچہ" کے موضوع سے متعلق ہے اور اسی صنعت کے لیے زمانۂ مابعد میں کانپور نے امتیاز حاصل کیا۔

اس زمانے میں آگرے کے پریس بھی اِن موضوعات کی طرف متوجہ ہوئے، چنانچہ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کی کتاب "توصیفِ زراعت" وہاں کے مطبعِ قادری سے ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

دہلی شاہ نشیں شہر تھا جسے وہاں کے باشندے تمام علوم و فنون کا منبع سمجھتے تھے۔ وہ اپنے حال میں خوش تھے اور بزرگوں کے زمانے کے علم کو آگے بڑھانے میں کوشاں تھے۔ جدید علوم کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ سرسید احمد خاں نے ۱۸۴۴ء میں فارسی کے ایک رسالہ معیار العقول کا ترجمہ "تسہیل فی جر الثقیل" کے

نام سے کیا۔ پھر ۱۸۴۶ء میں اپنے نانا کی کتاب "فوایدالافکار فی اعمال الفرجار" [۵۲] کا ترجمہ کیا اور اپنی طرف سے مثالوں کا اضافہ بھی کیا۔ اس کے دو برس بعد انھوں نے ایک رسالہ ۱۸۴۸ء میں "قول متین در ابطال حرکت زمین" [۵۳] بھی شائع کیا، حالانکہ بقول حالیؔ اس زمانے میں سارا یورپ حرکتِ زمین کا قائل ہو چکا تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اسی زمانے میں دہلی کالج قائم ہوگیا۔ اس کالج میں "علوم مفیدہ" کی کتابوں کی تیاری کے لیے ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی بنائی گئی اور اس نے سائنسی مضامین سے متعلق متعدد کتابیں تیار کرکے شائع کیں۔ کچھ یہ ہیں:

[۵۴] معاشیاتِ مل۔ جان اسٹورٹ۔ مترجم وزیر علی۔ دہلی ۱۸۴۴ء

[۵۵] اصولِ علمِ انتظامِ مدن۔ واسے لینڈ فرانسس۔ مترجم پنڈت دھرم نرائن۔ انجمن اشاعتِ علومِ مفیدہ، دہلی کالج ۱۸۴۵ء

[۵۶] کھیت کرم۔ مصنف کالی رائے۔ دہلی اردو اخبار پریس، دہلی ۱۸۴۶ء

[۵۷] بارِ دیگر ۱۸۴۹ء۔ آراضی کو بہتر بنانے اور پیداوار بڑھانے کے طریقے۔

[۵۸] جغرافیۂ ہند۔ مترجم پنڈت شواروپ نرائن و شیوروپ نرائن۔ دہلی ۱۸۴۸ء

[۵۹] اصول علمِ طبیعی (فزکس) مترجم اجودھیا پرشاد و شوا پرشاد۔ دہلی ۱۸۴۸ء۔

[۶۰] رسالہ مراۃ مناظر۔ مصنف برشل۔ مترجمین ورناکیولر سوسائٹی، دہلی۔ قبل ۱۸۵۰ء
اس کا موضوع علمِ روشنی ہے۔

[۶۱] اصولِ مساحت (پیمایش)۔ مترجم دیبی چند۔ دہلی ۱۸۵۰ء

[۶۲] اصولِ قواعد مائیات۔ مترجم اجودھیا پرشاد۔ دہلی ۱۸۵۰ء

[۶۳] رسالہ مقناطیس۔ مترجم سید کمال الدین حیدر لکھنوی۔ دہلی ۱۸۵۰ء

اس فہرست سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

(الف) باوجودیکہ دہلی کالج کے استادوں میں بیشتر مسلمان تھے، سائنسی موضوعات سے متعلق ترجمہ کا کام کرنے والوں میں صرف ایک مسلمان کا نام نظر آتا ہے اور اس کا تعلق بھی دہلی یا دہلی کالج سے نہیں تھا۔

(ب) خوش آیند بات یہ ہے کہ اِس عشرے میں کم سے کم ایک علاقے یا طبقے میں ترجمے کی حد سے نکل کر تصنیفی کام کرنے کی طرف رجحان پیدا ہو چلا تھا۔

انیسویں صدی عیسوی کے چھٹے عشرے میں ملک پر جو قیامت ٹوٹی تھی، اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ سلطنت کی تبدیلی نے حاکم کو محکوم، عالی کو سافل اور زردار کو مفلس و بے زر بنا دیا تھا۔ جو خود کو صاحب علم و دانش خیال کرتے آئے تھے، جاہل و بے علم ٹھہرے۔ حیدر آباد میں جہاں سے کبھی علمی کتابوں کی تیاری کا کام شروع ہوا تھا، باوجودیکہ شمس الامرا ابھی زندہ تھے، اس سلسلے کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ اُس زمانے میں جو کام ہوا ہوگا، اُسے انفرادی کاوش سمجھا جا سکتا ہے۔

حیدر آباد سے علم کی روشنی مدراس تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں کے حالات شاید کچھ بہتر تھے۔ وہاں علمی کتابوں کے ترجمے چھپتے رہے۔ بعض یہ ہیں:

۶۳؎ اصولِ فن قبالت۔ مصنف ڈاکٹر جی، ڈی، کنکویسٹ۔ مترجم ایڈورڈ بالفور۔ مدراس ۱۸۵۲ء۔ انگریزی متن مع اردو ترجمہ۔

۶۴؎ جغرافیہ کا پہلا رسالہ۔ مصنف مِس برڈ۔ مترجم میر غلام علی۔ مدراس ۱۸۵۳ء بار دیگر: اسکول بک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۵۳ء۔ تیسری بار ۱۸۵۶ء

۶۵؎ اصولِ طبابت (مجموعۂ مضامین)۔ مصنف ڈاکٹر جارج اسمتھ۔ مترجم حکیم سید باقر علی و حکیم سید علی۔ اسکاٹش پریس مدراس۔ ۱۸۶۰ء۔ بار دیگر ۱۸۶۳ء

مدراس کی کتابیں کلکتہ تک پہنچ رہی تھیں اور خود کلکتہ میں بھی ترجمے کیے جا رہے تھے لیکن کام کی رفتار میں تیزی یا ترقی معلوم نہیں ہوتی۔ وہاں کی کچھ کتابیں یہ ہیں:

۶۶؎ علم الحساب۔ مصنف براؤن، مترجم نامعلوم۔ کلکتہ بار اول، بار دوم؟ بار سوم ۱۸۵۲ء بار چہارم ۱۸۵۷ء

۶۷؎ تحریر اقلیدس۔ مصنف ولیم لالر۔ مترجم نامعلوم۔ کلکتہ ۱۸۵۲ء

لکھنؤ میں تو پہلے بھی خالص علمی کاموں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔ پھر یہ

چھٹا عشرہ تو وہ تھا جب شاہی کا چراغ (بجھنے کے لیے) بھڑک اٹھا تھا۔ چند سال کے بعد ابتلاؤں کا وہ زور ہوا کہ الامان الحفیظ۔ کانپور کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے البتہ وہاں کے چھاپے خانے کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب کچھ سکون ہوا تو پھر علم و دانش کی طرف توجہ ہوئی۔ اِس زمانے کی ایک کتاب یہ ہے:

[۶۸] جغرافیۂ جہاں۔ مصنف اس ایچ ریڈ، مترجم محمد کریم بخش۔ لکھنؤ ۱۸۶۰ء بار دیگر ۱۸۷۰ء۔

حالات کی تمام ہنگامہ خیزیوں کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ بنارس میں جدید علوم کی طرف توجہ رہی ہے۔ چنانچہ وہاں کی ایک کتاب یہ ہے:

[۶۹] مقالاتِ طبعی (فزکس) مصنف نند کشور۔ فوق کاشی پریس ۱۸۵۸ء

اہم بات یہ ہے کہ آگرے میں علمی کتابوں کے ترجمہ کا کام تسلسل کے ساتھ نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں ترقی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اہل علم نے بعض مقامی حقائق کی طرف بھی اِس زمانے میں توجہ کی تھی۔ چنانچہ ذیل کی تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے:

[۷۰] ہندوستان کے پُل اور دریا (فنِ تعمیر)۔ مصنف کرنل ایف ایبٹ۔ مترجم منولال۔ یتیموں کا چھاپہ خانہ (سکندرہ) آگرہ۔ ۱۸۵۱ء

[۷۱] خلاصۃ الصنایع (فزکس کی نصابی کتاب)۔ مترجم بھولا ناتھ آگرہ ۱۸۵۴ء

[۷۲] گنگا کی نہر۔ مترجم سدا سکھ لال۔ آگرہ۔ ۱۸۵۴ء

[۷۳] جامع النفایس (جغرافیہ)۔ مصنف رابرٹ جیمس مین۔ مترجم ہنری اسٹورٹ ریڈ۔ نور الابصار پریس، آگرہ۔ حصہ اول، دوم ؟۔ حصہ سوم ۱۸۵۸ء حصہ چہارم ۱۸۵۹ء حصہ پنجم ۱۸۶۰ء

رُڑکی انجنیرنگ کالج کھل گیا تھا جس کے پاس چھاپہ خانہ بھی تھا۔ وہاں سے نصابی ضرورتوں کے مطابق کتابیں چھاپی گئیں، مثلاً:

[۷۴] مٹی کی کھدائی۔ مصنف کنھیالال۔ مترجم بہاری لال۔ رُڑکی ۱۸۵۱ء۔

۷۵ استعمال لوگارتھم۔ مترجم شمبھوداس۔ طامس انجنیئرنگ کالج چھاپہ خانہ، رڑکی
۱۸۵۷ء

اسی قسم کی ایک کتاب یہ بھی ہے،

۷۶ سڑک کی تعمیر۔ مصنف ڈیوڈ سنڈیمن۔ ۱۸۵۴ء

پنجاب میں لاہور میں بھی اب علمی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ ہوئی۔ وہاں یہ کتاب بھی طبع ہوئی:

۷۷ چائے لگانے کی ترکیب (زمین وفصل وغیرہ کا حل)۔ کوہ نور پریس لاہور ۱۸۵۴ء

دہلی میں کالج کی ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے بہ ضرورت کچھ علمی کتابوں کے ترجمے کرائے تھے لیکن اربابِ اقتدار اس قسم کے کاموں کے موید نہیں تھے۔ ۱۸۴۶ء کی رپورٹ میں یہ ذکر آچکا تھا کہ:

> "جب بمبئی اور دوسرے مقاموں کے علاوہ لکھنؤ میں بارہ اور دہلی میں سات سنگی مطبع ہیں۔۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ دہلی سوسائٹی اس قسم کی کتابیں طبع کرکے ان سے مقابلہ کرے مگر۔۔۔ جن حضرات نے انگریزی سائنسوں کو دیسی زبان کے ذریعہ ہندوستان میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے وہ پھر سوسائٹی کی اعانت فرمائیں گے تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے تک دہلی میں کچھ ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے یوروپی سائنسوں کو اپنے ہموطنوں میں عام کر دینے کا "بیڑا" اٹھایا تھا، وہ اس سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور سوسائٹی سائنس کے مختلف شعبوں اور مسئلوں سے متعلق کتابیں تیار کرواکر شائع کرتی رہی۔ مثلاً:

۷۹ حفظانِ صحت۔ مصنف نامعلوم ۱۸۵۲ء

۸۰ مساحت (ٹھیوڈومک) " باراول ۱۸۵۳ء۔ باردیگر ۱۸۵۶ء

۸۱ حالاتِ ہندوستان (جغرافیہ)۔ مصنف مرے۔ ۱۸۵۶ء

۸۲ جغرافیہ طبعی۔ ایچ اف بلند فورڈ۔ ۱۸۵۶ء
۸۳ حرارت۔ مصنف نامعلوم قبل۔ ۱۸۵۷ء
۸۴ الجبرا۔ برخیر۔ ۱۸۵۷ء
۸۵ لودسر کا علم مثلث مستوی؛ مصنف لودسر۔ مترجم محمد ذکاراللہ قبل ۱۸۵۷ء
۸۶ ہائڈرالکس۔ مصنف نامعلوم قبل ۱۸۵۷ء
۸۷ اصول علم ہیئت۔ مصنف ہرشل و بونی کیسل قبل ۱۸۵۷ء
۸۸ مرکبات و سکونیات (ڈائنمکس اینڈ اسٹیٹکس)۔ مصنف ینگ۔ قبل ۱۸۵۷ء
۸۹ سکون سیالات۔ مصنف ایس ایل سونے قبل ۱۸۵۷ء
۹۰ رسالہ علم برق۔ مصنف راجٹ۔ قبل ۱۸۵۷ء
۹۱ علم المناظر۔ مصنف فلپ۔ قبل ۱۸۵۷ء
۹۲ رسالہ کیمسٹری۔ مصنف برتھا مورس پارکر۔ قبل ۱۸۵۷ء
۹۳ رسالہ جراحی۔ مصنف نامعلوم۔ قبل ۱۸۵۷ء
۹۴ روشنی کا دوہرا انعکاس۔ مصنف نامعلوم۔ قبل ۱۸۵۷ء

اتنی کثیر تعداد میں سائنسی کتابوں کی طباعت سے اِن کی ضرورت اور قبولیت کا پتا چلتا ہے۔ اِس صورتِ حال نے شہر کے مختلف مطبعوں کو بھی متوجہ کیا اور انھوں نے بھی کم و بیش اِس کام میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان کی چھاپی ہوئی چند کتابیں یہ ہیں:

۹۵ قوانین زراعت۔ مصنف نامعلوم۔ مطبع دارالسلام، دہلی ۱۸۵۰ء
۹۶ تحریر اقلیدس۔ مصنف سیمسن۔ مترجم محمد ذکاراللہ مطبع العلوم دہلی ۱۸۵۵ء
۹۷ تحریر اقلیدس (آٹھ کتابیں)۔ مترجم مولوی مملوک علی مطبع العلوم دہلی ۱۸۵۱ء
۹۸ ہندسہ بالجبر۔ مصنف النگر۔ مترجم محمد ذکاراللہ۔ مطبع مرتضوی، دہلی قبل ۱۸۵۷ء

اِس فہرست سے پتا چلتا ہے کہ اِس عشرے میں دہلی میں بھی بعض باصلاحیت مسلمانوں نے علمی اور سائنسی موضوعات سے متعلق کتابوں کو ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس ابتدائی منزل پر اِس میدان میں تصنیفی کام کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ دہلی کے

باہر ہندوؤں میں بھی خال خال ہی ایسے لوگ تھے جو سائنس کے کسی خاص شعبے میں خود کوئی کتاب لکھ دینے کی لیاقت رکھتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگاموں میں ملک کی آبادی کے جس حصے پر زیادہ تباہی آئی وہ اردو داں طبقہ تھا۔ اُس قیامتِ صغرا کے گزر جانے کے بعد اس طبقہ نے کسی طرح خود کو سنبھالا اور ساتویں عشرے میں پھر ایک زندہ قوم کی طرح وہ علم و دانش کی ترویج و اشاعت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شمس الامرا محمد فخرالدین خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کے بیٹوں نے دارالترجمہ اور مطبع کو سنبھال لیا، لیکن اُن کے پاس وسائل کم تر تھے، اس لیے کام کی رفتار سست رہی۔ شہر کے دوسرے اہلِ مطبع نے ساتھ دیا اور علم کی توسیع کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ جو کتابیں چھپیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۹۹ علاجِ ہیضہ۔ مصنف ڈاکٹر مرے۔ مترجم سید اشرف علی۔ مطبع مظہرالعجائب، حیدرآباد ۱۸۷۰ء۔

۱۰۰ علم الامراض۔ سید اشرف علی۔ مطبع مظہر العجائب حیدرآباد ۱۸۷۰ء

۱۰۱ شمس العلاج۔ مترجم جان مرقس جانسٹن۔ مطبع رحمانی حیدرآباد ۱۸۷۰ء / ۱۲۸۷ھ۔ ہومیوپیتھی علاج، اصول و مبادیات۔

۱۰۲ مطالباتِ بخار۔ مصنف غلام دستگیر۔ مطبع رحمانی حیدرآباد ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۶۹ء۔

مدراس میں بھی کمی ہو گئی لیکن علم کی شمع وہاں بھی بجھنے نہیں پائی۔ ایک کتاب جو پہلے بھی چھپ چکی تھی اِس عشرے میں دوبارہ چھپی یعنی:

۱۰۳ اصول طبابت۔ مصنف جارج اسمتھ۔ مترجم حکیم سید باقر علی و حکیم سید علی۔ اسکاٹش پریس، مدراس۔ بار اول ۱۸۶۰ء۔ بار دیگر ۱۸۶۳ء۔

اسی طرح ذیل کی کتاب بمبئی میں طبع ہوئی:

۱۰۴ خلاصہ علم جغرافیہ۔ عبدالفتاح گلشن آبادی۔ حیدری پریس، بمبئی ۱۸۷۰ء

ہو سکتا ہے کہ اِن شہروں میں کچھ اور کتابیں بھی چھپی ہوں۔

غدر سے پہلے کلکتہ کو سرکار کمپنی بہادر کے پایۂ تخت کا درجہ حاصل تھا۔ غدر کے بعد اُس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہ گئی۔ علمی نقطۂ نظر سے اُسے جو مرکزیت ملی ہوئی تھی اِس صورتِ حال سے وہ بھی متاثر بلکہ مجروح ہوئی۔ علمی کتابوں کی اشاعت کی رفتار وہاں بھی بہت سست ہوگئی۔ ایک کتاب یہ ہے:

۱۰۵ سائنس ریڈر۔ میکمیلن کمپنی، کلکتہ ۱۸۶۹ء

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ دہلی کے رہنے والے سرسید احمد خاں مغربی سائنسوں سے ناواقف ہونے کے باوجود سائنسی موضوعات سے دل چسپی رکھتے تھے۔ دلّی سے نکلنے کے بعد انھیں مختلف مقاموں پر جانے اور انگریزوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا تو انھوں نے سائنسی ترقیات کی جھلک دیکھی۔ انھیں اندازہ ہوا کہ دہلی کالج کی طرف سے سائنسی کتابوں کے تراجم کی اشاعت کے باوجود، علمی اعتبار سے دہلی والے کس حد تک پسماندہ تھے۔ اس احساس کے بیدار ہونے کے بعد سرسید نے اپنی زبان اور قلم سے قوم کی غفلت اور جہالت کے خلاف جد و جہد شروع کر دی۔ انھوں نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قایم کی، جو بعد میں علی گڑھ میں منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سائنسی کتابوں کی تیاری اور طباعت کا کام بھی شامل تھا۔ اس عشرے میں جو کتابیں چھپیں اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۰۶ رسالہ علمِ فلاحت (جیالوجی اور فزیالوجی)۔ مصنف رابرٹ اسکاٹ برن۔ مترجم سائنٹفک سوسائٹی، غازی پور۔ ۱۸۶۵ء

۱۰۷ رسالہ ہومیوپیتھک۔ سرسید احمد خاں۔ ۱۸۶۷ء

۱۰۸ رسالہ علاجِ ہیضہ (بموجب اصولِ ہومیوپیتھک) سرسید احمد خاں ۱۸۶۸ء

۱۰۹ رسالہ علم برق۔ مصنف سر ولیم اسنو ہیرس۔ مترجم سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ ۱۸۶۹ء

دہلی کالج اگرچہ دوبارہ کھول دیا گیا تھا، وہاں سے سائنسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری نہیں ہوا۔ اِس کی وجہ غالباً یہی ہوئی کہ اب اِس شہر کے لوگ اس لائق نہیں رہ گئے

تھے کہ وہ کالج کی سوسائٹی کی "اعانت" کر سکتے۔ یہی سبب شاید اس بات کا بھی ہوا کہ دہلی کے دوسرے مطبع بھی اس کام کو جاری نہیں رکھ سکے۔

لکھنؤ میں منشی نولکشور نے اپنا مشہور پریس لگایا اور کانپور میں بھی اس کی شاخ قائم کردی۔ اس پریس نے جو صدہا کتابیں شائع کیں ان میں کچھ سائنسی موضوعات سے متعلق بھی تھیں، مثلاً لکھنؤ سے یہ کتابیں چھپی تھیں:

(۱) چھوٹا جام جہاں نما۔ بابو شیو پرشاد۔ ۱۸۶۲ء۔ موضوع جغرافیہ۔

(۱۱) قرابادینِ ذکائی۔ مصنف حکیم ذکاء اللہ خاں۔ مترجم حکیم محمد ہادی حسین خاں۔ ۱۸۷ء۔ مرکب ادویہ کے خواص وافعال

(۱۲) قرابادینِ شفائی۔ مصنف مظفر شفائی بن محمد الحسینی۔ مترجم حکیم محمد ہادی حسین خاں ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء۔

کانپور میں علمی سرپرستی کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہاں کے اہلِ مطبع نے روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اِس عشرے کی دو کتابیں یہ ہیں:

(۱۳) میزان الطب۔ مصنف محمد اکبر محمد ارزانی۔ مترجم محمد حسن نظامی پریس کانپور ۱۸۶۴ء۔

(۱۴) رسالۂ طب۔ مترجم محمد عبدالرحمان۔ مطبع نظامی، کانپور ۱۸۶۴ء

رڑکی کالج کی طرف سے تدریسی ضرورتوں کے مطابق علمی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی کم و بیش جاری رہا۔ ایک کتاب یہ ہے:

(۱۵) سڑکوں کی تعمیر۔ مصنف کیپٹن ایچ بنگم۔ مترجم لالہ بہاری لال ۱۸۶۱ء

آگرے میں علمی موضوعات سے متعلق چھپنے والی کتابوں کی تعداد زیادہ تو نہیں تھی لیکن اِس شہر میں علم و دانش کی ترویج و توسیع کی روایت مسلسل اور غیر منقطع تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں عشرے کی چند کتابیں یہ ہیں:

(۱۶) رہنمائے حکمت۔ مصنف ایبر و کرامبی۔ مترجم ناصر الدین خاں۔ آگرہ ۱۸۶۱ء

(۱۷) تشریح العظام (علم الابدان)، مصنف ڈاکٹر فریڈرک جان مونٹ، آگرہ ۱۸۶۹ء

۱۱۸ ہڈیوں کا بیان۔ مصنف پیٹر برٹن۔ آگرہ ۱۸۶۹ء

۱۱۹ ندیم الطلاب (ندیم الاطبائی)۔ موضوع علم الابدان۔ مصنف ڈاکٹر جان
آگرہ ۱۸۷۰ء

شدہ شدہ یہ سلسلہ میرٹھ تک پہنچ گیا۔ وہاں سے چھپنے والی ایک کتاب یہ ہے:

۱۲۰ حلِ حساب۔ مصنف برنارڈ اسمتھ۔ مترجم الیسری پرشاد، کنھیالال۔ میرٹھ ۱۸۶۸ء

پنجاب میں لاہور کے اہلِ مطبع نے سلسلے کو جاری رکھا، لیکن کوئی ترقی نہیں معلوم ہوتی۔ چند مطبوعات کے نام اس طرح ہیں:

۱۲۱ جغرافیہ (دنیا کا جغرافیہ)۔ مصنف اجودھیا پرشاد۔ لاہور ۱۸۶۱ء

۱۲۲ جبر و مقابلہ۔ مترجمین انجمن پنجاب۔ مطبع سرکاری، لاہور ۱۸۶۹ء

پنجاب ہی کے علاقہ میں لدھیانہ میں بھی علمی کتابیں چھپنے لگیں، مثلاً:

۱۲۳ علاج الامراض۔ مصنف جان ولسن۔ لدھیانہ ۱۸۶۸ء

اس عشرے میں طبی مباحث سے متعلق کتابوں کی طرف توجہ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ غدر سے پہلے سائنسی موضوعات میں جو تنوع پیدا ہو چلا تھا، اس میں واضح طور پر کمی معلوم ہوتی ہے۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اب ترجمہ کے ساتھ ساتھ تالیف کا رجحان بھی ظاہر ہونے لگا ہے۔

سائنسی اور علمی کتابوں کے ترجمہ اور تالیف کے نقطۂ نظر سے انیسویں صدی عیسوی کا آٹھواں عشرہ بہت اہم ہے۔ یہی نہیں ہوا کہ حیدرآباد، لکھنؤ، دہلی اور لاہور میں اس زمانے میں اِس باب میں نمایاں ترقی ہوئی، بلکہ اورنگ آباد، الہ آباد، اور رہتک میں بھی علمی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوگیا، البتہ کلکتہ اور مدراس میں اس طرف توجہ کم ہوگئی، اس عشرے کی مطبوعہ کچھ کتابیں یہ ہیں:

حیدرآباد

۱۲۴ پریکٹس آف فزکس۔ مصنف ڈاکٹر ونڈو۔ دار الطبع سرکارِ عالی حیدرآباد ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء

۱۲۵ رسالہ علمِ ہیئت ۔ مصنف جیمز فرگوسن۔ مترجم سید عبدالرحمان مطبع سنگی شمس الامرا ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء

۱۲۶ جامِ جہاں بیں (جغرافیہ)۔ مصنف اِس 'جی' اڈالفس۔ محبوب شاہی پریس حیدر آباد۔ ۱۸۷۸ء۔

۱۲۷ تجرباتِ مطبِ وزیری ۔ مولف حکیم وزیر علی۔ دارالطبع سرکارِ عالی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء اورنگ آباد۔

۱۲۸ عملِ طب ۔ مصنف سموئیل ونڈو ۔ دارالطبع اورنگ آباد ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء بمبئی ۔

۱۲۹ اصولِ جغرافیہ ۔ مصنف غلام محمد۔ گنپت کرشناجی پریس ۔ ۱۸۷۹ء بنارس ۔

۱۳۰ دایرہ علومِ طبیعات (فزکس) مصنف لکشمی شنکر۔ میڈیکل ہال پریس ۱۸۷۵ء الہ آباد ۔

۱۳۱ جغرافیہ ہندوستان ۔ ایشری پرشاد ۔ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۔ ۱۸۷۹ء لکھنؤ ۔

۱۳۲ ترجمہ منتخب التواریخ ۔ عبدالقادر بدایونی ۔ مترجم احتشام الدین مرادآبادی مطبع نولکشور ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء

۱۳۳ اول جغرافیہ ۔ درگا پرشاد ۔ نولکشور پریس ۱۸۸۰ء

۱۳۴ تشریح الاسباب یا مظہر علوم ۔ حکیم قاضی الٰہی بخش امرتسری نولکشور پریس ۱۸۷۷ء۔

۱۳۵ فیضِ عام (طب) سید تہور علی ۔ نولکشور پریس ۱۸۷۳ء

۱۳۶ مجرباتِ اکبری ۔ مولف سید محمد اکبر محمد ارزانی ۔ مترجم واحد علی موہانی نولکشور پریس ۱۸۷۳ء

۱۳۷ قید کشا (تمباکونوشی سے متعلق) مصنف آئی فیلڈ بریو۔ مترجم نامعلوم لکھنؤ ۱۸۷۴ء۔

کانپور۔

۱۳۸ تزکِ جہانگیری۔ سید احمد علی رامپوری۔ مطبع نظامی ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء

۱۳۹ قواعد علم المساحت (پیمایش) محمد عبدالقادر۔ نظامی پریس ۱۸۷۴ء

آگرہ۔

۱۴۰ سامانِ آپریشن۔ محمد دلاور خاں۔ میڈیکل پریس ۱۸۷۳ء

۱۴۱ اسرار الاعضا۔ مصنف ڈاکٹر ٹی، ای، بی، براؤن۔ مترجم عزیز الدین مطبع الوری ۱۸۷۷ء

دہلی۔

۱۴۲ سماوات۔ مصنف الگزینڈر گوئلے من۔ مترجم ڈپٹی نذیر احمد۔ دہلی ۱۸۷۲ء

۱۴۳ حساب کی کتاب۔ پہلا حصّہ (اس کتاب کے پانچ حصّے ہیں)۔ مصنف برنارڈ اسمتھ مترجم محمد ذکاءاللہ۔ مطبع مرتضوی ۱۸۷۵ء۔ دوسرا حصّہ مطبع آفتابِ پنجاب لاہور میں ۱۸۷۶ء میں چھپا۔

۱۴۴ رسالہ مساحت۔ مصنف مور۔ مترجم محمد ذکاءاللہ۔ مطبع مرتضوی ۱۸۷۶ء

۱۴۵ رسالہ مساحت۔ مصنف ٹاڈ ہنٹر۔ مترجم محمد ذکاءاللہ۔ مطبع مرتضوی۔ طبع چہارم ۱۸۷۶ء

۱۴۶ علمِ فزیالوجی۔ مصنف ڈاکٹر ہکسلے۔ مترجم نامعلوم۔ کرزن گزٹ ۱۸۷۷ء

۱۴۷ جغرافیہ طبعی۔ محمد ذکاءاللہ۔ مرتضوی پریس ۱۸۷۶ء

لاہور۔

۱۴۸ رسالہ چند امراضِ مواشی۔ جوکہ زیادہ تر مہلک ہیں۔ مصنف جے ایچ پی بالن مترجم رحیم خاں۔ مطبع مطلع نور ۱۸۷۱ء

۱۴۹ علاج الامراض۔ مولف حکیم محمد شریف خاں دہلوی۔ مترجم حکیم محمد ہادی حسین خاں مرادآبادی۔ مطبع نولکشور۔ ۱۸۸۸ء

۱۵۰ مفتاح الارض ؟ گورنمنٹ پریس، لاہور۔ ۱۸۷۵ء۔

۱۵۱ جغرافیہ طبعی۔ مصنف ایچ ایف بلنڈ فورڈ۔ مترجم نامعلوم۔ سرکاری مطبع ۱۸۷۹ء
۱۵۲ مختصر جغرافیہ عالم۔ مصنف ایچ بلوک مین۔ مترجم محمد الدین۔ مفیدِ عام پریس ۱۸۷۷ء۔ بار دوم ۱۸۸۳ء
۱۵۳ مطالعۂ فطرت (دِ دنیچر کا ترجمہ)۔ مصنف چندر دت۔ مترجم نتھو رام نند مطبع کوہِ نور ۱۸۸۷ء
۱۵۴ افعال الاعضا۔ مصنف ہیکلے۔ مترجم ڈاکٹر رحیم خاں۔ لاہور ۱۸۷۷ء رہتک۔
۱۵۵ علم الامراض۔ مصنف ڈبلو، سی، اس، فاے۔ رہتک ۱۸۷۸ء رڑکی۔
۱۵۶ مخزن المساحت۔ مجید الدین محمد خاں۔ خورشید جہاں تاب پریس ۱۸۷۴ء
۱۵۷ بیانِ لوگارثم۔ مترجم شبھو داس۔ مدرسہ چھاپہ خانہ ۱۸۷۵ء

اس عشرے میں جیسا کہ تفصیلِ بالا سے ظاہر ہے، سائنس کے مختلف موضوعات سے متعلق کتابیں چھپتی رہی ہیں۔ طب و معالجہ وغیرہ نے غالب علمی رجحان کی حیثیت حاصل کر لی تھی لیکن طبیعیات وغیرہ سائنس کے کئی شعبے ایسے تھے، جن کی طرف غالباً اردو میں لکھنے والوں کی توجہ بالکل نہیں معلوم ہوئی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے میں اردو کو ایسے عالم بھی مل گئے تھے جو سائنسی موضوعات و مسائل سے متعلق تالیفی بلکہ تصنیفی کام کرنے کی بھی لیاقت رکھتے تھے۔ ایک اور بڑی بات یہ ہوئی کہ ملّا عبدالقیوم حیدر آبادی (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۵۴ء تا ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) نے اسی زمانے میں ایک منصوبہ[۱۵۸] "استدعار تعلیم جبری" کے عنوان سے پیش کیا تھا اور اس طرح ہندوستان کی علمی تاریخ کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش کی تھی۔ اس پر کما حقہٗ بہت بعد تک عمل نہیں کیا جا سکا۔

نویں عشرے میں ملک کے علمی ماحول پر لاہور پوری طرح چھا گیا تھا۔ علمی اور

سائنسی کتابیں اِس زمانے میں سب سے زیادہ یہیں سے چھپیں۔ غالباً اِسی کے اثر سے قرب و جوار کے شہروں مثلاً امرتسر وغیرہ میں بھی یہ اشاعتی سلسلہ جاری رہا۔ حیدرآباد میں بھی اِس معاملے میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ دہلی اور لکھنؤ کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ دوسرے مقاموں کی بھی سائنسی کتابوں کی اشاعت کے لیے کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی۔ اِس عشرے کی کچھ مطبوعات یہ ہیں:

حیدرآباد۔

۱۵۹ اصولِ حکمت (طبِ مغربی)، مصنف ڈاکٹر اسٹوارٹ۔ مترجم عبدالجلیل محمد پناہ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء

۱۶۰ نور العین۔ حکیم حافظ فخرالدین ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء۔ امراضِ چشم کے علاج سے متعلق۔

۱۶۱ جغرافیۂ ملکِ نظام۔ سید ابراہیم حسنی۔ احمدی پریس ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء

۱۶۲ زراعتِ دکن۔ حسن بن عبداللہ۔ ہزار داستان پریس ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء

۱۶۳ الکحل کے اخلاقی اور طبیعی تاثیرات۔ مصنف سر جن پیٹرک ہیر۔ مترجم نامعلوم دارالطبع جامعہ عثمانیہ ۱۸۸۵ء ـــ بار دیگر اورنگ آباد ۱۸۸۸ء

۱۶۴ مرأۃ الشباب۔ محمد اسماعیل فخرالدین۔ مجلس اورنگ آباد پریس ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۶ء

۱۶۵ عملی فوٹوگرافی۔ مصنف جانسٹن بنجمن۔ مترجم نامعلوم۔ مفتن پریس ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء۔

۱۶۶ التشخیص الکامل۔ مصنف حکیم سید احمد سعید امروہی۔ مترجم محمد عبداللہ۔ سفیرِ دکن پریس ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء

مدراس۔

۱۶۷ رسالہ تندرستی۔ عبدالرزاق۔ سی کے ایس پریس ۱۸۸۱ء

بنارس۔

۱۶۸ طریقِ تندرستی۔ ؟ - میڈیکل ہال پریس ۱۸۸۸ء

الٰہ آباد۔ ۱۶۹ فنِ زراعت۔ مصنف جے بی فلر۔ گورنمنٹ پریس ۱۸۸۱ء

کانپور۔

۱۷۰ ہادی المساح پیمائش۔ محمد اکرام اللہ خاں۔ مطبوعہ نولکشور بار اول ۱۸۸۳ء
بار دیگر ۱۸۹۴ء

۱۷۱ معالجات احسانی۔ محمد احسان علی خاں۔ نولکشور پریس ۱۸۸۵ء

۱۷۲ طب اکبر (جلد اول، دوم) محمد اکبر محمد ارزانی۔ مترجم نامعلوم۔ نولکشور پریس ۱۸۸۸ء

آگرہ۔

۱۷۳ رسالہ وکسی نیشن۔ ڈاکٹر تجمل حسین۔ مطبع النوری۔ ۱۸۸۶ء

دہلی۔

۱۷۴ مبادی علم جیالوجی (فرانسیسی کتاب کا عربی کی معرفت ترجمہ) مترجم الطاف حسین حالی۔ دہلی کالج، دہلی ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء

۱۷۵ جغرافیہ طبعی۔ مترجم محمد ذکاء اللہ۔ مرتضوی پریس ۱۸۸۵ء

رڑکی۔

۱۷۶ پلوں کا بیان۔ مترجم لالہ بہاری لال۔ چھاپہ خانہ کالج رڑکی۔ ۱۸۸۶ء

۱۷۷ قواعد حساب متعلقہ فن انجنیری۔ مصنف کرنل اے ایم برینڈریتھ۔ مترجم لالہ جگموہن لال۔ چھاپہ خانہ کالج۔ ۱۸۸۵ء

لاہور۔

۱۷۸ امراض الصبیان۔ ڈاکٹر رحیم خاں۔ البرٹ پریس ۱۸۸۲ء

۱۷۹ رسالہ ہیضہ۔ حکیم غلام نبی۔ وکٹوریہ پریس ۱۸۸۴ء

۱۸۰ امراض النسواں۔ ڈاکٹر رحیم خاں۔ مطبع گلزار محمدی ۱۸۸۵ء

۱۸۱ قرابادین رحیمی۔ محمد رحیم خاں۔ مطبع محمدی ۱۸۸۶ء۔ طب مغربی کے مطابق ادویہ کے خواص وافعال۔

۱۸۲ رسالہ انواع حقیقت آراضی ملک پنجاب۔ مصنف بیڈن پال۔ مترجم لالہ جیارام۔ مفید عام پریس ۱۸۸۶ء

۱۸۳ تشریح انسانی۔ مصنف بی جولنی۔ مترجم ڈاکٹر بیلی رام۔ مطبع مرتضائی بار اول ۱۸۸۶ء
بار دوم ۱۸۸۷ء، بار سوم ۱۹۰۰ء

۱۸۴ خلاصہ جغرافیہ طبعی۔ مصنف کرنل ہالرائیڈ۔ مترجم سریش چند۔ مفید عام پریس ۱۸۸۶ء

۱۸۵ اردو فسٹ جاگرفی۔ مترجم گلاب سنگھ۔ مفید عام پریس ۱۸۸۷ء

۱۸۶ طبِ رحیمی۔ ڈاکٹر رحیم خاں مطبع محمدی ۱۸۸۸ء۔ ایلوپیتھک طریقۂ علاج۔

۱۸۷ لذت الحیات۔ حافظ فخر الدین۔ گلزار محمدی پریس ۱۸۸۸ء

۱۸۸ علاج الامراض۔ مصنف حکیم محمد شریف خاں دہلوی۔ مترجم حکیم محمد ہادی حسن خاں
مراد آبادی مطبع نولکشور لاہور ۱۸۸۸ء

۱۸۹ قرابادینِ حیوانات۔ ڈاکٹر رحیم خاں۔ مطبع محمدی ۱۸۸۹ء

۱۹۰ فنِ زراعت کی پہلی کتاب۔ جے، بی، فلر۔ مجتبائی پریس ۱۸۹۰ء

اِس عشرے میں خالص سائنسوں مثلاً کیمیا، طبیعیات وغیرہ کے موضوعات سے متعلق کتابوں کی طباعت کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس ملک کے سائنس والوں نے خود کو اردو دنیا سے الگ کر لیا تھا۔ حالی کی نصابی کتاب "مبادیاتِ علم جیالوجی" کو مستثنیات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ انجنیری کو بھی اردو دنیا سے الگ سمجھ لیا گیا تھا اور اُس سے متعلق مباحث کے بارے میں نصابی کتابوں کی اشاعت عملاً رڑکی کالج تک محدود ہو گئی، علمِ مساحت (پیمایش) کے مسائل سے بھی دل چسپی بس برائے نام رہ گئی۔ عام طور سے زراعت، جغرافیہ، طب اور معالجہ وغیرہ سے متعلق کتابیں چھاپی جانے لگی تھیں۔ اِس عشرے میں ایلوپیتھی کی طرف عام رجحان معلوم ہوتا ہے۔

اِس نہج پر یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں سیاسیات کا موضوع انیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں متعارف ہو چکا تھا۔ علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے جان اسٹوارٹ مل کی مشہور کتاب کا ترجمہ پنڈت دھرم نارائن کرا کر ۱۹۱ رسالہ سیاستِ مدن کے نام سے ۱۸۶۹ء میں چھاپ دیا تھا۔ نویں عشرے میں اِس

موضوع سے متعلق ذیل کی کتابیں چھپ گئی تھیں:

۱۹۲ مسلمانوں کی حالتِ آیندہ۔ والفرڈ اسکاون بلنٹ۔ مترجم اکبر الہ آبادی۔ میرٹھ ۱۸۸۴ء

۱۹۳ آزادی (لبرٹی کا ترجمہ) مصنف جان اسٹوارٹ مل۔ مترجم دیوان نریندر ناتھ۔ نیو امپیریل پریس۔ ۱۸۸۷ء۔

۱۹۴ چٹھی۔ مصنف سر کالون آکلینڈ۔ مترجم نامعلوم۔ مفیدِ عام پریس آگرہ ۱۸۸۸ء

۱۹۵ علم السیاسیات۔ جان اسٹوارٹ مل۔ مترجم مولوی ابوالحسن۔ مطبع نولکشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۰ء

اور پھر ہندو اور مسلمان دونوں کے فکر و عمل میں سیاست نے گھر کر لیا۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے میں علمی نقطۂ نظر سے اردو کا دایرہ اور بھی سکڑ گیا۔ اس زمانے میں ریاضی اور حساب وغیرہ سے متعلق بھی کتابیں کمیاب ہوگئیں اور غالباً اسی وقت سے ضرب المثل کی حد تک یہ بات مشہور ہوگئی کہ اردو والوں کو حساب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تواریخ سے دل چسپی میں بھی نمایاں حد تک کمی آگئی۔ جغرافیہ، زراعت اور انجینیری سے متعلق کچھ کتابیں ضرور شائع ہوئیں لیکن بیشتر کتابیں ادویہ اور معالجہ سے متعلق چھپیں۔ علمی کتابوں کے اشاعتی مرکز کی حیثیت سے صرف لاہور اور حیدر آباد باقی رہ گئے۔) باقی شہروں سے جو کتابیں طبع ہوئیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ چند مطبوعہ کتابیں یہ ہیں:

حیدر آباد۔

۱۹۶ دافع الامراض۔ حکیم محی الدولہ عزت یار خاں۔ مطبع ابوالعلائی ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء

۱۹۷ تسکین الانفس بہ تحقیق ذیابیطس۔ حکیم سید احمد سعید امروہی مطبع بنیظیر دکن ۱۸۹۱ء

۱۹۸ تحقیقِ مرضِ جذام (ضمیمہ تحقیق ذیابیطس)، حکیم سید احمد سعید مطبع بنیظیر دکن ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء

۱۹۹۔ صفاتِ مرغ (علاج بالحیوانات) سید سردار علی۔ مفید دکن پریس ۱۳۱۰ھ فصلی۔
۲۰۰۔ جغرافیہ۔ مصنف رورنڈ اڈورڈ سیل۔ مترجم نا معلوم۔ ابوالعلائی پریس ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء
۲۰۱۔ جغرافیۂ دکن۔ محمد عبدالرحیم خاں۔ فخرِ نظامی پریس ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء
۲۰۲۔ فیہ شفاء الناس (وبائی امراض کے اسباب و علاج) حکیم میر افتخار علی۔ مطبع کنز العلوم ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء
۲۰۳۔ جغرافیۂ دکن۔ عبدالجلیل محمد پناہ۔ برہانیہ پریس ۱۸۹۲ء
۲۰۴۔ مساحت نامۂ منشی مع کارنامۂ منشی۔ منشی سید محمد خواجہ حسن۔ ابوالعلائی پریس ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء
۲۰۵۔ جبر و مقابلہ (حصہ اول) مصنف اسمتھ۔ مترجم مولوی محمد علی۔ حیدرآباد۔ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء

اورنگ آباد۔

۲۰۶۔ تحفۂ صحت و فیضِ عام۔ حکیم محمد قاسم علی۔ مطبع اورنگ آباد ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء

مدراس۔

۲۰۷۔ مبادیِ حفظِ صحت۔ مصنف سرجن پیٹرک ہیپر۔ مترجم مرزا مہدی خاں، کے،آر، پریس ۱۸۹۱ء

بمبئی۔

۲۰۸۔ رسالہ پیری (مغربی طب)، مترجم سید محمد حیدر۔ بمبئی ۱۸۹۷ء

الہ آباد

۲۰۹۔ ہیضہ کا علاج۔ مصنف ایچ سینڈ ہین۔ مترجم نا معلوم الہ آباد ۱۸۹۴ء

امرتسر۔

۲۱۰۔ فن زراعت۔ جے بی فلر۔ افغانی پریس۔ ۱۸۹۱ء (پہلی بار الہ آباد سے ۱۸۸۱ء میں)
۲۱۱۔ فربہی و لاغری جسم انسانی۔ نیاز علی خاں۔ افغانی پریس ۱۸۹۱ء
۲۱۲۔ علاجِ آتشک و سوزاک۔ نیاز علی خاں۔ " " ۱۸۹۱ء

۲۱۳ کلید انجنیری ۔ حاجی قطب الدینؒ ۔ امرتسر ۔ قبل ۱۸۹۹ء

جالندھر ۔

۲۱۴ ثمرِ بہشت (در بابِ کاشتِ درختِ آم)۔ غلام حسین مطبع بھارت سیوک ۹۹

لاہور ۔

۲۱۵ ویٹیری نیری اناٹمی ۔ سید مہتاب شاہ گیلانی لاہور ۱۸۹۴ء

۲۱۶ رسالہ کاشت اجناس ہند ۔ منسارام ۔ رفاہِ عام اسٹیم پریس ۱۸۹۹ء

۲۱۷ کلید انجنیری کا ریویو ۔ حاکم الدین ۔ خادم التعلیم اسٹیم پریس ۱۸۹۹ء

۲۱۸ لکنت اور اس کا علاج ۔ منشی محمد الدین خلیق ۔ خادم التعلیم اسٹیم پریس ۱۹۰۰ء

۲۱۹ تشریح انسانی ۔ بیلی رام ۔ البیون پریس ۱۹۰۰ء

۲۲۰ المخدرات من المسکرات ۔ حکیم غلام نبی ۔ زبدۃ المطابع ۱۸۹۵ء

علی گڑھ

۲۲۱ جوہرِ حکمت ۔ پیارے لال ۔ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۹۶ء

۲۲۲ علمِ جغرافیہ ۔ ولیم ولکسن ۔ " " ۱۸۹۶ء

آگرہ ۔

۲۲۳ المقادیر (پیمایش)۔ غلام محمد ۔ مفید عام پریس ۱۸۹۵ء

۲۲۴ میریا میڈیکا ۔ سکندر علی ' مفید خلایق پریس ۱۸۹۰ء

مراد آباد ۔

۲۲۵ رموز الحکمت ۔ رجب علی ۔ مطبع گلزار احمدی ۱۸۹۵ء

لکھنؤ ۔

۲۲۶ جمناسٹک ایکسرسائز ۔ پنڈت گنیش دت مطبع نولکشور ۱۸۹۴ء

۲۲۷ میزان الطب اردو ۔ مصنف محمد اکبر ارزانی ۔ مترجم محمد حسن علی ۔ لکھنؤ ۱۸۹۹ء

۲۲۸ اسرار الانفاس ۔ مصنف جودیا بین جی ۔ مترجم سید محمد محی الدین خاں مطبع نولکشور ۱۹۰۰ء ۔

علم و دانش کی توسیع و ترقی میں کتابوں کے ساتھ ساتھ رسالوں نے بھی زبردست کردار ادا کیا ہے۔ اردو میں ایسے رسالے جن میں تعلیم و تدریس کے مسائل زیرِ بحث آتے تھے، اُنیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں ہی نکلنے لگے تھے۔ اِس سلسلے میں لاہور کے دو رسالے[229] معلّمِ ہند اور[230] معلم العلوم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا جولائی ۱۸۵۴ء میں اور دوسرا مئی ۱۸۵۶ء میں نکلا تھا۔ یہ دونوں ماہوار رسالے تھے۔ ان کی اشاعت نے دوسرے علمی رسالوں کے لیے بھی گویا تحریک کی چنانچہ ۱۸۶۲ء میں لاہور ہی سے ایک طبّی رسالہ[231] بحرِ حکمت جاری ہوا۔ یہ پندرہ روزہ تھا۔ اس کے بعد مختلف موضوعات سے متعلق علمی رسالوں کا سلسلہ چل پڑا زراعت و کاشتکاری سے متعلق کئی رسالے نکلے۔ اُن میں ہوشیار پور کا پندرہ روزہ رسالہ اتالیقِ[232] ہند، اور لاہور کے ماہوار رسالے انجنیئرِ[233]نگ گائڈ اور[234] انڈین آرکٹیکٹ بھی تھے، ان میں سے پہلا اپریل ۱۸۷۷ء میں اور بعد کے دو ۱۸۸۵ء میں جاری ہوئے لیکن راقم کو کسی ایسے رسالے کا علم نہیں ہے جو اس زمانے میں خالص سائنسی موضوعات اور جغرافیہ، تواریخ یا ریاضی سے متعلق رہا ہو۔

بات رسالوں کی ہے اس لیے یہ ذکر ضروری ہے کہ اردو میں تبلیغی مقاصد کے لیے رسالے نکالنے کا خیال سب سے پہلے عیسائی پادریوں کو ہُوا۔ پادری عماد الدین نے "حقایقِ عرفان" کے نام سے امرتسر سے ایک ماہنامہ جنوری ۱۸۶۸ء میں نکالا، پھر پادری رجب علی نے نومبر ۱۸۷۳ء میں اُسی شہر سے ایک ہفتہ وار "[236] ہندو پرکاش" کے نام سے جاری کیا۔ ثانی الذکر کے نام سے ظاہر ہے کہ اِس کے مخاطب خصوصیت کے ساتھ ہندو تھے۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے کوئی ڈیڑھ برس بعد اپریل ۱۸۷۵ء میں ایک ماہوار رسالہ "[237] ہندو باندھو"، کے نام سے جاری کیا گیا اور پھر تو صدی کے خاتمہ تک ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور ذاتوں کی طرف سے اردو میں ڈیڑھ درجن سے بھی زیادہ رسالے نکلنے لگے۔ ان حالات نے مسلمانوں کو بھی متوجہ کیا۔ ۱۸۷۸ء میں لاہور سے اہلِ حدیث کا ماہوار رسالہ "[238] اشاعۃ السنہ" جاری ہوا۔ پھر کوئی چھ برس کے بعد لاہور میں

انجمن حمایت الاسلام قائم ہوئی اور اُسی سال یعنی ۱۸۸۴ء سے اِس انجمن کا ماہوار[۲۳۹] رسالہ نکلنے لگا جس کے بنیادی مقاصد میں " عیسائیوں کی تبلیغ کا سدِباب کرنا " بھی شامل تھا۔ مختلف ذاتوں، فرقوں اور جماعتوں کے اِن رسالوں میں نثر و نظم میں جو چھپتا تھا، وہی اردو دنیا کے فکر و عمل کا آئینہ دار تھا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس نے بالآخر علم و ادب کو بھی ذاتوں، اور مذہبوں میں تقسیم کردیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس ڈھیر میں مسلمانوں کے عقاید سے متعلق رسالوں کی تعداد پچیس فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔

گزشتہ اوراق میں کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے، اُس کے مکمل ہونے کا دعوا نہیں کیا گیا ہے لیکن اِس میں شبہ نہیں کہ اِس سے سائنسی مضامین و مباحث کے ساتھ اردو داں حلقے کی دل چسپی میں اُتار چڑھاؤ کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اِس سے یہ معلوم کرلینا بھی ممکن ہے کہ اِس حلقے میں معاملات و مسائل پر غور و فکر کا انداز مختلف زمانوں اور علاقوں میں کیا اور کیسا رہا ہوگا۔

اہل دہلی کے یہاں معمولاً سائنسی موضوعات سے دل چسپی نہیں رہی ہے۔ وہ قلبی واردات پر جان چھڑکنے والے لوگ تھے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو بہترین انداز سے پیش کردینے پر قدرت رکھتے تھے۔ اِن کے اقوال کا نمونہ یہ ہے

ع مستند ہے میرا فرمایا ہُوا میرؔ

ع اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے غالبؔ

ع ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے داغؔ

یہ شاعر تھے اور کہتے تھے کہ شعر کہنا وہ شخص کیا جانے[۲۴۱] جس نے نہ شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا "

سائنسی فکر و مزاج کا تعلق اِس بات سے ہرگز نہیں ہے کہ متعلق شخص نے سبقاً سبقاً سائنس کی کتابیں پڑھی ہیں یا نہیں۔ یہ ایک فطری ملکہ ہے جو سازگار حالات میں

ترقی کرتا ہے اور ناموافق ماحول میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس سے مراد حق پسندی حق بینی اور حق گوئی ہے۔ راقم کے نزدیک فطرتاً کوئی بھی شخص اِس ملکہ سے پوری طرح محروم نہیں ہوسکتا۔ اہلِ دہلی کے بارے میں یہ دعوا صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ سائنسی نظر سے عاری تھے "دل" کی باتیں کرنے کے باوجود کم سے کم اس حد تک تو یہ ملکہ ان کے یہاں ضرور موجود تھا کہ وہ اپنی بات کو اس طرح کہتے ہیں کہ وہ سُننے والوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ دہلی میں کچھ اہلِ قلم ایسے ضرور موجود تھے جو زندگی کے حقائق اور علمی مسائل کا بیان کرتے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ اپنے زمانے میں وہ مقبول ہوئے اور اس کلام میں افادیت بھی تھی مثلاً:

پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مردوں کا منہ　　شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں
جتنا خورشید تپے، اتنی ہی بارش ہو سوا　　ہو وے کیونکر تپش عشق نہ رحمت کی دلیل

لیکن اکثر ناقدوں کا اتفاق ہے کہ یہ طرزِ فکر و بیان اہلِ لکھنؤ کا اثر ہے۔

لکھنؤ میں جیسا کہ مذکور ہوا، کچھ مدّت ایسی ضرور گزری تھی جب وہاں سائنسی موضوعات سے دل چسپی لی گئی تھی۔ اُس زمانے کے شاعروں کا کلام دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اسے حقائق اور واقعات سے تعلق ہے، مثال کے طور پر اُس زمانے کے مرثیہ گو میاں دلگیر کہتے ہیں ؎

سند سے سچ ہے کہ خالی مرا کلام نہیں

غزل گو شاعر بھی خیال رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مدلل ہو، بلکہ وہ ہر لفظ کی معنویت اور صحت پر بھی نظر رکھتے تھے، اِسی لیے اُن کا دعوا ہے کہ ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

کانپور ملکِ نصارا تھا جہاں شفاخانے اور اسکول بھی انگریزوں کے تعلیم سے معالجے تک اہلِ کانپور کی زندگی کے تمام شعبوں میں اُن کے فوائد جاری پھر وہاں صنعتوں کا زور ہوا۔ کانپور والوں کی زندگی کا انحصار بیشتر صنعت و تجارت پر تھا۔ اس نے اُن کو مسائل پر غور و فکر کرنے اور انجام پر نظر رکھنے کا عادی بنا دیا

نا۔ وہ خیالوں کی دنیا میں رہنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جذبات کی رو میں بہہ جانا ان
ے مزاج کے خلاف تھا۔ انھوں نے غزل کو بھی بیانِ واقعات کا ذریعہ بنالیا مثلاً نواب
مین الدولہ مہرؔ کہتے ہیں ؎

ہم کو شہا دیس نکالا ملا — تا بہ گدا دیس نکالا ملا
لکھنو تھا جسم تو ہم جان تھے — آئی قضا، دیس نکالا ملا
شاہ ہم اس ملک کے دیوانے ہیں — بے سرو پا دیس نکالا ملا
ظلم ہے شیطان، بنی آدم ہیں ہم
مہرؔ بجا دیس نکالا ملا

ہ ایسی ردیفیں اختیار کرتے ہیں جن میں کسی نظم کا عنوان بن جانے کی لیاقت موجود
ہوتی ہے۔ ایک سے زاید شاعروں نے اپنے دیوان میں تاریخی مقطعے کہے ہیں[۲۴۲]۔ اہلِ
انپور کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور ربط موجود ہے۔ اُن پر بے ربطی اور
ہمواری کا الزام عاید نہیں ہوتا۔

دہلی میں عالمگیر اورنگ زیب کے زمانے میں تحریر اور املا سے متعلق بعض[۲۴۳]
سائل سامنے آئے تھے لیکن انیسویں صدی تک عملاً (اور غالباً عملاً بھی) اُن کو فراموش
یا جا چکا تھا۔ اہلِ لکھنؤ نے مسائل پر غور کیا اور اکثر ایسے اصول وضع کیے جن پر آج
ی[۲۴۴] عمل کیا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں لفظ "پہنچنا" کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔
اٹھارھویں صدی کے ربع ثالث تک اِس لفظ کا تلفظ "پھونچ" (بائے فارسی
خلوط الہا بہ واد کشیدہ) تھا۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کہتے ہیں ؎

تیرے فیضِ نگاہ کو ہر گاہ — پھونچ کر جا ہیے ہو مغرور

میر علی اوسط رشکؔ لکھنوی نے ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں لکھا ہے:

"[۲۴۵] پوہنچا۔ ایں لغت ہمیں است، چہ اگر ہائے ہوز بعد بائے فارسی
نویسند بائے فارسی مخلوط الہا شود، فتامل۔"

لیکن بعض اہلِ لکھنؤ کو اس سے اختلاف ہے۔ نواب سید محمد خاں رندؔ کہتے ہیں:

ع پہنچتی ہے شکست اک دن بتوں سے شیشۂ دل پر

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ والے اِس نقطے کے تلفظ اور املا کے بارے میں غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن دہلی میں مرزا اسداللہ خاں غالب نے نواب یوسف علی خاں (رامپور) کے نام ایک خط میں لکھا ہے :[۲۴۶]

"لفافہ مجھ تک پہونچا"

اہل کلکتہ نے املا اور تحریر کے مسائل سے متعلق اور پہلے بعض نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے زمانے ہی میں حرف تالی ہندی کو مختصر 'ط'[۲۴۷] کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس طرح۔ ٹ

اہل لکھنؤ ان سے پیچھے رہ گئے۔ وہ انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں اِسے دو نقطوں اور ایک مختصر 'ط' کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس طرح :- ٹ

لیکن مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی ساتویں عشرے میں بھی 'ٹ' پر چار نقطے بناتے رہے، اِس طرح — ٹ

اردو زبان سے متعلق جو لغتیں تیار کی گئی تھیں، ان پر نگاہ کریں تو اُس سے بھی مُلک کے مختلف مراکز کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ ذیل میں بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

مستشرقین نے جو لغتیں اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں شائع کی تھیں، اُن سے قطع نظر، اردو کے اوّلین لغات میں مرزا جان طپش کی کتاب "شمس البیان[۲۴۸] فی مصطلحاتِ ہندوستان" بھی ہے جو مطبعِ آفتابِ عالمتاب مرشدآباد میں ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء میں چھپی تھی۔

کانپور و لکھنؤ میں اردو کا پہلا لغت مرتب کرنے کا سہرا امیر علی اوسط رشک کے سر ہے۔ ان کا لغت جس کا تاریخی نام نفس اللغہ ہے، بہ گمانِ غالب مکمل تو ہو گیا تھا لیکن اس کا صرف ایک حصہ چھپ سکا ہے اور وہی[۱۲] دستیاب ہے۔

آگرے[۲۴۹] سے سید احمد علی کی کتاب لغاتِ غریب ۱۸۵۰ء میں چھپی تھی۔ اِس کے

•

ایک برس بعد جو لغات چھپے، اِس طرح ہیں:

۲۵۰ مفتاح اللغات۔ سید محمد۔ دہلی ۱۸۵۱ء

۲۵۱ خزینۃ الامثال۔ عبدالرحمان شاکر۔ مطبع مصطفائی کانہ پور (کانپور)

۱۲۷۰ھ/۵۴-۱۸۵۳ء — ۲۲۴ صفحے

۲۵۲ اے وو کیبلری (حصہ اول، انگریزی سے ہندوستانی۔ ۲۰۲ صفحے، حصہ دوم، ہندوستانی سے انگریزی۔ ۷۳ صفحے)۔ امریکن مشین پریس، مدراس۔ ۱۸۵۳ء

انیسویں صدی کے وسط تک دو اور لغتوں کا حال معلوم ہوتا ہے لیکن وہ دونوں بھی لکھنؤ ہی سے تعلق رکھتی ہیں:

۲۵۳ لغات السعید۔ محمد حصار۔ مطبع حسنی، لکھنو ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء بطرز خالق باری

۲۵۴ انفس النفائس۔ اوحدالدین بلگرامی۔ مطبع حسنی لکھنؤ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء — ہندی فارسی، عربی کا لغت ہے۔

صدی کے نصف آخر میں الٰہ آباد، بمبئی، پٹنہ، بھوپال، حیدر آباد، لاہور وغیرہ سے بھی اردو کے لغات شائع ہوئے لیکن تعداد کے لحاظ سے کانپور سب سے آگے معلوم ہوتا ہے اور اس کے بعد لکھنؤ ہے۔

اردو قواعد کی کتابیں انیسویں صدی کے نصف اوّل میں کلکتہ، مدراس اور پھر دہلی سے چھپی تھیں۔ نصف آخر میں البتہ اِس موضوع سے متعلق بھی سب سے زیادہ کام پنجاب خصوصاً لاہور میں کیا گیا تھا۔

تذکیر و تانیث کے مسائل سے متعلق غور و فکر کا سلسلہ تو انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہو چکا تھا لیکن اِس موضوع سے متعلق جداگانہ کتابیں لکھنے کا کام اُس صدی کے ربع آخر میں کیا گیا اور لکھنؤ اِس باب میں سب سے پیش پیش رہا۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ میر آمن دلّی والے نے اپنی کتاب "باغ و بہار" کے آغاز میں لکھا تھا:

"صاحبانِ ذیشان کو شوق ہوا کہ اردو زبان سے واقف ہو کر

ہندوستانیوں سے گفت وشنود کریں ۔۔۔ جان گلکرسٹ صاحب
نے فرمایا کہ اِس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں جو اردو کے لوگ
ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے
ہیں ترجمہ کرو ۔۔۔ میر امن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ ۔۔۔ جو شخص سب
آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں گزریں
۔۔۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا
البتہ ٹھیک ہے۔"

مرزا رجب علی بیگ سرور نے بہ عالم غریب الوطنی اپنی مشہور کتاب "فسانۂ عجائب" لکھی جسے وہ بادشاہِ لکھنؤ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دیباچے میں لکھنؤ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ:

"جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے کسی نے کبھی سُنی ہو سُنائے لکھی دیکھی ہو دکھائے ۔۔۔ میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں، محاورے کے ہاتھ مُنہ توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بد نام ہوتا ہے ۔۔۔
نیازمند کو تحریر سے نمود نظم ونثر و جودتِ طبع کا خیال نہ تھا، شاعری کا خیال نہ تھا بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل عربی و فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اُسے دور کیا اور جو سہل ممتنع محاورے کا تھا وہ رہنے دیا۔"

اہلِ دہلی کو سرور کی یہ عبارت ناگوار ہوئی چنانچہ سروشِ سخن وغیرہ کتابیں لکھ اِس کا جواب دینا چاہا لیکن سچ یہ ہے کہ فسانۂ عجائب کا جواب بن نہیں پڑا۔ اِس کے برخلاف ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ نے لکھنؤ کے بعض اساتذہ کے کلام پر اپنے رسالہ انتخابِ نقص[۵۵] میں کچھ اعتراض کیے تھے۔ اس کے جواب میں لکھنؤ والوں کی طرف سے

رسالے شائع کیے گئے اُن میں سے بعض یہ ہیں:

گستاخی معاف۔ سید مرتضا گستاخ بن سید علی امروہوی۔ مطبع شعلۂ طور کانپور ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء۔ ۸۱ صفحے

تطہیر الاوساخ للنسخ الناسخ۔ مرزا محمد رضا معجز۔ مطبع شعلۂ طور کانپور ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء۔ ۱۵۱ صفحے

سنانِ دلخراش۔ منیر شکوہ آبادی۔ تفضیح اودھ پریس لکھنؤ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء۔ ۲۱۱ صفحے

تفضیح۔ مولوی آغا علی۔ مطبع اودھ، لکھنؤ

اِن کے جواب میں نسّاخ کی طرف سے بھی بعض چیزیں چھپیں۔ ایک کتاب یہ ہے:

طومارِ اغلاط۔ عصمت اللہ النسخ۔ میڈیکل پریس آگرہ۔

اِن کتابوں سے جانبین کے عیوب و نقایص، یا شعر اور زبان و بیان کے اصول وضوابط سے واقفیت یا عدم واقفیت کا پتا نہیں چلتا ہے بلکہ اِن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات محض دعوے کرنے کے عادی نہیں تھے۔ یہ جو کہتے یا لکھتے تھے، اُس کے لیے اپنے پاس جواز اور دلائل بھی رکھتے تھے۔ اِس کا امکان ہے کہ اِن معرکوں میں بعض باتیں محض اپنی بات کو نباہنے کے لیے یا کسی خاص تعصب سے کہی گئی ہوں لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ اِنھی اختلافی بحثوں نے حقیقت تک رسائی کے شوق اور جذبہ کو ابھارا تھا اور جس چیز کو آج ہم سائنسی نظر کہتے ہیں وہ انھیں مباحث کی دین ہے۔

حواشی، حوالے

۱. مثلاً کتاب "شری وگیان راماین" کے بارے میں کہا گیا ہے: "ایسی کتاب سنسکرت زبان میں بھی نہ نکلے گی" (شیو شنبھو، لاہور، جنوری ۱۹۱۷ء ص ۶-۱ — اور دوسرے شماروں میں بھی)۔

۲۔ ترجمہ ہا ص ۳۲۶

۳ ایضاً ص ۳۲۰

۴۔ انجمن جلد ۳ ص ۵۶

(۵) آصفیہ جلد ا ص ۲۹۱، ۲۹۲

(۶) نفس اللغۃ ص ۵۶

(۷) ایضاً ص ۹۶

(۸) آصفیہ جلد ا ص ۲۸۷

(۹) ان کے حالات میں جناب نصیرالدین ہاشمی کی ایک تالیف "شمس الامرا کے علمی کارنامے" ہے۔ افسوس ہے کہ وہ کتاب ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔

(۱۰) دکن میں اردو ص ۵۲۰

(۱۱) ایضاً ص ۵۲۱ تا ۵۲۲

(۱۲) تراجم ص ۱۰۲
(۱۳) دکن میں اردو ص ۴۷۵
(۱۴) انجمن جلد ۳ ص ۳۴
(۱۵) تراجم ص ۲۶۲
(۱۶) شاہانِ اودھ ص ۷۸
(۱۷) دکن مین اردو ص ۵۲۲
(۱۸) تراجم ص ۲۰۵
(۱۹) آصفیہ جلد ۱ ص
(۲۰) انجمن جلد ۳ ص ۲۰ وغیرہ
(۲۱) آصفیہ جلد ۱ ص ۲۷۶
(۲۲) ایضاً ص ۲۷۶
(۲۳) ایضاً ص ۲۷۹
(۲۴) ایضاً ص ۲۷۳
(۲۵) تراجم ص ۱۴۰
(۲۶) تراجم ص ۱۴۳
(۲۷) ایضاً ص ۳۸۶
(۲۸) دہلی ص ۲۳
(۲۹) تراجم ص ۳۸۷
(۳۰،۳۱) ایضاً ص ۳۸۶
(۳۲) ایضاً ص ۳۸۷
(۳۳) ایضاً ص ۳۸۶
(۳۴) ایضاً ص ۱۹۶
(۳۵) نفس اللغۃ ص ۲۱
(۳۶) نفس اللغۃ ص ۷۴۱
(۳۷) سائنٹسی ادب ص ۳۷
(۳۸) ایضاً ص ۳۶
(۳۹) تراجم ص ۱۸۸
(۴۰) آصفیہ جلد ۱ ص ۸۳
(۴۱) تراجم ص ۱۸۶
(۴۲) ایضاً ص ۱۱۵
(۴۳) ایضاً ص ۱۸۱
(۴۴) سائنٹسی ادب ص ۳۶
(۴۵) تراجم ص ۱۸۴
(۴۶) نفس اللغۃ ص ۱۹
(۴۷) ایضاً ص ۵۶
(۴۸) زرعی کتب ص ۵۳
(۴۹) موزۂ ملّی ص ۷
(۵۰) تلخیص ملّا ص ۲۶
(۵۱) حیاتِ جاوید ص ۶۱
(۵۲) ایضاً ص ۶۶
(۵۳) ایضاً ص ۶۷
(۵۴) تراجم ص ۳۳۲
(۵۵) ایضاً ص ۳۲۹
(۵۶) زرعی کتب ص ۶۹
(۵۷) تراجم ص ۱۰۷
(۵۸) ایضاً ص ۲۰۵

(۵۹) تراجم ص ۲۱۷
(۶۰) ایضاً ص ۱۴۱
(۶۱) ایضاً ص ۲۱۹
(۶۲) ایضاً ص ۲۲۱
(۶۳) سائنسی ادب ص ۸۷
(۶۴) تراجم ص ۱۰۰، ۱۰۱
(۶۵) ایضاً ص ۱۸۱
(۶۶) ایضاً ص ۱۴۰
(۶۷) ایضاً ص ۱۳۵
(۶۸) ایضاً ص ۱۰۱
(۶۹) سائنسی ادب ص ۱۴۸
(۷۰) تراجم ص ۴۰
(۷۱) ایضاً ص ۲۱۲
(۷۲) ایضاً ص ۱۴۸
(۷۳) ایضاً ص ۱۰۶، ۳۹۲
(۷۴) سائنسی ادب ص ۲۴۲
(۷۵) تراجم ص ۳۴
(۷۶) ایضاً ص ۳۸
(۷۷) زرعی کتب ص ۵۲
(۷۸) دہلی کالج ص ۱۳۷، ۱۳۸
(۷۹) تراجم ص ۱۸۶
(۸۰) ایضاً ص ۲۴۲
(۸۱) ایضاً ص ۱۰۶
(۸۲) تراجم ص ۱۰۱
(۸۳) ایضاً ص ۲۱۳
(۸۴) ایضاً ص ۱۳۵
(۸۵) تراجم ص ۱۴۶
(۸۶) ایضاً ص ۳۵
(۸۷) ایضاً ص ۳۸۶
(۸۸) ایضاً ص ۲۱۵
(۸۹) ایضاً ص ۲۱۵
(۹۰) ایضاً ص ۲۰۸
(۹۱) ایضاً ص ۲۱۸
(۹۲) ایضاً ص ۳۱۸
(۹۳) ایضاً ص ۱۸۳
(۹۴) ایضاً ص ۲۱۶
(۹۵)
(۹۶) تراجم ص ۱۴۵
(۹۷) تراجم ص
(۹۸) ایضاً ص ۱۳۷
(۹۹) سائنسی ادب ص ۶۳
(۱۰۰) ایضاً ص ۵
(۱۰۱) ایضاً ص ۲۹
(۱۰۲) ایضاً ص ۵۲
(۱۰۳) تراجم ص ۱۸۱
(۱۰۴) سائنسی ادب ص ۱۲۹

(۱۰۵) تراجم ص ۱۱۴
(۱۰۶) ایضاً ص ۱۴۷
(۱۰۷) حیاتِ جاوید ص ۱۳۷
(۱۰۸) ایضاً ص ۱۳۷
(۱۰۹) تراجم ص ۲۰۸
(۱۱۰) سائنسی ادب ص ۱۲۸
(۱۱۱) ایضاً ص ۳۳
(۱۱۲) ایضاً ص ۳۳
(۱۱۳) ایضاً ص ۶
(۱۱۴) تراجم ص ۱۸۱
(۱۱۵) سائنسی ادب ص ۲۴۶
(۱۱۶) تراجم ص ۲۵۲
(۱۱۷) ایضاً ص ۱۹۱
(۱۱۸) ایضاً ص ۱۹۵
(۱۱۹) ایضاً ص ۱۹۵
(۱۲۰) تراجم ص ۱۴۹
(۱۲۱) ایضاً ص ۱۰۱
(۱۲۲) ایضاً ص ۱۳۶
(۱۲۳) ایضاً ص ۲۰۰
(۱۲۴) تراجم ص ۲۰۵
(۱۲۵) ایضاً ص ۲۸۵
(۱۲۶) ایضاً ص ۱۰۰
(۱۲۷) سائنسی ادب ص ۴۳
(۱۲۸) تراجم ص ۱۸۱
(۱۲۹) سائنسی ادب ص ۲۰۴
(۱۳۰) ایضاً ص ۱۴۳
(۱۳۱) ایضاً ص ۱۲۶
(۱۳۲) ترجمہ ہا ص ۱۸۹
(۱۳۳) سائنسی ادب ص ۱۲۷
(۱۳۴) ایضاً ص ۵
(۱۳۵) ایضاً ص ۴۰
(۱۳۶) ایضاً ص ۴۲
(۱۳۷) تراجم ص ۱۸۷
(۱۳۸) ترجمہ ہا ص ۱۷۶
(۱۳۹) سائنسی ادب ص ۱۴۷
(۱۴۰) ایضاً ص ۲۱
(۱۴۱) ایضاً ص ۴۷
(۱۴۲) تراجم ص ۳۸۶
(۱۴۳) تراجم ص ۱۳۹
(۱۴۴) ایضاً ص ۱۴۱
(۱۴۵) سائنسی ادب ص ۲۴۸
(۱۴۶) تراجم ص ۱۹۳
(۱۴۷) سائنسی ادب ص ۱۲۷
(۱۴۸) زرعی کتب ص ۱۴
(۱۴۹) سائنسی ادب ص ۳۴
(۱۵۰) ایضاً ص ۱۳۲

(۱۵۱) تراجم ص ۱۰۱
(۱۵۲) ایضاً ص ۱۰۸
(۱۵۳) ایضاً ص ۱۱۷
(۱۵۴) ایضاً ص ۱۹۰
(۱۵۵) ایضاً ص ۳۰۰
(۱۵۶) سائنسی ادب ص ۲۴۸
(۱۵۷) تراجم ص ۴۴
(۱۵۸) دکن میں اردو ص ۶۴۰
(۱۵۹) تراجم ص ۱۸۱
(۱۶۰) سائنسی ادب ص ۶۶
(۱۶۱) سائنسی ادب ص ۱۲۶
(۱۶۲) زرعی کتب ص ۵۸
(۱۶۳) سائنسی ادب ص ۵۸
(۱۶۴) ایضاً ص ۴۸
(۱۶۵) تراجم ص ۳۴
(۱۶۶) سائنسی ادب ص ۴
(۱۶۷) ایضاً ص ۱۰۳
(۱۶۸) ایضاً ص ۱۰۴
(۱۶۹) زرعی کتب ص ۶۳
(۱۷۰) سائنسی ادب ص ۲۴۷
(۱۷۱) ایضاً ص ۳۹
(۱۷۲) ایضاً ص ۴۲
(۱۷۳) ایضاً ص ۶۰
(۱۷۴) تراجم ص ۱۰۳
(۱۷۵) سائنسی ادب س ۱۲۷
(۱۷۶) ایضاً ص ۲۴۵
(۱۷۷) ایضاً ص ۲۶۴
(۱۷۸) ایضاً ص ۹۱
(۱۷۹) سائنسی ادب ص ۶۳
(۱۸۰) ایضاً ص ۵۰
(۱۸۱) ایضاً ص ۲۳
(۱۸۲) زرعی کتب ص ۵۶
(۱۸۳) سائنسی ادب ص ۷۴
(۱۸۴) تراجم ص ۱۰۱
(۱۸۵) ایضاً ص ۱۰۰
(۱۸۶) سائنسی ادب ص ۳
(۱۸۷) ایضاً ص ۴۸
(۱۸۸) ایضاً ص ۳۴
(۱۸۹) زرعی کتب ص ۱۴
(۱۹۰) ایضاً ص ۶۳
(۱۹۱) ایضاً ص ۱۵۳
(۱۹۲) تراجم ص ۱۵۷
(۱۹۳) ایضاً ص ۱۷۰
(۱۹۴) ایضاً ص ۱۶۱
(۱۹۵) ایضاً ص ۱۵۳
(۱۹۶) سائنسی ادب ص ۱۹

(۱۹۷) سائنسی ادب ص ۴۹
(۱۹۸) ایضاً ص ۴۹
(۱۹۹) ایضاً ص ۲۳
(۲۰۰) ایضاً ص ۱۲۸
(۲۰۱) ایضاً ص ۱۲۸
(۲۰۲) سائنسی ادب ص ۶۰
(۲۰۳) ایضاً ص ۱۳۱
(۲۰۴) ایضاً ص ۲۴۸
(۲۰۵) تراجم ص ۱۳۶
(۲۰۶) سائنسی ادب ص ۵۸
(۲۰۷) ایضاً ص ۱۰۱
(۲۰۸) تراجم ص ۱۸۶
(۲۰۹) تراجم ص ۱۸۹
(۲۱۰) سائنسی ادب ص ۴۳-۴۷
(۲۱۱) ایضاً ص ۱۰۶
(۲۱۲) ایضاً ص ۵۴
(۲۱۳)
(۲۱۴) زرعی کتب ص ۲۱
(۲۱۵) سائنسی ادب ص ۱۶
(۲۱۶) ایضاً ص ۵۶
(۲۱۷)
(۲۱۸) سائنسی ادب ص ۷۰
(۲۱۹) ایضاً ص ۷۴
(۲۲۰) سائنسی ادب ص ۵۸
(۲۲۱) ایضاً ص ۳
(۲۲۲) ایضاً ص ۱۳۱
(۲۲۳) ایضاً ص ۲۴۷
(۲۲۴) ایضاً ص ۴۳
(۲۲۵) ایضاً ص ۳
(۲۲۶) ایضاً ص ۱۰۸
(۲۲۷) سائنسی ادب ص ۵
(۲۲۸) ایضاً ص ۵۶
(۲۲۹) اخبارات جلد ص ۲۰۶
(۲۳۰) ایضاً ص ۲۰۶
(۲۳۱) ایضاً ص ۶۵
(۲۳۲) اخبارات ص ۲۲
(۲۲۳) ایضاً ص ۵۶
(۲۳۴) ایضاً ص ۵۷
(۲۳۵) ایضاً ص ۱۰۵
(۲۳۶) ایضاً ص ۲۳۵
(۲۳۷) ایضاً ص ۲۳۵
(۲۳۸) ایضاً ص ۳۴
(۲۳۹) ایضاً ص ۱۰۶

(۲۴۰) مہرشی شیو برت لال ورمن نے اپنے مشہور ناول " شاہی لکڑ ہارا " میں لکھا ہے کہ:

"میں اردو کے ذریعہ ہندی زبان کی اشاعت کرنا چاہتا ہوں۔ میری زبان کھچڑی ہے، جس میں ہندی سنسکرت کے لفظ بہ کثرت آتے ہیں۔ یہ میں جان بوجھ کر کرتا ہوں تاکہ ہندی کے لفظ پڑھنے والوں کی زبان پر چڑھ جائیں " (ص ۳)

یہ رجحان شعوری یا غیر شعوری طور پر فورٹ ولیم کالج کے داستان نویس نہالچند لاہوری کی "گل بکاولی" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اِس میں ترقی ہوگئی اور بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں " قوم کے لیے خالص ہندو لٹریچر فراہم " کرنے کی فرمائش کا اعلان شائع ہوا اور کہا گیا کہ "اس قومی یگیہ میں معاون بن کر اِس مشن کو کامیاب بنائیں " زمان سرور، دسمبر ۳۰ ۱۹ء ص ۲)

(۲۴۱) مکتوب ذکار اللہ۔ نگار رامپور، فروری ۱۹۶۳ء

(۲۴۲) علی ضامن شوقؔ کے لیے کہا گیا ہے کہ اِن کی ہر غزل کا مقطع تاریخی ہوتا ہے (سخن شعرا ص ۲۵۶) امین الدولہ مہرؔ اور حکیم کاشفؔ کے دیوان میں بھی کئی غزلوں کے مقطعے تاریخی ہیں۔

(۲۴۳) پنجاب میں اردو ص ۱۶، اردو کے حروفِ تہجی ص ۶۳ تا ۶۶

(۲۴۴) نفس اللغہ ص ۲۲/ ۱۱۸ وغیرہ، تلخیص معلا ص ۷۴ تا ۸۷، ۱۰۲ وغیرہ

(۲۴۵) نفس اللغہ ص ۱۱۸

(۲۴۶) مرقعِ غالب

(۲۴۷) اردو کے حروفِ تہجی ص ۴۰ تا ۴۶

(۲۴۸) لغات اردو ص ۱۳۱

(۲۴۹) ایضاً ص ۷

(۲۵۰) لغاتِ اردو ص ۲۹

(۲۵۱) ایضاً ص ۱۳۱

(۲۵۲) لغاتِ اردو ص ۶۱
(۲۵۳) ایضاً ص ۱۱۵
(۲۵۴) ایضاً ص ۱۱
(۲۵۵) انتخابِ نقص، مطبعِ نظامی کانپور میں محرم ۱۲۹۶ھ/جنوری ۱۸۷۹ء میں چھپا تھا۔

ماخذ

اردو کے حروفِ تہجی۔ محمد انصار اللہ مطبع علی گڑھ ۱۹۷۲ء

اردو میں زرعی کتب (کتابیات) زینت قاسمی۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ۱۹۸۷ء

اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مقتدرہ قومی زبان کراچی ۱۹۸۱ء

پنجاب میں اردو۔ حافظ محمود خاں شیرانی۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۸ء

ترجمہ ہائے متون فارسی بہ زبانہائے پاکستان۔ اختر راہی۔ مرکز تحقیقات فارسی، اسلام آباد ۱۹۸۶ء

تلخیص معلا۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر مرتب محمد انصار اللہ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۶ء

حیاتِ جاوید۔ الطاف حسین حالی ترقی اردو بورڈ، دہلی ۱۹۷۰ء

دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی ترقی اردو بورڈ، دہلی ۱۹۸۵ء

دہلی کے اردو مخطوطات۔ ڈاکٹر صلاح الدین انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۷۵ء

شاہان اودھ کے کتب خانے مترجم محمد اکرام چغتائی انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۳ء

فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی، موزۂ ملی پاکستان کراچی۔ سید عارف نوشاہی مرکز تحقیقات فارسی، اسلام آباد ۱۹۸۳ء

فہرست اردو مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ (جلد اول)۔ نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد ۱۹۶۱ء

کتابیاتِ پاکستان کے اخبارات و رسائل ۱۹۴۷ء۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری
مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء (د۔ اخبارات)
کتابیاتِ تراجم (جلد اول) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔ مقتدرہ قومی زبان۔
اسلام آباد ۱۹۸۶ء
کتابیات لغات اردو۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری مقتدرہ قومی زبان
اسلام آباد ۱۹۸۶ء
کتابیات قواعد اردو ایضاً ایضاً ۱۹۸۵ء
مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد سوم) افسر صدیقی امروہوی۔ انجمن ترقی
اردو کراچی ۱۹۷۵ء (د۔ انجمن)
مرحوم دہلی کالج۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۴۵ء
مرقع غالب۔ پرتھوی چندر۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

غالب اور مغرب

غالب انیسویں صدی کے ایک ایسے دور سے وابستہ ہیں، جو تاریخی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے ایک بحرانی اور انقلابی دور سے موسوم کیا جا سکتا ہے، اس دور میں صدیوں کی مغلیہ سلطنت کو اپنے تہذیبی اور سماجی اقدار کے ساتھ انتشار اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ غدر کے نتیجے میں آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کو تخت سے اتار کر رنگون جلا وطن کیا گیا، انگریزی سامراجیت ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اقتدار پر قابض ہوگئی، انگریز ملکی قبضے کو مستحکم کرنے کے ساتھ ہی اپنی تعلیم، افکار اور تہذیب، نیز سائنسی معلومات و ایجادات کی فیوض و برکات کو عام کرنے لگے، اور ملک میں ایک نشاۃ الثانیہ کے دور کا آغاز ہوا، یہ ایک عجیب متضاد صورتِ حال تھی، جس کا سامنا لوگ کرتے رہے، زوال رسیدہ تہذیب کے ساتھ لوگوں کے جو جذباتی رشتے تھے، ان کی عاجلانہ تنسیخ ناممکن تھی، اور نئے مغربی تہذیب کے اقتدار کے بارے میں، جس کی صورت غیر واضح تھی، کے بارے میں کوئی ٹھوس رائے قائم کرنا مشکل تھا، ظاہر ہے ملک کے شاعر اور دانشور بھی ایک گومگو کی حالت میں تھے اس تاریخی موڑ پر سر سید احمد خاں سامنے آئے، اور اُنھوں نے مغربی اقتدار کی برتری اور ناگزیریت کو تسلیم کرکے، اس کی برکتوں سے مستفیض ہونے پر اصرار کیا اور مسلمانوں

کی ذہنی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی، راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں ہندوؤں کے لیے یہ کام انجام دیا۔

انیسویں صدی کے وسط سے بین الاقوامی سطح پر اہم اور دور رس ذہنی اور معاشرتی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، انگلستان میں ۱۸۳۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے بعد ہی تبدیلیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اِس سے قبل کلاسکیت کے ردعمل کے طور پر مفکروں اور ادیبوں کے طرزِ فکر پر رومانی شدت کا غلبہ تھا، لیکن وکٹورین عہد میں رومانیت کے وفور میں کمی واقع ہونے لگی، اور پھر ایک بار کلاسیکی نظم وضبط، روایت پسندی، توازن اور عقلیت کی بحالی پر زور دیا جانے لگا، موہوم خوابوں اور آرزؤں کو ذہنی اور فکری تگ وتاز کی منزل بنانے کے بجائے ٹھوس حقیقتوں اور عملی زندگی کے امکانات کو دریافت کرنے کا رجحان تقویت پانے لگا۔

انیسویں صدی کو سائنسی ترقی کا عہد قرار دیا جاتا ہے، سائنس کی نت نئی ایجادات نے انسانی شعور کی توسیع میں نمایاں رول ادا کیا، انسان کو اپنی شخصیت کی بے پناہ قوتوں کی آگاہی ہوئی، وہ مظاہرِ فطرت پر قابو پانے لگا، اور صدیوں کی لاعلمی، غفلت اور توہم پرستی کے شکنجوں کو توڑ کر عقل وادراک کے آزادانہ عمل سے حقیقت کا سامنا کرنے لگا وہ مفروضات پر تکیہ کرنے کے بجائے تجزیاتی نقطۂ نظر سے حقیقت کا ادراک کرنے لگا اور زندگی کے عملی اور ٹھوس نتائج کو اہمیت دینے لگا، انیسویں صدی کے شعور کی بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ وہ عقلی اور استدلالی ہے، اور یہ بیداری اور ترقی کی جملہ تحریکات کے پس پشت کام کرتا رہا۔

غالب نے ۱۸۲۸ء میں تیس سال کی عمر میں کلکتہ کا سفر کیا، کلکتہ کا سفر اُن کی ذہنی اور تخلیقی زندگی میں اہم اور دور رس تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا، کلکتہ میں انھوں نے اپنے ایک سال نو مہینے کے قیام کے دوران انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر واقتدار کو بہ چشم خود دیکھا، انھوں نے شدت سے محسوس کیا کہ ملک میں

جاگیردارانہ نظام، جس کی کچھ نشانیاں ملک کے بعض علاقوں میں باقی تھیں، کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، اور زندگی اور معاشرت کے قدیم تصورات اور عقاید قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی تقدیر بدل چکی ہے، اور انگریز ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بن رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ غدر برپا ہوا، اس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا اور انگریزی اقتدار ایک مسلمہ حقیقت بن گئی، غالب کو انگریزوں کے برسر اقتدار آنے سے، جیسا کہ اُن کے بعض مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے، کوئی تعجب نہ ہوا، وہ تو غدر سے پہلے ہی یعنی ۱۸۵۴ء ہی میں جب کہ وہ بادشاہ کے استاد مقرر ہو چکے تھے قاضی عبدالجمیل جنوں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیا کرتے ہیں، میں کبھی اس محفل جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا، اور یہ صحبت چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں، کیا معلوم اب نہ ہو، اب کے ہو، آیندہ نہ ہو۔"

ظاہر ہے غالب کو غدر سے پہلے ہی بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ مغلیہ سلطنت کے دن پورے ہو چکے ہیں، چنانچہ غدر کے واقعے نے انھیں جذباتی طور پر زیادہ مشتعل نہ کیا۔ وہ حقیقت شناس تھے۔ اور حالات کی تبدیلی کا استدلالی تجزیہ کرنے کی قوت رکھتے تھے، وہ تاریخی قوتوں پر نظر رکھتے تھے، بعض لوگ ہنگامۂ غدر میں ان کی خاموشی یا لاتعلقی کو انگریز دوستی یا ان کی ابن الوقتی پر محمول کرتے ہیں، یہ روّیہ غالب ناشناسی پر دلالت کرتا ہے، یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران وہ خانہ نشینی اختیار کر چکے تھے لیکن انھوں نے معصوم اور مظلوم ہموطنوں کی حالت زار سے چشم پوشی نہ کی، ان کے کئی خطوط میں اس بے پناہ دکھ کا اظہار ملتا ہے، جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر قابض ہونے اور اس کے دست تظلم دراز کرنے کے نتیجے میں ان کے وجود میں سرایت کر گیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، اور جو رہ گئے، جاگیر دار وپنشن خوار، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں بچا، مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پہ شدت ہے، اور باز پرس وگیرودار میں مبتلا ہیں۔"

چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں:

"یہاں شہر ڈھ رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار اور اردو بازار اور حاتم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں ہے۔"

ایک اور خط کا اقتباس:

"میں مع زن و فرزند ہر وقت اِس شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔"

غالب نے اپنی آنکھوں سے ملک کی تصویر کی برگشتگی کا ہوشربا منظر دیکھا، وہ انگریزوں کی حکمت عملی، سیاست گری اور سائنسی قوت سے آشنا تھے، اور جانتے تھے کہ وہ ملک پر قابض ہو رہے ہیں، اس لیے وہ ان کو شدید ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، خود انگریزوں نے ان کی کوئی قدر نہ کی، وہ اُن سے بیگانہ وشی بلکہ سختی سے پیش آئے، جب وہ کلکتہ سے دلی واپس لوٹے تو وہ انگریزوں سے مزید دل برداشتہ ہو چکے تھے، وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود پنشن کی وصولی میں ناکام ہو چکے تھے غدر کے ہنگامے کے دوران اُن پر کئی مصائب ٹوٹے انگریزوں نے اُن پر بہادر شاہ ظفر کے لیے سکہ کہنے کا الزام لگایا، گورے ان کو گرفتار کر کے تھانے لے گئے، اُن کا بھائی یوسف مرزا گوروں کے ہاتھ قتل ہوا، ان کی پنشن بند ہوئی، ان حالات میں اگر غالب انگریزوں کے ساتھ ساتھ ان کی ہر چیز یعنی تعلیم، تہذیب اور سائنسی کمالات سے بھی چشم پوشی کرتے، تو بات قابل فہم تھی، لیکن غالب نے ایسا نہیں کیا۔ وہ حقیقت نگر تھے، ایک بڑے دانشور اور دیدہ ور شاعر کی طرح انھوں نے انگریزوں

کے اُن کے تئیں غیر دوستانہ رویے یا اجتماعی سطح پر ملک کے بارے میں ان کے غاصبانہ عزائم کے باوجود اُن کی آمد کو ایک نئے دور بیداری سے تعبیر کیا، وہ تاریخی نقطۂ نظر سے جاگیردارانہ نظام کے کھوکھلے پن کے المناک انجام کو دیکھ چکے تھے، اور انھوں نے انگریزوں کو ایک نئی تاریخی قوت کے طور پر تسلیم کیا۔

چنانچہ اس دور میں جب کہ لوگ قدامت پسندی کے تحت نئی تبدیلیوں سے منحرف تھے، سر سید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے لوگوں کے عقاید اور رویوں میں جو انقلاب پیدا کیا، اس کے لیے غالب نے ہی فضا سازگار کی تھی، اور اپنی بصیرت کا ثبوت دیا تھا، سر سید نے ابوالفضل کی کتاب آئینِ اکبری کی تصحیح کر کے جب غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی، تو اُس کے جواب میں اُنھوں نے فارسی میں جو مثنوی لکھی، وہ ان کی روشن دماغی اور دانشوری کا بیّن ثبوت ہے انھوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ "پدرم سلطان بود" کے مقولے پر زندہ رہنا غیر فطری اور غیر عقلی رویہ ہے، انھوں نے انگریزی تہذیب، عدلیہ اور سائنسی کمالات کو سراہا اور صحت مند شخصی ردعمل کا اظہار کیا، اُنھوں نے انگریزوں کو نئے آئین کی علامت قرار دے کر پرانے آئین کی تنسیخ کا اعلان کیا:

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار　　　گشتہ آئینِ دگر تقویم پار

اور کہا:

مردہ پروردن مبارک کار نیست

غالب نے دیکھا کہ انگریزوں کی آمد کے نتیجے میں ہندوستان پر بھی انگلستان کے صنعتی انقلاب کے اثرات مرتب ہو رہے تھے، یہاں بھی صنعتی کارخانے لگائے گئے اور گھریلو دستکاریاں اکھڑنے لگیں، سفر کے جدید ذرائع مثلاً ریلوے، موٹر اور لاریاں، مروج ہو رہے تھے اور فاصلے مختصر ہو رہے تھے، ڈاک، تار اور جہازرانی سے رسل و رسائل کے نئے طریقے رائج ہو رہے تھے۔

انگریزی زبان، تعلیم اور تہذیب سے تدریجی واقفیت کے نتیجے میں یہاں

کے لوگ قدیم توہم پرستی، اندھے عقاید، مذہبی جنوں اور سماجی پس ماندگی جیسی لعنتوں سے آزاد ہونے کی اشد ضرورت محسوس کرنے لگے، اور تعلیم یافتہ طبقوں میں معاشرتی اور مابعدالطبعیاتی سطح پر طبقاتی تفاوت، تہذیب، اخلاق، زندگی، موت اور خدا اور اس نوع کے دیگر مسائل و تصورات پر نئے سرے سے غور و خوض کرنے کی ضرورت بڑھنے لگی، پریس کی ایجاد نے روشن خیالی کی فضا کو مزید تقویت دی، دلی میں دلی کالج کے قیام سے جدید فکر و نظر کی روشنی عام ہونے لگی، اس کالج میں نئے علوم مثلاً سائنس، فلسفہ اور ریاضیات کی تدریس و تعلیم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ غالب اگرچہ خود انگریزی تعلیم سے بے بہرہ تھے، تاہم انھیں وجدانی طور پر محسوس ہو چکا تھا کہ تعلیم کا پرانا آئین منسوخ ہو چکا ہے، اور جدید علوم کی واقفیت ناگزیر ہے۔ میر مہدی کے نام خط میں میر سرفراز حسین کو ہدایت کرتے ہیں:

"میاں کس قصے میں پھنسا ہے، فقہ پڑھ کر کیا کرے گا،
طب و نجوم و منطق و فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہیے۔"

جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، انیسویں صدی کے شعور کی شناخت اس کے تعقلی انداز سے کی جا سکتی ہے، غالب خود عقل و ادراک کی غیر معمولی قوتوں سے متصف تھے، انھوں نے انسان اور فطرت کے مختلف پہلوؤں کے مشاہدے اور مطالعے کے عمل میں ہر قدم پر شخصی تجربے اور تعقل سے کام لینے کی کوشش کی، اور "دین بزرگاں" سے انحراف کیا، وہ ایک حکیمانہ مزاج رکھتے تھے، اور حیات و کائنات کے اسرار کی تفہیم کے لیے کوشاں رہتے تھے، یہ تعقلی انداز فکر ان کی شخصیت میں خود ضبطی پیدا کرتا ہے، اور ایک پر آشوب دور سے متصادم ہونے کے باوجود ان کی شخصیت کا تحفظ کرتا ہے ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

"مغنی نامہ" ان کی خرد پسندی کی روشن مثال ہے، وہ خرد کو چشمۂ زندگی قرار دیتے ہیں، خرد پسندی کا یہ رجحان انھیں مسلّمات کو من

دعن قبول‌نے سے روکتا ہے۔ وہ مروجہ علوم، مفروضات اور تصورات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اور اپنے متشکک ذہن کا ثبوت دیتے ہیں یہ تشکک اس عہد کے نئے ذہن کی پہچان تھا، اور سچے علم و آگہی کی راہ ہموار کرتا تھا۔

آخر میں، یہ کہنا مناسب ہوگا کہ غالب کے یہاں ایک نئے دور کو، جسے مغربی دور کہا جا سکتا ہے، خیر مقدم کرنے کا یہ حاوی رویہ اتنا سادہ اور یک رخا نہیں، جتنا کہ یہ بظاہر دکھائی دیتا ہے، غالب بنیادی طور پر ایک تخلیقی فنکار ہیں، وہ سماجی مصلح، مورخ یا مفکر نہیں، انھوں نے وجدانی طور پر شخصی سطح پر بدلتے حالات کی آگاہی پیدا کی، یہاں تک کہ انھوں نے بعض سائنسی تجربات کو شخصی طور پر محسوس کرکے ان کی مصوری کی، مثلاً بقول بجنوری انھوں نے اس شعر میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو پیش کیا ہے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

یا کائنات کی آفرینش و زوال کے بارے میں جدید سائنسی نظریے کی یوں پیکر تراشی کی ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگزار بادیاں

لیکن یہ حقیقت اٹل ہے کہ نئے دور کا استقبال کرتے ہوئے انھیں نفسیاتی اور روحانی سطح پر بے پناہ الجھنوں اور کشمکشوں سے گزرنا پڑا ہوگا، جس کا ثبوت اُن کا اردو اور فارسی کلام فراہم کرتا ہے، اُن کا ذہن طلسم پیچ و تاب تھا، اس میں شبہ نہیں کہ وہ عقلی طور پر زندگی کو ایک نامیاتی قوت سمجھتے تھے جو تغیر آشنا اور مائل بہ ارتقا ہے، لیکن ان کو مٹتے ہوئے معاشرے اور

تہذیب سے جو موروثی اور جذباتی لگاؤ تھا، اس کی شکست کے نتیجے میں، اُن کی داخلی شخصیت میں جو درد و داغ، شکستِ آرزو، محرومی، تنہائی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی، اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ ایک متناقض رویہ ہے' جو غالب نے روا رکھا ہے۔ لیکن یہی رویہ ان کو شعور کے اُس مقام تک لے جاتا ہے جہاں غم کی حقیقت کھل جاتی ہے، یعنی غم کا احساس زندگی کے شعور کی شناخت بن جاتا ہے اور یہی رویّہ غالب کے تشخص کی ضمانت بن جاتا ہے۔

شیخ سلیم

غالبؔ کی شرحیں

غالبؔ کے کلام کی جتنی شرحیں لکھی گیئں اتنی اردو تو اردو فارسی کے بھی کسی شاعر کے کلام کی نہ لکھی گئی ہوں گی ان شرحوں میں شارحین نے جس قدر کاوش سے کام لیا ہے اتنی کاوش شاید مرزا غالبؔ کو شعر کہنے کے لیے بھی نہ کرنی پڑی ہوگی اور مرزا کے اشعار میں جتنے پہلوان سخن فہموں نے تلاش کیے اتنے خود شاعر کے پیش نظر نہ رہے ہوں گے۔ اتنی کثرت سے شرح نویسی اس بات پر دال ہے کہ غالبؔ کا کلام جتنی دقت نظری سے مطالعہ میں آیا، اتنی دقت نظری سے کسی اور شاعر کا کلام مطالعے میں نہ آیا ہوگا۔ اس طرح خود غالبؔ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی:

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

اس میں شک نہیں کہ شارحین نے اپنے ذوق کے لحاظ سے کافی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔ بعض نے لفظی ولغوی تحقیق کو سامنے رکھا اور بعض نے اس عقیدے کی بنا پر غالبؔ کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں، اس کے بعض بے معنی اشعار میں بھی کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض شارحین ایسے بھی ہیں جن کو غالبؔ کا ہر شعر حکمت و فلسفہ نظر آتا ہے اور اس کی شرح و تفسیر میں غالبؔ سے زیادہ نا قابل فہم ہو کر رہ گئے ہیں۔ بعض شرحوں

میں بہت اختصار و اجمال پایا جاتا ہے اور بعض میں ضرورت سے زیادہ اطناب۔ بعض شرحوں میں ایسا نظر آتا ہے کہ شارح شعر کے اصل خیال کو چھوڑ کر صرف و نحو کے کسی ضمنی مسئلے کی طرف نکل گیا ہے اور کئی جگہ تشریح کی بجائے صرف ترجمے پر ہی اکتفا کی ہے، حالانکہ وہاں تشریح کی ضرورت تھی۔

دیوان غالب کی شرحیں اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں لکھی گئیں۔ ہندی میں جو شرحیں چھپی ہیں ان میں بیڈھب بنارسی کی شرح "غالب کی کویتا" تخلص کی مناسبت سے بیڈھب ہے۔ بعض شرحیں ایسی بھی ہیں جن میں دماغی ورزشوں کے کرتب دکھائے گئے ہیں اور بعض شارحین نے تو غالب کے کلام پر اصلاح بھی دی ہے اور شرح کے پردے میں غالب سے زیادہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے[1]۔ یہاں فی الحال میرا مقصد صرف حیدرآباد اردو ریسرچ سنٹر میں موجود ۵۰ کے قریب شرحوں کی سنہ واری فہرست مرتب کرنا ہے تاکہ محققین ان سے استفادہ کر سکیں۔ راقم نے صرف کلام غالب کے مشہور شرحوں کی جو مطبوعہ ہیں ان کی سنہ واری فہرست مرتب کی ہے ان میں وہ شرحیں شامل نہیں ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں یا پھر ایسی شرحیں جو مختلف رسائل میں چھپی ہیں یا پھر جن کا مجھے علم نہیں۔

سلسلہ نمبر	اسم شرح	اسم شارح	تاریخ اشاعت
(۱)	وثوق صراحت شرح دیوان غالب	عبدالعلی والہ	۱۸۹۵ء
(۲)	حل کلیات اُردو مرزا غالب دہلوی مرحوم	ابوادریس احمد حسن شوکت میرٹھی	۱۸۹۹ء
(۳)	شرح دیوان اردوئے غالب	نظم طباطبائی	۱۹۰۰ء
(۴)	شرح دیوان اردوئے غالب	محمد عبدالواجد واجد	۱۹۰۲ء

---

[1] سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھوی، حرفِ آغاز، ص۔ ۵۔۴۔ ۱۹۶۸ء

(۵)	وثوق صراحت موسوم بہ	محمد عبدالواجد واجد	۱۹۰۲ء
	وجدان تحقیق	ایضاً	۱۹۰۲ء
(۶)	شرح دیوانِ غالب	حسرت موہانی	۱۹۱۱ء
(۷)	دیوان غالب مع شرح دیوان غالب	"	"
(۸)	مطالب غالب	مولانا سہا	۱۹۲۳ء
(۹)	مطالب غالب	قاضی سعید الدین احمد	۱۹۲۶ء
(۱۰)	ہدیہ سعید دیوان غالب مع شرح و مقدمہ مشتمل بر سوانح عمری و تنقید کلام غالب	" " " " "	"
(۱۱)	دیوان غالب مع شرح نظامی	نظامی بدایونی	۱۹۲۷ء
(۱۲)	مکمل شرح دیوان غالب	مولوی عبدالباری صاحب آسی	۱۹۳۱ء[1]
(۱۳)	شرح اشعار غیر مطبوعہ دیوان غالب	" " " " "	"
(۱۴)	مطالب الغالب	مولانا سہا (علیگ)	۱۹۳۱ء
(۱۵)	مراۃ الغالب	سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی	۱۹۳۴ء
(۱۶)	شرح دیوان غالب	ایم ڈی کشتہ	۱۹۳۹ء
(۱۷)	گزارش شرح دیوان غالب	آنجہانی عرش آشیانی	۱۹۳۹ء
(۱۸)	بیان غالب کلام غالب کی		۱۹۳۹ء
	ایک دل پذیر شرح ۔	آغا محمد باقر	۱۹۴۰ء
(۱۹)	بیان غالب شرح دیوان غالب	" " " "	"
(۲۰)	دیوان غالب مع شرح	جوش ملسیانی	۱۹۵۱ء
(۲۱)	مطالب غالب	قاضی سعید الدین احمد	۱۹۵۲ء

---

[1] گیان چند جین، تفسیر غالب، ص ۱۰۰۔

نمبر	کتاب	شارح	سنہ
(۲۲)	ترجمان غالب یعنی دیوان غالب کی مکمل و جدید ترین شرح	شہاب الدین مصطفیٰ	۱۹۵۶ء
(۲۳)	ترجمان غالب	ایضاً	"
(۲۴)	مشکلات غالب	نیاز فتح پوری	۱۹۶۱ء
(۲۵)	مزاحیہ شرح دیوان غالب	غلام احمد فرقت	۱۹۶۴ء
(۲۶)	شرحِ دیوان غالب	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۱۹۶۷ء
(۲۷)	شرحِ دیوان غالب	مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھوی	۱۹۶۸ء
(۲۸)	مفہوم غالب	احسن علی خاں	۱۹۶۹ء
(۲۹)	شرحِ دیوان غالب	علامہ سید محمد احمد بے خود دہلوی	۱۹۷۰ء
(۳۰)	تفسیرِ غالب	پروفیسر گیان چند جین	۱۹۷۱ء
(۳۱)	الہامات غالب	پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ	۱۹۷۱ء
(۳۲)	شرح طباطبائی اور دیوان غالب	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۹۷۳ء
(۳۳)	شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب	ایضاً	"
(۳۴)	مراد غالب دیوانِ غالب کی مختصر شرح	منظور احسن عباسی	۱۹۷۵ء
(۳۵)	شرحِ غزلیات غالب (فارسی) جلد اول	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	۱۹۸۱ء
(۳۶)	" " " جلد دوم	ایضاً	"

دیوانِ غالب کی ایسی شرحیں جن میں شارحین کے نام تو ملتے ہیں لیکن تاریخ اشاعت درج نہیں۔

نمبر	کتاب	شارح
(۳۷)	شرحِ دیوان غالب	سید علی عبدل
(۳۸)	نوائے سروش مکمل دیوانِ غالب مع شرح۔	غلام رسول مہر

(۳۹) خوشں مطالب شرح دیوانِ غالب — پروفیسر عاصی کرنالی

(۴۰) عنقائے معانی — شیر علی خاں سر خوش

(۴۱) تفہیم غالب — سیّد احسن زیدی

(۴۲) روحِ غالب شرح دیوانِ غالب — ابو نعیم مولانا عبدالحکیم خاں صاحب نشتر جالندھری

(۴۳) گنجینۂ مطالب (فارسی) — آقا بیدار بخت

(۴۴) دیوان غالب مع شرح وسوانح — احسان بن دانش

(۴۵) اندازِ غالب (غالب کی اُردو غزلیات مع مطالب) — نرلیش کمار شاد

مندرجہ بالا شرحوں میں دو ایسی ہیں جن میں شارح کا نام اور سنہ اشاعت دونوں درج نہیں ہیں۔

(۴۶) شرح دیوان غالب

(۴۷) دیوان غالب مع شرح ردیف "ی"

(۴۸) تفہیم غالب — جناب شمس الرحمٰن فاروقی

سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء

دیوانِ غالب

غالب کا اُردو دیوان آج بھی اردو کی مقبول ترین کتاب ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے دیوانِ غالب کا یہ نیا اڈیشن بہت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اِس کا متن اُس نسخے پر مبنی ہے جو مرزا صاحب کی زندگی میں مطبعِ نظامی کان پور میں بہت اہتمام کے ساتھ چھپا تھا۔ غالب کی زندگی میں دیوانِ اردو کے جو نسخے چھپے ہیں، اُن میں مطبعِ نظامی کا اڈیشن سب سے زیادہ معتبر ہے۔

غالب کے ابتدائی عہد کا کلام جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہے، اپنی الگ حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے اور اُس کے مطالعے کے بغیر غالب کے ذہنی ارتقا کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس غیر متداول کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو جواہر ریزوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے اِس خاص اڈیشن میں نسخۂ حمیدیہ میں شامل اس کلام کا انتخاب بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اِس طرح دیوانِ غالب کے اِس نئے اڈیشن کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ متن کی صحت پر خاص کر توجہ کی گئی ہے اور توقیف نگاری کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دبیز سفید کاغذ، بے حد خوب صورت گرد پوش اور مضبوط جلد۔

صفحات :— ۲۴۰

قیمت :— ۲۵ روپے

ملنے کا پتا : غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرگرمیاں

غالب انعامات کی تقسیم

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب نئی دہلی میں جمعہ ۲۱ر جولائی ۱۹۸۹ء شام ۵½ بجے غالب انعامات برائے ۸۸-۱۹۸۷ء کی تقسیم کی تقریب منعقد کی گئی۔ عزت مآب ڈاکٹر شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریہ ہند کے مبارک ہاتھوں غالب انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس تقریب میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے انعام یافتگان دہلی کے ادیب و شاعر ، اساتذہ اور طالب علم اور شہر کے عمائدین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

اس تقریب میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے فرمایا کہ اُردو ہمارے مشترکہ کلچر، ہماری فکر اور سیکولرزم کی نمائندہ ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو نے ہمیشہ اتحاد اور ملاپ کے لیے کام کیا ہے اور موجودہ دور میں جب کہ فرقہ پرست طاقتیں سر ابھار رہی ہیں اس اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ آزادی کے بعد ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ ملک میں سیکولرزم آ گیا ہے اور تھوڑی لاپرواہی سے تخریبی طاقتوں کو موقع فراہم کر دیا اور وہی اتحاد کے لیے خطرہ بن گئیں۔ نائب صدر نے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ ملک کو درپیش خطرہ سے عوام کو اپنے قلم کے ذریعہ آگاہ کریں اور تمام مذاہب کی

بنیادی باتوں کو عوام تک پہنچائیں تاکہ نفرت کے بجائے محبت اور یک جہتی کا ماحول پیدا ہو سکے۔ آزادی کی جدوجہد میں اردو زبان کے مثبت کردار کی وکالت کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ اردو کے بہتر مستقبل پر شک کرنے والے ان کی نظر میں مشکوک ہیں۔ انھوں نے اردو کے حق کے لیے جدوجہد کی بھی وکالت کی اور فرمایا کہ یک جہتی اور اتحاد کے لیے جدوجہد سے بھی اردو کو کافی طاقت مل سکتی ہے۔ آخر میں نائب صدر جمہوریہ نے تمام انعام یافتگان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں موجودہ دور میں اردو کے مسائل کا تذکرہ کیا اور بہت واضح لفظوں میں کہا کہ اقلیتیں احسان فروش نہیں ہیں۔ ان کے محبِ وطن ہونے پر شک کرنا افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کی زبان اور کلچر کے تحفظ کی یقین دہانی ضروری ہے۔
اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین بیگم عابدہ احمد نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے مندرجہ تقریر فرمائی:

بیگم عابدہ احمد کی تقریر

عزت مآب نائب صدر جمہوریہ ہند اور حاضرین جلسہ

برصغیر کے عظیم الشان علمی و ادبی ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین کی حیثیت سے میں آج کی اس یادگار تقریب کے علم دوست و ادب نواز مہمان خصوصی اور جمہوریہ ہند کے نائب صدر عالی قدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو اپنی خوش آمدید کہتے ہوئے تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ اپنی اہم ترین اور گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر بطور خاص آج کی اس تقریب میں تشریف لائے ہیں۔ ساتھ ہی میں ۸۸۔ ۱۹۸۹ء کے غالب انعامات حاصل کرنے والے فنکاروں، دانشوروں، ادیبوں اور تمام شرکا کا بھی خیر مقدم کرتی ہوں، جنھوں نے ہماری دعوت پر آج کے جلسے میں شرکت فرمائی۔

مرزا غالب کا نام آج محض کسی شخص کا نہیں بلکہ ایک عہد، ایک مایہ ناز تہذیب ایک مشترک کلچر کی نمائندہ زبان اور اُردو غزل کے اوج کا نام ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس عظیم المرتبت شاعر و نثر نگار اور اس کے قابلِ قدر بے مثال تخلیقی کارناموں کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ مرزا غالب نے سوزشِ دل سے جو سخن گرم صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا اس کی آگ پورے ایک سو بیس سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک ہم اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ اس سے زندگی کرنے کا ایک نیا عزم ایک نیا حوصلہ نیا جوش اور نیا ولولہ حاصل کرتے ہیں۔

مرزا غالب اُردو زبان کے ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ اہم ترین نثر نگار بھی ہیں۔ "خطوطِ غالب" اردو نثر نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر غالب کے خطوط وجود میں نہیں آتے تو اُردو نثر ترقی کے ان مدارج پر ہرگز نہیں پہنچ سکتی تھی جن مدارج پر وہ ہمیں دورِ حاضر میں نظر آ رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے اِنقلاب عظیم کے سیاسی وسماجی واقعات کی تاریخیں تو بہت سے مورخوں نے لکھی ہیں لیکن اس خون چکاں داستان میں انسان کے قلب و روح پر جو کچھ گزری ان احساسات و محسوسات کو تمام تر سچائیوں کے ساتھ صرف اور صرف غالب رقم کرتے رہے اور اس طرح پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے۔ خطوطِ غالب ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم سے متعلق اہم ترین اور معتبر "انسانی دستاویز" کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارے مورخ اگر غور سے ان کا مطالعہ کریں تو آج بھی بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں اِن میں سینکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> "ہر چند حکام کو عضوِ جرائم منظور رہا۔ مگر قہرِ حاکم حقیقی بدستور رہا۔ نہ مکیں کا پتا نہ مکان کے آثار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اس سے بہتر ہے۔ مگر وہ عمارت جس پر خدا کے

قہر کی آندھی چلی تھی وہ کدھر ہے ؟"

اپنے ملک اور اپنے شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، ان پر مرزا غالب خون کے آنسو بہاتے ہیں خاص کر اہلِ دہلی پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ مرزا اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار بھی باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غالب کی اِنہیں عظمتوں کے پیشِ نظر غالب انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد بیس سال قبل ۱۹۶۹ء میں رکھی گئی تھی جب دُنیا بھر میں غالب صدی منانے کی تیاریاں شروع کی گئی تھیں۔ فخرالدین علی احمد مرحوم اور آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس ادارے نے بیحد ترقی کی۔ غالب اور عہدِ غالب کی تفہیم اس کا بنیادی مقصد قرار پایا۔ جس کے حصول کے لیے مختلف سمتوں میں کام شروع کیا گیا۔ ایک جامع لائبریری اور میوزیم کی بنیاد ڈالی گئی۔ ادارے کی جانب سے غالب اور عہدِ غالب کے متعلق اہم کتابیں شائع کی گئیں بین الاقوامی غالب سیمنار، انٹر یونیورسٹی تقریری مقابلے اور انسٹی ٹیوٹ کی دیگر ادبی سرگرمیوں کے علاوہ غالب ایوارڈس ادارے کی پہچان بن گئے ہیں۔ علم و ادب کے مختلف شعبوں کے اہلِ قلم کی صلاحیتوں کا اعتراف ہر سال غالب ایوارڈ دے کر کیا جاتا ہے۔ غالب انعامات کی یہ گیارہویں تقریب ہے اور اب تک ۶۹ حضرات کو اُردو زبان و ادب کی نُمایاں خدمات کے صلے میں انعامات دیئے جا چکے ہیں۔ آج پندرہ حضرات کو ۸۸-۱۹۸۷ء کے غالب انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہر سال آٹھ ادبی انعامات تحقیق و تنقید، اُردو نثر، اُردو شاعری، اردو ڈرامہ، اور میوزیکل پلے، مجموعی ادبی خدمات، طنز و مزاح، اُردو صحافت اور خطاطی پر دیئے جاتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ایسے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی خدمات کا اعتراف کریں اور یہ انعامات ادبی اور فنی

خدمات کے اعتراف کا ایک وسیلہ ہے۔

اب تک ملک کے اعلا درجے کے ارباب علم و ہنر کی خدمت میں یہ انعامات پیش کیے جا چکے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ آئندہ بھی ہم اپنے فن کاروں اور ادیبوں کی خدمات کا وسعت قلب کے ساتھ اعتراف کرتے رہیں گے۔

غالب اور عہد غالب سے متعلق ایک خاص چیز اس ادارے میں غالب میوزیم کا قیام ہے۔ اس میوزیم میں عہد غالب سے متعلق چیزوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ غالب کی اپنی زندگی اور ان کے زمانے کی کچھ جھلکیاں دیکھی جا سکیں۔

اس مرتبہ فخرالدین علی احمد میموریل لکچرز کا پانچواں اجلاس منعقد ہوا تھا۔ جس میں ملک کے مشہور تاریخ داں اور دانش ور پروفیسر نورالحسن گورنر اڑیسہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے "نہرو اور آزاد" کے موضوع پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی تھی۔

اسی سال ہم سب ڈرامہ گروپ کی جانب سے حضرت امیر خسرو کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مبنی ایک میوزکل ڈرامہ "ڈگر پنگھٹ کی" دہلی اور دہلی سے باہر اسٹیج کیا گیا۔ جسے عوام اور خواص دونوں طبقوں نے پسند کیا۔ اور اخبارات نے حوصلہ افزا تبصرے کیے۔

حضرات! ان سب کاموں سے جہاں ہم ایک جانب اس ادارے کے قیام کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں وہیں دوسری جانب اردو زبان و ادب کی بھی کچھ خدمت ہو رہی ہے۔ ہم پوری طرح مطمئن تو نہیں ہیں مگر ہمیں خوشی ہے کہ ہم اپنی بساط بھر کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔

میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما جی کی شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔ میں تمام انعام پانے والے حضرات کو ایک بار پھر مبارکباد دیتی ہوں اور آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ ہماری درخواست پر یہاں تشریف لائے۔

اس موقع پر ملک کے ممتاز ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، صحافیوں اور خطاطوں کو غالب انعام برائے ۸۸ ۔ ۱۹۸۹ء پیش کیا گیا۔ انعام یافتگان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

جناب علی سردار جعفری، مودی غالب انعام۔ جناب اختر الایمان مودی غالب انعام۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی، فخرالدین علی احمد غالب انعام۔ جناب علی جواد زیدی، فخرالدین علی احمد غالب انعام۔ جناب کالی داس گپتا رضا، مودی غالب انعام۔ جناب رام لعل، مودی غالب انعام۔ جناب رفعت سروش، ہم سب غالب انعام۔ جناب حفیظ احمد خاں، ہم سب غالب انعام۔ جناب ڈاکٹر عبدالمغنی، ایٹلس غالب انعام۔ جناب ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا، ایٹلس غالب انعام۔ جناب ہلال سیوہاروی، ساگرسوری غالب انعام۔ جناب بھارت چند کھنہ، ساگرسوری غالب انعام۔ جناب رضوان احمد، بیدی سحر غالب انعام۔ جناب شمیم احمد انصاری، پدم چند گپتا غالب انعام۔ جناب حافظ عبدالستار، پدم چند گپتا غالب انعام۔

شاہد ماہلی

مجلّہ
غالب نامہ

مجلسِ مشاورت

پروفیسر مسعود حسین خاں

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی

پروفیسر مختار الدّین احمد

اُردو میں علمی، ادبی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مجلّہ غالب نامہ

مجلسِ ادارت:

پروفیسر نذیر احمد (مدیرِ اعلا)

رشید حسن خاں

پروفیسر عبدالودود اظہر

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جولائی ۱۹۹۰ء
جلد ۱۱ شمارہ ۲

قیمت : ۴۰ روپے

ناشر و طابع : شاہد ماہلی
کتابت : محمد فاروق امینی
مطبوعہ : فیئر فیلڈ گرافک (پرائیویٹ لمیٹڈ)
۱۴ کیلاش کالونی مارکیٹ۔ نئی دہلی

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ
ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۳۳۱۶۵۱۸

فہرستِ مضامین

اداریہ

غالب نامے کا شیرانی نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔اس شمارے کے بیش تر مقالے وہی ہیں جو غالب انسٹی ٹیوٹ کے شیرانی سمینار میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ان مقالوں میں کافی تنوع ہے۔ان سے مجموعی طور پر شیرانی کے علم وفضل، ان کی غیر معمولی محققانہ صلاحیت اندازِ تحقیق اور فارسی زبان وادب پر بے پناہ قدرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔حافظ محمود شیرانی ہندوستان کے عظیم محقق اور دانش مند تھے، ان کی تحقیقات سے ایک طرف تو سیکڑوں نئے نئے ادبی و تاریخی حقائق سامنے آئے تو دوسری طرف بعض مفروضات کا پردہ چاک ہوا، ان کا میدان عمل اُردو اور فارسی زبان وادب و تاریخ ہے۔اُردو کے تعلق سے ان کے معرکۃ الآرا کارنامے پنجاب میں اُردو اور خالق باری کے متن کی تحقیق اور اس کے مصنف کے بارے میں نئے انکشاف ہیں۔اُردو زبان کے بارے میں شیرانی صاحب نے جو نظریہ قائم کیا اس کے متعلق محققین میں اختلاف ہے اس کے باوجود ان کا نظریہ اب بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، فارسی ادبی موضوعات جو ان کی توجہ کے مرکز بنے وہ تھے فردوسی اور اس کا شاہنامہ اور تنقید شعر العجم، فردوسی پر انھوں نے چار مقالے لکھے: شاہنامہ کی پہلی داستان، فردوسی کا مذہب، ہجو محمود اور مثنوی یوسف زلیخا کا فردوسی کی طرف غلط انتساب ـــــ ان موضوعات پر شیرانی صاحب نے جس محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے، اس سے تحقیق کے اُصول مرتب ہو سکتے ہیں، داخلی شہادت جو جدید تحقیق میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، شیرانی کی تحریروں ہی میں سب سے پہلے نظر آتی ہے، زبان فارسی کے ارتقا

پر جیسی ان کی نظر تھی ویسی نظر مشرق و مغرب کے کسی اور محقق کے یہاں بہ استثنائے علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نہیں ملتی، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان موضوعات پر شیرانی صاحب پر اب تک اضافہ نہیں ہو سکا ہے، اور یہ بات تو بہت عام ہو چکی ہے کہ جب مثنوی یوسف زلیخا فردوسی کے نام سے محققین یورپ چھاپ رہے تھے تو ہندوستان کے اس نامور فرزند کے ذریعے اس غلط انتساب کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ تنقید شعرالعجم شیرانی کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے، اس کتاب میں انھوں نے پچاسوں موضوعات پر مختتم گفتگو کی ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان و ادب پر اُن کی بصیرت کس درجے کی تھی۔ ان کے بعض نتائج سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کا طرز استدلال دوست دشمن دونوں سے خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہوگا۔ تحقیق جامد شے نہیں، اس کا عمل برابر جاری رہتا ہے، نئے نئے مواد سامنے آتے رہتے ہیں، ان سے بعض قدیم نظریات کی تائید اور بعض کی تکذیب ہوتی رہتی ہے، اس بنا پر کسی تاریخی و تحقیقی کارنامے کے جانچنے کے سلسلے میں یہ اصول مدِ نظر رکھنا ہے کہ مورخ و محقق نے اپنے مآخذ کا استعمال صحیح طور پر کیا ہے یا نہیں۔ اس سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوئی یا اس نے ان کے استعمال میں کہاں تک دیانت برتی ہے۔ لیکن نئے مآخذ کی دریافت سے اس کے بیان کی تصدیق ہو یا نہ ہو اس پر اعتراض کرنا صحیح نہ ہوگا، اس لیے مآخذ کے حصول پر کسی کو کوئی قدرت حاصل نہیں ہوا کرتی اکثر اس طرح کی دریافت اتفاق کا نتیجہ ہوتی ہے۔

راقم حروف کے دو مقالے اس شمارے میں شامل ہیں، ایک لاہور کے شیرانی سمینار کے دو تین جلسوں میں پڑھا گیا تھا جو رسالہ اُردو جلد ۴۵، شمارہ ۴ میں شائع ہوا، دوسرا شیرانی کے حالیہ سمینار میں پیش ہوا تھا، ان دونوں مقالوں میں بعض ان مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے جو شیرانی کے علم میں نہ تھے، ان سے مرحوم کے بعض بیانات کی توثیق اور بعض کی تردید ہو گئی ہے، لیکن ان کی بنا پر شیرانی کی تحقیقات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ دراصل یہی اصول کسی مورخ یا محقق کی تحریر پر بحث کے سلسلے میں پیش نظر رکھنا ہوگا۔ مولانا شبلی کے

وقت میں رودکی اور قطران تبریزی کے دیوان نامشخص تھے، جو شیرانی کے زمانے میں الگ الگ ہوئے، پس اگر شبلی کے یہاں قطران کے کچھ اشعار رودکی کی طرف منسوب ہوں اور رودکی کے قطران کے نام سے ملیں تو یہ قدرتی امر تھا، اس میں شبلی کا کوئی قصور نہ تھا۔ شیرانی کی تحریروں میں اسدی خرد و بزرگ کے نظریے کی جھلک ملتی ہے، لیکن اب یہ نظریہ رد ہو چکا ہے، لیکن اس سے شیرانی کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ پنجاب میں اُردو میں فارسی فرہنگوں میں داخل ہندوستانی الفاظ سے اُردو کی قدامت کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے، شیرانی صاحب کو اکثر الفاظ بعد کی فرہنگوں میں ملے تھے، ان کے سامنے سب قدیم فرہنگیں نہ تھیں، اب ان میں بعض قدیم فرہنگیں راقم حروف کے اعتنا سے چھپ گئی ہیں، ان کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ شیرانی کے خاصے اندراج غلط تھے۔ میرے عرض کرنے کا مدعا ہے کہ محقق یا مورخ کے پیش نظر جو مآخذ نہ ہوں، اور اگرچہ ان مآخذ کی روشنی میں اس کے نتائج ناقص ہوں تو اس سے مورخ و محقق پر اعتراض لازم نہیں آتا۔ ہمارے محققین اکثر اس نکتے سے غفلت برتتے ہیں شیرانی صاحب کی تحریروں میں بعض جگہ ہمیں یہ نقص نظر آتا ہے۔ اگر یہ نکتہ پیش نظر ہو تو تحقیق میں جو تلخی پیدا ہو جاتی ہے وہ ختم ہو جائے۔

میرا پہلا اور شیرانی صاحب کا مقالہ "آلات آتش بازی" رسالہ اُردو، کراچی بابت ۱۹۸۰ء شائع ہو چکے تھے، ان کی دوبارہ اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے عام قاری کو ان سے استفادہ کا موقع مل جائے۔

نذیر احمد
۱۷ - اگست ۱۹۹۰

حافظ محمود شیرانی

آلات آتش بازی

حافظ محمود شیرانی مرحوم کا یہ مضمون اُن کے کاغذات میں دستیاب ہوا ہے، یہ انھوں نے لاہور میں ملازمت کرنے سے قبل اپنے وطن میں سپرد قلم کیا تھا۔ مضمون کے ایک فقرے سے جس میں جنگ عالمگیر اوّل کی بابت "موجودہ جنگ" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۸ء کے درمیان لکھا گیا ہے، اس مضمون کے پہلے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف جنھیں شکار کا بے حد شوق، دراصل شکار کی تاریخ پر کوئی مقالہ لکھ رہے تھے، اس مقالے کے لئے ضمنی طور پر آتشیں آلات کے موضوع پر یہ سطور قلم بند کرنے لگے، جو بذات خود ایک دلچسپ اور عالمانہ مضمون کی صورت اختیار کر گئیں۔ لاہور میں ملازمت کے بعد دوسری تحقیقی اور تنقیدی مصروفیات کے باعث وہ یہ مقالہ مکمل نہ کر سکے اور غالباً اسی بنا پر انھوں نے اُسے شائع نہیں کی۔

پہلی بار جب میں نے ان صفحات پر نظر ڈالی تو سمجھا کہ یہ اس مضمون کا مسودہ ہے جو انھوں نے آتشیں اسلحہ کے موضوع پر تنقید پر تھی راج راسا کے سلسلے میں

لکھا تھا لیکن تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ اس سے مختلف مضمون ہے۔ گو چند باتیں دونوں میں مشترک ہیں۔ غالبًا راسا والا مضمون لکھتے وقت انھوں نے پرانے مضمون سے بھی مدد لی ہوگی۔

زیر نظر مضمون حنائی کاغذ کی ایک بیاض (½۱۰ × ½۸) کے آغاز میں ۱۲ صفحات پر محیط ہے اور یقیناً تکمیل کا محتاج ہے۔ اس کے بعد ان کا مشہور مضمون "مثنوی یوسف زلیخائے فردوسی بھی اسی بیاض میں مندرج ہے جو رسالہ اردو (اورنگ آباد) کے اکتوبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا بیاض کے باقی صفحات خالی ہیں۔ کاغذ خستہ ہو چکا ہے اور اکثر اوراق کے کنارے گھس گئے ہیں خصوصاً بیسواں صفحہ جو بیاض کی جزوبندی سے نکلا ہوا ہے اس کا کنارہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہے جس کی وجہ سے مضمون کے پچھلے حصے میں ہر سطر کے چند آخری الفاظ غائب ہیں۔ ان جگہوں پر میں نے قوسین میں مناسب الفاظ کے اندراج سے عبارت کا ربط قائم کیا ہے۔ دو ایک جگہ جہاں کسی اصطلاح یا پیمائش کی ضرورت تھی میں نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اس کی اصل وجہ (جو حواشی نہ دینے کی وجہ بھی ہے) وقت کی قلت ہے۔

مضمون چونکہ نقش اوّل ہے اور خط شکستہ میں لکھا گیا ہے اس لیے پڑھنے میں دشواری پیش آئی۔ پھر الفاظ پرانے انداز میں تحریر ہوئے ہیں یعنی پتھر کو پتھر، مٹی کو مٹی، دیکھیں گے کو دیکھینگے، نیز یہ کو یہہ، مجھ کو کو مجکو، نہ ہوا کو نہوا، اور پاؤں کو پانو لکھا گیا ہے۔

(منظر محمود شیرانی)

شکار کی تاریخ کے دوران میں آلات آتش بازی کی تاریخ پر خامہ فرسائی کرنا بادی النظر میں غیر موسمی مضمون پر ہاتھ ڈالنا ہے لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس بیگانہ موضوع کا شکار کے افسانہ سے نہایت اہم اور قدیم تعلقات ہیں اور کون انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح ال آلات محرقہ کی اختراع اور اشاعت نے میدان جنگ کے کارناموں میں انقلابات عظیم پیدا کر دیے

دنیا کی آئندہ تاریخ بدل دی اسی طرح شکار کے میدان میں ان کا رواج تغیرات عظیم کا بانی نہیں ہوتا ہے لیکن ان آلات کی اصلی تاریخ مشاہدہ کرنے سے پیشتر سرسری طور پر ہمیں ان اسلحہ کے واقعات معلوم کرنا چاہئیں جو ان کی اختراع سے پہلے انسان نے مدافعانہ اور جارحانہ اغراض سے وضع کئے تھے۔

اسلحۂ آتشی کی ایجاد کے زمانہ سے رجعت قہقری کرتے ہوئے اگر ہم ان زمانوں میں گھس جاویں جو "قرون الاحجار" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جب انسان کا آلۂ حرب ایک نوک دار گھڑا ہوا پتھر ہوتا تھا جس کو مٹھی میں مضبوط پکڑ کر وہ اپنے دشمن کے خلاف نہایت پھرتی اور طاقت سے استعمال کرتا تھا اور وہاں سے لوٹ کر منزل بمنزل ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے اپنے زمانے تک آجاویں تو "قرون الحدید" میں لوہے کی دریافت کے وقت سے لے کر اب تک ہر وقت ہر ملک اور ہر قوم میں ہم بے شمار مصنوعات کا سلسلہ جاری دیکھیں گے جو حملہ اور حفاظت کی غرض سے بنی آدم نے ایجاد کئے ہیں۔ ان کی پوری تاریخ اور تفصیل میں نیا مجلہ تیار ہو سکتا ہے جس کا اندراج یہاں ہمارے مقصد کے منافی ہے ذیل میں صرف ان ہتھیاروں کے نام دیئے جاتے ہیں جو ایران اور ہندوستان میں رائج تھے۔

گوپال	گرز	تیغ	سپر	درقہ	خنجر
ژوپیں	ناوک	خشت	تیر	خدنگ	کمند
سنان	نیزہ	شمشیر	پرتاب	نیرزیں	چرخ
دبوس	قارورہ	شراع	عرادہ	کھانڈہ	گیتی
جمدھر	دوی	جمبیہ	کٹار	کمھٹی	برچھی
سانگ	سیلرہ	گوپھن	جم گباک	بانک	کتارہ
نرسنگ موتھ	سبز	ساری	زاغتول	نرنگانہ	خارماہی
کھیوہ	بہدی	اڈانہ	ابلغہ	گھوگھی	گھوگھوں

ان حربوں میں نیزہ کی تاریخ دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت سادہ مگر مضبوط آلہ ہے جو اور حربوں کی بہ نسبت نہایت قدیم ہے۔ چوب دستی اور سنان کی ترکیب سے نیزہ کی

ولادت ہوئی ہے۔ نیزہ عربوں کا قدیم قومی اسلحہ ہے۔ عرب اور ان کی تقلید میں مسلمان فن نیزہ بازی میں نہایت ممتاز رہے ہیں۔ عربی فتوحات کا سیلاب جو ممالک مشرق و مغرب پر یکایک پھیل گیا اور جس کی سرعت رفتار اب تک مؤرخین کے لیے سرمایۂ حیرت ہے، اس راز کی عقدہ کشائی صرف عربی نیزہ بازی کے اوراق تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ وہ اس فن میں اپنے زمانے میں فرد تھے۔

اسی اصول پر تیر کی ایجاد ہوتی ہے۔ تیر کی شکل کہہ رہی ہے کہ میں نیزہ کا بچہ ہوں۔ تیر اور کمان کے وصل نے تیرانداز کو اپنے حریفوں پر بہت کچھ برتری بخشی ہے اس کا کام اپنے دشمنوں کو دور ہی سے چھید دینا ہے۔ فن تیر میں مغل تیرانداز بہت مشہور رہے ہیں اور اس فن کو انھوں نے بہت ترقی دی ہے۔

تلوار، نیزہ اور تیر سے بہت بعد کی اختراع ہے۔ شمشیر صفاہانی اور تیغ ہندی قریب قریب ضرب المثل ہو گئی ہیں۔ جب دشمن دوبدو آتا ہے تیرانداز اور نیزہ باز سے شمشیر باز اچھا مقابلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ فاصلہ کے دشمن پر چوٹ نہیں کر سکتا لیکن جنگ مغلوبہ میں اس سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں۔ قدیم زمانوں میں یہ تین ہتھیار شکار اور جنگ کے وقت نہایت ضروری تھے۔

مسلمان اپنے زمانہ میں ان تینوں ہتھیاروں کے استعمال میں یگانہ تھے اور اسی یکتائی نے انھیں اپنے دشمنوں پر بھاری کر دیا تھا لیکن نئے زمانے جلد جلد آ رہے تھے اور نئے زمانوں کے ساتھ نئی ایجادیں بھی آ رہی تھیں۔ آخر وہ انقلاب کا دن آیا جس نے ثابت کر دیا کہ آئندہ میدان توپ اور بندوق کے ہاتھ رہے گا۔

مصرع : نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

میدانی جنگوں میں اگرچہ انسان اپنے موجودہ اسلحہ پر قانع معلوم ہوتا تھا اور جب کہ دو لشکر اسی قسم کے حربوں سے آراستہ تھے اس حالت میں زیادہ تر ذاتی دلاوری، کثرت فوج یا اچھی تدبیر پر فتح کا انحصار ہوتا تھا لیکن جب دشمن قلعہ نشین ہو گیا تو صورت حال بالکل بدل جاتی تھی۔ کمزور دشمن یہاں امن کے گنبد میں بیٹھ کر نہ صرف مہینوں بلکہ برسوں زبردست لشکر کا مقابلہ اور نقصان کرنے پر قادر تھا اور جس حالت میں کہ قلعہ مضبوط ہے اور اُس کی جغرافیائی کیفیت اس کی حفاظت کے قدرتی سامان پیش کر رہی ہے تو ان صورتوں میں ایسے قلعوں کا

تسخیر کیا جانا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔ قلعہ رنتھنبور علاء الدین غوری نے بہت بڑا نقصان اٹھانے کے بعد تین سال میں فتح کیا تھا۔ اس قلعہ کے گرد، جو کہ بلند پہاڑ پر واقع ہے، چاروں طرف دُور دُور تک بلند پہاڑ آ گئے ہیں جو گویا اس کی قدرتی حفاظت کر رہے ہیں۔ قلعہ چتوڑ اسی بادشاہ نے چند مہینہ میں مسخر کر لیا تھا۔ قلعۂ دولت آباد یا دیوگیر نہایت مشہور قلعہ تھا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس تک پہونچنے کا صرف ایک راستہ تھا وہ بھی نہایت تنگ۔ اس راستہ میں جگہ جگہ لوہے کے کڑھاؤ زمین دوز کر دیئے گئے تھے۔ غنیم کی آمد کے وقت ان کے نیچے آگ جلا دی جاتی تھی۔ یہ کڑھاؤ آگ کی طرح گرم ہو جاتے تھے اور دشمن کے لیے ان کا عبور کرنا ناممکن ہو جاتا تھا کوٹ کانگڑہ کی دیواریں ایک سو چالیس گز بلند تھیں۔ قلعہ پہاڑ پر واقع تھا جس میں بڑے بڑے تالاب تھے اور زراعت خوب ہوتی تھی۔ جہانگیر نے اس کو بڑی تکلیف کے بعد فتح کیا تھا صوبۂ بہار میں قلعۂ رہتاس نہایت نامی گرامی قلعہ تھا۔ بارہ کوس کے دور میں پہاڑ پر یہ قلعہ واقع تھا۔ گھوڑے، اونٹ اس پر نہیں جا سکتے تھے۔ قلعہ کے اندر جا بجا تالاب اور چشمے تھے اور چودہ گاؤں اس کے اندر آباد تھے۔ پہاڑ کی بلندی اس قدر تھی کہ پیدل آدمی مشکل سے دو پہر میں طے کر سکتا تھا۔ وہ ناممکن الفتح تھا لیکن شیر شاہ فریب سے لڑے بھڑے بغیر اس پر قابض ہو گیا۔

ان بیانات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قلعہ گیری قدیم زمانوں میں ایسا معمہ ہو گیا تھا جس کی عقدہ کشائی کے لیے ہزاروں شگرف کار دماغ مشغول تھے۔ نئی کلیں اور نئے مصالحے دریافت ہو رہے تھے، روزانہ نئی ایجادیں ہو رہی تھیں منجملہ ان کے ساباط، منجنیق، دبابہ، مہندام، عرادّہ جرخ اور رعد تھے۔ علاوہ ازیں نفت کا استعمال کیا جاتا تھا اور جب طاقت ور آتش گیر مصالحے دریافت ہو گئے تو نقب زنی سے کام لیا جانے لگا۔

آلات قلعہ کشائی میں منجنیق کا استعمال عربوں میں بہت قدیم ہے۔ ابن قتیبہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰ء قبل مسیح میں حزیمہ بادشاہ حیرہ نے سب سے پہلے اس سے کام لیا ہے عرب اس کی ایجاد نمرود سے منسوب کرتے ہیں۔ ۹ھ ہجری میں، جب رسول اللہؐ نے طائف کا محاصرہ کیا ہے، طفیل ابن عمرو دوسی کو بت خانۂ ذی الکفین کے انہدام کی غرض سے بھیجا گیا تھا، چار دن بعد وہ اپنے چار سو آدمیوں کے ساتھ واپس آ کر معہ منجنیق و دبّابہ رسولؐ خدا

سے ملحق ہوگئے۔

سنہ۶۴ ہجری میں جب مکہ کا محاصرہ ہوا ہے تو منجنیق کے ذریعے سے پتھر پھینکے گئے ہیں بعض مصنفین کا خیال ہے کہ نفت بھی مسلمانوں میں پہلی مرتبہ اسی موقعہ پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس محاصرہ کے متعلق تاریخ طبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دو منجنیقیں نصب کی گئی تھیں۔ پہلی خانہ کعبہ میں پتھر پھینکتی، دوسری صفا اور مروہ پر۔ منجنیق انداز ایک حبشی ملک حبش کا باشندہ اور کافر تھا۔ علاوہ ازیں شاعر بھی تھا۔ ام فروہ منجنیق کی کنیت ہے جب صفا مروہ پر پتھر پھینکتا، یہ شعر پڑھتا:

کیف تری ضیع ام فروہ　　　تاخذہم بین الصفا والمروہ

جب خانہ کعبہ پر پتھر پھینکتا، یوں پڑھتا:

ماترا ہا طعنا عبا ر ہا　　　واللہ یرعبون جا ر ہا

ماہ صفر میں تمام مہینہ سنگ اندازی جاری رہی۔ ربیع الاوّل کی ۳ تاریخ کو آگ لائی گئی جس کو روئی کے گٹھوں میں رکھ دیا گیا۔ اسی میں گندھک بھی رکھ دی گئی۔ اب یہ گٹھے منجنیق کے ذریعہ سے کعبہ میں پھینک دیئے گئے۔ غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی اور غلاف جل گیا، دیوار سیاہ ہوگئی اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس آگ کو بجھا سکتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب روئی کے گٹھے میں آگ لگا کر پھینکنا چاہا، کل بگڑ گئی اور گٹھا منجنیق پر ہی جلنے لگا۔ محاصرین نے بہت کوشش کی کہ آگ بجھا دیں لیکن ممکن نہیں ہوا۔ یہ اسی روز کا واقعہ ہے جس روز کہ یزید کا شام میں انتقال ہوا۔[1]

بلاذری کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح سندھ کے وقت محمد بن قاسم نے سنہ۹۳ ہجری میں مجانیق کے ذریعہ سے جنھیں قدیم مورخ "عروس" کہتے ہیں اور جن سے کام لینے کے لیے پانچ سو آدمی درکار تھے، بندرگاہ دیبل فتح کی تھی۔ الور کی جنگ میں جو فتح دیبل کے چند روز بعد ہوا

---

[1] یہ واقعہ تاریخ اسلام کے طبعزاد افسانوں میں سے ایک ہے مورخین نے یزید کی موت کا اس سے تعلق قائم کرکے اپنی غلط بیانی کا خود اعتراف کر لیا ہے واضح رہے کہ یزید اس مہینہ واقعہ سے ۹ سال قبل ۷ میں فوت ہوچکا تھا۔ (ادارہ)

کہا جاتا ہے کہ راجہ داہر کا ہاتھی ایک نفت بست تیر سے، جو عربوں نے اس پر چھوڑا تھا ڈر کر بھاگ گیا تھا۔

اس واقعہ کے تین صدی بعد جب سلطان محمود غزنوی انند پال راجۂ لاہور کی سزا دہی کے ارادہ سے ۳۹۹ھ ہجری میں ہندوستان آتا ہے تو پشاور کے میدان میں ہندو فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس جنگ میں راجہ کا ہاتھی حقۂ نفت سے ڈر کر، جو اس پر پھینکا گیا تھا، بھاگ جاتا ہے۔ اس واقعہ سے ہندو فوجیں ہزیمت پاتی ہیں۔ اس سے دس سال بعد ملتان کے قریب محمود اور کوہ جود کے جاٹوں میں دریائی جنگ ہوتی ہے۔ محمود کے پاس چودہ سو کشتیاں تھیں۔ ہر ایک کشتی میں بیس تیرانداز اور پانچ نفت انداز بیٹھے تھے۔ جاٹوں کو شکست ملی

عنصری قلعہ غرجستان کے متعلق لکھتا ہے:

چناں فگندی زد سنگ منجنیق عدو — کز دشدی دل خود از نہیب او بظلام

الپ ارسلان سلجوقی (۴۵۵ھ و ۴۶۵ھ) اور ارمانوس قیصر روم کی جنگ میں جس میں ارمانوس گرفتار ہوتا ہے، رومیوں کے پاس اتنی بڑی منجنیق تھی جس پر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے وہ آٹھ حصوں میں منقسم تھی۔ اس کی بار برداری کے لیے ایک سو جانور درکار تھے۔ اس منجنیق سے ایک من سے زائد وزن کا پتھر پھینکا جاتا تھا۔

مسعود سعد سلمان نے فتح آگرہ پر آتشی آلات کا استعمال یوں بیان کیا ہے:

سپہ چو دائرہ بپیچید گردِ حصنِ حصین
نمود حصن از و ہمچو نقطۂ پرکار

ز ہر چہار طرف سنگ منجنیق رواں
برو چنانکہ سوی چرخ دعوت ابرار

ہر آتشی کہ بیند اختند از او کنگر
چناں نمودی کہ از چرخ کوکب سیار

ہر آں سواری کاندر میاں آتش رفت
اگرچہ بودی آتش بگرد او انبار

بردن شدی چو براہیم از دل آتش
بگردش آتش سوزندہ می شدی زنہار

شہاب الدین غوری اور پرتھی راج کی جنگ میں اگرچہ مسلمان مؤرخ آتشی آلات کے استعمال کے متعلق خاموش ہیں لیکن راجہ کے بھاٹ چند کوی کی نظم "پرتھی راج راسا" میں ایسے موقع آتے ہیں جن میں نہ صرف آتش گیر آلات کا ذکر ہے بلکہ زنبور، توپ اور توپ کے گولوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ گولوں کی آواز دس دس کوس تک جاتی تھی۔ اس سے کامل شبہ ہوتا ہے کہ ایسے اشعار پرتھی راج راسا میں غالباً بعد میں اضافہ کئے گئے ہیں۔

چنگیز خان کے زمانہ میں ہم قارورہائے نفت وسنگ منجنیق اور عرادہ کے علاوہ کمان رعد کا بھی ذکر پڑھتے ہیں۔ یہ آلہ کیا تھا؟ ہم نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ منجنیق سے کوئی علیٰحدہ شے ہے۔ اس سے تیر اور پتھر چلائے جاتے تھے۔

ہلاکو نے جب ۶۵۱ھ میں ایران کی طرف پیش قدمی کی ہے تو اس کے لشکر میں ہزار خانہ دار منجنیق سازوں اور نفت اندازوں کے تھے۔ میا فارقین کا جب اُس کی فوجوں نے محاصرہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ ملک کامل کے پاس ایک ایسا زبردست منجنیقی تھا جس کی نشانہ بازی نے مغلوں کی فوج کا بہت نقصان کیا۔ مجبور ہو کر انھوں نے بدرالدین لولو کے منجنیقی کو جو اپنے فن میں اُستاد کامل مانا گیا تھا، بلوایا۔ اس نے قلعہ کی منجنیق کے عین مقابلہ میں اپنی منجنیق نصب کر دی۔ دونوں استادوں نے ایک ہی وقت میں پتھر چلائے جو راہ میں آکر ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر گر گئے۔

امیر تیمور نے بعض قلعے نقب زنی کے ذریعہ سے مسخر کئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور اور سلطان محمود تغلق کی جنگ میں ہندوستانی فوج میں ہاتھیوں کی صف کے برابر رعداندازوں کی صف تھی۔ یہ کون لوگ تھے؟ ہم کہہ نہیں سکتے۔ ایرانی تاریخ میں تخش اندازلوگوں کا بھی ذکر آتا ہے اور رعداندازوں کا تذکرہ بھی دیکھا گیا ہے۔ سنگ رعد کے چلتے وقت بڑی آواز ہوتی تھی، جو دور دور تک پہونچتی ہوگی اور غالباً اسی وجہ سے اسے "کمان رعد" کہا جاتا تھا۔ "حبیب السیر" کا یہ فقرہ، جو قلعۂ گل خندان کی تسخیر کے موقع پر جب کہ شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوجیں اُسے گھیرے پڑی تھیں قابل لحاظ ہے

"از ہیبت صدای سنگ رعد ارکان آن کوہ سمت تزلزل گرفت واز شعلۂ قارورۂ
نفط بنای زندگانی آن گروہ صفت احتراق پذیرفت۔"

'کوہ' اور 'گروہ' سے مراد قلعہ اور اہالی قلعہ ہیں۔ ایک اور موقع پر (صفحہ ۸۶، جلد ۳)
"حبیب السیر" میں یہ فقرہ آتا ہے:

"غرّش کمان رعد صدای مرگ بگوش ہوش بہادران رساند۔"

امیر تیمور اور سلطان بایزید یلدرم کی جنگ میں مغلیہ لشکر میں نفط انداز تھے جو ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ قلعۂ ازمیر جب تیمور نے فرنگیوں سے فتح کیا ہے، محاصرہ کے دوران میں محاصرین نے قلعہ کے نیچے نقب لگا کر عرّادہ اور منجنیق نصب کئے۔ محصورین جواب میں تیر چرخ اور قارورہائے نفط اور سنگ پھینکتے تھے۔ محاصرین کے نقب چیوں نے بر دوبارہ کے پتھر نکال کر اُن کی جگہ لکڑیاں بھر دیں، جن پر نفط ڈال دی گئی تھی اور پھر آگ لگا دی گئی۔ اس سے قلعہ کی دیوار ڈھے گئی۔ رخنوں میں سے مغل اندر گھس گئے۔ اسی عرصہ میں محصورین کی مدد کے لیے کئی جہاز فرنگیوں کے معہ فوج و سامان آئے۔ امیر کے حکم سے بعض مقتولین کے سر کمان رعد میں رکھ کر ان کی کشتیوں میں پھینک دیئے گئے۔ جہاز والے اپنی قوم کے مقتولین کے سر دیکھ کر اور ڈر کر واپس چلے گئے۔

نفط غالباً ایشیائی قوموں میں نہایت قدیم زمانہ سے مستعمل ہے۔ قدیم سریانی اس کے استعمال واقف تھے۔ علیٰ ہذا قدیم ایرانی۔ ان کے ممالک میں نفط کے چشمے اکثر مقامات میں پائے جاتے ہیں۔ نفط کو آج کل پڑولیم یا مٹی کا تیل کہا جاتا ہے۔ اس کا رواج بحری جنگوں اور قلعہ کشائی میں زیادہ رہا ہے۔ چمچوں اور کڑچھیوں کے ذریعہ سے محاصرین پر ڈالی جاتی تھی یا تانبے کی نلکیوں سے جو جہاز کے عرشہ میں لگی ہوتی تھیں۔ بعض وقت رسّیاں نفط میں بھگو کر اس میں آگ لگا دی جاتی تھی اور پھر تیروں یا نیزوں کے ذریعہ سے غنیم پر پھینک دی جاتی تھیں۔ قارورہ اور شیشوں میں بھر کر پھینکی جاتی تھی علاوہ ازیں بھاری بھاری گلوں سے کثیر مقداریں پھینک دی جاتی تھی۔ جہاں جہاں نفط گرتی تھی وہاں آگ لگ جاتی تھی پانی ڈالنے سے وہ اور بھڑکتی تھی۔ زمین پر وہ چنداں خوفناک نہیں تھی جیسی کہ سمندر پر تھی۔

حروب صلیبی کے دوران میں مغربی قوموں نے سب سے پہلے نفط کا استعمال دیکھا اس
آتش [illegible] ۱۱۷۰ [illegible] میں ضرورت سے زیادہ جم گئی تھی قرون اواسطہ کے

مؤرخین یورپ مبالغہ آمیز الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ژوان ول کا بیان ہے کہ میں نے عمر بھر اس سے زیادہ کوئی مہیب شے نہیں دیکھی۔ اس کے شعلوں کو وہ اُڑتے اژدہا سے مثال دیتا ہے جب سینٹ لوئی بادشاہ فرانس کے قریب یہ چشمہ آتش پہنچتا تھا وہ زمین پر گر پڑتا اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر نہایت تضرع کے لہجے میں کہتا تھا: "اے میرے خداوند مسیح مجھ کو اور میری فوج کو اس بلا سے بچا۔"

بعض اساتذہ کی رائے ہے کہ وہ یورپ میں ساتویں صدی عیسوی میں پہونچ گئی تھی۔ اس کا اشاعت دینے والا ایک شامی معمار کا فی مینکس نامی تھا۔ عربوں کے محاصرۂ قسطنطنیہ کے وقت یونانیوں نے نفط سے نہایت کامیابی کے ساتھ کام لیا ہے۔ قیاصرۂ روم جو نسخہ استعمال کرتے تھے باوجودِ تلاش کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ گویا ایک قومی راز تھا۔ ایک مصنف کی رائے میں اس کے اجزا یہ تھے۔ صنوبر کا پسا ہوا گوند، گندھک اور نفط۔ فرائر بیکن صرف اس کے دو اجزا بتاتا ہے، شورہ اور گندھک۔ ایک اور مصنف کہتا ہے، بید کا کوئلہ، نمک، گندھک، رال، لوبان، کافور اور ادن جن کو ملا کر ابالا جاتا ہے۔ رینداور فادے کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مادّہ محرقہ کے یہ اجزا تھے، گندھک، گوند اور چربی۔ نفط یا یونانی آگ کے اجزا خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عربوں نے یہ نسخہ بہت جلد معلوم کر لیا۔ ان کے استاد خواہ رومی ہوں یا چینی اور اس کثرت سے اس کا استعمال اُن کے ہاں ہونے لگا کہ بقول رینادو فادے ان کے حربی آلات کا جزو اعظم بن گیا۔ وہ اسے صدہا طرح سے اور مختلف آلات کے ذریعہ سے دشمنوں پر پھینکتے تھے۔ انہی نفط کے نسخوں میں سے جو قرونِ اواسط میں کثرت کے ساتھ مستعمل تھے غالباً بارود ماخوذ ہوتی ہے۔ بعض مغربی محققین کی رائے ہے کہ بارود کی ولادت گاہ مشرق الاقصیٰ ہے چینی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بارود وہاں دو ہزار برس سے آتش بازی میں رائج ہے لیکن بارود جنگی استعمال سے چینی لوگ واقف نہیں تھے محض اس بنا پر ہم چین کو اس کا مسقط الراس نہیں مان سکتے۔ اس لیے کہ آتش بازی تمام ایشیا میں قدیم زمانہ سے ہے اور بارود کے اجزا یعنی شورہ، گندھک اور کوئلہ کا استعمال عموماً آتش بازی میں کیا جاتا ہے اور وہ ایشیا میں قریب قریب ہر ملک میں افراط سے ملتے ہیں۔

سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۹ھ میں قلعہ بھیم نگر کی فتح کی خوشی میں ایک جشن کیا تھا جس میں آتش بازی بھی شامل تھی۔

"ونیز استادان نادرہ کار صنعت شعار انواع آتش بازی حاضر آوردہ ہنگامۂ تماشہ گرم کردند"

سلطان فیروز شاہ خلجی (۷۵۲ھ) اپنے عہد میں شب برأت کی رات اور بازیوں کے علاوہ کوشک فیروز آباد میں بقول شمس عفیف گل ریز اور عنبر بیز ہوائیاں چھڑوایا کرتا۔ ۸۲۲ھ میں میرزا شاہ رخ نے شادی خواجہ کو بطور سفیر خان بالیع کے دارالسلطنت ختا میں بھیجا تھا اور ہدایت کردی تھی کہ شروع سفر سے اختتام سفر تک کے روزانہ حالات اور واقعات لکھتا رہے اس روزنامہ سے جس کا خلاصہ روضۃ الصفا میں درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ختا کے ہاں رسم شب چراغ میں آتش بازی بھی چھوڑی جاتی تھی۔ سفیر نے جو آتش بازی وہاں دیکھی تھی یوں بیان کرتا ہے کہ لکڑی کا ایک بہت بڑا پہاڑ بنایا گیا اس پر سرو کی شاخیں نصب کردیں جن سے تمام پہاڑ زمرد پوش معلوم ہونے لگا۔ پھر ایک لاکھ چراغ اس پر رسیوں پر نصب کردیئے گئے نفط کی انھوں نے موشک یعنی چھچھوندر بنائی۔ ایک چراغ جلادیا۔ چھچھوندر اس کی آگ لے کر رسیوں پر دوڑنے لگی اور جس چراغ کے پاس پہنچی اس کو جلاتی نکل گئی۔ دم بھر میں اسی طرح سے سارے پہاڑ کے چراغ نیچے سے لے کر اوپر تک روشن ہوگئے۔

شہر بیجا نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے مصنف روضۃ الصفا، جشن مہتابی کے ذکر میں جو تین روز تک منایا جاتا تھا۔ ضمناً آتش بازی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ مثالیں اگرچہ قدیم نہیں تاہم یہ دلیل ہیں اس امر کی کہ آتش بازی ایشیا کے ہر ملک میں ہوا کرتی تھی۔

اب آتش بازی سے بارود کا ماخوذ ہونا نہایت قرین قیاس ہے۔ آتش بازی کے نسخوں میں علی العموم شورہ، گندھک اور کوئلہ کا استعمال ہوتا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ جس طرح اس کی احتراقی قوت عام طور پر معلوم تھی ایک دن کسی آتش باز کو اس کی نفوذی طاقت بھی معلوم ہوگئی۔ آتش بازوں کو اکثر ایسے حادثات پیش آئے ہوں گے۔ ہم یہاں آتش بازی کی کسی بیاض سے جو قلمی ہے چند نسخوں کے اوزان لکھتے ہیں:

وزن انار تجربہ جان محمد :

شورہ	گندھک	انگشت
۱۰ درم	یک درم	دو درم

وزن ہوائی از مہاکرن :

شورہ	گندھک	ہتل ہری	ازندھی
۷ درم	دو درم	درم	دس دانہ

وزن انار :

شورہ	گندھک	کافور	ہتل
؟	۸ درم	درم	۴ درم

وزن انار کوکنی محمد شاہی :

شورہ	گوگرد	دیگچوں	انگشت
۵ تولہ وسہ ماشہ	۲ تولہ	۳ تولہ	دو نیم ماشہ

وزن موشک خضر خاں :

شورہ	گندھک	انگشت
۴ درم	۳ درم	نیم درم

وزن درخت سرد :

شورہ	گندھک	انگشت
۱۰ درم	۳ درم	یک درم

وزن مہتاب شاہ قطبی صاحب :

شورہ پختہ	گندھک	ہڑتال پوربی	ملل کتبری
۸ درم	۲ درم	۶ ماشہ	۸ ماشہ

کافور	سفیدۂ کاشغری
سہ ماشہ	ماشہ

سوائے شورہ وگندھک اول ہمہ را بسایند بعد ازاں ہمہ را آمیختہ بسایند۔ شورہ پختہ بکار برند اوّل شعلہ را سوزند اگر شعلۂ سفید برآید بکار برد و نم کردہ پر کنند۔

وزن ترنج دل بادل :

شورہ	انگشت	گندھک	آہن
۷ درم	۲۱ درم	۷ درم	حصہ دو

لقمۂ اول سخت پر کنند لقمۂ دوم نرم لقمۂ سوم نرم تر دارد۔

گلہائے سوسنی:

سنگ راسخ شورہ قلمی نوسادر گندھک انگشت چیدہ دیگچوں رال

۲ تولہ ۳ پاؤ پاؤ سیر نیم سیر ۸ تولہ ۳ تولہ

اوّل ہمہ ادویہ را کوفتہ باریک نمایند بعد ازاں در ہاون انداختہ دو پاس ضرب موسل دھد واز آب ستر و شراب ترکند بعد ازاں دانہ پھول جھڑی نیم پاؤ کارطوس طیار کند و سنگ راسخ و شورہ و نوسادر رایک جا دو پاس بکوبد و گندھک و انگشت بہ نصف و شورہ وراں رایک جا بکوبد۔ بعد آں کارطوس ہا طیار کند اوّل از بارود پرکنند یک تہ بعد آن درمیان سنگ راسخ دیگچوں را آمیز کردہ قدری بارود انداختہ پرکنند ہمین منوال تا بلب رساند۔ برلب شراب و بارود دھد و خشک کند بعد از دہ روز آتش دھد گلہای رنگ سوسنی برآید۔

آتش بازی نے، اس میں شک نہیں کہ ایشیا میں بہت کچھ ترقی پائی ہے۔ ایران و عراق وغیرہ ممالک میں اس فن کے اچھے اچھے استاد گزرے ہیں۔ وہ قریب قریب ہر رنگ اور ہر پھول کی آتش بازی تیار کرسکتے تھے مثلاً نرگس، صدبرگ، داؤدی، سمن، سوسن، ارغوان، گل امرود، گل بادام، گل نیلوفر، گل بنفشہ، گل شقائق، مروارید، درخت سرو، ناصری، گل مہدی، گل جنار، غبار قمر، غبار گل مروارید، غبار قمر غربی، غبار شمس، غبار گل خرگاہی، غبار گل صدبرگ وغیرہ۔

یہی آتش باز جنھیں ہم آج کل شورہ گر کہتے ہیں قدیم زمانوں سے باروت ساز بھی ہیں، اور صنعت بارود سازی ہندوستان میں ابھی تک اسی فرقہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے بھی یہی یقین ہوتا ہے کہ بارود آتش بازی سے نکلی ہے اور آتش بازی کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اچھے استاد آتش باز کے پاس باروت کے علیحدہ علیحدہ ایک دو نسخے ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنا نسخہ کسی کو نہیں دیتے تھے اس لیے کتابوں کے ذریعہ سے ہم کوئی زیادہ مفید اطلاع حاصل نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم مجموعۃ الصنائع سے یہ نسخہ باروت کا نقل کرتے ہیں جسے وہ داروی تیر کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"درصنعت داروی تیر بابت مصر و شام جہت قلاع یادگار محمد زرکش است"

عیار البقر۔ چہاردہ درم، عقرب۔ سہ درم، فحم۔ چہار درم۔ ایں دارو را از برای سنگ بزرگ و تخمار بزرگ و قلعہا افگندن نہایت مجرب است۔"

تیر گولی کے معنوں میں قرون وسطیٰ میں مستعمل ہوتا ہے اور اسی وجہ سے تیر بندوق اکثر تاریخ میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ دارو غالباً عربی لفظ ہے جو فارسی میں بھی مستعمل ہے۔ وحید بندوق کی

تعریف میں کہتا ہے :

نماید حکیمی مسیحا مزاج زداروی او دشمنان را علاج

دارو اصل میں علاج اور نسخہ وغیرہ کے معنوں میں تھا۔ آتش بازوں میں یہ اصطلاح ہر قسم کے نسخہ کے واسطے استعمال ہونے لگی مثلاً داروی طاسہ لیکن بعد میں دارو صرف باروت کے معنوں میں مخصوص ہوگیا۔ جیساکہ شعر بالا سے مفہوم ہوتا ہے۔

'داروی کمان' ایک اور لفظ ہمیں ملتا ہے۔ یہاں غالباً کمان کے معنی بندوق کے ہیں۔ اس طرح سے داروئے کمان بھی بارود کا دوسرا نام ہے۔ لغت کی کتابوں میں کمان زنبوری کے معنی بندوق کے ہیں۔ اس کے لیے اسدی کا ایک شعر بھی نقل کیا گیا ہے۔

گرفتند گردان ایران زمین کمانہای زنبوری وچرخ کین

اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر مجازاً کمان بندوق کے معنوں میں آیا ہو۔ داروی تیر کا ایک اور نسخہ ہم اسی کتاب سے نقل کرتے ہیں۔

القبر نوزدہ، زغال چہاردہ، نیم سائیدہ در سرکۂ کہنہ ترکند اما کمان را بگیر داز خانۂ فتیلہ تا دہان باید کرد و ریو دانگاہ دارو دو دانگ بیش رود دہ دانگ میدان کمان چو عقدہ کمان معلوم شد چون از دارو تیر کردہ می شود و بہ نشانہ و تپش رود و پرسازد تا کار خوب آید و مثل آن کمان از قاق و تحمار گران و این لعبت ہا پیش استاد درست می شود۔

اس فارسی کو عام فہم معنی دینا ہماری طاقت سے باہر ہے اس لیے کہ اس کی اصطلاحوں سے ہم ناواقف محض ہیں۔ دوسرے عبارت میں بعض مقامات پر بعض افعال غالباً چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

اسی قسم کا ایک اور نسخہ ہم اسی کتاب سے نقل کرتے ہیں :

این را نیز دارو خوانند عبارتیست القبر مثقال لال عقرب مثقال سخت و نرم بسایند کہ کمان را غبار باید کرد دو دانگ و نیم دارو و دو دانگ و نیم از میدان رعد ورھا کند از بہر تیر دیا از بہر سنگ و کمان را باید کشید باید کہ وزن کمان ہم وزن آن سنگ (باشد) و چہار سوراخ باید کرد بمقدار چہار انگشت و زفت رومی و مشبق صافی و علک فالی از مشبق رومی در سرشت کار و بوزن راست است۔ ہمہ را بسایند و بیزند و در دیگی سفالین اینک بینند کہ این دارو ھا چند است بوزن صد درم دارد

یک درم روغن نفط سفید بستانند و در دیگی اندازند واین دارو با درمیان دیگر اندازند و در سوراخ سنگ کنند تا پر شود و چہار سرمہ دان پر کنند واز روغن نفت د... را بفتیلہ استوار کنند و سنگ را بگیرند و جامہ در بوشانند از نمد و ہمہ را بر روغن نفط چرب کنند و گرد بر گرد نمد پارہ پارہ کنند و درمیان دھان کمان استوار کنند و کمان را باید در آن ترخری بسازند در آنجا نند وشاخہای نمد را آتش بزنند کہ ہر کجا کہ سنگ برسد بشکنند وبسوزد مجرب است واین اعمال استاد محمد زرکش است۔"

مندرجۂ بالا پھٹنے والے پتھر کے گولے کا بیان ہے جو کسی کل سے چلایا جاتا ہوگا اور کوئی تعجب نہیں اگر یہ وہی کمان رعد ہو جس کا ذکر ہم خروج چنگیز خان کے زمانہ میں پڑھتے ہیں ۔ اس کمان سے تیر اور پتھر چلائے جاسکتے ہیں ۔

اسی سلسلہ میں سہم الطائی کا بھی ذکر کرنا چاہیئے جو بلاد مصر و شام میں مستعمل تھا ۔ اس کا عیار حسب ذیل ہے :

" القبر بست مثقال، عقرب یک مثقال، فحم دو مثقال کہ تنک بسایند و کنند وی پیچیدہ و پنجاہ طاق کاغذ تا بدکہ سوراخ او علیحدہ باشد و چہار گوشۂ او بضرب بکوبند و بہر ضربی صد ضرب زنند و بر سر این دارو پنج درم داروی مفرح بریزند و پنجاہ ضرب بزنند و قوام نگاہ دارند و بیست ضرب دیگر بزنند. وسہ درم گوگرد بر سر این دارو بریزند و درمیان این دارو یک مثقال خاک سرخ و پنجاہ ضرب بزنند و قوام نگہ دارد و بیست ضرب دیگر بزنند واین سرشت و باید سوراخ این سہم یک نیم گندم باشد بدین طریق سوراخ نیمہ بر دبود و ہنگام باید کہ رخت آہنین باشد چوب تیر باید کہ دراز فرجہ ومشت باشد و ہنگام دو مشت باید کہ سہ بر داشتہ از پوست وسہ جای در بند کنند و عدل او باید در پیدا باشد و بر انگشت عدل کنند تا راست آید ذتیر دان (؟) نیم قد آدمی باشد و زلفین آہنین باید سوراخ در و باید کرد واین سہم درمیان زلفین انداز و فتیلہ را آتش دہند کہ مجرب است۔"

سہم الطائی، ممکن ہے کہ محض تفریحی آتش بازی ہو لیکن اس کی صورت . رخت آہنین سوراخ اور فتیلہ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو توپ سے بہت ملتی جلتی ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ یہی تفریحی اشیا سب سے پہلے توپ کی ایجاد کا راز کھولتی ہوں ۔

اسی کتاب میں داروئے کمان کے دو اور نسخے دیئے گئے ہیں " القبر بیت، نفط شش

حدید چہار دہ انگشت وکل شذن "

دوسرا نسخہ ہے عیار دار روئے کمان کا از مبارک شاہ رعدانداز :

" القبر دہ مثقال، زغال مثقال، عقرب دو نیم مثقال "

مجموع الصناع کے جس قدر نسخے ہیں وہ عربی ذرائع سے پہنچے ہیں، استادان خوارزم، خطا، عراق و شام و مصر کے منقول ہیں۔

القبر (شورہ) عقرب (گندھک) فحم (کوئلہ) بھی عربی اصطلاحیں ہیں۔

ان ملکوں میں آتش بازی، اس میں شک نہیں، مفرداتی کیفیت سے گزر کر مرکباتی حیثیت میں آگئی ہے جیسا کہ طوطک اندر قفس کے حوالے سے، جو استاد عوض بغدادی کی طرف منسوب ہے، معلوم ہوتا ہے جس میں ایک طوطا پنجرے کے اندر دکھایا جاتا ہے اور پنجرہ چاروں طرف سے گھومتا رہتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمان رعد جس کے متعلق سابق میں ذکر ہو چکا ہے، توپ و بندوق کی ایجاد کی طرف رہنمائی کرتی ہے مغلوں کے خروج کے وقت سے اس کا استعمال شروع ہوتا ہے اور یہی قوم اس کو ایشیا کے اقصائے مغرب تک پہنچا دیتی ہے۔ شام و مصر میں اس پر کچھ اضافہ کیا جاتا ہے مصر سے افریقہ میں اشاعت پاتی ہوئی ہسپانیہ پہنچ جاتی ہے جہاں وہ پوری نشو و نما پا کر توپ کی شکل میں نکلتی ہے۔ لیکن اس سلسلۂ بحث کو کچھ دیر کے لیے منقطع کر کے ہمیں ان روایات کا بھی ذکر کر دینا چاہیے جو یورپین مؤرخین بارود کے متعلق بیان کرتے ہیں۔

بعض اسناد کی یہ رائے ہے جس میں زیادہ تر یورپین مؤرخ شامل ہیں کہ قدیم اہل یونان و ہند و روما غالباً اس مصالحہ سے واقف تھے اس لیے کہ ان کی تصنیفات سے کسی ایسے مصالحہ کا پتہ چلتا ہے۔ ورجل کی کتاب ایلیڈ کا اقتباس جس میں ایلس کے بادشاہ کو پیٹرنے برق اور رعد کی بہت مشابہ کی تقلید کے جرم میں مار ڈالا تھا، اس خیال کی تقویت کے لیے نقل کیا گیا ہے۔ ڈاین کاسیس اپنی تاریخ روما میں کالیگلا کے ذکر میں بیان کرتا ہے کہ اُس نے ایسی ایجاد کی تھی جس میں برق اور رعد کی سی خاصیت تھی اور جس سے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ پہلا سٹریس، دوسری عیسوی کا مصنف ہندوستان کے دوآبہ میں رہنے والی کسی قوم کے ذکر میں گویا ہے کہ اگر سکندر اُن کے ملک پر فوج

فوج کشی کرتا تو کبھی فتح نہیں پا سکتا اس لیے کہ یہ لوگ میدان جنگ میں آکر اپنے دشمنوں سے لڑنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ شہر کی دیواروں پر سے طوفان اور صاعقہ بار ی کے ذریعہ سے ان کو برباد کر دیتے ہیں ۔ آئین جنیٹو میں، جو حضرت موسیٰ کی ہم عصر ہندوستانی تصنیف مانی جاتی ہے، کہا جاتا ہے آلات محرقہ کے متعلق سب سے قدیم حوالہ ملتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "رئیس کو کسی خدع آمیز یا زہری اسلحہ یا توپ اور بندوق یا کسی اور قسم کے آتشی حربوں سے جنگ نہیں کرنا چاہیئے"۔ انگریزی مترجم آئین جنیٹو کے قول کے مطابق "آتشی حربہ" سنسکرت لفظ" اگنی استر" کا لفظی ترجمہ اور توپ" شت اگھنی" کا ترجمہ ہے۔ یہ ایسا حربہ تھا جس سے سو آدمی فوراً مارے جاتے ہیں۔

کیٹیس کا بیان ہے کہ دریائے سندھ کے قرب وجوار کے رہنے والے لوگ ایسا تیل تیار کرتے تھے جو گھڑوں میں بھر کر لکڑی کی عمارت پر پھینکا جاتا تھا جس سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے تھے اور صرف مٹی ہی سے وہ بجھ سکتا تھا۔ وہ صرف پادشاہ کے لیے تیار کیا جاتا تھا، دوسرے آدمیوں کو اس کے رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

ایلین، ایک اور مصنف اس آتش سیال کے متعلق، کچھ اور معلومات کا اظہار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس تیل سے نہ صرف لکڑی جلتی ہے بلکہ جانور اور آدمی بھی جل جاتے ہیں۔ اور ہندوستان کا بادشاہ اس تیل کی مدد سے شہر اور قلعے فتح کرتا ہے۔ مٹکوں میں بھر کر غنیم کی گڑھی کے دروازوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ دروازے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔

پہلا سٹرٹیس اسی تیل کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کسی جانور سے نکالا جاتا ہے اور یہ جانور صرف بادشاہ ہی رکھ سکتا ہے۔ ہم ہندوستان میں ایک آتش بست تیر کے استعمال کا بھی ذکر پڑھتے ہیں جو بانس کی نال سے پھینکا جاتا تھا۔ مجمل التواریخ جو کسی سنسکرت کتاب سے عربی میں ۱۱۲۶ء میں ترجمہ ہوئی ہے راجہ ہال کے قصہ میں لکھا ہے کہ برہمنوں نے راجہ ہال کو، جب کشمیر کے راجہ کی فوجیں چڑھ آئیں، یہ مشورہ دیا کہ مٹی کا ایک ہاتھی بنا کر اپنی فوج کے اوّل رکھے۔ الغرض جب راجہ کشمیر کی فوج آئی، ہاتھی پھٹا اور اس کے شعلوں سے کشمیر والوں کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں مہابھارت، ہری ونس، سری بھاگوت وغیرہ میں بھی ہم کچھ نہ کچھ آلات آتش کے متعلق پڑھتے ہیں۔ ٹائمز انسائیکلو پیڈیا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کی تصنیف میں کچھ ایسے اشرات کا ذکر

کیا گیا ہے جو قطعی طور پر آتش بازی اور آتشی حصّوں سے پیدا ہو سکتے ہیں، اگرچہ شاعر یہ اثرات سحر اور جادو کی طرف تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ یہاں قطعی غلط ہے۔ جادو کے اثرات میں فردوسی صرف غیر موسمی برف باری اور تاریکی منسوب کرتا ہے لیکن وہ آلات محرقہ کا خود ذکر کرتا ہے۔ نفط، نفط سیاہ، قارورہ، عرّادہ اور منجنیق وغیرہ سے بخوبی واقف ہے اور کئی موقعوں پر اُن کا ذکر کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی نفط کا عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ کیخسرو نے جب کنگ دژ افراسیاب سے فتح کیا ہے اشعار ذیل میں آتشی آلات کا مذکور ہوا ہے:

دو صد پارہ عرّادہ و منجنیق   نہاد از برش بر سوی جاثلیق
دو صد چرخ بر ہر سوی بدگمان   ز دیوار در چون سر بدگمان
پدید آمدی منجنیق از برش   چو ژالہ ہمی کوفتن بر سرش
پس منجنیق اندرون رومیان   رہا چرخ ہا تنگ بستہ میان
دو صد پیل فرمود پس شہریار   کشیدن ستونہا بہ پیش حصار
یکی کندۂ زیر بارہ درون   بکندہ نہادند زیرش ستون
پراگندہ بر چوب نفط سیاہ   بر آنگونہ فرمود نیرنگ شاہ
بر آن چوبہا بار ماند بپای   بدان چوبہا بر گرفتہ زجای
بیک سو پراز منجنیق و ز تیر   رخ سرکشان بود ہمچون زریر
تجویداندرون آتش و نفت و چوب   زیر گرزہای گران کوہ کوب
بہر چار سو ساختہ کارزار   چنان چون بود ساز جنگ حصار

اس کے بعد ان چتروں میں آتش زدگی کا اثر یوں دکھایا گیا ہے:

بدان چوب و نفط آتش اندر زدند   ز بر شان ہمی سنگ بر سر زدند
ز بانگ کمان ہای چرخ و ز دود   شدہ روی خورشید تابان چو دود
ز عرّادہ و منجنیق و ز گرد   زمین نیلگون شد ہوا لاجورد
خروشیدن پیل و بانگ سران   درخشیدن تیغ و گرز گران
تو گفتی بر آمیخت [illegible]   ز باریدن تیر و گرد سپاہ

برآنگونه گشت آسمان ناپدید | کجی چشم روشن جہاں را ندید
زنفط سیہ چو بہا برفروخت | بفرمان یزدان چو ہیزم بسوخت
نگون بارہ گفتی کہ برداشت پای | بکردار کوہ اندر آمد زجای
وزان بارہ چندی زترکان بزیر | نگون اندر آمد بکردار شیر
کہ آرد بدو شور بختی جہان | بدام اندر آید سرش ناگہان

یہی ایک منفردہ مقام نہیں ہے جہاں شاہنامہ میں ان آلات کا ذکر آتا ہے بلکہ فور اور سکندر ں جنگ میں، جب کہ یونانی فوجیں غنیم کے حملوں کی دست برد سے بہت بیدل ہوگئی ہیں، سکندر یلسوفاں روم کے مشورہ سے لوہے کے سوار معہ گھوڑوں کے بناتا ہے۔ راکب اور مرکب کے جوف ں نفط بھر دی جاتی ہے اور جب دوبارہ جنگ ہوتی ہے تو یہ آہنی سوار سب سے پہلے میدان نگ میں لائے جاتے ہیں اور ہاتھیوں پر چھوڑ دیئے جاتے اور نفط میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ شمن کے ہاتھی ان مصنوعات آتشی سے ڈر کر اپنی فوجوں کو روندتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں اور ور کو شکست مل جاتی ہے:

باسب و نفت آتش اندر زدند | ہمہ لشکر فور برہم زدند
از آتش برافروخت نفط سیاہ | بجنبید از ان کاہنین بد سپاہ
چو پیلان بدیدند از ایشان گریز | برفتند با لشکر از جای تیز
زلشکر برآمد سراسر خروش | بزخم آوریدند پیلان کوش
چو خرطوم ایشان بر آتش گرفت | بماندند از ان پیلبانان شگفت
ہمہ لشکر ہند گشتند باز | ہمہ زندہ پیلاں گردن فراز

نوشیروان نے جب قلعۂ قالی نیوس قیصر روم سے فتح کیا ہے اس موقع پر قارورہ کا بھی ذکر آتا ہے۔

بدروازہا جنگ برساختند | ہمہ تیر و قارورہ انداختند

ہندوستان میں آلات آتش بازی کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے علی ہذا کہا جاتا ہے آتشی حقوں کا بھی استعمال جاری تھا، لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان آلات کو بارود سے کیا تعلق

ہے ۔ علیٰ ہٰذا مؤرخین یورپ کو پورا پورا شبہ ہے کہ ہندوستان میں سکندر اعظم ضرور کسی آتشی اسلحہ سے دوچار ہوا ہے کیونکہ کوئنٹس کرٹیس مورخ کے ایک فقرے سے اس قسم کا مطلب مفہوم ہوتا ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم برہمنوں کے پاس گرجنے والی اور چمکنے والی کلیں ضرور تھیں ۔ اسی سلسلہ میں فردوسی کے بیانات سکندر کے آہنی سواروں کے متعلق بھی قابل لحاظ ہیں ۔ ہندوستان میں ممکن ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا کوئی آتشی حربہ ہو لیکن اگر ایسا تھا تو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت ضائع ہو چکا ہوگا کیونکہ مسلمانی فتوحات کے دوران میں ، جس میں ہندو اور مسلمان فوجیں ہندوستان کے میدان میں معرکہ آرائی ہوئی ہیں ہم کسی آتشی آلہ کا ذکر نہیں پڑھتے جس سے مسلمان واقف نہ تھے بلکہ ہم کو اس امر کے تسلیم کرنے میں بھی تامل ہے کہ مسلمان غلبہ کے دوران ہندو نفت کے استعمال سے واقف تھے ۔ قدیم ہندو اگر کسی قسم کے مصالحہ سے واقف تھے تو یہ کیا ضروری ہے کہ وہ بارود ہی ہو ۔ ظن اغلب ہے کہ وہ نفت ہو جس کے چشمے ہندوستان کے مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں چنانچہ خان پور اور کوہاٹ کے قریب اس قسم کے چشمے ہیں ۔ ہندو ممکن ہے کہ بارود کے اجزا سے آتش بازی کے سلسلے میں واقف ہوں گے لیکن بارود کی نفوذی طاقت سے وہ اسی طرح بے خبر معلوم ہوتے ہیں جیسے اور قومیں ۔ ہندوستان میں اگر کوئی آتش بازی قدیم سے ہے تو وہ نہایت ابتدائی حالت میں ہوگی ۔ اس لیے کہ موجودہ زمانہ میں اس فن کی اکثر اصطلاحات مسلمانی ہیں اور شورہ گر عموماً مسلمان ہوتے ہیں ۔ ہندو شورہ گر دارو گر اور بارود کو دارو کہتے ہیں لیکن یہ دونوں لفظ مسلمانی ہیں ۔ اہل عراق شورہ کو بارود کہتے ہیں اور چونکہ اس مرکب میں جزو اعظم تھا اس لیے اس کا نام بھی بارود ہو گیا ۔ اگرچہ قدیم نام اس کا دارو تھا ۔

بعض مغربی اسناد بارود کی ایجاد راجر بیکن کی طرف منسوب کرتی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مثل البرٹ اعظم ان پرانے نسخوں کی تجدید کی ہے علی الخصوص اس نسخہ کی جسے مارکس گریکس نے اپنی کتاب مصنفہ ۱۲۳۰ء میں درج کیا ۔ دشمن پر آگ برسانے کا ایک طریقہ اُس نے یوں بیان کیا ہے :

آدھ سیر گندھک سیر بھر بید کا کوئلہ تین سیر شورہ ؛ سنگ مرمر کی اوکھلی میں پیس لیا جاوے اور پھر ملا دیا جاوے ۔ کچھ حصہ اس میں سے ایک لمبی تنگ اور مضبوط جوڑی ہوئی چیز میں رکھ کر پھر

دیا جا دے۔

یہ حلیہ ہوائی یا قلم کا ہو سکتا ہے۔ بارود کی اختراع شوار بز نامی جرمنی کے ایک راہب کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے اس نے کلون میں ۱۳۳۰ء مطابق ۷۳۱ھ میں کوئلہ شورہ اور گندھک کی ترکیب سے ایک نیا آتش گیر مرکب دریافت کیا۔ یہ نسخے مثل اور نسخہ جات ازمنۂ متوسط عربوں سے ماخوذ ہیں۔ رینا اور فادے کی تحقیقات اور ان سے پہلے کاسبرے اور آندلیسے اور دیا رود کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ گولی کا بارود جس سے غرض یہ تھی کہ اس کے ذریعہ سے آلات حربی فاصلہ پر اور زور سے پھینکے جا دیں، عربوں نے ایجاد کیا۔ ان دونوں مصنفین نے اس ایجاد کو اپنی پہلی تصنیف میں چینیوں کی طرف منسوب کیا تھا لیکن اپنی تصنیف مابعد میں جو ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی انھوں نے اپنی رائے بدل دی بعض نئی کتابوں کے مل جانے سے اُن کو اس امر کا ثبوت مل گیا ہے کہ یہ ایجاد عظیم، جس نے فن حرب میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے، عربوں کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں چینیوں نے فقط شورہ کو نکالا اور آتش بازی میں استعمال کیا لیکن بارود کی قوت نفوذیہ کا استعمال عربوں ہی نے کیا ہے یعنی انھوں نے توپ اور بندوق ایجاد کی۔ باروت سازی کے ایک عربی رسالہ سے جو تقریباً ۱۲۵۰ء میں تصنیف ہوا تھا اور جو کتب خانۂ اسکوریل میں محفوظ ہے معلوم ہوتا ہے کہ عرب لوہے کے مجوّف غبارے بنا کر ان کو آتش گیر یا پھٹنے والی اشیا سے بھر کر یا تو ہاتھوں سے دشمنوں پر جیسے آج کل بم کا گولہ پھینکا جاتا ہے یا جنگی کلوں کے ذریعہ سے جو اس زمانہ میں اس غرض کے لیے مستعمل تھیں، پھینک دیتے تھے۔ اس قسم کے پتھر کے گولہ کا مجموع الصنائع کے حوالہ سے اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

عام مؤرخین توپ کا پہلا استعمال ۱۳۴۶ء میں جنگ کریسی میں بتاتے ہیں لیکن عرب مؤرخین کے بیانات اور مختلف تصانیف مظہر ہیں کہ توپ اس سے بہت پہلے استعمال ہو چکی ہے۔ منجملہ ان انتخابات کے جن کو کانڈے نے مختلف عربی تصانیف سے ترجمہ کیا، ایک حکیم یہ لکھتا ہے کہ کسی امیر یعقوب نامی نے اپنے ایک باغی کے شہر مہدیہ نامی کا جو افریقہ میں واقع ہے، ۱۲۰۵ء میں محاصرہ کیا تھا اور دیواروں پر مختلف آلات اور گرجتی ہوئی کلوں کے ذریعہ سے، جن کو آج تک کسی نے

نہیں دیکھا تھا، حملہ کیا۔ ان کلوں میں سے سوسو دھاریں نکل رہی تھیں اور شہر میں بڑے بڑے پتھر اور آگ کے گولے برس رہے تھے۔ ابن خلدون کا مندرجۂ ذیل بیان جو اس تاریخ بربر سے لیا گیا ہے کچھ کم صاف نہیں ہے اور اس سے محاصرہ کے وقت توپ کا استعمال ثابت ہوتا ہے وہ لکھتا ہے :

"ابو یوسف سلطان مراکش نے ۶۷۳ھ مطابق ۱۲۷۵ء میں سجلماسہ کا محاصرہ کیا اس نے آلات محاصرہ کو شہر کے سامنے لگایا۔ ان میں منجنیق عرادے اور نفط کے متہدام (معرب آلۂ حرب) جن سے لوہے کے ریزے برسائے جاتے تھے یہ ریزے متہدام کے صندوق میں بھرے جاتے تھے اور اُن کے پیچھے بارود تھی جس سے آگ دی جاتی تھی اس کا اثر نہایت عجیب تھا اور اس کے نتائج کو قدرت باری تعالیٰ کہنا چاہئے۔ ایک دن ایک بڑے پتھر کے زور سے جو منجنیق سے پھینکا گیا تھا، تھوڑی سی دیوار گر گئی اور اس راہ سے شہر پر حملہ کیا گیا۔"

کانڈ کی "تاریخ مسلمانان ہسپانیہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل بن فارض (فرز) بادشاہ غرناطہ ۱۳۲۵ء مطابق ۷۲۶ھ میں جب بازہ (بیضا) کا محاصرہ کیا تو اس کے پاس علاوہ اور مشینوں کے ایک ایسی کل تھی جو لوہے کے گولے پھینکتی تھی۔ جب وہ کل چلائی جاتی تھی تو اس کی روشنی اور گرج سے سخت طوفان کا سا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ گولوں سے شہر کی دیواروں اور برجوں کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ حلیہ صرف توپ کا ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ کی قلمی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ توپ کا استعمال عربوں میں بہت کثرت سے ہو گیا تھا اور انھوں نے اس کو زیادہ تر ۱۳۴۲ء میں الحسیر کی حفاظت میں، جس پر الفانس یازدہم نے حملہ کیا تھا استعمال کیا۔ الفانس یازدہم کی تاریخ میں لکھا ہے

"شہر کی مسلمان فوج پر بہت سی گرجنے والی چیزیں اور لوہے کے گولے بہت بڑے سیب کے برابر پھینکتے تھے۔ یہ گولے اس قدر دور جاتے تھے کہ بعض فوج کے اس پار اور بعض فوج میں گرتے تھے"

انگریزی کاؤنٹ ڈاربی اور سالسبری نے جو محاصرہ کے وقت موجود تھے، بارود کے اس استعمال کو دیکھا اور اس ایجاد کو اپنے ملک میں لے گئے اور اسی وجہ سے چار سال بعد انگریزوں نے جنگ کریسی میں توپ کا استعمال کیا۔ یہ یاد رہے کہ عربی میں توپ کا نام مدفع ہے۔ بارود کا نسخہ اور پھینکنے والی کلوں کا بیان ہمیں عربی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے ذیل میں ہم اس کے متعلق ایک نہایت کم

عبارت نقل کرتے ہیں جو تیرھویں صدی عیسوی کے آخر کی ایک قلمی کتاب سے لی گئی ہے اور اس کا ترجمہ ینو نے کیا ہے۔

"اس سفوف اور اس کی مقدار کا بیان جو مدفع میں بھرا جاتا ہے۔ شورہ دس درم، کوئلہ دو درم اور گندھک ڈیڑھ درم۔ ان کو نہایت باریک پیس کر مدفع میں ایک تہائی بھرنا چاہیئے اور اس سے زیادہ نہیں کیونکہ اس کے پھٹ جانے کا خوف ہے۔ بھرنے کے لیے مدفع کے منہ کے برابر ایک لکڑی کا گز بنائیں اور اس سے بارود کو زور سے ٹھوکیں اور پھر اس کے اوپر سے گولہ یا لوہے کا ٹکڑا ڈالیں اور اس کے بعد فلیتہ میں آگ لگا دیں۔ مدفع کی لمبائی اس کے سوراخ کے مطابق ہونا چاہیئے اگر سوراخ بڑا ہوا اور مدفع اس کے مطابق لمبا نہ ہو تو اس میں عیب ہوگا۔"

ہسپانیہ سے آلات آتش بازی کا رواج عیسائی یورپ میں پہنچا۔ یورپ میں توپ کے متعلق سب سے پہلی اور صحیح دستاویز جواب تک محفوظ ہے۔ ۱۱ فروری ۱۳۲۶ء کی نوشتہ ہے۔ یہ کاغذ ایک اجازت نامہ فلورینس کی کونسل کے بارہ ممبروں اور رہبان سرداروں کے نام ہے جس کی رو سے انھیں ریاست جمہوریہ فلورینس کی حفاظت اور مدافعت کے لیے برنجی توپوں اور آہنی گولوں کی ساخت کے لیے آدمی نوکر رکھنے کی اجازت مل گئی ہے۔

۱۳۳۸ء مطابق ۷۳۹ھ کی ایک دستاویز سے، جو پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بحری دارالصنع فرانس واقع روئیں میں اسی سال ایک ایسا آہنی آلہ موجود تھا جسے ظرف آتشی کہا جاتا تھا اور جس کے ذریعہ سے بان یا تیر پھینکے جاتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی شورہ اور گندھک تھے جن کو پیس کر اس آلہ میں چلاتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ اجزا علیحدہ علیحدہ رکھے جاتے تھے اور ضرورت کے وقت ملا دیئے جاتے تھے۔

انگلستان میں ایڈورڈ سوم کے زمانہ میں (۱۳۴۵ء مطابق ۷۴۶ھ) ایسی فرد حساب ملتی ہے جس میں ایسی اشیاء کی خرید کے حسابات درج ہیں جو بارود بنانے کے کام میں آتی ہیں۔ ۱۳۴۶ء مطابق ۷۴۷ھ میں اسی بادشاہ نے اپنی قلم رو سے شورہ اور گندھک خرید کیے جانے کا حکم دیا لیکن باوجود کوشش یہ اشیاء نہایت قلیل مقدار میں دستیاب ہوئیں۔ اسی سال جنگ کرلیسی ہوئی اور کہا جاتا ہے اس میں، توپیں استعمال ہوئیں کلیں نہایت بد وضع اور بھدی تھیں۔

تیرھویں صدی عیسوی کے خاتمہ کے قرب وجوار میں عربوں نے ایسی کل ایجاد کی تھی، جو نال کی شکل میں تھی جس کو یا تو وہ اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے یا نیزہ کے سرے پر نصب کر دیا کرتے تھے۔ اس نال سے قریب کے فاصلہ سے دشمن پر گولیاں برسائی جاتی تھیں۔ اصل میں یہ بندوق کا حلیہ ہے۔ بندوق ماخوذ ہے عربی لفظ بندوق سے جو مٹی کے غلہ کو کہتے ہیں۔ انگلستان میں ۱۳۷۵ء مطابق ۷۷۷ھ میں بندوق کا رواج ہو گیا تھا۔ اسی سال یارک شائر کے کسی جاگیردار کی گڑھی کے محاصرہ کے وقت بندوقچیوں کا ذکر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوار اور پیادے دونوں بندوق رکھتے تھے۔ بندوق کی شکل یہ ہوتی تھی۔ وہ لوہے یا برنج کی نال ہوتی تھی، جس میں کوٹھی کے قریب ایک سوراخ ہوتا تھا۔ یہ نال کسی لکڑی پر جما دی تھی جو دستہ کا کام دیتی تھی۔ چلاتے وقت پیادہ دستہ کو اپنے سیدھے ہاتھ کی بغل میں مضبوطی سے داب لیا کرتا تھا اور اسی دستہ کو جو لمبا ہوتا تھا سینہ کے مقابل اُلٹے ہاتھ سے پکڑ لیا جاتا تھا۔ سیدھے ہاتھ میں ایک سلگتا فلیتہ ہوتا تھا۔ سوار کی بندوق کا دستہ چھوٹا ہوتا تھا، جو سینہ کے خلاف رکھا جاتا بندوق کی نال ایک دوشاخہ پر جو زین سے بندھا ہوتا تھا، قائم کر دی جاتی تھی رنجک کی پیالی یا سوراخ میں فلیتہ بنانے سے بندوق سر ہو جاتی تھی۔ بندوق کی نال اس زمانہ میں دو بالشت سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

ہنری سوئم کے عہد کے آغاز میں بندوق میں یہ ترقی ہوئی کہ گھوڑا لگا دیا جو لبلبی کے ذریعہ سے گر کر پیالی پر آجاتا تھا۔ پیالی نالی کے پہلو میں ہوتی تھی۔ گھوڑے میں فلیتہ لگا ہوتا تھا جس سے رنجک میں آگ لگ جاتی تھی۔ رنجک کا علاقہ ایک چھوٹے سوراخ کے ذریعہ سے کوٹھی سے ہوا کرتا تھا۔ یہ بندوق ہمارے ہاں توڑے دار کہلاتی تھی۔

بعد کی تبدیلی نے ایک نئی وضع کی بندوق ایجاد کی۔ اس میں ایک چرخی نما گھوڑا ہوتا تھا۔ وہ فولاد کا پہیہ ہوتا تھا، جو نال کے پہلو میں ہوتا تھا اور رنجک کی پیالی تک آسکتا تھا گھوڑے میں سنگ چقماق جما ہوتا تھا جو کمانی کے ذریعہ سے رنجک کی پیالی تک آجاتا تھا۔ ایک اور کمانی تھی جب کوک دی جاتی تھی تب اس کا اثر پہیہ پر پہنچتا تھا۔ اب پہیہ تیزی کے ساتھ گھومنے لگتا تھا۔ اس حالت میں بار بار سنگ چقماق سے رگڑ کھا کر آگ کے پتنگے پیدا کر

تھا۔ پتنگوں سے رنجک میں آگ لگ جاتی تھی۔ چرخ نما گھوڑے والی بندوق کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ اس کی ترتیب پیچیدہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کی بناوٹ قیمتی تھی۔ دوسرے اس پر پورا اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ بعض وقت وہ دھوکہ بھی دے جاتا تھا اور اس کے کل پرزے جلد خراب ہو جاتے تھے اور سترھویں صدی عیسوی کے وسط تک میدان توڑے دار بندوقوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس زمانہ کے بعد سے بندوق چقماق یا پتھر کلہ رائج ہو گئی۔ سولہویں صدی کے خاتمہ پر پتھر کلہ کی قدیمی قسم جسے "سنا فانس" کہا جاتا تھا جرمنی میں وضع ہوئی۔ اس بندوق میں رنجک کی پیالی کے لیے فولاد کا ڈھکن یا سرپوش بھی ہوا کرتا تھا۔ گھوڑے میں سنگ چقماق جڑا ہوتا تھا۔ لبلبی دبانے پر گھوڑا گر کر سرپوش کو رنجک کی پیالی سے اٹھا کر اپنی مقابل سمت میں دھکیل دیتا تھا اور اسی عرصہ میں لوہے کے ساتھ تصادم سے شرارہ پیدا کر کے رنجک اڑا دیتا تھا۔ انہی تغیرات اور ترقی کے زمانوں میں بندوق کی نال میں بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ۱۶۲۱ء میں نال چار فٹ لمبی ہوتی اور اس سے ایسی گولی چلائی جاتی تھی جو آدھ سیر وزن میں بارہ بن سکتی تھیں۔

سلاطین عثمانیہ نے غالباً توپ و بندوق کا استعمال یورپ سے سیکھا ہے۔ ان زمانوں میں فرنگی لوگ اکثر تلاش معاش کی خاطر مختلف ممالک اسلام میں پہنچا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی لوگ، جن میں اکثر توپچی اور گولہ انداز ہوتے تھے، سب سے پہلے ترکوں میں توپ کا رواج دیتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک قیاس ہے اور تاریخی واقعات سے تصدیق یا تردید کا مستوجب ہے۔ ممکن ہے کہ افریقہ یا مصر سے توپ ان کے پاس پہنچی ہو۔ سلاطین عثمانیہ نے، کہا جا سکتا ہے، ان آلات محترقہ کی نشوونما میں خاص دلچسپی لی ہے کیونکہ تسخیر قسطنطنیہ کے موقع پر سلطان محمد ثانی کے حکم سے دو ایسی عظیم الشان توپیں بنائی گئی تھیں جو بیس بیس من کا گولہ پھینکتی تھیں۔ محاصرہ کے وقت توپوں نے اُمّید کے مطابق کامیابی دکھائی اور قسطنطنیہ جس کی تاریخ "بلدۃ طیبۃ" ہے، اکاون روز کے محاصرہ کے بعد ۱۵ ربیع الاوّل ۷۵۸ھ میں فتح ہو گیا۔ ان قلعہ شکن توپوں کے مقابلہ کی توپیں گذشتہ صدیوں میں کہیں نہیں سُنی گئیں البتہ وہ توپیں جو موجودہ جنگ میں جرمنی نے نامور اور انٹورپ کے قلعوں کے مسمار کرنے میں استعمال کی ہیں سلطان محمد ثانی کی

توپوں سے کہیں طاقت در ہیں جو سنا جاتا ہے اٹھائیس اٹھائیس من کا گولہ پھینکتی ہیں۔

ایران میں توپ اور بندوق کا استعمال سب سے پہلے شاہ اسمٰعیل صفوی (۹۰۵ و ۹۳۰ھ) نے کیا ہے۔ اس زمانہ میں توپ خانہ کو آتش خانہ اور آتش بازکہا جاتا تھا۔ اسمٰعیل نے توپ خانہ کا استعمال غالباً اپنی ہمسایہ سلطنت عثمانیہ سے سیکھا ہے۔ ایرانی تاریخ میں اس کا ذکر قلعہ یزد کی فتح کے وقت آتا ہے حبیب السیر میں وہ فقرہ یوں ہے:

"آخرالامر بزخم سنگ و توپ و تفنگ بہادران تیز چنگ رخنہا در بہ فرج و بارہ یزد پیدا شد۔"

یہ واقعہ غالباً ۹۱۰ھ کے قریب ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ صاحب حبیب السیر توپ کی پہلی اشاعت کے موقع کو بغیر کسی قسم کی تمہید یا تاریخ کے ذکر کیے عبور کر جاتا ہے۔ دیار بکر میں اسمٰعیل صفوی نے قلعۂ جزیرت بھی توپ و تفنگ کے ذریعہ سے تسخیر کیا تھا۔ ۹۲۰ھ میں سلطان سلیم اور اسمٰعیل صفوی کے مابین موضع چالدران میں جو تبریز سے بیس فرسنگ پر واقع ہے سخت جنگ ہوئی۔ سلطان کے پاس اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ تھا اس فوقیت کا اثر ایرانیوں پر جلد ظاہر ہو گیا۔ اگرچہ ہم عصر مؤرخ صاحب حبیب السیر اسمٰعیل کی شکست کا ذکر نہیں کرتا لیکن اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل کو واقعی شکست ہوئی تھی ایک ترکی شعر اس جنگ کی تاریخ میں ہے:

ہاتف غیبی و دِی بو تاریخی   آلدی عجم شاہی سلطان روم

عثمانی ترکوں کا قاعدہ تھا کہ توپ خانہ کو لشکر کے چاروں طرف پھیلا دیتے تھے۔ توپوں کے ارابے زنجیر بند کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح سے فوج گویا محفوظ مقام میں آجاتی تھی۔ اتفاق سے اس جنگ میں اسمٰعیل کے ساتھ توپ خانہ نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ایرانی شمشیر کو توپ کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتے تھے۔ صاحب فوائد صفویہ لکھتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل نے سلطان کو پیغام بھیجا تھا کہ:

"شجاع آن کس است کہ با شمشیر در میدان جنگ کند، در پس پشت توپ خانہ پناہ بردن خزیدن طریقۂ دلاوری نیست وچون ما بایلغار آمدہ ایم و آتش خانہ ہمراہ نیاوردہ ایم اگر تنہا بمنازعہ و مقابلہ رضا ہستی توپ خانہ را موقوف داشتہ طرفین درمیدان بقلیل سپاہ خود باسپا

بی کران تو بمجادلہ شمشیر حاضریم "

توپ خانہ اس میں شک نہیں ان زمانوں میں فیصلہ کن مدار علیہ بن گیا تھا اور جن قوموں نے اس کے استعمال سے انکار یا سہل انگاری کی وہی اس کے بے پناہ غضب کے بے وقت شکار بنے۔ وہ قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدلنے آیا تھا اور اب وہ اپنے انقلابی دور کے مرحلے سرعت کے ساتھ طے کر رہا تھا۔ محمد خان شیبانی سلاطین ازبک میں زبردست بادشاہ گزرا ہے۔ ترکستان میں مغل شہزادوں کی طاقت توڑ کر اُس نے اپنی وسیع سلطنت قائم کی تھی وہ تجربہ کار سپاہی تھا اور سینکڑوں معرکے اُس نے سر کیے تھے لیکن اسمٰعیل صفوی کے توپ خانہ سے اُسے کہیں پناہ نہیں ملی۔ نہ اس کی شجاعت اس کے کام آئی نہ وسیع تجربہ یہ بہادر سپاہی جنگ میں مارا گیا۔ کہا جاتا ہے اس کی نعش کے گرد بڑے بڑے آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں، جو تعداد میں پانچ سو تھیں، جن میں اکثر بادشاہ اور شہزادے تھے، جو اسمٰعیل کی آتش بار توپوں کے بے وقت شکار ہوئے تھے۔ اسمٰعیل نے زبردست فتح کا جشن اس وحشیانہ طریقہ سے منایا کہ شیبانی خان کے سر کے کاسہ کو سونے میں منڈھوا کر اس سے شراب پی اور اپنے امیروں کو پلائی۔ ایک تورانی امیر اس دربار میں حاضر تھا کسی ایرانی نے طنزیہ اس سے کہا تمہارے بادشاہ کا سر اب تو قدح شراب حریفاں بن گیا ہے اس نے جواب میں اس موقع پر کمی نہیں کی اور بولا، موت میں وہ زندگی سے زیادہ باعظمت ہے۔ زندگی میں اس سر پر تاج رکھا جاتا تھا لیکن موت میں یہ سر بڑے بڑے سلاطین اور جلیل القدر امراء کا بوسہ گاہ بن گیا ہے۔

ظہیر الدین بابر نے غالباً شیبانی خان کی مثال سے نصیحت حاصل کر کے اپنے ہاں توپ خانے کا رواج دیا اور مغلوں میں یہی پہلا بادشاہ ہے جس نے ان آلات کے استعمال سے فائدہ اٹھایا اور توپ خانہ اس پر مبارک ہوا اس لیے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی بادشاہت بغیر زیادہ محنت کیے اس کے ہاتھ لگ گئی، لیکن اب وقت ہے کہ ہم ہندوستان میں آتش بازی کی اشاعت کے متعلق کچھ کہیں۔

ایران کے مقابلہ میں ہندوستان میں آلات محترقہ کا رواج بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مسلمان سلاطین محمد شاہ بن علاء الدین حسن بہمنی (۷۵۹ھ-۷۷۶ھ) پہلا بادشاہ ہے جس نے توپ خانے

سے کام لیا۔ ۷۶۷ھ میں محمد شاہ نے بیجانگر کے راجہ پر چڑھائی کی جس کے واقعات مختصراً حسب ذیل ہیں۔ ایک دن محمد شاہ بہمنی کے دربار میں دہلی کے چند قوال آئے جو امیر خسرو اور حسن دہلوی کے عمل او صورت سے خوب واقف تھے بادشاہ نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی اور بڑا جشن کر کے ان کا گانا سنا اور بہت محظوظ ہوا۔ اس خوشی کے عالم میں جب کہ شراب کا بھی اثر اس کے دماغ پر غالب آچکا تھا اُس نے اپنے وزیر ملک سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان قوالوں کے انعام کی چٹھی بیجانگر کے راجہ کے خزانہ پر لکھ دے۔ وزیر اس خیال سے کہ بادشاہ اس نشہ کی حالت میں ہے، جو حکم کہہ کر فراموش ہو رہا۔ دوسرے دن بادشاہ نے ہوش کے عالم میں وزیر سے پوچھا کہ دلّی کے قوالوں کی چٹھی راجہ بیجانگر کے نام لکھ دی یا نہیں مزاج دان وزیر نے کہا، ابھی تک نہیں لکھی گئی لیکن ابھی لکھ دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیجانگر کا راجہ اس زمانہ میں دکن میں تمام راجاؤں سے بلحاظ کثرتِ فوج و وسعت نہایت ممتاز تھا۔ چھ سو کوس کے طول اور ڈیڑھ سو کوس کے عرض میں اس کا راج پھیلا ہوا تھا۔ کئی راجہ اس کے ماتحت اور باج گزار تھے۔ جنگ کے وقت وہ تین ہزار ہاتھی اور نو لاکھ پیدل فوج میدان میں لاسکتا تھا۔ نئی دکھنی مسلمان سلطنت کسی حال میں اُس کے معیار یا مقابلہ کی نہیں تھی۔ قصہ مختصر سلطان نے وزیر سے کہا کہ قوالوں کے انعام کی بابت جو کچھ میں نے رات کو کہا مستی کی وجہ سے نہیں کہا تھا بلکہ اس وقت ہوش کی حالت میں بھی وہی بات کہتا ہوں۔ بادشاہ ہو کر کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنی زبان سے لغو یا شیخی کے الفاظ نکالوں۔ تم چٹھی لکھ دو اور بیجانگر کے خزانہ سے یہ انعام دلوانے کے لیے میں ہر طرح تیار ہوں۔ ملک سیف الدین سلطان کی طبیعت سے واقف تھا۔ اُس نے وہ چٹھی بیجانگر کے خزانہ پر لکھ دی۔ جب قوال بیجانگر پہنچ کر راجہ کے سامنے لائے گئے انھوں نے چٹھی پیش کر دی۔ مہاراجہ بیجانگر چٹھی دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ گویّوں کو گدھے پر بٹھا کر اور شہر میں تشہیر کرا کر اس نے اخراج کر دیا اور خود اپنی تمام فوج تیار کر کے اپنی رفع توہین کی غرض سے مسلمانی سرحد میں گھس آیا۔ برسات کا موسم تھا اور کرشنا ندی دونوں پاٹ بہہ رہی تھی اس لیے خاطر جمعی سے قلعۂ مدگل کو جو کرشنا ندی سے بیجانگر کی طرف واقع تھا محصور کر لیا اور قبل اس کے کہ محصورین کی امداد میں مسلمانی فوجیں آئیں راجہ نے قلعہ فتح کر کے اس کی کل آبادی کو

جس کی تعداد آٹھ سو تین تھی قتل کر ڈالا۔ محمد شاہ نے جب خبر سنی تھی جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی اٹھا اور اپنے لشکر کی تیاری کا انتظار کیے بغیر یلغار کرتا ہوا کرشنا ندی کے کنارے جا دھمکا اور اپنے بیٹے مجاہد شاہ کو اپنا جانشین بنا کر نو ہزار سواروں کے ساتھ کرشنا ندی سے گزر گیا۔ راجہ بیجانگر محمد شاہ کے اچانک ندی عبور کرنے کی خبر سن کر نہایت بدحواس ہو گیا۔ اسی وقت اُس نے اپنا بھاری سامان اور ہاتھی بیجانگر کی طرف روانہ کر دیئے اور خود اپنی انتخابی فوج کے ساتھ جنگ کی غرض سے مقیم رہا۔ ہاتھی اور بھیر کیچڑ کی وجہ سے صرف دو کوس راہ کر سکے اور پھر تھک کر وہیں ٹھہر گئے۔ محمد شاہ اُن کی روانگی کی خبر سن کر اپنے سواروں کے ساتھ غنیم کی طرف بڑھا۔ راتوں رات چل کر وہ علی الصباح دشمن کی فوج تک پہنچ گیا۔ ہندو فوج سلطان کی فوج کو اپنے مقابل کھڑا دیکھ کر اس قدر حواس باختہ ہو گئی کہ اس میں لڑے بھڑے بغیر بھگدڑ مچ گئی۔ اس نے قلعۂ ادونی کا رخ کیا۔ راجہ کا بھاری سامان بغیر کسی دقت کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس میں دو ہزار ہاتھی، تین سو توپیں اور ضرب زن وغیرہ تھے۔ محمد شاہ اس غیبی فتح کے بعد برسات بھر قلعۂ مدگل میں ٹھہرا رہا۔ اس عرصہ میں اس نے اپنے علاقہ میں فرامین بھیج کر جگہ جگہ سے توپیں اور ضرب زن منگوا لیے اور اس کارخانہ آتش بازی کو جس کا بقول فرشتہ اب تک دکن میں رواج نہیں تھا مقرب خان ولد صفدر خاں سیستانی کی سپردگی میں دے دیا اور جس قدر رومی اور فرنگی اس سلسلہ میں سلطانی ملازم تھے اس کی ماتحتی میں دے دیئے گئے اس طرح بادشاہ کے پاس بہت بڑا توپ خانہ جمع ہو گیا۔ چوری کے ڈر سے رات کے وقت مقام پر توپوں کے ارابوں کو زنجیر سے جکڑوا دیا جاتا تھا۔ محمد شاہ اس اہتمام سے قلعۂ ادونی کی طرف روانہ ہو کر بیجانگر کے علاقہ میں گھس گیا۔ بھوج مل، کشن رائے کے سپہ سالار سے اس کا مقابلہ ہوا۔ ۱۹ ذی قعدہ سنہ مذکور کو جنگ شروع ہوئی۔ موسیٰ خاں اور عیسیٰ خاں افغان دو بڑے سردار بندوق کے زخم سے اس جنگ میں مارے گئے۔ ہندو اس موقع پر بڑی بہادری سے لڑے اور قریب تھا کہ مسلمان شکست کھا جاویں اتنے میں محمد شاہ اپنے تین ہزار سواروں سے آ پہنچا۔ مسلمان فوج کو اس کی موجودگی سے اطمینان ہو گیا اور جم کر لڑنے لگے۔ مقرب خان نے اپنا توپ خانہ آگے بڑھایا، جس سے معلوم ہوتا ہے اب تک کوئی کام نہیں لیا گیا تھا۔ توپوں نے آتے ہی جنگ کا رُخ بدل دیا اور ہندو فوج پریشان

ہوگئی اور مقرب خاں اور خاں محمد نے بھوج مل پر عام حملہ کر دیا۔ یہ حملہ زبردست تھا اور ہندوؤں کو اپنا توپ خانہ استعمال کرنے کا کبھی موقع نصیب نہیں ہوا۔ الغرض اُن کے پاؤں اٹھ گئے اور محمد شاہ کو فتح ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی توپوں کی مار بہت کم تھی اور وہ اس وقت کام دے سکتی تھیں جب کہ دشمن بہت قریب ہو۔ متواتر ضربوں کے بعد کشن رائے جب لڑائی سے عاجز ہوگیا تو اُس نے صلح کی غرض سے محمد شاہ کے پاس ایلچی بھیجے۔ سلطان نے اب بھی وہی شرط پیش کی کہ دلی کے قوالوں کی جب تک راجہ چٹھی ادا نہ کر دے گا اس سے ہرگز صلح نہیں کروں گا۔ ایلچیوں نے یہ رقم ادا کر دی اور صلح ہوگئی۔

اس جنگ سے تین سال بیشتر، جب کہ سلطان محمد شاہ ناگ دیو اور ولیم پٹن کو قتل کرکے واپس اپنے ملک آرہا تھا، ایک رات اندھیرے میں سلطان کے بندوق کی گولی لگی۔ اس راستہ میں اس کے ڈھائی ہزار آدمی راتوں کے وقت ہندوؤں کے تیر اور گولیوں کا نشانہ بنے۔ چونکہ فرشتہ کے بیانات سے، جو ملا داؤد بیدری سے یہ واقعات نقل کر رہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ توپ خانہ میں عموماً رومی اور فرنگی آدمی تھے قرین قیاس ہے کہ یہی لوگ توپ خانہ ہندوستان میں لائے ہیں۔ ممالک فرنگ کے اکثر لوگ ملازمت کی غرض سے بلاد اسلام میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں فرنگیوں کی ہندوستان میں موجودگی پر کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ پرتگالی اس زمانہ کے عرصہ بعد ہندوستان میں آتے ہیں۔ مارکوپولو تیرھویں صدی عیسوی کا ایک سیاح کبلائی خان کے ہاں ملازم تھا۔

تاریخ گجرات میں آتش بازی کا پتہ سلطان محمود بیگڑہ (۸۶۳ھ - ۹۱۷ھ) کے زمانہ میں لگتا ہے۔ اگرچہ قلعوں کی تسخیر کے وقت ساباط افگنی کا رواج اس زمانہ سے بیشتر گجرات میں موجود تھا۔ سب سے پہلے ۸۸۷ھ میں ملیباری جہازات سے بحری جنگ کے وقت توپ و تفنگ کا ذکر آتا ہے۔ ملیباری لوگ پرتگالیوں کی طرح سے سمندر میں قطاع الطریقی کے ارادہ سے اترے تھے۔ سلطان محمود نے اپنے جہاز درست کراکر اُن کے مقابلہ میں بھیجے۔ ملیباریوں کی کئی کشتیاں گرفتار ہوئیں اور سلطانی بیڑہ بندر کھنبایت میں واپس آگیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال سلطان نے ۸۸۸ھ میں قلعہ چنپانیر بھی آلات آتش کی مدد سے فتح کیا۔ اس موقع پر ہم

ساباط، مورچل، حقۂ بارود اور توپ کا استعمال قلعہ شکنی کی غرض سے گجرات میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ بھاری قلعہ شکن توپیں استعمال ہوتی تھیں جن سے قلعہ کی دیوار میں شگاف ہوگیا۔ اسی بادشاہ کے زمانہ ۹۱۳ھ میں سلطان روم نے اپنا بیڑہ فرنگیوں کو ہندوستانی سمندروں میں سے نکالنے کے لیے بھیجا یہ بیڑہ بسئی و بمبئی اور رھائم کے بندروں پر وارد ہوا۔ محمود بیگڑے نے اپنے سپہ سالار ایاز کو رومی بیڑہ کی امداد پر متعین کر دیا۔ فرنگیوں کا ایک بڑا جہاز جس کی قیمت ایک کروڑ روپیہ تھی اور جس میں اُن کا امیر البحر موجود تھا مسلمانی بیڑہ کی توپوں سے غرق ہوگیا۔ رومیوں کے چار سو آدمی مارے گئے اور فرنگیوں کے دو تین ہزار آدمی مارے گئے۔ تاریخ مالوہ میں مورچل اور توپ کا ذکر سلطان محمود خلجی (۸۳۹ و ۸۷۳ھ) کے ذکر میں ملتا ہے۔ قلعۂ منڈل گڑھ علاقہ رانا چتوڑ کو سلطان نے ۸۶۲ھ میں مورچل اور توپ کی مدد سے فتح کیا۔ اس کے بعد ہمیں توپ و تفنگ کا استعمال مالوی واقعات میں برابر ملتا ہے۔ محمود کے جانشین سلطان غیاث الدین نے عورتوں کا جو شہر آباد کیا تھا منجملہ اُن کے پانچ سو حبشی کنیزوں کو مردانہ فوجی لباس دے کر تفنگ بازی اور شمشیر بازی کی بھی تعلیم انھیں دی تھی۔

کشمیر میں سلطان زین العابدین (۸۳۶ و ۸۷۷ھ) کے زمانہ میں ایک شخص حبیب نامی نے جو اقسام فنون آتش بازی میں صاحب کمال تھا سب سے پہلے بندوق کا رواج اس ملک میں کیا۔ اُس نے مختلف اقسام کے بارود بنائے اور فن آتش بازی میں بہت سی نئی نئی ایجادیں کیں۔ سلطان زین العابدین نے اپنے زمانہ میں شکار کھیلنے کی منادی کر دی تھی۔

لیکن ہم نہایت تعجب سے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان خاص میں آلات آتش بازی کی اشاعت بہت دیر میں ہوئی جس کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ لودھیوں کے زمانہ میں کہیں توپ و تفنگ کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ابراہیم لودھی (۹۲۳ و ۹۳۲ھ) کے عہد میں جب قلعہ گوالیار فتح ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ کی دیواروں کو نقب لگا کر اور بارود سے پُر کر کے آگ لگا کر اڑا دیا گیا تھا۔ دیواروں کے گرنے پر محاصرین قلعہ میں گھس گئے اور قلعہ مسخر ہوگیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بارود کی اشاعت اس عہد میں ہندوستان میں ہو چکی تھی لیکن توپ اور بندوق کا رواج نہیں ہوا تھا۔ وہ ان اطراف میں ۹۳۲ھ تک

غالباً رواج یاب نہیں ہوئیں یعنی بابر اور ابراہیم لودھی کی پانی پت میں لڑائی کے وقت تک۔ اس جنگ میں بابر کے ساتھ بھاری توپ خانہ تھا جس کا افسر استاد علی قلی تھا۔ توپ خانہ کو رومی دستور کے مطابق نصف دائرہ کی شکل میں رکھا تھا تاکہ توپ اندازوں کی حفاظت ہو سلطان ابراہیم کے ساتھ اگرچہ ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھی تھے لیکن غالباً توپ خانہ کی وجہ تھی کہ بابر کو ایسی آسان فتح حاصل ہوگئی حالانکہ بابر کے ساتھ کل بارہ ہزار فوج تھی۔ سلطان ابراہیم کی لاش کے گرد پانچ ہزار آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ خوں ریزی صرف توپ خانہ ہی کر سکتا ہے۔ دوران جنگ میں کل سولہ ہزار پٹھان مارے گئے۔ رانا سانگا جب بابر کے مقابلہ میں آیا تو یہ بہت بڑا اتفاق تھا، جو ہندوستانی نژاد قوموں نے مغلوں کے خلاف کیا تھا۔ اتحادیوں میں بڑے بڑے راجپوت اور پٹھان رؤسا شامل تھے۔ اُن کی مجموعی تعداد دو لاکھ لڑنے والی فوج تھی۔ بابر کی فوجی حیثیت اتحادیوں کے مقابلہ میں ایک چوتھائی بھی نہیں تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ توپ خانہ کی بدولت بابر نے اس زبردست اجتماع کو فاش شکست دے دی۔ حسن خاں میواتی بندوق کی گولی سے مارا گیا۔ علیٰ ہٰذا اور بڑے بڑے راجپوت مثلاً راول دیو، چندربھان چوہان، نانک چند چوہان اور کرم سنگھ راجپوت عین جنگ میں مقتول ہوئے۔ اس جنگ میں حسب دستور رومی توپ خانہ سب سے آگے تھا اور اسی توپ خانہ کی وجہ سے یہ فتح بھی بابر کو حاصل ہوئی اس لیے کہ اتحادیوں کے پاس کوئی توپ خانہ نہیں معلوم ہوتا۔

بنگالہ میں توپ خانہ کا استعمال سلطان محمود والئ بنگالہ کے عہد میں جاری تھا۔ شیر شاہ نے بنگالہ اس بادشاہ سے چھینا ہے اور سلطان محمود بھاگ کر ہمایوں کے پاس چلا گیا۔ شیر شاہ ہو ۹۵۲ھ میں کالنجر قلعہ کی فتح کے وقت باروت کے بم پھٹنے کی وجہ سے جل کر مرا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ بادشاہ قلعہ کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی باروت کے گولے رکھے ہوئے تھے۔ ایک گولہ قلعہ کی طرف پھینکا گیا۔ اتفاقاً دیوار سے ٹکرا کر وہ گولہ پھٹ کر واپس بادشاہ کے قریب آگرا۔ یہاں اور گولے پڑے تھے اُن میں آگ لگ گئی۔ گولوں کے پھٹنے سے کئی آدمی جلے مثلاً شیر شاہ، شیخ خلیل شیر شاہ کا مرشد، ملا نظام دانش مند اور دریا خاں

شیر دانی۔ اس حادثہ کے بعد بادشاہ چند ساعت زندہ رہا اور بار بار فوج کو قلعہ کی تسخیر کی تاکید کرتا تھا۔ کالنجر کی فتح اس کی زندگی کا آخری کام تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ میں اسے پورا کر کے مروں کچھ دیر میں قلعہ فتح ہوا۔ ادھر یہ خوش خبری اُس کے کان میں پہنچی ادھر بادشاہ خود بھی جان بحق تسلیم ہو گیا۔

ابو الفضل توپ خانہ کو قفل و کلید سلطنت کہتا ہے اور سچ بھی یہی ہے۔ اکبر نے آتش خانہ کے معاملہ میں خاص دلچسپی لی ہے۔ اور جس قدر توپوں کا ذخیرہ اس کے ہاں جمع ہوا تھا، سلطنت عثمانیہ کے سوا اور کہیں نہیں سُنا گیا۔ بعض توپیں اکبر کے پاس اس قدر بڑی تھیں کہ اُن سے بارہ بارہ من وزن کا گولہ پھینکا جاتا تھا۔ ان توپوں کے کھینچنے کے لیے ہزار بیل اور متعدد ہاتھی درکار تھے۔ توپ خانے کا انتظام اکبر کے عہد میں نہایت معقول پیمانے پر تھا سینکڑوں افسر اس کارخانہ میں مامور تھے۔ بعض توپیں خود اکبر کی ایجاد تھیں ان میں وصف یہ تھا کہ ان کے پرزے سفر کے وقت علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاتے تھے اور ضرورت کے وقت آسانی سے انہیں جوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کی ایک ایجاد یہ تھی کہ سترہ توپیں صرف فتیلہ سے سر ہو سکتی تھیں۔ گجنال اکبر کی اختراع ہے جسے ایک ہاتھی آسانی سے لے جا سکتا تھا۔ نرنال بھی اکبری مستخدثات میں سے ہے جسے ایک آدمی لے جا سکتا تھا۔ اس دوراندیش بادشاہ نے توپوں کا بڑا ذخیرہ اپنے ہر ایک صوبے میں جمع کروا دیا تھا۔

بندوق

پرانے زمانے میں بندوق کی نال میں لوہے کے چار قطعے درکار تھے۔ بعض اوقات لوہے کی لمبی چادر کو لے کر گول کر کے اس کے دونوں لبوں کو ایک دوسرے سے پیوست کر دیا جاتا تھا لیکن ایسی بندوقیں خوفناک تھیں۔ چلاتے وقت اکثر پھٹ جاتی تھیں۔ اکبر نے اس خامی کو یوں رفع کیا کہ لوہے کی چادر لے کر اس کے لبوں کو کاغذ کی طرح ایک دوسرے پر چسپاں کرا دیا یا ٹھوس لوہے کے پارچے لے کر اُن میں برموں کے ذریعہ سے سوراخ کرا دیا اور پھر انھیں آپس میں جوڑ لیا۔ بندوق کی نال بالشت سے لے کر دو گز تک لمبی نال والی بندوق دُمانک، کہلاتی تھی۔ اس کی کوٹھی کی وضع بھی اور بندوقوں سے مختلف تھی۔ بعض

ندوقیں ایسی بھی تھیں جو صرف گھوڑے کی حرکت سے بغیر فلیتہ آگ لیتی تھیں بعض بندوقوں
لی گولیاں تیرنما ہوتی تھیں۔ استاد حسین بندوق ساز اپنے فن میں اکبر کے ہاں کامل مانا گیا تھا۔
نال کے لیے لوہا تیار ہونے پر اپنے اصلی وزن کا نصف رہ جاتا تھا۔ اس پر اصلی وزن اور
نقصان زدہ وزن کی اصلی تعداد علیحدہ علیحدہ لکھ دی جاتی تھی۔ ایسے لوہے کے پارچے کو اصطلاح
میں ڈول کہا جاتا تھا۔ بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے ڈول محل سرا میں بھیج دیا جاتا تھا۔ پھر حسب الحکم
اس میں بڑا یا چھوٹا سوراخ بنایا جاتا تھا۔ گولی کے وزن کے لحاظ سے یہ سوراخ بنایا جاتا تھا۔
بڑی گولی کا وزن پچیس ٹانک اور چھوٹی گولی کا پندرہ ٹانک ہوتا تھا۔ پچیس ٹانک کی
گولی چلانے کے عام لوگ عادی نہیں تھے صرف بادشاہ اُسے چلا سکتا تھا۔ جب نالی میں سوراخ
ہوچکا، شاہی ملاحظہ کے لیے وہ دوبارہ حرم سرا میں لائی گئی۔ اس کے بعد اُسے کندے پر
چڑھایا اور نال کے تہائی حصہ تک بارود بھر کر کئی فیر اس سے چلائے۔ اگر بندوق قابل
اطمینان نکلی تو بادشاہ کے معائنہ کے لیے پھر جاوے گی۔ واپسی پر اس کا دہانہ تیار کیا جاوے گا
اس کے بعد پھر امتحان کیا جاوے گا کہ گولی سیدھی گئی یا نہیں۔ اگر گولی نشانہ پر نہیں لگتی تو گرم
کرکے نال کو خاص لکڑی میں رکھ کر اُسے راست کیا جاوے گا۔ عیب نکلنے کے بعد نقش و نگار کے
لیے سوہان گر کے پاس جاوے گی۔ بعد میں شاہی ملاحظہ میں جاکر واپس آوے گی۔ کندے کی
لکڑی بادشاہ خود پسند فرماتے تھے۔ اس موقع پر نال کے سابق وزن کے ہندسے محو کر دیے
جاتے تھے۔ اُن کی بجائے کاریگر کا نام، مقام، تاریخ، مہینہ اور سال کندہ کر دیے جاتے تھے
اب گز اور گھوڑے کی تیاری کی جاتی اور جب بندوقیں تیار ہوگئی تو سادہ کہلاتی
تھی۔ بادشاہی امتحان سے فراغت پاکر نال اور کندے کے رنگ کی باری آتی تھی جب
رنگ ہوچکا تب رنگین بندوق کہلاوے گی۔ اب بادشاہ کے پاس پھر بھیجی جاوے گی جہاں
اس کا پھر امتحان کیا جاوے گا۔ بادشاہ اس سے چار گولیاں لگا کر بندوق ساز کو واپس
بھیج دیتا۔ جب دس رنگین بندوقیں مندرجہ بالا مراتب طے کرکے تیار ہوجاتیں تب اُن پر
طلائی کوفت کا کام کرنے کی غرض سے شاہی چیلہ کے سپرد کر دی جاتیں۔

اکبری دور سے پیشتر بندوق کے صیقل کے لیے کئی کئی اوزاروں اور آدمیوں کی

ضرورت تھی لیکن بادشاہ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جسے "دولاب خانہ" کہتے تھے اور جو ایک بیل سے پھرتا تھا۔ اس چرخ کے ذریعہ سے سولہ بندوقیں بہت ہی کم وقفہ میں نہایت آسانی کے ساتھ صیقل ہوسکتی تھیں۔ اکبر نے مہینوں ہفتوں اور دنوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بندوقیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اُن کی پوری تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں جس جس بندوق سے جو جو شکار اکبر نے مارا تھا اس کی تفصیل مع تاریخ میر شکار لکھ لیا کرتے تھے چنانچہ ایک بندوق سنگرام نامی سے جو ماہ فروری یا مارچ سے منسوب تھی اکبر نے گیارہ سو جانور شکار کیے تھے۔

اکبری عہد کے بعد گج نال اور نرنال کے اتباع میں گھڑنال اور شترنال وضع ہوئیں اور جیسا کہ ان ناموں سے ظاہر ہے، گھوڑے اونٹ کے اٹھانے کے قابل تھیں شترنال کو زنبور بھی کہا جاتا تھا۔ جزائل بھی اسی زمانہ کی ایجاد ہے۔ رہکلہ چھوٹی توپ ہوتی تھی بم کے گولوں میں فہرست میں فتیارہ وغیرہ کا شمار کرنا چاہیے جس کے واسطے عام اصطلاح حقۂ آتشی تھا بان ایک لوہے کی نال ہوتی تھی بطول میں کسی جانب زیادہ نہیں ہوتی۔ اس میں تین پاؤ سے لے کر سیر بھر تک بارود ڈالی جاتی تھی۔ بارود خوب ٹھوک ٹھوک کر بھری جاتی تھی۔ یہ کام ہر شخص نہیں کرسکتا تھا۔ پیندے میں ایک طرف سوراخ ہوتا تھا۔ اس میں شتابہ رکھا جاتا تھا) نال کے منہ کو لوہے سے بند کرکے جھال دیا جاتا تھا۔ بغرض احتیاط اس پہ بان لپیٹ دیا جاتا تھا۔ بعد میں ایک تھیلی میں بند کرکے تھیلی کا مُنہ سی دیا جاتا تھا۔ اصل شتابہ اس سے نمودار رہتا (ہے) تھیلی میں سے گز سوا گز کی ڈور لٹکتی رہتی ہے۔ جلاتے وقت فلیتہ کو آگ دے دی جاتی ہے اور پھر دوڑ کر زور سے پھرا کر غنیم کی طرف پھینک دیا جاتا ہے۔

رومی بندوقیں ہندوستان میں ہر زمانہ میں مشہور رہی ہیں۔ اُن کی نال ہشت پہلو اور سوا گز تک لانبی ہوا کرتی تھی۔ مار پلہ (؟) بہت تھا۔ ہندوستان میں سندھ اور کوہاٹ کی بندوقیں اوّل درجہ کی مانی گئی ہیں۔ مار میں رومی بندوقوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔ سندھی کی نال ایک گز چھ گرہ سے پونے دو گز تک لمبی ہوتی ہے۔ اس کا تیر ہمیشہ بیس نمبر کا ہوتا ہے کوہاٹی اور رومی کا تیر سندھ سے بڑا ہوتا ہے۔ سندھی بندوق کی موری زیادہ تر مگر یا شیر کی صورت

جوہر کے لحاظ سے کوئی بندوق سندھی کا مقابلہ نہیں
میں ہوتی ہے. نال پر اعلیٰ درجہ کا جوہر ہوتا ہے،
کرسکتی. کوہاٹی بھی جوہردار ہوتی ہے اور ہاتھ پھیرنے سے اس کا جوہر سطح سے ابھرا ہوا معلوم

ہوتا ہے۔
ہندوستان کے اور مقامات میں لاہور، یوندی اور آمیر کی بندوقیں بھی مشہور
ہیں نیرودکی بندوق بلحاظ صنعت کاری زیادہ پسند کی جاتی ہے. ان پر اسی قسم کے جوہر
نمودار ہوتے ہیں جیسے تلواروں پر۔ جوہر مختلف قسم کے ہوتے ہیں مثلاً جوڑی دار، لہریہ، جلبی
اذر میخی. اعلیٰ لاہوری بندوقوں میں میخی جوہر ہوتے ہیں۔ آمیری بندوق کی نال پر کوٹھی
سے موہری تک مکھی کے محاذ میں ایک خط مستقیم پڑا ہوتا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد

فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات

(ایک جائزہ)

محمود شیرانی نے ادبی دنیا میں اوہام و مفروضات کے پچاسوں بت توڑے ہیں۔ فردوسی کی طرف یوسف زلیخا کا انتساب، فردوسی کی ہجو محمود، فارسی دیوان کا حضرت شیخ معین الدین چشتی کی طرف انتساب، پرتھی راج راسا منسوب بہ چند بردائی، امیر خسرو کی طرف منسوب خالق باری وغیرہ موضوعات پر انھوں نے جس دقیق نظری سے بحث کی ہے اور جعلی انتساب کا جس طرح پردہ چاک کیا ہے، وہ تحقیقی دنیا کے شاہکار ہیں۔ ان کے علاوہ بعض متداول کتابوں پر انھوں نے جیسا عادلانہ محاکمہ کیا ہے اس سے ان کے وسعت مطالعہ اور باریک بینی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تنقید شعر العجم، ترجمہ خزائن الفتوح اور تنقید آب حیات سر فہرست ہیں۔ پھر بعض کتابوں پر ان کے بے لاگ تبصرے ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں۔ شمس العلماء پروفیسر عبد الغنی کی کتاب "مغلوں سے پہلے کا فارسی ادب"، اور ڈاکٹر اقبال حسین کی تصنیف، ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا" پر انھوں نے جس انداز میں تبصرہ کیا ہے اس سے فن تبصرہ نگاری کے اصول مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے

کہ تبصرہ نگاری کتنی گہری علمی بصیرت اور دقیق مطالعہ کی متقاضی ہے۔

شیرانی صاحب نے اردو فارسی زبان وادب کے سینکڑوں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ہر موضوع پر جتنا نیا اور اچھوتا مواد فراہم کر دیا ہے اس سے ادبی تاریخ مالا مال ہوگئی ہے۔ ان کی حیثیت ایک تاریخ ساز محقق و نقاد کی ہے۔ ان کا دائرۂ عمل بھی کافی وسیع ہے۔ زبان وادب ولسانیات کے علاوہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کو انھوں نے نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ایرانیات میں مشرق میں اس پائے کا کوئی اور محقق نظر نہیں آتا جس نے اتنے اہم موضوعات پر ایسی مختتم گفتگو کی ہو۔ ایران کے نامور محقق مرزا محمد قزوینی اپنی گوناگوں صلاحیت کی وجہ سے تحقیق کی دنیا میں غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں لیکن فارسی ادب وزبان کے تعلق سے ان کا کارنامہ شیرانی کے برابر نہیں۔ خصوصیت سے فارسی کے امہات مسائل پر شیرانی کے مقابلے کی کوئی یادگار قزوینی کی نہیں پائی جاتی۔ غرض ایسے عظیم محقق کے کارناموں کے مفصل جائزے کے لئے ضخیم مجلدات درکار ہیں۔ یہ خدمت مستقبل کا نقاد ومورخ بجالائے گا فی الحال میں ان کی تحقیقات کا جو فارسی سے متعلق ہیں ایک مختصر سا جائزہ لینا چاہتا ہوں اس کا پہلا حصہ فردوسی اور شاہنامہ پر ہے، دوسرا تنقید شعرالعجم اور تیسرا ہندوستانی فارسی ادب سے متعلق ہے۔

(۱)

حافظ محمود شیرانی نے فارسی ادب کے اکثر امہات مسائل پر فاضلانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے۔ ان کا ایک دل پسند موضوع فردوسی اور شاہنامہ فردوسی ہے جو فارسی ادب میں یگانہ حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر جتنا اچھوتا کام کیا ہے اور جتنا نیا مواد فراہم کر دیا ہے مشرق ومغرب کے سارے محققین مل کر نہیں کر سکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ فردوسی اور شاہنامہ پر ہزاروں صفحے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں تکرار ہے۔ اس تکرار کا نتیجہ ہے کہ اس موضوع پر کثیر الحجم مواد اکٹھا ہو گیا ہے۔ شیرانی صاحب نے آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے فردوسی پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت تک یورپ میں تو اس پر کام ہو چکا تھا لیکن

ایران کام کے اعتبار سے ابھی دورِ طفولیت سے گذر رہا تھا ۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپی محققین فردوسی سے متعلق کوئی چونکا دینے والی چیز پیش نہیں کر سکے تھے لیکن شیرانی صاحب نے فردوسی اور شاہنامے پر جو کچھ لکھا ہے وہ چونکا دینے والے نتیجے کا حامل ہے ۔ جولائی ۱۹۲۱ میں رسالہ اردو اورنگ آباد میں شاہنامے کی نظم کے اسباب اور زمانے کے عنوان سے ایک معرکتہ الآرا مضمون شائع کیا ۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ داستان بیژن و منیژہ سب سے پہلی داستان ہے جو منظوم ہوئی ۔ اس داستان کے چند سال کے وقفے کے بعد شاہنامے کا آغاز ہوا جو کئی سال کی طویل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ داستان بیژن و منیژہ کی اولیت کے سلسلے میں انھوں نے کئی دلیلیں پیش کی ہیں ۔ ان میں آخری اور بڑی محکم دلیل شہادت کلام سے پیش کی ہیں ۔ یہی داخلی شہادت حافظ صاحب کی تحقیق کی جان ہے ۔ ان کا بجا خیال ہے کہ خارجی شہادت اضافی ہوتی ہے ۔ اس کے برخلاف داخلی شہادت اکثر شبہ سے پاک ہوتی ہے ۔
انھوں نے لکھا ہے داستان بیژن و منیژہ کی زبان بقیہ شاہنامے کی زبان سے متفاوت ہے ۔ اور یہ تفاوت و تقدم و تاخر زمانی پر دال ہوتا ہے ۔ داستان بیژن و منیژہ میں الف زائدہ کا استعمال بکثرت ہے جو شاہنامہ میں تدریجاً کم ہوتا گیا ہے ۔ فارسی زبان کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ابتدائً الف زائدہ کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا ۔ رفتہ رفتہ وہ کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کا استعمال بالکل متروک ہوگیا ۔ شاہنامہ ۲۵ سال کی طویل مدّت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ اس مدّت میں فارسی زبان میں بھی تحوّل و تغیّر رونما ہوا ۔ یہی تغیّر شاہنامہ کی ابتدائی اور آخری حصّے کی نظموں کے باہمی مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اسی تفاوت کی ایک شکل ابتدائی نظموں میں الف زائدہ کا استعمال اور تدریجاً اس کا عدم استعمال ہے ۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ :

> "الف اشباع کا استعمال بہ تقلید عربی فردوسی سے ماسبق اساتذہ رودکی و دقیقی کے یہاں کثرت سے ملتا ہے ۔ دقیقی کے ہزار اشعار میں جو شاہنامے میں محفوظ ہیں کئی موقعوں پر نظر آتا ہے ۔ یہ الف بغرض تحسین کلام اسم اور فعل دونوں کے آخر میں لایا جاتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے الف

کا استعمال داستان بیژن میں ۲۷ موقعوں پر ہوا ہے۔ جو بجائے خود ایک قابلِ حیرت معاملہ ہے کیونکہ باقی شاہنامے میں ایسے الف کی مثالیں پندرہ سے زیادہ نہیں ملیں گی۔ اس سے یہی پایا جاتا ہے کہ داستان بیژن شاہنامے سے بہت پہلے لکھی گئی ہے جب کہ فردوسی اپنا انداز خاص قائم نہیں کر چکا تھا۔"

(مقالات، ج ۴، ص ۶۷-۶۸)

دوبارہ اسی تخصیص کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فردوسی کی ابتدائی اور بعد کی داستانوں میں یہ نمایاں تفاوت ناقابلِ تشریح رہتا ہے۔ اس کی معما کشائی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی انقلاب کے تھپیڑوں کا تختۂ مشق بن رہی تھی اور زبان میں تغیرات واقع ہو رہے تھے۔ فردوسی ایک باخبر ماہر ہونے کی حیثیت سے ان تغیرات سے ہمیشہ بروقت وقوف حاصل کرتا رہا۔ باغ سخن کا یہ سب سے بہتر اور ماہر باغبان اپنی جھولی میں وہی پھول چنتا رہا جو سکۂ رواں کی فہرست میں شامل تھے۔ عدالت سخن سے جو لفظ خاطی اور مجرم قرار دیا گیا۔ اس کو زبردست فردوسی بھی اپنی اقلیم میں پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ الف تحسین جس کا داستان بیژن میں فردوسی اس قدر شائق معلوم ہوتا ہے، آخرکار اسی فردوسی کا شاہنامہ اس کا گورستان بنا۔"

(ایضاً، ص ۱۱۷-۱۱۸)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، شیرانی صاحب کے تقریباً ۲۲-۲۳ سال بعد "حماسہ سرائی در ایران" میں اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اگر صفا صاحب نے شیرانی صاحب کی تحریریں نہیں دیکھی ہیں تو اس کو نوارد خیال کی حیرت انگیز مثال سمجھنی چاہیئے بہرحال وہ لکھتے ہیں:

"داستان بیژن و گرازان میں فردوسی نے جو سبک کلام اختیار کیا ہے، اس کی تحقیق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ داستان جوانی میں نظم ہوئی۔ مثلاً اگر اس داستان کو شاہنامے کے دوسرے حصّوں سے مقابلہ کریں تو دیکھیں گے کہ

الف اطلاقی کا کثرت سے استعمال جو کبھی کبھی مخل فصاحت بھی ہے علی التواتر ہے چنانچہ اس داستان کے ایک حصّے کی نوے ابیات میں نو میں الف اطلاقی آیا ہے ... یعنی دس فی صد ابیات میں الف زائدہ کا قافیہ استعمال ہوا ہے یہ بات شاہنامے کے دوسرے حصوں میں نہیں پائی جاتی ! اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر اس ابتدائی حصّے میں وہ بے مثل مہارت حاصل نہیں کر سکا ہے جو اس کو بعد میں حاصل ہوئی "

(حماسہ سرائی ، ۱۳۲۳ ، ص ۱۷۷-۱۷۸)

تاریخ ادبیات ایران میں بھی ، جو حماسہ سرائی کے چند سال بعد تصنیف ہوتی ہے ، اسی خیال کی تکرار ملتی ہے۔

" فردوسی ظاہراً و بنا بر آنچہ از تحقیق در سبک کلام وی در داستان بیژن دگراز ان برمی آید ، این داستان را در ایام جوانی ساختہ بود۔ یکی از دلائل این مدعا ، استعمال الفہای اطلاق فراوانیست کہ علی التوالی و زیادہ از حد لزوم درین داستان مشاہدہ می گردد و دلیل آنست کہ فردوسی چنانکہ در دیگر موارد شاہنامہ دیدہ می شود ہنوز بہ نہایت پختگی و مہارت خود نرسیدہ بود "

(تاریخ ادبیات در ایران ، ج ۱ ، ص ۴۶۳-۴۶۴)

یہ نازک بحث جو شیرانی صاحب کی دقت طبع سے بردئے کار آئی ہے ، ہر شاعر و ادیب کے ادوار کے معین کرنے میں بے حد مفید ہے اس لئے کہ اکثر شاعر و ادیب کے کارنامے عموماً ۳۰۔ ۴۰ سال کے وقفے میں انجام پاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میری معلومات ہے ، ابھی تک کسی فارسی ادیب یا شاعر کے کلام کا مطالعہ اس اصول کے تحت نہیں ہوا ہے۔ شاہنامہ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت مشکل مسئلہ ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ صبر آزما کام دقیق مطالعہ اور غیر معمولی ذہانت کا متقاضی ہے اور غالباً یہی دشواری ہے کہ اب تک یہ اصول عملی جامہ نہ پہن سکا اور یہ دلچسپ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

آخر میں یہ بات پھر دہراتا ہوں کہ داستان بیژن پر ایسی مفصّل اور محققانہ و عالمانہ

بحث آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ شیرانی صاحب کے نظریے کی تائید تو ہو گئی ہے لیکن انھوں نے جس سطح سے گفتگو کی ہے وہاں تک کسی کے ذہن کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ یہ ان کی بالغ نظری کی بہترین دلیل ہے۔

حافظ شیرانی صاحب کا دوسرا اہم کارنامہ فردوسی کی طرف منسوب ہجو یہ اشعار تنقیح و تردید ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے جو داد تحقیق دی ہے وہ ہر طرح کی ستائش سے مستغنی ہے۔ پہلے اشعار ہجو میں ہر شعر کی اصل سے بحث کی گئی ہے اور یہ پتا چلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہجو کے اکثر اشعار مصنوعی اور جعلی ہیں۔ کچھ اشعار شاہنامے میں دوسرے مواقع پر کہے گئے تھے۔ ان کو ایک تسلسل میں پیش کر کے ہجو کی روایت کی توثیق کی گئی ہے۔ کچھ اشعار دیگر اساتذہ سے لئے گئے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن کی اصلیت واضح نہیں ہو سکی ہے۔ ہجو کی روایت جب تراشی گئی تو چند ہی شعر ہجو یہ متعین ہوئے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ چھٹی صدی کے بعد میں نظامی عروضی نے صرف چھ شعر دیئے ہیں اور اب ان کی تعداد ایک سو پچاس سے زیادہ ہو گئی ہے۔ نظامی کے ان ابیات کی لغوی اور تاریخی تنقیح سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ان میں کا کوئی شعر ہجو کا نہیں ہو سکتا۔ بعض کی نسبت فردوسی کی طرف غلط ہے۔ اس سلسلے میں شیرانی کا وہ بیان جو نتیجہ کے طور پر سپرد قلم ہوا ہے، ذیلاً نقل کیا جاتا ہے: (ص ۲۰۴)

"(ہجو) کسی فرد واحد کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اس قصر کی تعمیر میں ساری قوم نے ہاتھ بٹایا ہے اور اس کی تکمیل میں کئی صدیاں گذری ہیں۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہجو کی دو ولادت گاہیں ہیں۔ شیعی نقطۂ خیال کے ابیات کی کثرت سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اس عقیدے کے اصحاب نے ہجو کی سرپرستی میں غالب حصّہ لیا ہے۔ ہجو کی تعمیر کے لئے سب سے زیادہ ذخیرہ شاہ نامے سے لیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ربط کلام کی غرض سے بعض اشعار میں اصلاح یا تبدیلی کی گئی ہوگی۔ سلسلہ قائم کرنے کے لئے نئے اشعار کی بھی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی

اس طرح سے یہ ہجو تیار ہوئی ہے جو آج بغیر کسی شبہ کے فردوسی کی تصنیف
مانی جاتی ہے۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دیباچہ نگار بایسنغر خانی نے
ہجو کی تنظیم و تشکیل میں بڑا حصّہ لیا ہے۔"

پروفیسر شیرانی نے ہجو کے اشعار پر جو مفصل بحث کی ہے وہ کتاب کے کم و بیش سو صفحے کو حاوی ہے۔ اس میں جو اصول مدنظر رکھے گئے اس کی بنیاد پر اس مقالے کو تحقیق ادبی کا شاہکار سمجھنا چاہیئے۔ لیکن غضب ہے کہ ایرانی محققین کو اب تک اس کا کوئی پتا نہیں اس لئے تو ایرج افشار جیسے جہاں گرد اور جہاں دیدہ محقق نے بھی شیرانی کے فردوسی سے متعلق تقریباً پانسو صفحے پر مشتمل مواد کو اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ سوائے ان کے اس چھوٹے سے مقالے کے جو مقدمہ شاہنامۂ قدیم سے متعلق ہے "کتاب شناسی فردوسی" میں کسی کا ذکر نہیں۔

اس علمی بے خبری (اور اگر دیدہ و دانستہ ہے تو بددیانتی) کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ جب ایرانی فضلاء کی بے بصری اس درجہ تک پہنچ چکی ہو تو ان سے کسی بڑے پائے کی تحقیق کی توقع عبث ہے۔ ایران میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے ہجو کے اشعار کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر بات کہی ہو۔ یہ ایران کے سب سے مایۂ ناز شاعر اور فارسی زبان کے سب سے بڑے شاہکار کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ مغرب کے پرستار کے لئے ایک ہندوستانی محقق کی تحقیق اور وہ بھی محمود غزنوی کے تعلق سے، جو ان کے نزدیک ہر طرح کی اہانت کا مستحق تھا، کیونکر درخور اعتنا قرار پاتی۔ نصر اللہ فلسفی کا حسب ذیل حقارت آمیز بیان، جو تنگ نظری، عصبیت اور بے علمی پر مبنی ہے، کسی حد تک ایرانی ذہن کا عکّاس ہے، حیرت اس پر ہے کہ ایک تیر سے تین نشانے لگائے گئے۔ محمود غزنوی کا تو ذکر ہی کیا، عرب اور ترک بھی اس ایرانی فلسفی کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکے۔

"فردوسی اپنے اجداد کی طرح آرزومند تھا کہ ایران کے پاک نژاد اور
ایرانی بادشاہوں کی نسل سے کوئی بادشاہ اس کے وطن (ایران) کا حکمران
ہو تاکہ عرب بادیہ نشین کا دست تسلّط کوتاہ اور وحشی اور ویران کرنے
والے ترکوں کے منحوس قدم سے سرزمین ایران پاک ہو۔ وہ محمود غزنوی جیسے

بے ہنر غلام کو ایران کے تخت پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

(مجلّہ مہر، ۱۳۴۲ شمسی، بحوالہ مقالات شیرانی اضافہ مرتب، ج ۴، ص ۱۲۴)

اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ جس شخص نے سرسری طور پر بھی شاہنامے کا مطالعہ کیا ہے اس کے نزدیک اس بیان کے کھوکھلے اور بے بنیاد ہونے میں ادنیٰ تامّل نہ ہوگا۔

اب میں ایک اور ایرانی محقق ڈاکٹر صفا کا قول نقل کرتا ہوں، جو شیرانی صاحب کے تیئیس سال بعد فردوسی کے ہجویہ اشعار کی اصالت کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"شاہ نامہ کے محمود غزنوی کی خدمت میں تقدیم کرنے کے بعد فردوسی ہمیشہ اس پر نظر ثانی کرتا رہا۔ چنانچہ اپنی وفات کے قریبی ایام میں ایک بار اس پر کلی طور پر نظر ثانی کی، کچھ اشعار بڑھائے اور بعض اشعار میں تغیر و تبدّل کئے اور شاہ نامے میں یہ شاعر کی آخری تجدید نظر تھی اور آج شاہ نامے کے متداول اور مشہور نسخے اسی آخری نسخے پر مبنی ہیں۔ اس نسخے میں ہجونامہ شامل تھا اور وہ فردوسی کے مرنے کے بعد منتشر ہوا۔ اس بنا پر نظامی کا یہ قول کہ ہجونامہ مندرس ہوگیا اور اس میں سے صرف چھ بیت باقی رہ گئے پوری طرح قابل قبول نہیں اس بارے میں 'نلدکے' کا قیاس زیادہ قرین صحت ہے۔ اس کے نزدیک فردوسی محمود غزنوی کا ہجونامہ اپنی زندگی میں مشتہر نہیں کرسکا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہجونامہ میں اگر الحاقی اور جعلی ابیات ہیں بھی تو ان کی تعداد بہت کم ہے، اس کے بیشتر ابیات حقیقی ہیں، ان کی اصالت پوری طرح واضح ہے۔" (حماسہ سرائی، ص ۱۹۰-۱۹۱)

صفا صاحب کا یہ پھُس پھسا بیان شیرانی صاحب کے پختہ دلائل کے سامنے کچھ وزن نہیں رکھتا۔

اس کے برخلاف عبدالحی حبیبی جنھوں نے شیرانی صاحب کی کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کو فارسی میں منتقل کیا ہے پورے اعتماد کے ساتھ شیرانی صاحب کے نقطۂ خیال کی حمایت کررہے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شاہنامے کی بابت سب سے قدیم روایت تاریخ

سیستان کی ہے۔ اس میں فردوسی کی محرومی کا تو ذکر ہے لیکن نہ ہجو کا تذکرہ ہے اور نہ اس کے شیعہ ہونے کا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ پروفیسر صفا تاریخ سیستان کے بیان کو بھی افسانہ سمجھتے ہیں۔ آخرالذکر تاریخ کے بیان کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"اور رستم کا معاملہ اس طرح ہے کہ ابوالقاسم فردوسی نے شاہنامہ لکھا اور سلطان محمود کے نام معنون کیا اور مدتوں سناتا رہا۔ محمود نے کہا پورا شاہنامہ سوائے رستم کی داستان کے اور کچھ نہیں، میری فوج میں رستم جیسے ہزار دلاور ہیں ابوالقاسم (فردوسی) نے کہا، حضور کی زندگی دراز ہو، میں نہیں جانتا کہ آپ کے لشکر میں کتنے مرد رستم جیسے ہیں، صرف اتنا جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے رستم جیسا دوسرا دلاور پیدا ہی نہیں کیا، اتنی بات کہی، زمین بوسی کی، اور چلا گیا۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ اس مردک نے تعریضاً مجھے جھوٹا بنایا۔ وزیر نے کہا، اسے قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن ہر چند اس کی تلاش کی ہاتھ نہ آیا، ایسی بات کہی اس کی ساری محنت اکارت گئی، وہ چلا گیا اور صلے سے محروم رہا۔"

(تاریخ سیستان، ص ۸، طبع تہران، ۱۳۱۴)

دوسری روایت ناصر خسرو کی ہے۔ جس کے سفر نامے کے حوالے سے ژول موہل نے لکھا ہے کہ:

"۴۳۸ھ میں ناصر خسرو جب طوس سے گذر رہا تھا تو اس نے ایک کارواں سرائے دیکھی جو تازہ تازہ بنی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ عمارت اس رقم سے بنی ہے جو سلطان محمود نے فردوسی کو بطور صلہ بھیجی تھی لیکن وہ رقم اس وقت پہنچی جب شاعر فوت ہو چکا تھا۔"

اگر ناصر خسرو کی یہ روایت صحیح ہے تو فردوسی کی محرومیت کی داستان بہت پرانی ہے ناصر خسرو کا یہ بیان فردوسی کی وفات کے بیس بائیس سال کے اندر کا ہے لیکن اس بیان میں ہجو کا مطلق ذکر نہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ناصر خسرو محض شیعہ ہی نہ تھا بلکہ اسماعیلی

راعی اور خراسان کا حجت تھا۔ ترکوں سے اسے بڑی عداوت تھی اس لئے کہ غزنوی اور سلجوقی حکمرانوں کے ہاتھوں اسے بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر اس نے فردوسی کی ہجوسرائی کا ذکر نہیں کیا تو یہ نہایت درجہ قابل توجہ امر ہے۔

حبیبی صاحب کا خیال ہے کہ پانچویں صدی تک ہجو کی داستان نہ تھی، چھٹی صدی میں یہ داستان گھڑی گئی۔ فی الحال قدیم ترین روایت نظامی عروضی کی ہے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد عبدالجلیل قزوینی نے اپنی تالیف "کتاب النقض" (تالیف ۵۵۶ھ) میں فردوسی کے تشیع کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے تقریباً دو صدی بعد محمّد بن علی شبانکارئی نے اپنی کتاب "مجمع الانساب" (تالیف ۷۳۶ھ) میں بڑی شرح وبسط سے فردوسی کی محرومی کی وجہ اس کا تشیع اور سلطان کی مذہبی سخت گیری قرار دی ہے۔

نفیسی صاحب کے ہاں ہجو کے بارے میں غالباً کوئی تحریر نہیں ملتی لیکن وہ شیرانی صاحب کے علم وفضل اور ان کے تبحر علمی کے بڑے قائل تھے۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے ایک بار مجھ سے شیرانی صاحب کی کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کا ذکر بڑی دلچسپی سے کیا اور اس اعتراف کے ساتھ کہ فارسی میں اس موضوع پر کوئی کتاب اس پائے کی نہیں، ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ کتاب فارسی میں منتقل ہو جائے۔ لیکن ان کی یہ خواہش ۱۹۷۷ء میں عبدالحی حبیبی کے ذریعے پوری ہوئی جنھوں نے اس اہم کتاب کا ترجمہ ۱۳۵۵/۱۹۷۷ء میں ایک مقدمہ کے ساتھ کابل سے شائع کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس عالمانہ اور محققانہ تالیف کے بعد ایرانیوں کے نقطۂ نظر میں کچھ تبدیلی آجائے۔

فردوسی کی ہجو نویسی کا رشتہ اس کے تشیع سے جوڑا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور سلطان محمود کٹر سنی۔ اس بنا پر اس کو صلے سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہجو نویسی اس کا لازمی نتیجہ تھی۔ یہ سب باتیں شیرانی سے قبل ایسی مسلّمہ حقیقت تھیں جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ شیرانی صاحب کی جرأت مندی تھی کہ انھوں نے ایسی مسلّمہ حقیقت کے خلاف آواز اٹھائی اور فردوسی کا مذہب اپنے ایک مقالے کا موضوع بنایا اور انھوں نے اس مسئلے کو اس نتیجے تک پہنچایا کہ جہاں تک داخلی شہادت کا تعلق ہے اس سے قطعی طور پر

نہ اس کو شیعہ کہہ سکتے ہیں، نہ سنی۔ لیکن زیادہ اشعار ایسے ملتے ہیں۔ جن سے اس کے تسنّن کا پلّہ بھاری نظر آتا ہے۔ شیرانی صاحب کے محکم دلائل کے پیش نظر حبیبی صاحب بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فردوسی کا تسنّن بڑی حد تک قابل قیاس ہے: "دربارۂ مذہبش ہم سخنانی دارد شنیدنی و در خور غور و تامّل۔"

اگرچہ ایرانی فضلاء کے نزدیک فردوسی کے مذہب کے بارے میں کسی بحث کی گنجائش نہیں، اس کا تشیّع ایک مسلّمہ امر ہے لیکن مجلہ مہر کے فردوسی نمبر میں محیط طباطبائی نے اعتراف کیا ہے کہ ابھی اس مسئلے پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

"جب تک میں نے اس موضوع کی تحقیق اور مقالہ کی نگارش شروع نہیں کی تھی میرا گمان نہ تھا کہ میری تاریخی بحث کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ فردوسی شیعہ زیدی تھا لیکن اس بحث کے بعد پھر موقع نہ ملا کہ فردوسی کے کلام سے وہ سارے اشعار منتخب کئے جائیں، جن سے اس کے زیدی یا معتزلہ عقائد کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مستشرقین و محققین اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ ان کے بحث و انتقاد کے نتیجے میں فردوسی کی شخصیت کا یہ تاریک گوشہ روشن ہو جائے۔"

شیرانی صاحب کی تحقیق جو تمام تر داخلی شہادت پر مبنی ہے، اس سلسلے میں ترقی کا ایک قدم ہے۔ اس مقالے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ مسئلہ جو ایک مدت سے طے شدہ مانا جاتا تھا، شیرانی صاحب کی تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ واقعہ ایسا نہیں ہے، ابھی اس سلسلے میں کام کرنے کی بڑی گنجائش ہے اور آئندہ کا مورخ ہی یہ بات بقرار واقعی طے کر سکے گا کہ فردوسی سنّی تھا یا شیعہ اور اس کی شیعیت کا اس کی محرومی میں دخل تھا بھی یا نہیں، البتہ اس سلسلے کی آخری کڑی کہ فردوسی کی محرومی ہجو نویسی کی محرک ہوئی، شیرانی کی تحقیق سے بڑی حد تک مشکوک ثابت ہو گئی ہے اور یہ بات تو کسی حد تک یقین کے درجے تک پہنچ گئی ہے کہ موجودہ ہجو کے اشعار یا تو جعلی ہیں یا شاہنامے کے دوسرے مقامات سے منتخب کر کے ہجو کے لئے مربوط انداز میں مرتّب کر لئے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی شعر، اگر ہجو لکھی بھی گئی ہو، تو اس کا نہیں ہے۔

شاہنامہ کے تعلق سے شیرانی صاحب کا سب سے معرکتہ الآرا کارنامہ یوسف زلیخا کے فردوسی کی طرف انتساب کا بطلان ہے۔ شیرانی صاحب نے یہ مضمون آج سے تقریباً ۵۸ سال قبل رسالۂ اُردو، اپریل ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ یوسف زلیخا کی نسبت فردوسی کی طرف ایک ایسی مسلّمہ حقیقت بن چکی تھی جو ہر قسم کے شبہ سے پاک سمجھی جاتی تھی۔ مغرب کے فضلاء کی تحقیق نے اس پر ایسی مہر اثبات ثبت کر رکھی تھی کہ اس بارے میں کسی کو شک کرنے کا موقع نہ تھا۔ یورپی محققین میں ایتھے، نولدیکے، پروفیسر براؤن وغیرہ نے واضح طور پر اس مثنوی کو فردوسی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ چنانچہ اوّل الذکر کے مقدمے کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں اکسفورڈ (انگلستان) سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ متاخر تذکرہ نویسوں نے بھی ان کا انتساب فردوسی کی طرف کیا ہے۔ دورِ جدید کے مشرقی فضلاء کی بھی یہی رائے تھی۔ ایسی مسلّمہ بات کے خلاف قلم اٹھانا ایسا جرأت مندانہ اقدام ہے کہ اس کی مثالیں، فارسی ادبی تاریخ میں شاذ ہیں۔ فردوسی فارسی کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے اور ہر ایرانی کا اس سے جذباتی لگاؤ ہے۔ لیکن ایرانی تحقیق کا یہ کھوکھلا پن تو دیکھئے کہ شیرانی صاحب کی تحریرات سے قبل کسی ایرانی ادیب نے اس جلیل القدر شاعر کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر تحقیقی کام انجام ہی نہیں دیا تھا اور کوئی چونکا دینے والی بات تو اب تک کسی مشرقی یا مغربی محقق کے قلم سے نہیں نکلی ہے۔ جدید دور کے اکثر نقاد مثنوی یوسف زلیخا کو فردوسی کی تصنیف نہیں مانتے لیکن یہ ادھر چند سالوں کی بات ہے۔ یہ آواز سب سے پہلے ہندوستان میں پروفیسر شیرانی نے اُٹھائی اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے محکم دلائل پیش کئے کہ آج تک ان پر کسی قسم کا اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔

ایرانی محققین میں سب سے پہلے پروفیسر عبدالعظیم قریب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور مجلہ آموزش و پرورش ۱۳۱۸ شمسی/ ہ - ۱۹۳۹ء میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دوبارہ پانچ سال بعد اسی مجلے میں لکھا کہ مثنوی یوسف زلیخا کا فردوسی سے کوئی تعلق نہیں

شماروں میں شائع ہوئے ۔ اس میں شبہ کہ استاد فریب کو فردوسی کی طرف انتساب کے غلط ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ لیکن ان کے آخری مضامین شیرانی صاحب کے ۲۲، ۲۳ سال بعد کے ہیں اور تعجب اس بات پر ہے کہ ان آخری مضامین میں بھی ادنیٰ اشارہ نہیں کہ اس موضوع پر شیرانی صاحب مدتوں پہلے سیر حاصل بحث کر چکے ہیں ۔ بہر حال بہ مشکل ہی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شیرانی صاحب کے خیالات، جو مضامین کے علاوہ کتابی شکل میں آ چکے تھے، ایرانی فضلا، کی نظر میں نہ ہوں ۔ لیکن اگر ایسا ہے بھی تو یہ ایسی کوتاہی ہے جو کسی حال میں مستحسن نہیں ہو سکتی اور مجلہ انڈو ایرانیکا کے ہندوستانی مدیر کو کیا کہوں کہ جس نے اس چھاپے ہوئے لقمے کے ساتھ الوان نعمت جیسا سلوک کیا اور یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں کہ پروفیسر شیرانی صاحب نے اس موضوع پر جس تعمق نظر سے بحث کی ہے اس کا ادنیٰ شائبہ نہ استاد قریب کی اور نہ کسی ایرانی اور غیر ایرانی کی تحریریں ملتا ہے ۔ مثال کے طور پر میں داخلی شہادت کو لیتا ہوں ۔ شیرانی صاحب نے شہادت کلام کے تحت حسب ذیل ذیلی عنوان قائم کئے ہیں ۔

اسالیب خصوصی، افعال متعدی بیک مفعول، اسالیب مقامی، اسالیب ایائی ادائے مطلب، توصیفات، عربیت، عربی الفاظ کی ترکیب، عربی فارسی الفاظ کی ترکیب، اضافت کا استعمال، فارسی حروف کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال ۔

ان عنوانات کے تحت یوسف زلیخا اور شاہنامے کے کئی سو اشعار پیش کر کے دونوں کے فرق کو نمایاں کیا ہے اور یہ دلچسپ اور ٹھوس بحث جو قدم قدم پر امثلہ سے موشح کی گئی ہے، تقریباً سو صفحے کو حاوی ہے ۔ ان کے عالمانہ و محققانہ مباحث کے سامنے سارے ایرانی ناقدین کی تحریریں پھس پھسی اور بے وقعت نظر آتی ہیں ۔ دکتر صفا نے چند سطروں میں اس پر محاکمہ (حماسہ سرائی میں) کر کے چھوڑ دیا ہے: "امّا از سبک کلام دستی بسیاری از ابیات واستعمال اصطلاحات و کلمات و ترکیباتی بسیاری از آنہا دور از سبک کلام فارسی در عہد سلمانی و اوائل عہد غزنوی است، چنیں بر می آید کہ گوینده این منظومہ فردوسی نیست۔"

(حماسہ سرائی، ۱۳۲۴/۱۹۴۵ء، ص ۱۷۵)

استاد قریب نے کچھ تفصیل پیش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"دلیل مہم تر و محکم تر اختلاف شیوہ و اسلوب شاہنامہ و مثنوی یوسف زلیخاست۔ شیوہ شاہنامہ بغایت متین و نغز و پسندیدہ و زیبا و اسلوب مثنوی یوسف زلیخا بکلی مخالف شاہنامہ است و اشعار سبک سست و نازیبا فراوان دران دیدہ می شود و ہم چنین مضامین و معانی و تشبیہات و استعارات آن بیک دگر شباہت ندارد و اضح و مسلم است کہ سرایندہ این مثنوی دو چکامہ سرا و از دو سرچشمہ مایہ گرفت۔"

(انڈو ایرانیکا، ج ۷، نمبر ۴ دسمبر ۱۹۵۴، ص ۶)

اس عمومی بیان کا شیرانی کے اس بیان سے جس میں انھوں نے مثنوی یوسف زلیخا سے ایسے الفاظ، فقرات، محاورات، ترکیبات، استعارات وغیرہ کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو فردوسی کے زمانے میں وجود ہی میں نہیں آئے تھے، کوئی نسبت نہیں شیرانی کے اس طریق استدلال سے ان کی تحقیق کا مرتبہ دوسرے محققین سے بدرجہ بلند ہو جاتا ہے۔

استاد قریب کے علاوہ ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی نے مجلۂ روزگار نو، ج ۵، شمارہ ۲، سال ۱۹۴۵ء میں اپنے ایک مضمون: "کتاب ہزارۂ فردوسی و بطلان انتساب یوسف و زلیخا بہ فردوسی" میں ثابت کیا ہے کہ مثنوی یوسف زلیخا سے فردوسی کا کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح محمد قزوینی نے اپنی ایک یادداشت میں اسی عقیدے کا اظہار کیا۔ (یادداشت ہائے قزوینی، ج ۷، ۱۳۴۲، ص ۲۲۴-۲۲۵)۔

غرض باوجود اس امر کے کہ ایرانی فضلا کے بھی نزدیک یوسف و زلیخا کا انتساب فردوسی کی طرف غلط ہے، حبیب یغمائی نے اپنی ایک تالیف "فردوسی و شاہنامۂ او" (انتشارات انجمن آثار ملی، تہران، ۱۳۴۸/ ۱۹۶۹-۱۹۷۰) میں بلا تامل بغیر کسی شک و شبہ کے یوسف و زلیخا کو فردوسی کی ملکیت قرار دیا ہے جیسا کہ اس کتاب کے مندرجات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایرج افشار جیسے محقق نے "کتاب شناسی فردوسی"

میں شیرانی جیسے جلیل القدر محقق کے فردوسی سے متعلق ایسے فکر انگیز مطالعات کا مطلق ذکر نہیں کیا حالانکہ ان کی یہ کتاب ۶۹-۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ البتہ ان کے ایک مضمون: شاہنامہ کا دیباچۂ قدیم (اورنٹیل کالج میگزین، ج ۵، ۱۹۲۹، ص ۳-۱۹) کا ذکر اس اضافے کے ساتھ کیا ہے۔

"ہمیں مقالہ در مجلہ اردو ہم ظاہراً طبع شدہ"

دراصل حکیم شمس اللہ قادری نے رسالۂ اردو اپریل ۱۹۲۷ء میں شاہنامہ کے دیباچۂ قدیم پر ایک مضمون لکھا اور ساتھ ہی اس دیباچے کو چھاپ بھی دیا۔ اس پر شیرانی صاحب کا ایک تبصرہ اورنٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۸ء شائع ہوا۔ اس کا جواب حکیم صاحب کی طرف سے رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۲۸ء میں چھپا۔ آخر میں شیرانی صاحب نے اورنٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۹ء میں اس موضوع پر ایک سیر حاصل بحث کی۔ اسی مضمون کا حوالہ ایرج افشار کی کتاب میں ہے۔ البتہ اس کے ساتھ آخر الذکر کی اضافی اطلاع غلط ہے۔ بہر حال ایرانی نقادوں کی ہندوستانی محققین کے کارناموں سے ایسی بے توجہی قابلِ معذرت نہیں بالخصوص ایسے کارنامے جو عظیم ترین شاعر سے متعلق ہوں اور جو بعض لحاظ سے تاریخ ادب میں اپنی آپ نظیر ہوں۔

یہاں ایک ضروری بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاہنامے کے دیباچۂ قدیم کا تعلق فردوسی سے نہیں۔ یہ ایک قدیم نثری شاہنامے کا مقدمہ ہے جو ابومنصور محمد بن محمد الرزاق کے حکم سے ۳۴۶ھ میں مرتب ہوا تھا۔ اس امر کی تصدیق مقدمہ قدیم شاہنامہ کے علاوہ بیرونی کی آثار الباقیہ سے بھی فراہم ہوتی ہے۔ مرزا محمد قزوینی نے اس موضوع پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے ان کی بحث کا نتیجہ یہ ہے:

"یہ مقدمہ اگرچہ ہمیشہ شاہنامۂ فردوسی کی ابتدا میں ملتا ہے اور اگرچہ اس کے آخر میں فردوسی، اس کے شاہنامہ اور سلطان محمود کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ظنّ قوی ہے، جس کے متعدد قرائن ہیں کہ اس مقدمہ کا بڑا حصّہ یعنی تقریباً ⅘ حصّہ ابتدا سے فردوسی اور شاہنامہ

وغیرہ کے ذکر کے قبل تک، شاہنامۂ فردوسی کا مقدمہ نہیں ہے۔ بلکہ فردوسی کے علاوہ دوسرے شاہنامہ کا مقدمہ ہے اور شاہنامۂ فردوسی پر تقدم زمانی رکھتا ہے۔

اس مقدمے کی اور خود شاہنامہ ابومنصور جس پر یہ مقدمہ ہے اس کی تاریخ بطور تحقیق (جیسا کہ خود مقدمہ میں مذکور ہے) محرم ۳۴۶ھ ہے۔ اس طرح یہ مقدمہ شاہنامہ منصوری، ترجمۂ تاریخ طبری سے جو ۳۵۲ھ میں مکمل ہوا تقریباً ۶ سال متقدم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فی الحال یہ مقدمہ بعد از اسلام کی فارسی میں قدیم ترین نثری یادگار ہے جو تالیف کے ایک ہزار چھ سال بعد ہم تک پہنچا ہے۔ اس مقدمہ شاہنامہ ابومنصوری کی بقا شاہنامۂ فردوسی کے سائے میں ہے ورنہ صدیوں پہلے اپنے اصل کے ساتھ غائب ہو چکا ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہنامۂ فردوسی کے قدیمی کاتب قدیم الایام ہی سے اس مقدمے کو شاہنامۂ فردوسی سے کمال مجانست کی بنا پر اس کے شروع میں شامل کرتے رہے ہیں۔ ان کی پیروی میں بعد کے کاتبوں نے جب بھی شاہنامہ نقل کیا تو اس مقدمۂ قدیم کو جو اس کے شروع میں ہوتا، یہ خیال کر کے یہ مقدمہ شاہنامہ ہے، وہ لوگ ہو بہو نقل کرتے رہے، اس طرح یہ مقدمہ ہم تک پہنچا ہے۔"

مرزا محمد قزوینی اس مقدمہ کا ایک ناقدانہ متن جس پر ایک محققانہ مقدمہ ہے بیست مقالۂ قزوینی (ج ۲، ص ۶ - ۹۰) میں شائع کر چکے ہیں جس کو بعد میں حبیب یغمائی نے اپنی کتاب: "فردوسی و شاہنامۂ او" (ص ۲۸۷ - ۲۲۸) میں دوبارہ شامل کر لیا۔

اگرچہ اس وقت تک یہ فارسی نثر کا سب سے قدیم نمونہ تھا۔ لیکن ادھر ایک کتاب بنام کشف المحجوب ملی ہے جو عقائد اسماعیلی پر ہے اور خراسان کے ایک اسماعیلی داعی ابویعقوب اسحاق بن احمد سجزی کی تالیف ہے جو ۳۳۱ھ بخارا میں قتل کر ڈالا گیا تھا ۱۹۴۹ء میں ہنری کاربن نے ایک فرانسیسی مقدمے کے ساتھ اس کو تہران سے چھاپ کر

شائع کر دیا ہے۔ اس لئے اب اسی کتاب کو فارسی نثر کا سب سے قدیم نمونہ سمجھنا چاہیئے۔
یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ پروفیسر شیرانی نے حکیم شمس اللہ قادری کے چھاپے ہوئے نسخے میں بڑی غلطیاں بتائی ہیں اور ان میں سے بعض غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے شیرانی صاحب کی اصلاحی تحریروں کا جب مرزا محمد کے انتقادی متن سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو شیرانی صاحب کی تحقیق کی قدر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذیل میں تینوں روایتوں کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں:

متن حکیم شمس اللہ قادری	اصلاح شیرانی	متن مرتبہ قزوینی
چون ہمان سنگ کہ افریدین بپای بر داشت	چون ہمان سنگ کجا آفریدون بپای بازداشت	(عین مطابق شیرانی) آفریدون بجائے ایدون
پس دانایان کہ نامہ خواہند ساخت ایدون سزد	پس دانایان کہ نامہ خواہند ساختن ایدون سزد	(عین مطابق شیرانی) ایذدن بجائے ایدون
سہ دیگر خواص نامہ چہارم خداوند نامہ	سہ دیگر ہنر نامہ چہارم نام خداوند نامہ	سہ دیگر ہنر نامہ الخ (مطابق شیرانی)
ششم نشان دارن از دانش کہ نامہ از بہزاد است	ششم نشان دادن از دانش آنکس کہ نامہ از بہزاد ست	(عین مطابق شیرانی)
و نامہ بادشاہان فارسی از گنج خانۂ مامون موبد یزدگرد شہریار	و از نامۂ پادشاہان پارس و از گنج خانۂ مامون و از بہرام شاہ مردان شاہ کرمانی و از فرخان موبدان موبد یزدگرد شہریار	(عین مطابق شیرانی) مردان شاہ بجائے مردان شاہ

وگودرز بگاه کیخسرو سالار گنج خانهٔ مامون موبد یزدگرد شهریار	واز نامهٔ پادشاهان پارس واز گنج خانهٔ مامون داز بهرام شاه مردان شاه کرمانی واز فرخان موبدان موبد یزدگرد شهریار	(عین مطابق شیرانی) مردان شاه بجائے مردان شاہ
وگودرز بگاه کیخسرو سالار بود که بیژن را کشت بیژن پسر بود پسر بسوان پسر حسین	گودرز بگاه کیخسرو سالار بود که پیران را کشت پیران پسر ویسه بود پسر حشو پسر بسوان	گودرز بگاه کیخسرو سالار بود پیران را او کشت که اسپهبد افراسیاب بود پسر حشوان پسر آزس و پیران پسر ویسه بود و ویسه پسر زادشم بود
وانگه خسرو پرویز بدر روم شد، کنارنگ پیشتر و لشکر او بود و در هنگام ساده شاه الخ	وانگه خسرو پرویز بدر روم شد کنارنگ پیشرو لشکر پرویز بود و حصار روم بسته و نخیستن کسی که بدیوار حصار بر شد او بود که با قیصر روم آویخت واورا بگرفت و در پیش شاه آورد و در هنگام ساده شاه الخ	وآنگه که خسرو پرویز بدر روم شد کنارنگ پیشرو بود لشکر پرویز را و حصار روم بسته و نخیستن کسی که بدیوار بر رفت و با قیصر درآویخت و اورا بگرفت و بپیش شاه آورد او بود و در هنگام ساده شاه الخ

اوپر کی گذارش سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دیباچہ شاہ نامۂ قدیم سے فردوسی کا کوئی سروکار نہیں البتہ اس کے آخری حصے یقیناً شاہ نامہ فردوسی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس کے آخری حصہ رطب و یابس ہے، اس کے لئے فی الحال کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ اسی وجہ سے اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ مناسب نہ ہوگا۔

ضمناً یہ بات قابلِ ذکر ہے شیرانی صاحب نے ایک تاریخی واقعہ کی مدد سے اختتام شاہنامہ کی تاریخ ۳۹۴ ہجری مقرر کی ہے اور اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ۳۸۸ سے ۳۹۴ تک غزنین میں موجود تھا۔ یہ تاریخی واقعہ کانِ زر کے انکشاف سے متعلق ہے، جو ۳۹۴ میں سیستان میں زلزلہ نے سے برآمد ہوئی تھی۔ احمد غفاری نے نگارستان میں اور محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا یہ قیاس کہ فردوسی کا محمود غزنوی کی مدح میں یہ شعر:

زخاور بیارا ست تا باختر پدید آمد از فرّ او کانِ زر

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نگارستان میں اس واقعہ کو حاکم سیستان خلف کی شکست اور اس خطے پر محمود غزنوی کے قبضے سے مربوط کیا گیا ہے۔ نگارستان میں ہے۔

"درسن اربع وتعین وثلث مائۃ سلطان بواسطۂ امر شنیعی کہ از خلف حاکم سیستان در وجود آمادہ بود بدانجا نہضت فرمودہ قلعہ طاق بدست آوردہ آن ولایت راضبط کرد وہم دران سال دریکی از جبال آنجا معدن طلا بشکل درختی درزمین پدید آمد الخ۔"

امیر خلف حاکم سیستان کے حالات کا اہم ماخذ تاریخ سیستان ہے۔ اس میں خلف کی شکست کی تاریخ شب یک شنبہ ۱۲ صفر اور محمود کے قبضۂ سیستان کی تاریخ یکشنبہ ۱۲ صفر ۳۹۳ ہجری درج ہے۔ طاق کے محاصرے سے تنگ آکر امیر خلف نے صلح کا پیغام بھیجا۔ سلطان محمود نے اس کا پیغام قبول کرلیا۔

"سلطان محمود او را اجابت کرد کہ فرود آمی چنانکہ خواہی وچندانکہ خواہی

ہیچ کس را بر مال داہل تو کار نیست ..... پس نماز خفتن شب یکشنبہ دوازدہم صفر سنہ ثلث وتسعین امیر خلف فرود آمد بر طاق وطیلسان برسم علماء وزہاد بر خری مصری نشستہ و شمعہا افروختہ اندر پیش وی، وپیش سلطان محمود اندر شد، چون بنزدیک وی رسید محمود برخاست واورا اندر کنار گرفت وبجانب خویش نشاند و نیکو پرسید و دل او گرم کرد و امیدہای نیکو کرد۔" (ص ۳۵۲)

اس کے بعد کی ذیلی سرخی اس طرح ہے۔

"صافی شدن پادشاہی سیستان سلطان عالم عادل یمین الدولہ ابوالقاسم محمود بن سبکتگین را روز یکشنبہ در صفر سن ثلث وتسعین و ثلثمائہ۔"

واضح ہے کہ ایک شنبہ کو صفر کی تیرہ تاریخ تھی۔

اس تفصیل سے یہ بات بڑی حد تک قطعی طور پر طے ہو گئی کہ سیستان کی فتح اور اس پر مکمل قبضے کی تاریخ روز یکشنبہ ۱۲ صفر ۳۹۳ ہجری ہے۔ اس بنا پر نگارستان میں دی ہوئی تاریخ ۳۹۴ غلط ہوگی اور اس کے نتیجہ صریح کے طور پر فردوسی کی غزنین میں موجودگی ۳۹۳ تک سمجھنا چاہیئے۔

فردوسی اور شاہنامے پر جناب شیرانی صاحب کی تحقیقات کے جائزے کے لئے چند صفحے ناکافی ہیں۔ پھر بھی جو چند باتیں عرض کی گئی ہیں ان سے شیرانی صاحب کی تحقیق کی عظمت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا اور آپ یہ بات پیش نظر رکھیں کہ ادھر پچاس ساٹھ برس میں اس موضوع پر جہاں بھی اور جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ سب وہی باتیں ہیں جو شیرانی صاحب پہلے کہہ چکے ہیں، ان پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں، تو ان کی عظمت دو چند ہو جاتی ہے۔ شیرانی صاحب کی غیر معمولی کامیابی کا راز ان کی پہلو دار شخصیت میں مضمر ہے۔ وہ بڑے ذہین اور طباع تھے۔ جدّت و اختراع ان کی طبیعت کا جوہر تھا نہایت جری اور جسور تھے۔ جو بات حق سمجھتے اس کا اظہار بے لاگ کرتے خواہ وہ بادی النظر میں کتنی عجیب ہی کیوں نہ معلوم ہوتی ہو۔ وہ بلند نظر نقاد، ادب و شعر کے تقاضوں سے بخوبی

واقف تھے۔ وہ تحقیق و تنقید میں تضاد کے قائل نہ تھے۔ ہر چیز کو تنقید کی نظر سے دیکھتے بغیر پرکھے آزمائے وہ ہر بات، خواہ کتنی ہی مشہور کیوں نہ ہو، قبول نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اکثر فارسی متون کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ چونکہ ہر دور کی زبان کے خصائص ان کی نظر میں تھے اس لئے کسی شاعر یا ادیب کے زبان و بیان سے اس کے عہد کے تعین میں اکثر کامیاب ہو جاتے تھے۔ قوت آخذہ کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ داخلی شہادت کی اہمیت کے قائل تھے اور ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ ان کی تحریر بڑی دلکش ہوتی ہے۔ اس بنا پر خشک مضمون بھی دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ ان کی تحقیقات سے دو تین قدیم مفروضات کی تکذیب ہوگئی۔

۱۔ محقق نقاد نہیں ہو سکتا۔

۲۔ تحقیق کی زبان میں ادبیت غلط نتائج پر ڈال دیتی ہے۔

۳۔ تحقیق محض گورکنی ہے، زندگی سے اس کا تعلق نہیں۔

(۲)

شیرانی صاحب کا فارسی ادب کے تعلق سے دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ تنقید شعر العجم ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شعر العجم نہایت درجہ مشہور اور مستند اول کتاب ہے چنانچہ اس کے متعدد ایڈیشن اس کی قبولیت کی سند ہیں اور بعض خصوصیات کے اعتبار سے اردو میں یہ منفرد کتاب ہے، لیکن تاریخی اسقام بھی اس میں بکثرت موجود ہیں چنانچہ شیرانی صاحب نے اس لحاظ سے اس پر بھرپور تنقید کی ہے۔ ان کی یہ تنقید شعر العجم کی پہلی دو جلدوں تک محدود ہے۔ تیسری جلد ہندوستانی فارسی ادب پر ہے اور چوتھی اور پانچویں شاعری کے محرکات، فارسی شاعری کے مابہ الامتیازات، اس کا تاریخی و تہذیبی تجزیہ، فارسی شاعری کے اقسام کا تاریخی و تنقیدی جائزہ وغیرہ جیسے اہم موضوعات کو حاوی ہیں اور یقیناً ان موضوعات پر جیسی سیر حاصل بحث شعر العجم میں کی گئی ہے، کسی اردو یا فارسی تصنیف میں نہیں ملتی۔ شیرانی صاحب نے بھی اس کتاب کی امتیازی حیثیت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے شعر العجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اُردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعر العجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے۔ ملک نے بھی اس کی قدر کرنے میں حوصلے سے کام لیا چنانچہ اس وقت تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔"

تنقید شعر العجم میں پروفیسر شیرانی کا فن تحقیق اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ موصوف کی غیر معمولی کامیابی کا سب سے بڑا راز ان کی تاریخ فارسی ادب میں گہری بصیرت میں مضمر ہے۔ وہ علم زبان کے ماہر اور فارسی زبان کے ارتقا سے کما حقہٗ واقف تھے۔ ہر دور کی زبان کے خصائص پر ان کی گہری نظر نے ان کے اندر یہ غیر معمولی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ شاعر یا ادیب کے کلام سے وہ اس کے عہد کا تعین کر سکتے تھے بلکہ جیسا کہ شاہنامے کے متعلق میری گفتگو سے واضح ہو گیا ہو گا کہ وہ ایک ہی شاعر کے ابتدائی اور آخری کلام میں زبان کے ارتقا کی جھلکیاں دکھا سکتے تھے۔ تنقید شعر العجم میں ان کے انداز تحقیق کا یہ جوہر پوری طرح نمایاں ہے اسی بنا پر داخلی شہادت یا خود شاعر کے کلام سے ثبوت کی فراہمی کے اعتبار سے فارسی کے تمام محققین میں وہ سب سے زیادہ ممتاز ہیں اور اگرچہ زبان شناسی کا ملکہ ایرانی محقق کا خاصہ ہونا چاہیئے لیکن اس لحاظ سے کوئی ایرانی ان کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکا ہے۔

تنقید شعر العجم کا مقصد مولانا شبلی کی علمی فضیلت کی منقصت نہ تھی بلکہ یہ اس روش کے خلاف احتجاج تھی، جس میں تحقیق پر تقلید اور عقل کی جگہ نقل کو ترجیح دی جاتی تھی۔

تنقید شعر العجم کے تمام مباحث پر سیر حاصل تبصرہ ایک مقالے کی سمائی سے باہر ہے اسی بنا پر اس کے چند منتخب مباحث تک میری گفتگو محدود رہے گی۔

رودکی و قطران

رودکی کی شاعری پر بحث کے دوران شعر العجم میں رودکی کے نام سے قطران کے کچھ

اشعار درج ہو گئے۔ کچھ اشعار تو رودکی کے ہیں لیکن زیادہ منظومات قطران کے ہیں۔ اس غلط مبحث کی بنا پر رودکی کی شاعرانہ شخصیت جو اُبھرتی ہے، اس میں قطران کا عکس زیادہ نمایاں ہیں۔

دراصل دیوان رودکی کے نام سے ایک دیوان متعدد قلمی نسخوں کی شکل میں مختلف کتابخانوں میں پایا جاتا تھا جس میں کچھ رودکی کے اور بقیہ قطران تبریزی کے منظومات شامل تھے۔ یہی دیوان ۱۳۱۵/۲۷-۱۹۲۶ء میں تہران میں رودکی کے نام سے شائع بھی ہو چکا تھا۔ لیکن ایران میں طبع ہونے سے قبل ہی اس جعلی دیوان کی قلعی کھل گئی۔ چنانچہ ۱۰، ۱۳۰۹ شمسی میں پروفیسر نفلیسی نے اپنی کتاب اشعار رودکی میں اس دیوان پر سیر حاصل بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سر ڈینیسن راس کا خیال کہ اس دیوان کی نسبت رودکی کی طرف غلط ہے، اس لئے کہ اس کے سارے اشعار رودکی کے نہیں، کاملاً درست ہے۔

سر ڈینیسن راس کا یہ مضمون رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کے اکتوبر ۱۹۲۴ء کے شمارے میں (ص ۶۰۹ - ۶۴۴) شائع ہوا۔ اس کا عنوان یہ تھا۔ RUDAKI AND PSEUDO RUDAKI — اس میں بڑی شرح و بسط سے رودکی کی طرف منسوب اس جعلی دیوان کا پردہ چاک کیا ہے۔

دراصل مولانا شبلی کے پیش نظر رودکی کا یہی جعلی دیوان تھا اس وقت تک نہ ڈینیسن راس کی تنقید سامنے آئی تھی اور نہ پروفیسر نفلیسی کی تحقیق۔ موصوف سے یہ توقع کہ وہ جعلی دیوان میں رودکی کا کلام قطران سے الگ کر سکیں گے عبث تھی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اوّل وہ اس کے مرد میدان نہ تھے دوم ان کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متداول دیوان کی بنا پر شاعر کے کلام کا تجزیہ کرنا ہے (عام اس بات سے کہ اس میں رطب و یابس کس قدر ہے اس لئے کہ فارسی کا شاید ہی ایسا کوئی شاعر ہو جس کا کلام الحاق اور تبدیل و تبدل کے نقص سے پاک ہو)۔ اگر وہ الحاق کی عمومیت کا عذر ہی پیش کر دیتے تو ان کے لئے کافی تھا۔ بہرحال اس کی ذمّہ داری ان کے سر ہے اور وہ

اس سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

جعلی دیوان کے سلسلے میں نفیسی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ جعل ہندوستان میں ہوا۔ ان کے اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ جن کتابوں میں قطران کے اشعار رودکی کے نام درج ہوئے ہیں، ان میں سے اکثر ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اور گیارہویں صدی کے بعد، مگر میرے نزدیک یہ دلیل اتنی محکم نہیں کہ جس کو بعینہٖ تسلیم کرلیا جائے۔

رودکی کے اس جعلی دیوان کے بارے میں ڈینیسین راس اور نفیسی وغیرہ سے بہت پہلے پروفیسر شیرانی واضح طور پر اپنا خیال پیش کر چکے تھے۔ اگرچہ بعض تذکروں میں اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ ممکن ہے شیرانی صاحب کی توجہ ان کتابوں کے مطالعے سے اس طرف منعطف[1] ہوئی ہو، لیکن شیرانی صاحب کی طبّاعی سے اس قیاس کی بالکلیہ نفی بھی نہیں کی جا سکتی کہ ان کے ذہن میں یہ نکتہ دونوں شاعروں کے اختلاف زبان و بیان سے پیدا ہوا ہو۔ بہر حال صورت جو بھی ہو دورِ جدید میں مشرق و مغرب کے تمام محققین میں سب سے پہلے پروفیسر شیرانی نے رودکی کی طرف قطران کے منظومات کے انتساب کا مسئلہ چھیڑا اور کامیابی کے ساتھ اس کا حل پیش کیا۔ ان کے بعد ڈینیسین راس نے صراحتہً دیوان رودکی کے جعل پر ایک لمبی بحث کی۔ اس کے کئی سال بعد نفیسی کی تحقیقات سامنے آئی اور اب یہ طے ہو چکا ہے کہ متداول دیوان کا رودکی کی طرف انتساب غلط ہے۔ شیرانی صاحب نے اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"یہ دیوان رودکی، رودکی سے کوئی تعلّق نہیں رکھتا، اگرچہ ایک قصیدہ

---

[1] شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ شبلی اپنے اجتہاد پر بھروسا کر کے اس فاحش غلطی کے مرتکب ہوئے۔ اگرچہ آزاد نے سخن دان فارسی میں اور دیباچہ نگار نے دیباچۂ دیوان میں کافی ہوشیار کر دیا تھا۔ آزاد گو تحقیق کے میدان کا مرد نہ ہو، یہاں اس نے گپ نہیں ہانکی تھی۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ شبہ تو ان کے ذہن میں پیدا ہو گیا جس کو ان بیانات نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

اور بعض قطعات رودکی کے بھی اس میں شامل ہیں اس کا نام اگر دیوان
قطران تبریزی ہوتا تو موزوں تھا۔" (ص ۲۸-۲۹)

شعرالعجم میں شامل سارے اشعار کے ماخذ پر بحث کرنے کے بعد شیرانی صاحب نے رودکی کے "پہلا صاحب دیوان" ہونے پر بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رودکی کے زمانے تک فارسی شاعری ترقی کے کافی منازل طے کر چکی تھی، اس میں عمومیت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ شعراء کافی تعداد میں موجود تھے، تمام اصناف سخن متعین ہو چکے تھے۔ رودکی کے عہد تک ایسے شعراء مل جاتے ہیں جنھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اصناف سخن کے علاوہ عروض فارسی ایک جداگانہ حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ رودکی اور اس سے قبل بھی متعدد شعراء مختلف تصانیف کے مالک ہو چکے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں صاحب تصنیف ہونا معمولی بات نہ تھی۔ اسدی طوسی جب لغت فرس لکھ رہا تھا تو اس کے سامنے متعدد شعراء کے دواوین تھے غرض رودکی کے سب سے پہلے صاحب دیوان ہونے کی روایت خواہ مشتبہ ہو یا نہ ہو، یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس دور میں صاحب دیوان ہونا کوئی عجوبہ نہ تھا۔

اس کے بعد پروفیسر شیرانی نے رودکی کی بڑائی اور دائمی شہرت کے اسباب بتائے ہیں پھر شاعری اور زبان فارسی پر اس کے احسانات کا تجزیہ کیا ہے جس سے ان کی ناقدانہ صلاحیت کا بخوبی حال معلوم ہوتا ہے۔ ہم لوگ عام طور پر شیرانی صاحب کو محض محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ان کی کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد بھی تھے چنانچہ تنقید شعرالعجم میں جابجا انھوں نے شاعروں کے کلام پر بڑے دلچسپ انداز میں اور نئے زاویۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں انوری اور نظامی کے کلام پر ان کا تبصرہ ان کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے۔

رودکی کے اصل کلام کے بارے میں شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ اصلی نمونے وہی ہیں جو لغات اسدی، تاریخ بیہقی، لباب الالباب، المعجم فی معائیر اشعار العجم، معیار الاشعار، حدائق السحر، فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشدی میں ملتے ہیں: تذکروں

میں جو اشعار اس کے نام سے درج ہیں وہ رودکی سے کم تعلق رکھتے ہیں۔

رودکی کے کلام کے منابع کی ایک جامع فہرست سعید نفیسی کی کتاب "احوال و اشعار رودکی" میں ملتی ہے۔ اس کے مقابلے سے اوپر کی فہرست میں اور ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ سیستان (تالیف بعد ۴۴۵ھ) کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، جس میں رودکی کا ایک طویل قصیدہ، نونیہ، جو ۹۴ ابیات پر مشتمل ہے، نقل ہے یہ قصیدہ ایک تاریخی واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ امیر نصر بن احمد نے ایک بار سیستان کے حاکم امیر ابوجعفر احمد بن محمد بن خلف بن لیث کو بڑے انعام سے اس کی غیبت میں نوازا اور تکریم و تشریف کے سارے لوازم سیستان روانہ کئے گئے۔ اس موقع پر رودکی نے قصیدہ لکھا تھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

مادرمی را بکرد باید قربان بچۂ او گرفت و کرد بزندان

خود شیرانی صاحب نے اس قصیدے کا ذکر تاریخ سیستان کے حوالے سے کیا ہے

ضمناً یہ بات عرض کی جاتی ہے کہ فرہنگ جہانگیری و فرہنگ رشیدی دونوں میں بعض اشعار کا غلط انتساب ملتا ہے۔ نفیسی صاحب کا یہاں تک خیال ہے کہ منجملہ چند اور کتابوں کے یہ دو فرہنگیں رودکی کے اشعار میں الحاق اور اس کی طرف غلط انتساب کا موجب ہوئیں۔ بہرحال رودکی کے اصلی کلام کے دو اہم ماخذ فرہنگ قواس اور فرہنگ شرف نامۂ منیری ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر راقم کے اعتنار سے ۱۹۷۵ء میں تہران سے شائع ہو گیا ہے۔

اسعدی خرد و بزرگ

دو اسدیوں کا نظریہ دولت شاہ سمرقندی کے غلط بیان کی وجہ سے وجود میں آیا چنانچہ ایتھے اور براؤن وغیرہ یورپی نقادوں نے اس پر اعتماد کر کے اس نظریے کو کافی آگے بڑھایا یہ نظریہ عرصے تک قابل قبول رہا۔ مستشرقین میں سب سے پہلے پروفیسر چائکین نے ایشیاٹک سوسائٹی جرنل بابت ۱۹۳۵ء میں ایک مضمون شائع کیا اور مضبوط

دلائل سے اس نظریے کی تردید کی ۔ ایرانی نقادوں میں پروفیسر فروزانفر نے اپنی کتاب سخن اور سخنوران میں اور ذبیح اللہ صفا نے تاریخ ادبیات در ایران میں اس خیال کو بے بنیاد قرار دیا ۔ پروفیسر نفیسی ۱۳۱۰ شمسی میں احوال و اشعار رودکی ج ۲ میں اس نظریے کے قائل معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن ۱۳۱۹ میں جب تیسری جلد شائع ہوئی تو اس میں اس خیال کو غلط بتایا ۔ شیرانی صاحب اگرچہ اس نظریے کے قائل تھے لیکن ان کا شک وشبہ رفع نہیں ہوا تھا ۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ۔

"یورپین تحقیقات مظہر ہے کہ دو اسدی گزرے ہیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ہیں اور اسدی تخلص دونوں میں عام ہے اسدی کلان کا نام ابونصر احمد بن منصور طوسی ہے جو صاحب مناظرہ ہے ۔ دوسرا اسدی خرد، اس کا فرزند، جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور گرشاسپ نامہ اور لغت فرس کا مصنف ہے ۔ یہ بیان مجھ کو بظاہر عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے ۔ باپ اور بیٹے میں تخلص کا اشتراک نہایت غیر معمولی ہے لیکن دو زبردست مغربی مستشرق، ڈاکٹر ایتھے اور پروفیسر براؤن اس کے راوی ہیں اس نظریے کی تصدیق نظامی گنجوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے ۔ محمود کے دربار سے فردوسی کی ناکامی کے اسباب پر غور کرتے ہوئے موصوف اتفاقیہ اسدی کا بھی ذکر کر دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :

در سخا و سخن چہ می پیچم ۔۔۔ کار بر طالع است من ہیچم

نسبت عقربی است با توسی ۔۔۔ بخل محمود و بذل فردوسی

اسدی را کہ جود داو بنواخت ۔۔۔ طالع و طالعی بہم در ساخت

یہاں محمود کے تعلق میں اسدی کلاں مانا جا سکتا ہے نہ اسدی خرد ۔ اسی لئے یہ مغربی نظریہ قابل تسلیم ہے ۔

شیرانی کو دو اسدی کے نظریے پر بنیادی طور پر شک تھا لیکن دو باتوں کی

وجہ سے وہ اس کے قائل ہو گئے تھے۔ اوّل یورپی محققین کی تحقیق کا نتیجہ، دوم نظامی کا شعر۔ لیکن نظامی کی بیت میں "جو داد" کی جگہ "بودلف" ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسدی والی بیت کا تعلق محمود والی بیت سے نہیں ہے۔ اس بنا پر اسدی کو محمود سے منسوب نہیں قرار دینا چاہیئے۔ اور یہ بات تو عام ہے کہ اسدی، ابودلف ارانی کا مدّاح تھا۔ چنانچہ اس کی مدح گرشاسپ نامے میں موجود ہے۔ رہا یورپی محققین کی تحقیق کی مخالفت، تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، خود شیرانی صاحب انھیں محققین کی روایت جو مثنوی یوسف زلیخا کے انتساب فردوسی سے متعلق ہے، باطل قرار دے چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دو اسدی کے نظریے میں شیرانی صاحب سے چوک ہو گئی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، یہ چوک ایسی نہیں جو بے بنیاد ہو۔

بہرحال جدید نظریہ یہی ہے کہ اسدی ایک ہی ہے اس کا تعلق فردوسی سے استاد شاگرد کا نہ تھا، وہی قصائد مناظرہ کا مصنف ہے، اسی نے گرشاسپ نامہ لکھا اور اسی کے قلم سے لغت فرس نکلا، جو فارسی کا سب سے پہلا مکشوف لغت ہے۔ اسی اسدی کے قلم کی یادگار دنیا میں محفوظ مفردات طب کی پہلی فارسی کتاب "الابنیہ عن حقائق الادویہ" ہے۔ اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب طرز خطاط ہے یہ کتاب ۱۸۵۹ میں جرمن مستشرق زیگمان کی توجہ سے نہایت دقیق انداز میں چھپ گئی تھی۔ حال میں تہران سے اس کا عکسی متن (بعض حصے کا) ۱۳۴۴ شمسی میں اور انتقادی متن ۱۳۴۶ میں شائع ہوا۔ یہ اطلاع بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ابوالہیجا اردشیر بن دیلم سپار النجمی القطبی شاعر، جس کی تشویق پر لغت فرس[1] لکھا گیا تھا اس کی ۷۰۵ھ کی کتابت کا نسخہ ترجمان البلاغہ ترکی میں مکشوف ہوا۔ اس سے اس نظریے کا ابطال ہوا کہ یہ کتاب فرخی سیستانی کی ہے۔ اس کا مصنّف دراصل محمد بن عمر ارادویانی ہے اس کتاب کا ایک دقیق انتقادی اور عکسی ایڈیشن پروفیسر احمد آتش کے اعتنا سے ۱۹۴۹ء

---

[1] پس فرزندم حکیم جلیل اوحد اردشیر بن دیلم سپار النجمی الشاعر دام اللہ عز، از من کہ ابومنصور علی بن احمد الاسدی الطوسی ہستم لغت نامۂ خواست۔" (چاپ عباس اقبال، ص ۱-۲)

میں شائع ہو چکا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردشیر بن دیلم سپار النجمی کا خط ہو بہو اسدی کے خط کی نقل ہے۔ کتاب الابنیہ کے سنِ کتابت ۴۵۰ھ سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اسدی کا یہ دوست اسدی سے عمر میں کافی چھوٹا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بہت طویل عمر پائی۔ اور اگر یہ بات نہ ہو تو اسدی کی تاریخ وفات پر نظر ثانی کی گنجائش نکلتی ہے۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ آخر الذکر نے کم عمر پائی۔ بہر حال ترجمان البلاغہ کا یہ اہم نسخہ اسدی کے حالات کی ترتیب میں اثر انداز ہو سکتا ہے۔

سنائی کی وفات

اگرچہ اس سلسلے میں شیرانی صاحب نے کوئی نظریہ پیش نہیں کیا ہے، بلکہ مرزا محمد قزوینی کی روایت نقل کر دی ہے کہ ۵۴۵ھ کو سنائی کی وفات کی تاریخ سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ ان کا ۵۴۲ کے بعد تک زندہ رہنا ان کے قطعے سے ثابت ہے جو معزی کی وفات (۵۴۲ھ) پر لکھا تھا۔ اس سلسلے میں اتنا عرض کرنا ہے کہ بعد میں قزوینی صاحب نے اپنی رائے بدل دی تھی جیسا کہ محمد معین کے تعلیقات چہار مقالہ سے واضح ہے اور ان کی رائے کی تبدیلی پروفیسر عباس اقبال کے اس بیان سے ہوئی جس میں انھوں نے معزی کی تاریخ وفات ۵۱۸ اور ۵۲۱ کے درمیان قیاس کی تھی۔ بہر حال جدید محققین کے درمیان سنائی کی تاریخ وفات کے بارے میں اتنا شدید اختلاف ہے کہ اگر وہ سارے کے سارے جمع کر دیئے جائیں تو ایک اچھا خاصہ رسالہ ہو جائے۔ بعضوں کے نزدیک ان کی وفات ۵۱۸ اور ۵۲۱ کے درمیان ہوئی۔ بعض نے ۵۲۵ اور کچھ لوگوں نے ۵۲۹، ۵۳۵ اور ۵۴۵ لکھی ہے۔ پہلی تاریخ تو یکسر غلط ہے۔ اس لئے کہ حدیقہ کی تصنیف بالاتفاق رائے ۵۲۵ ہجری کے بعد ہوئی، نیز ابو الفضل میبدی جب ۵۲۰ میں تفسیر کشف الاسرار کی پہلی جلد لکھ رہا تھا تو سنائی زندہ تھے اور دسویں جلد[1] میں وہ

---

[1] اس سلسلے میں راقم کا مقالہ: حکیم سنائی کی مقبولیت، مجلہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، ج ۱۲، دیکھنا چاہیئے۔

زندہ بتائے گئے ہیں مگر آخری جلد کی تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن کم از کم چار پانچ سال تو ان کی ترتیب میں لگے ہی ہوں گے۔ اس اعتبار سے سنائی کی تاریخ وفات ۵۲۵ بھی مشتبہ ہو جاتی ہے اکتوبر ۱۹۷۷ء میں کابل میں حکیم سنائی کے سیمینار میں دو مقالے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں پیش ہوئے۔ ایک پروفیسر اوبو تاس (سویڈن) کا تھا جنھوں نے سنائی کی طرف منسوب طریق التحقیق کا ایک نہایت عالمانہ انتقادی متن ۱۹۷۳ میں چھاپا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سنائی کی طرف اس کا انتساب غلط ہے۔ سنائی کی وفات کے سلسلے میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی وفات کی تاریخ ۱۱ شعبان ۵۲۹ ہے جیسا کہ کابل کے قدیمی نسخۂ اشعار کلیات میں درج ہے۔ دوسرا مضمون پروفیسر عبدالحی حبیبی کا ہے۔ اس میں انھوں نے ۵۴۵ھ سنائی کے فوت کی تاریخ بتائی ہے۔ ان کا مضمون شہادت کلام پر مبنی ہے۔ میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ پروفیسر شیرانی کی تحقیق کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے داخلی شہادت پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ثبوت شہادت کلام سے پیش ہوتا ہے وہ قطعی ہوتا ہے خارجی شہادتیں اضافی ہوتی ہیں۔ ان کی حیثیت اکثر CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE سے آگے نہیں بڑھتی لیکن پروفیسر حبیبی صاحب نے سنائی کے کلام سے جو شہادتیں پیش کی ہیں، وہ اس طرح کی ہیں کہ ان میں قیاس کا بڑا دخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہرحال ان کو اپنے نظریے کی تائید کرنا ہے۔ سنائی نے بعض قطعات میں اپنے زمانے کے محترم اشخاص کا ذکر کیا ہے لیکن اکثر ایسے قطعات معمائی شکل کے ہیں۔ ان کی توضیح اس سلسلے کے متعدد علوم میں بصیرت کی متقاضی ہے، پھر بھی ان کے حل سے ہر شخص مطمئن نہیں ہوگا۔ اس کو یہی نظر آئے گا۔ کہ لکھنے والا خواہی نخواہی اشعار کی وضاحت اور تشریح اپنے مقصد کے موافق کر رہا ہے۔ حبیبی صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ سنائی ۵۴۵ھ تک زندہ رہے جیسا کہ حسب ذیل قطعہ میں ہے۔

اعتقاد محمد بہر وز — کرد روزیش از جہاں آگاہ

چوں بہ از زر و عمر ہیچ ندید — زر بدرویش داد و عمر بشاہ

"درویش" اور "شاہ" اصول مقدمہ ہے۔ اس سے ۵۲۰ + ۳۰۶ = ۸۲۶ نکلتے ہیں اس میں سے عمر کے اعداد = ۳۱۰ ایک عمل تکمیلی کے طور پر منہا کریں تو ۵۱۶ باقی رہتے ہیں اس میں

سے کلمۂ "آگاہ" کے اعداد یعنی ۲۸ جمع کرنے سے ۵۴۴ حاصل ہوتا ہے یہی تاریخ وفات قرار پاتی ہے۔

غرض حبیبی صاحب کے نہایت مفصّل مضمون سے اس شبہے کا ازالہ نہیں ہو سکا کیونکہ اپنے مقصد کی توثیق کے لئے وہ دور از کار توجیہات سے کام لے رہے ہیں۔

ادھر ایک فارسی مجموعے کا قدیم خطی نسخہ راقم کے مطالعے سے گزرا۔ اس میں حسب ذیل دو کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ بستان العارفین ۲۔ منتخب رونق المجالس

مجموعے کے آخر میں سنائی کے دو خط ہیں جو مکاتیب سنائی مرتبۂ راقم الحروف میں نامۂ چہارم و پنجم ہیں۔ یہ نسخہ توبینگن TUBENGEN یونیورسٹی کے کتب خانے میں MSORII NTFOG 99 کے ذیل مندرج ہے۔ اس میں کل ۲۷۶ ورق ہیں۔ سنائی کے خطوط ورق ۲۷۲ س ہ سے شروع ہو کر ورق ۲۷۵ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ مجموعے کا یہ نسخہ ڈاکٹر احمد علی رجائی کی تصحیح کے بعد بحذف مکتوبات سنائی دانش گاہ تہران نے چھاپ دیا ہے۔ اس مجموعے کی کتابت کی تاریخ ذیل کے کتبے میں موجود ہے۔

"و ینتخب فی اخیر ربیع الاوّل من سنۃ ثلث و اربعین و خمس مائۃ کتبہ یحییٰ بن عمر بن خطیب المجر مخورانی و حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔"

اس میں حکیم سنائی کا نام "رحمۃ اللہ علیہ" کے دعائیہ فقرے سے یاد ہوا۔ مثلاً "نامۂ سنا ر رحمۃ اللہ علیہ"۔ اس سے واضح ہے کہ ۵۴۳ھ میں سنائی فوت ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں یہ ایک قوی دلیل ہے اور جب تک اس سے قوی تر دلیل سامنے نہ آجائے یہی سمجھنا چاہئیے کہ حکیم ۵۴۲ ہجری سے کچھ قبل فوت ہو چکے تھے۔ راقم حروف نے اس سلسلے میں ایک مقالہ الگ سے لکھا ہے۔ مرزا محمد قزوینی، پروفیسر عبدالحی حبیبی اور دوسرے نقاد جو سنائی کو ۵۴۴ میں بقید حیات قیاس کرتے ہیں، ان کے قیاس محل نظر ہیں۔

دیوان انوری میں الحاق

پروفیسر شیرانی کا نہایت شاندار تحقیقی کارنامہ دیوان انوری کی رو سے التمش کے

ر کے ایک شاعر تاج ریزہ دہلوی کے قصائد کا تعین ہے۔ ان کی تحقیق سے ایک شاعر
مفقود کلام کی بازیافت ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ دو شاعروں کے کلام کے گڈمڈ ہو جانے پر ان
شناخت اور ایک دوسرے سے الگ کرنے کے کیا اصول ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں متنی
قیق کا یہ شاہکار ہے۔ اس لئے کہ دو شاعروں کے ملے جلے منظومات میں بغیر کسی واضح قرائن
سابقے کے دونوں کے کلام کا جدا جدا تعین ایک علمی دریافت کے مترادف ہے۔ اس سلسلے
ں کچھ تفصیل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

شیرانی صاحب کا الحاق کے سلسلے میں یہ بیان ہے:

"کلیات انوری سب سے پہلے تبریز میں ۱۲۶۶ میں چھپا تھا۔ دوسری مرتبہ لکھنؤ
سے ۱۲۹۷ میں نول کشور پریس سے شائع ہوا۔ اسی اشاعت کی دوبارہ تجدید اسی مطبع سے ۱۳۲۶ھ
یں ہوئی۔ منشی نول کشور کی پہلی اشاعت تبریزی نسخے سے منقول ہے اس کے علاوہ اس میں
منشی برج موہن لال خلف بابو بہاری لال متوطن دہلی کے ایک قلمی نسخے سے بھی امداد لی گئی
ہے۔ اس کلیات میں اہل مطبع ایک عجیب غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس میں بعض ایسے قصائد
بھی شامل کر لئے گئے ہیں جو انوری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور نہ انوری کے وطن اور عہد
یں لکھے گئے بلکہ ہندوستان میں۔

یہ قصائد ..... ایک قدیم ہندی شاعر تاج ریزہ کی یادگار ہیں جو بلحاظ زمانہ امیر
خسرو دہلوی سے مقدم ہے۔ اس عہد کے ہندی نژاد شعراء کا سراغ، اگرچہ وہ کافی تعداد میں
موجود تھے، بہت کم ملتا ہے۔ اس لئے میں اس غلطی کا جس نے ہمارے وطن کے ایک قدیم
شاعر کا پتہ دیا ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے خیر مقدم کرتا ہوں۔"

الحاقی قصائد کے مطلعے یہ ہیں۔

۱۔ مژدہ عالم راز عالم آفرین آوردہ اند	در مدح التمش
۲۔ ساقی بیا کہ وقت می لعل روشن است	غیاث الدین محمد شاہ
۳۔ ساقی بیار بادہ کہ نوروز عالم است	رکن الدین فیروز شاہ
۴۔ افزود باز رونق ہر مرغزار گل	غیاث الدین محمد

۵۔ ای راستی کہ در دل لیل و نہار یافت	رکن الدین فیروز شاہ
۶۔ این منم کز دیدہ یاقوت روان آوردہ ام	رکن الدین فیروز شاہ
۷۔ بیدلان را روی تو آئینہ جان آمدہ است	نظام الملک جنیدی
۸۔ صبح خیزانی کہ وصف آن حظ وحذ کردہ اند	نظام الملک جنیدی
۹۔ بدر بار آمدم این جا بفریاد	رکن الدین فیروز شاہ
۱۰۔ ای فخر ہمہ نژاد آدم	رضیۃ الدین

ان میں سے آخر الذکر کے بارے میں حافظ صاحب کو برابر شک رہا۔ اس لیے کروہ ایک نسخے میں شامل ہے جس میں اور الحاقی قصیدے نہیں ہیں۔ مدرس رضوی نے قدیم نسخوں کی بنیاد پر جو دیوان مرتب کیا ہے اور جس میں فہرست بالا میں سے پہلے نو قصیدے شامل نہیں، اس میں بھی یہ آخری قصیدہ رضیۃ الدین مریم کی مدح میں چھ قصیدے یعنی نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۹، ۱۰ شامل ہیں۔ گویا ان کے نزدیک یہ انوری کے اصلی منظومات ہیں۔ چار قصیدے نمبر ۱، ۶، ۷، ۸ الحاقی سمجھ کر خارج کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور قصیدہ:

بہین وقت سخن گفتن لب شیریں دندانش

الحاقی قرار دیا گیا ہے اور دیوان مرتبہ نفیسی میں شامل نہیں۔ ان قصائد کے الحاق کے بارے میں نفیسی صاحب کے بیان کا ترجمہ یہ ہے:

"دیوان انوری کا کامل نسخہ جو قصائد انوری کے نام سے ۶۹، صفحوں میں نول کشور لکھنؤ کے مطبع میں مارچ ۱۸۸۹ء مطابق رجب ۱۳۰۶ھ میں چھپا ہے، کسی مکمل نسخے کی رو سے اس کی طباعت عمل میں آئی ہے لیکن گاہ گاہ ایسے اشعار جو انوری کے نہیں بلکہ سید سراج الدین سگزی شاعر۔ قرن ہفتم مقیم ہندوستان کے ہیں نادانستہ طور پر انوری کے کلام میں داخل کر لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انوری اور سید سراج الدین کے دیوان کے نسخے ایک دوسرے سے پیوستہ تھے۔ ان کی تشخیص نہ ہو سکنے کی بنا پر سید کے اشعار کو انوری کے اشعار میں شامل کر لیا گیا ہے۔"

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان پانچ قصیدوں میں سے کوئی بھی قصیدہ جن کو نفیسی

صاحب نے سراج الدین سگزی کا کلام قرار دے کر انوری کے دیوان سے خارج کر دیا ہے۔
سراج الدین کا نہیں اس لیے کہ وہ پانچوں کے پانچوں دیوان سراج الدین کے دونوں معلوم نسخوں سے خارج ہیں اور یہ بات حیرت سے سنی جائے گی کہ دیوان سراج الدین سگزی کے دیوان کا ضخیم اور معتبر نسخہ خود نفیسی صاحب کے ذاتی کتاب خانے میں تھا (جو بعد میں تہران یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا) اس میں انوری کی طرف ان پانچوں منسوب قصیدوں میں سے کوئی بھی شامل نہیں۔ نفیسی صاحب کے اس سہو کو اس کے سوا کسی اور چیز پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اپنے حافظے پر بھروسہ کر کے یہ بات کہی اور ظاہر ہے کہ حافظہ ہر وقت ساتھ نہیں دیتا۔ راقم نے دیوان سراجی کا جو دیوان ۱۹۷۲ء میں چھاپا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں ان قصائد کے داخل ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اس لئے کہ وہ اس کے قلمی نسخے میں موجود نہ تھے۔

البتہ یہ بات یقینی ہے کہ پانچوں قصیدوں میں سے چار قطعاً الحاقی ہیں۔ ان میں ایک سلطان التمش، ایک التمش کے بیٹے سلطان رکن الدین فیروز شاہ اور دو سلطان التمش کے وزیر نظام الملک محمد جنیدی کی مدح میں ہیں۔ البتہ پانچواں قصیدہ رضی الدین صدر کی مدح میں ہے۔ اس نام کا ایک صدر انوری کا ممدوح تھا۔ چنانچہ ایک اور قصیدہ اس کی مدح میں دیوان انوری میں موجود ہے۔ غرض اس پانچویں قصیدے کے الحاق کے بارے میں کوئی قوی قرینہ ہمارے پاس موجود نہیں۔

اب رہے بقیہ چھ قصیدے جو بقول پروفیسر شیرانی و آغا عبدالستار وغیرہ کے الحاقی اور بقول نفیسی خود انوری کے ہیں۔ ان کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ان میں دو قصیدے یعنی ساقی بیا الخ اور ساقی بیار بادہ الخ کی دو بیتیں فرہنگ فخر قواس میں تاج ریزہ کے ذیل میں درج ہیں۔ یہ فرہنگ ۶۹۵ کے کچھ ہی بعد ہندوستان میں لکھی گئی ہے۔ اس بنا پر یہ ایک قدیم اہم شہادت ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں قصیدے انوری کے نہیں ہیں بلکہ ہندوستانی شاعر تاج ریزہ کے ہیں۔ قصیدہ شمارہ ۵ : ای راستی کہ در دل لیل و نہار یافت، رکن الدین فیروز شاہ کی مدح میں ہے اور تقی کاشی کے تذکرہ خلاصۃ الاشعار

ہیں تاج ریزہ کے نام سے درج ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

قصیدہ لامیہ۔ افزود باز رونق ہر مرغزار گل، التمش کے بیٹے غیاث الدین محمد کی مدح میں ہے اور تاج ریزہ کے نام سے اس کے کچھ اشعار عرفات العاشقین اور مجمع الفصحا میں نقل ہیں۔

نواں قصیدہ۔ بفر یاد آمد این جا الخ، رکن الدین فیروز شاہ کے نام ہے۔ اس بنا پر بلاشبہ الحاقی ہے۔ لیکن اس کے اشعار کسی اور جگہ میری نظر سے نہیں گزرے۔ البتہ رضیۃ الدین کے نام کا جو قصیدہ فہرست بالا میں (قصیدہ نمبر ۱۰) درج ہے، اس کے بارے میں کوئی مختتم بات اس لئے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ انوری کے دیوان کے ایسے نسخوں میں شامل ہے۔ جن میں دوسرے الحاقی قصیدے نہیں ہیں۔

آغا عبدالستار نے انوری کے حسب ذیل قصیدہ کے بارے میں لکھا ہے کہ شاید یہ الحاقی ہو اس لیے کہ اس زمین کی ایک بیت فرہنگ فخر قواس میں تاج ریزہ کے نام سے درج[1] ہے۔

در دین چو اعتصام بحبل المتین کنند آن بہ کہ مطلع سخن از رکن دین کنند

یہ قصیدہ دیوان انوری کے معتبر نسخوں میں انوری ہی کے نام سے ہے اور رکن الدین مفتی کی مدح میں ہے۔ مفتئ مذکور کا تاج الدین عم زاد سے اختلاف ہو گیا تھا اور آخرالذکر کی متعدد ہجویں انوری کے دیوان میں موجود ہیں۔ اس بنا پر انوری سے اس قصیدے کی نسبت قوی ہو جاتی ہے۔ مزید یہ بھی معلوم ہے کہ قواس میں مذکور بیت اس قصیدے میں شامل نہیں۔

ایک اور قصیدہ جو ممکن ہے دیوان انوری میں الحاقی ہو، اس طرح شروع ہوتا ہے

عید بر بدر دین مبارکباد سن قرآن آفتاب دانش درداد

---

[1] تاج ریزہ کے نام سے "ہپیس"، بمعنی زہر کی سند میں منقولہ بیت یہ ہے۔

معلوم رای تست کہ جانی برای من پیوستہ ہپیس بقیہ در انگبین کنند (ص ۳۹)

آنکه شغل نظام عالم را | چرخ از عدل او نهد بنیاد
وانکه قصر خراب دولت را | دهر از دست او کند آباد
برق تیغش چو برق روشن د تیز | ابر جودش چو ابر معطی و راد

بدرالدین سنقر نام کا ایک امیر سلطان التتمش، رضیہ اور معزالدین بہرام کے زمانے میں گذرا ہے۔ اس کا تذکرہ طبقات ناصری میں الگ ذیلی عنوان کے تحت ہوا ہے۔ وہ رومی الاصل تھا، التتمش نے اسے خریدا اور ایک چھوٹی خدمت پر مامور کیا رفتہ رفتہ وہ ترقی کرکے نائب امیر حاجب اور پھر نائب امیر آخور ہوا۔ مولانا منہاج سراج کے ساتھ خصوصی توجہ رکھتا تھا۔ رضیہ کے عہد میں بداؤں کا اقطاع دار مقرر ہوا۔ ۶۳۸ھ میں سلطان معزالدین بہرام کے زمانے میں امیر حاجب ہوا مگر وزیر مہذب الدین سے اختلاف ہو جانے پر اس کو بداؤں جانا پڑا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ دہلی آیا، یہاں قید کرلیا گیا اور اسی سال ۱۴ ربیع الاول کو شہید کر دیا گیا۔

اسی بنا پر قوی امکان ہے کہ قصیدہ اسی بدرالدین سنقر کے نام پر ہو جو نائب امیر حاجب کے عہدہ پر فائز رہ چکا تھا۔ اگر یہ قصیدہ انوری کے دیوان میں الحاقی تصور کیا جائے تو اس کو بہ آسانی تاج ریزہ کا کلام سمجھا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس میں خاصہ کلام تاج ریزہ کا شامل ہو گیا ہے۔ ثانیاً بدرالدین سنقر تاج ریزہ کا معاصر تھا لیکن انوری کے ممدوحین میں ایک شخص کا نام بدرالدین الغ جاندار بیگ اینا بج سنقر ملتا ہے۔ اس کے نام دو قطعے ہیں ایک کے عنوان میں تو پورا نام یوں ہی درج ہے لیکن شعر میں بدرالدین غائب ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

خداوندا تو آنی کا فرینش | بکلی ہست چون دریا و تو دُر
جہاں را پہلوان چون تو بنا شد | زہ ای از تو جہان را صد تفاخر
نیارد بیشۂ دولت چو تو شیر | نزاید مادر گیتی چو تو حُر
فلک با اختران گفتا کہ آن کیست | کہ ہست از لشکرش خیلی ظفر پر
رکاب او بوسیدند و گفتند | الغ جاندار بیگ اینا بج سنقر

دونوں قطعے (جن میں سے ایک میں پورا نام بحذف بدرالدین آیا ہے) اور وہ قصیدہ جس میں بدرالدّین سنقر نام درج ہے، دیوان انوری مطبوعہ مدرّس رضوی میں مندرج ہیں۔ یہ دیوان قدیم قلمی نسخوں کی بنیاد پر طبع ہوا اور واضح طور پر جوالحاقی قصیدے دیوان انوری طبع نول کشور و طبع سعید نفیسی میں شامل ہیں، ان سے یہ خالی ہے۔ مدرس رضوی نے مقدمے میں امیر سنقر کی شخصیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ پہلے وہ سنجر کے دور کے بڑے امیر سنقر کے مترادف قیاس کرتے ہوئے عبدالواسع جبلی کا ممدوح بتاتے ہیں جس کے مدحیہ قصیدے کی ایک بیت یہ ہے:

غاصہ امیر سنقر خاص[1] آں ستودہ ای کورانیا فرید بہمت خدای یار

کبھی وہ کہتے ہیں، شاید وہ سنقر ہو جو سلطان سنجر کا مملوک تھا، جس کا ذکر ابن اثیر نے کیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ راحۃ الصدور میں دو سنقر مذکور ہیں۔ مگر وہ مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ آخر میں بدرالدین سنقر رومی کا نام طبقات ناصری کے حوالے سے کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شاید وہی ممدوح انوری ہو۔

لیکن عرض ہے کہ اس آخرالذکر سنقر کی انوری سے مصاحبت ناممکن ہے اس لیے کہ انوری کی وفات ۵۸۱ کے حدود میں ہوئی اور بدرالدین سنقر اپنے زمانۂ عروج میں ۶۳۹ میں قتل ہوا۔ گویا وفات میں ۵۸ سال کا فرق ہے اور معلوم ہے کہ انوری اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ اور سنقر طبعی عمر سے قبل ہی قتل کر دیا گیا۔ دوم یہ کہ سنقر کا تعلّق ہندوستان سے تھا، انوری ہندوستان آیا نہیں اس لیے یہ سنقر اس کا ممدوح نہیں ہوسکتا باقی اور سنقر کے نام مختلف ہیں۔ جبلی کے ممدوح کے نام کا جزء 'خاص' ہے اور وہ دوسری شخصیت معلوم ہوتی ہے۔ سنجر کے زمانے کا مشہور امیر اتابک سنقر ہے، جس کا

---

[1] یہ قصیدہ سلطان سنجر کی مدح میں ہے اور ضمناً اس کے امیر سنقر خاص کا نام آیا ہے۔ (دیوان چاپ صفا، ص ۲۱۲ - ۲۱۴، تاریخ ادبیات، ج ۲، ص ۷۲ - ۷۳) مگر واضحاً اس کا نام سنقر خاص ہے، اس لئے بدرالدین سنقر سے الگ سمجھنا چاہیئے۔

تفصیلی ذکر طبقات ناصری میں موجود ہے۔ غرض مدرس رضوی کی کوشش کہ بدرالدین سنقر اور الغ جاندار بک ایناج سنقر وغیرہ ایک ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس بنا پر بخوبی ممکن ہے کہ قصیدہ مذکورۂ بالا کا ممدوح ہندوستانی دربار کا امیر بدرالدین سنقر اور اس قصیدے کا مصنف تاج ریزہ ہو۔ اس قیاس کے صحیح ہونے کی صورت میں نتیجہ صریح کے طور پر یہ قیاس کرنا ہوگا کہ دیوان انوری کے قدیم نسخوں میں بھی الحاق موجود ہے بہرحال یہ نہایت دقیق مسئلہ زیادہ وقت اور توجہ چاہتا ہے۔

عطار نیشاپوری

شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری کے مختلف حالات زندگی اور شاعری پر تبصرے کے بعد شیرانی صاحب ان کے کلام کے تعین کی طرف مائل ہوئے ہیں اور مختلف منابع سے ان کی طرف منسوب کتابوں کی فہرست تیار کی ہے۔ ان کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں حسب ذیل دس عطار کی ہیں، بقیہ جعلی ہیں۔ اسرار نامہ، الٰہی نامہ، پندنامہ، دیوان، تذکرۃ الاولیاء، خسرو نامہ، شرح القلب، منطق الطیر، مصیبت نامہ، مختار نامہ۔

بقیہ ۲۵ جعلی کتابوں میں سے شیرانی صاحب نے حسب ذیل ۱۴ کتابوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کتابوں کی نسبت عطار کی طرف صحیح نہیں۔

آغاز عشق، اسرار الشہود، اسرار نامہ (اسرار نامہ اصلی سے الگ دوسری بحر میں ہے)، کنز الحقائق، مفتاح الفتوح، وصلت نامہ، منصور نامہ یا حلاج نامہ، بے سر نامہ، خیاط نامہ، کنز الاسرار، وصیت نامہ، مظہر العجائب، چار مذہب، جواہر الذات و ہیلاج نامہ اور ان کے جعلی ہونے کے سلسلے میں انھوں نے تمام تر داخلی شہادت پیش کی ہے جس سے اختلاف کرنے کا موقع ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ ان مباحث میں مظہر العجائب پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

مظہر، عطار کی طرف غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہے لیکن یہ انتساب بعض بڑے بڑے فضلاء کے قلم سے ہوا ہے مثلاً ایران کے مایۂ ناز محقق مرزا محمد، اس کو عطار کی تصنیف مانتے

ہیں حالانکہ وہ اس کتاب میں اور ان کی دوسری کتابوں میں صریح تفاوت محسوس کرتے ہیں جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :

"عطار کی آخری تصانیف میں مظہر العجائب ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں اپنی اکثر کتابوں کا، منجملہ تذکرۃ الاولیاء کے نام لکھا ہے لیکن اس کتاب کے اشعار میں اور عطار کی دوسری تصانیف کے اشعار میں واضح تفاوت ملتا ہے۔ اس کے اشعار اکثر پستی اور سستی کسی قدر رکاکت کے بھی حامل ہیں۔ اور جس شخص نے منطق الطیر، الٰہی نامہ خسرو و گل اور دیوان عطار کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ صاحب مظہر العجائب اور ان کتابوں کا مصنّف ایک ہی ہے۔ بظاہر اس انحطاط کا سبب ان کی طبیعت کا اضمحلال ہے جو بڑھاپے کی بنا پر رونما ہوا تھا۔" (مقدمہ تذکرۃ الاولیا رمرتبہ نکلسن)

لیکن شیرانی صاحب نے اس کے جعل کے سلسلے میں تازہ دلیلیں دی ہیں :

۱۔ اس کی زبان وبیان کو عطار کی دوسری کتابوں سے کوئی مناسبت نہیں۔

۲۔ اس میں تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو عطار جیسے فاضل کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتیں۔ شیخ نوری کو جو جنید کے معاصر تھے، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا بزرگ لکھا ہے۔

۳۔ عطار سنّی تھے لیکن مظہر کا مصنف شیعہ مسلک کا پیرو تھا۔

شیعہ پاک است عطار ای پسر — جنس این شیعہ بجان خود بخر
ما ز فاروق التجا برکندہ ایم — پی ز نورین شما ببریدہ ایم
بو حنیفہ را ز دست بگذار تو — خود بر و اندر پی کرّار تو

اس کے برخلاف ان کی ہر تصنیف میں خلفائے اربعہ کے ساتھ نہایت ارادتمندانہ اعتقاد کا اظہار کیا گیا ہے۔

۴۔ عطار کی کسی تصنیف میں الہام وکرامت کا دعویٰ نہیں ملا۔ یہ کتاب اس طرح کی لغویات سے پر ہے۔

۵۔ صوفیانہ ترک وتجرید وفنا کے بجائے بغض وحسد کے جذبات اس مثنوی میں

موجزن ہیں۔ اس تضاد کی توجیہہ ممکن نہیں۔

۶۔ وہ سو کتابوں کی تصنیف کا مدعی ہے۔ جب کہ عطار کی تصنیف ۱۵۔ ۱۶ سے آگے نہیں بڑھیں۔

۷۔ جوہر الذات کو اپنی آخری تصنیف قرار دیتا ہے۔ یہ غلط ہے، اس لئے کہ معاً اس کے بعد مظہر العجائب لکھتا ہے۔ زبان و انداز کلام کا اختلاف ان دونوں کتابوں کو عطار کی تصنیف قرار دینے میں حائل ہے۔

۸۔ مظہر العجائب میں تومان یا تومن کا ذکر ہے جو چنگیزیوں کے ساتھ ایران میں آیا ہے پہلے فوجی اصطلاح کے معنوں میں مستعمل ہے اور بعد میں مالیات کی اصطلاح بن گیا۔ عطار کے دور میں یہ اصطلاح کہاں ؟ ۔

۹۔ شیخ عطار اپنی تصنیف میں نظامی کا ذکر نہیں کرتے۔ مظہر کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ نظامی نے مجھ سے کسب فیوض کیا۔

۱۰۔ مظہر کا مصنف پیشین گوئی کا مشتاق ہے۔ عطار نیشاپوری کے بیانات پیشین گوئیوں سے خالی ہیں۔

۱۱۔ مولانا رومؔ کی بابت پیشین گوئی صاف پتہ دے رہی ہے کہ مصنف مولانا روم کے بعد کی شخصیت ہے۔

۱۲۔ اپنے اشعار میں شعر حافظ اور شعر قاسم کا ذکر آتا ہے۔ حافظ سے مراد حافظ شیرازی اور قاسم سے قاسم انوار کے علاوہ کوئی مراد نہیں ہو سکتا۔ حافظ کی وفات ۷۹۲ھ میں اور قاسم انوار کی ۸۳۵ یا ۸۳۷ ھ میں ہوئی۔ واضح ہے کہ مظہر کا مصنف اس کے بعد کا ہے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے علامہ محمد قزوینی نے مظہر العجائب کو عطار کی تصنیف قرار دینے کے لیے طرح طرح کی توجیہات کی ہیں، لیکن شیرانی صاحب کی تنقید کے چند سال بعد جب نفیسی صاحب نے احوال و آثار عطار نیشاپوری لکھی تو اس میں مظہر العجائب لسان الغیب وغیرہ کے جعل کی خوب خوب قلعی کھولی ہے۔ اس کا بخوبی امکان ہے کہ انھوں نے تنقید

شعر العجم دیکھی ہو۔ بہرحال ان کے بعض بیانات اس طرح پر ہیں۔

"بہرصورت اس میں شبہ نہیں کہ وہ نویں صدی ہجری کا بہروپیا تھا، جو اپنے کو فریدالدین محمد کہتا ہے۔ دراصل اس کا تعلق تون (قصبہ) سے تھا۔ لیکن اس نے مشہد میں زندگی گزاری اور متعدد سست اور بے مغز کتابیں از قسم اشتر نامہ (شتر نامہ)، بلبل نامہ، بی سر نامہ، ترجمۃ الاحادیث، جواہرالذات، حلاج نامہ، منصور نامہ، ہیلاج نامہ، خیاط نامہ، سی فصل، کنزالاسرار، کنزالحقائق، گل و ہرمز، لسان الغیب، مظہرالعجائب، معراج نامہ، مفتاح الفتوح، وصلت نامہ لکھیں، جو کسی صورت میں بھی فریدالدین عطار نیشاپوری کی نہیں ہو سکتیں۔ ضمناً اس نے عطار نیشاپوری کی کتابیں اپنے نام سے لکھیں حالانکہ اس میں اور عطار نیشاپوری میں ادنیٰ مشابہت نہیں پائی جاتی۔

ان اشعار میں اس نے بظاہر پیشین گوئی کی ہے۔ اور حافظ و قاسم انوار کے وجود کی خبر دی ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ وہ حافظ (م۔ ۷۹۱) اور قاسم انوار (م۔ ۸۲۷) کے بعد ہوا ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ نویں صدی میں گزرا ہے۔"

پروفیسر سعید نفیسی لسان الغیب سے حسب ذیل شعر پر جو شیرانی صاحب قبلاً اپنے مضمون (ص ۵۲۲) میں لکھ چکے ہیں، اس طرح تنقید کرتے ہیں۔

شہر نشاپورم تولدگاہ بود   در حرم گاہِ رضا مام راہ بود

واضح رہے کہ یہ شعر ایسے شخص نے لکھا ہے جو نہایت جھوٹا اور بے باک تھا۔ وہ ایسا جاہل اور بے علم تھا کہ نہیں جانتا تھا کہ آج تک کسی نے نیشاپور کو نشاپور نہیں لکھا اور نشاپور کازروں کے نزدیک ایک اور شہر کا نام ہے۔"

شیرانی نے لسان الغیب پر تفصیلی تنقید نہیں کی تھی گو وہ اس کے جعلی ہونے کے بالکل قائل تھے، لیکن مقالات شیرانی (ص۔ ۴۴) کے حاشیے سے معلوم ہوا کہ بعد میں ان کو اس کتاب کے مطالعے کا موقع ملا۔ اور اس سے اس کتاب کے جعلی ہونے کا خیال اور بھی مستحکم ہوا۔ مرزا محمد اور پروفیسر براؤن اس کو عطار کی کتاب جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے جعلی ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں چنانچہ نفیسی صاحب نے اپنی کتاب احوال و آثار عطار

ں بھی اس کے جعل ہونے کی قلعی کھولی ہے۔
اس میں شبہ نہیں کہ شیرانی صاحب نے مدتوں پہلے عطار کے کلام کی صداقت پر جس طرح محققانہ بحث کی تھی، اس کی مثال سوائے سعید نفیسی کے اور کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ نفیسی کے بیانات سے شیرانی صاحب کے نتائج کی مزید توثیق ہوگئی لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شیرانی کا انداز تحقیق نہایت عالمانہ ہے، اس لئے ان کے ہاں بیشتر داخلی شہادت سے استشہاد ہوا ہے اور چونکہ انھوں نے عطار کے اصلی اور ان کی طرف منسوب کلام کے ہزاروں صفحات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے ہر جعلی کتاب کے ماخذ کا بھی پتہ لگا لیا ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے مندرجات دوسری کتابوں میں ہو بہو شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ہیلاج اور جواہر الذات پر جو تنقید ہوئی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ وہ پروفیسر نفیسی کی رائے سے بھی متفق نہیں کہ حلاج نامہ اور ہیلاج نامہ ایک ہی کتاب ہے۔ (ص ۵۱۳ ح)
خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز محقق کے ذریعے مدتوں پہلے عطار کے بارے میں تحقیق سے جو نتائج برآمد ہوئے تھے، ان کی صداقت آج تک قائم ہے۔ بیس بائیس سال کی مدت میں ان کے بیانات پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ دو سو صفحات سے کچھ اوپر کا یہ حصہ ایک کتابچے کی شکل میں علیحدہ شائع ہو تاکہ اس سے استفادہ کرنے والوں کے حلقے میں اضافہ ہو۔

فارسی شاعری اور اس کی قدامت

شیرانی صاحب کا یہ قابل قدر مضمون جو تنقید شعر العجم میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ رسالۂ سہیل علی گڑھ (شماری جنوری و اپریل ۱۹۲۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ موضوع کافی وسیع ہے اور اس پر اتنا وافر مواد جمع ہوگیا ہے کہ اس کا احاطہ ایک مقالے کے حوزہ سے باہر ہے۔ چند ابتدائی امور کے بعد شیرانی صاحب نے چند روایتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ساسانی دور میں فارسی شاعری کا وجود بتایا گیا ہے۔ آخر میں مرزا عباس اقبال

آشتیانی کا قول نقل کیا ہے جس میں چامہ، چکامہ، سرواد، پساوند جیسے لغات سے دورِ ساسانی میں شاعری کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے۔ ان روایات کی تنقیح میں شیرانی صاحب نے بڑی دادِ تحقیق دی ہے۔ ابو طاہر خاتونی کے شعر کی مناسبت کے کئی شعر شاہنامے سے نکلے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاتونی کی اولیت کا تصوّر مشتبہ ہو جاتا ہے۔ دبستان المذاہب کی روایت دساتیری ہے اور بنا بریں جعلی اور قابلِ ترک۔ یہی حال شیدوش کے بعد منسوب شعر کا ہے۔ آج سے ۴۵ سال قبل دساتیری روایت کا تعیّن قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد اور عباس اقبال کی درج کردہ شعری اصطلاحات از قسم پیوستہ (نظم)، سروادہ (شعر)، چامہ (غزل)، سرواد (قافیہ)، پراگندہ (نثر)، دم (وزنِ شعر)، چکامہ (قصیدہ)، پساوند (ردیف) داغ (تخلص) کی تنقید کی ہے اور شاہنامے سے سوائے داغ کے ہر لغت کی شعری سند فراہم کر دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کے جو مترادفات لکھے گئے ہیں وہ ہو بہو مترادف نہیں ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "چامے کی ان مثالوں سے، جو اوپر دی جا چکی ہیں، ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ چامے کی نوعیت کیا ہے۔ ابتداءً وہ ایک گیت ہے جو عموماً موسیقی کے ساتھ گایا جاتا ہے اور چونکہ مہمان کی آمد کے وقت آسانی کے ساتھ بدیہہ بنایا جا سکتا ہے اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ فقرات موزوں کی شکل میں ہوتا ہوگا۔ بلحاظ مضمون وہ غزل سے بالکل مختلف ہے۔ فردوسی نے جو نمونے دیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چامہ اکثر تعریف میں ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے چامے پر اگر قصیدے کا اطلاق کیا جائے تو مناسبت سے خالی نہیں۔ غزل اور چامے میں البتہ ایک بات عام ہے یعنی چامے کے خاتمے پر تخلص کے بجائے چامہ گوئی کا نام ہوا کرتا تھا۔" (ص ۶۸۲)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ غزل یا قصیدہ نام کی ہو بہو کوئی چیز نہ تھی نیز چامے اور غزل یا قصیدہ میں اس لحاظ سے بھی تفاوت تھا کہ چامہ مثنوی کے طرز میں نقل ہوا ہے۔

جس کی ساخت غزل و قصیدہ سے الگ ہوتی ہے، پھر اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ یہ اصطلاحات پہلوی سے مستفاد ہیں۔ اگر بالفرض ان کو مستفادی مان لیا جائے تو اس کی نفی کیوں کر ہو سکتی ہے کہ یہ دور اسلامی کی یادگار ہوں۔

شیرانی صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ساسانی دور میں شعر کے اصلی نمونوں کی عدم حاضری اور ایرانی مؤرخین کا اس بارے میں سکوت اس امر کا ثبوت ہے کہ ساسانی دور کا ایران اس فن سے واقف نہ تھا۔ البتہ نوائے خسروانہ یا نوائے باربدی، جو اتنے مشہور ہیں۔ زیادہ تر نغموں اور گیت کی شکل میں ہوں گے اور شاعری کے جملہ لوازم سے عاری۔ بہرام گور کی طرف منسوب بیت: منم آن شیر گلہ الخ کی روایت تواتر کی حد تک ہے۔ اس بنا پر اس میں صداقت کا قیاس ہوتا ہے۔ لیکن بہرام کے دور میں (۴۲۰ء، ۴۳۸ء) جب فارسی کا وجود ہی نہ تھا، فارسی شعر کا قیاس بے معنی ہے اگر کچھ ہے بھی تو خلیل بن احمد واضع عروض عربی ۱۷۰ھ میں فوت ہوا۔ اس کی وفات کے ۱۸ سال کے اندر ایک ایسی بحر میں قصیدہ لکھنا جو عربی اوزان میں تصرف کے بعد عمل میں آیا ہو، ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ایرانیوں نے پہلے عربی اوزان کی نقل کی ہوگی۔ بعد میں اپنی طبائع سے ان کی مکمل ہم آہنگی نہ محسوس کر کے رفتہ رفتہ ان میں تصرفات کئے ہوں گے، بلکہ بعض بحریں بالکل نظر انداز ہو گئیں۔ (جیسے بحر طویل و مدید)۔ یہ سارے عمل مامون کے عہد تک پورے نہیں ہوئے ہوں گے مجھے اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ دراصل مامون کی باقاعدہ تخت نشینی ۱۹۳ میں نہیں بلکہ[1] ۱۹۸ھ میں ہوئی اور اس کا عہد ۲۱۸ھ تک تھا۔ اس زمانے میں عربی اوزان میں ضرور

---

[1] امین کے بعد مامون تخت خلافت پر بیٹھا اور امین کی وفات ۱۹۸ھ ہے (طبقات ناصری ص ۱۱۳۔ نیز رک: زین الاخبار، ص ۵۷)۔ دراصل ہارون رشید نے اپنے تینوں بیٹوں کو ولی عہد بنایا تھا۔ عراق و یمن و حجاز وغیرہ تو امین کو، ماوراء النہر، سندھ، کابل وغیرہ مامون کو اور شام و مغرب کا علاقہ موتمن کو دے رکھا تھا۔ رشید کے انتقال ۱۹۳ھ پر ہر ایک اپنے علاقے کا حاکم ہو گیا۔ اگر اس موقع پر مروزی کا (بقیہ اگلے صفحے پر)

تصرّف کا عمل دائر ہو چکا ہے اس لیے کہ حنظلہ بادغیسی اوائل تیسری صدی اور محمد بن وصف سگزی وغیرہ اواسط تیسری صدی کے قریب اپنے ایسے قصائد لکھ رہے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت فارسی عروض ارتقار کی تمام منزلیں طے کر چکی ہے۔ اس صورت میں ابتدائے تیسری صدی ہجری میں عربی اوزان میں فارسی تصرفات کا قیاس ناممکن نہیں۔

اس کے بعد شیرانی صاحب نے ابوحفص سغدی کا شعر:

آہوئی کوہی زردشت چگونہ دودا ‏ ‏ ‏ ‏ یار نہ دارد بی یار چگونہ رودا

بغیر تفصیل نقل کر دیا ہے۔ مرزا محمد قزوینی نے اس سلسلے میں بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابوحفص سعدی، حنظلہ بادغیسی سے موخر ہے۔ حنظلہ[1] تیسری صدی کے وسط[2] سے قبل

(بقیہ گزشتہ سے پیوستہ)

قصیدہ قیاس کیا جائے تو یہ اور بات ہے ورنہ ماموں کی تخت نشینی ۱۹۸ میں امین کی شہادت پر ہوئی۔ (دیکھیے زین الاخبار)۔

[1] - احمد بن عبداللہ خجستانی، جو حنظلہ کے اشعار سے بہت متأثر ہوا تھا، اس کی وفات ۲۶۸ھ میں ہوئی۔ (دیکھیے چہار مقالہ، ص ۶۹، تعلیقات)۔

[2] نفیسی نے لکھا ہے کہ حنظلہ قرن سوم کے اوائل کا شاعر ہے۔ نفیسی کی طرح قزوینی کا بھی خیال ہے کہ وہ آل طاہر کا معاصر ہے جس نے ۲۰۰ سے ۲۵۲ تک حکومت کی ہے، شیرانی صاحب نے حنظلہ کی تاریخ وفات ۲۱۹ھ لکھی ہے (مقالات ج ۵، ص ۴۴) مگر مجھے یہ تاریخ ابھی تک کہیں اور نہیں ملی۔ تاریخ گزیدہ میں حنظلہ کے اشعار کے پڑھنے کی روایت سامانی بادشاہ کے جد، سامان سے متعلق بتائی گئی ہے۔ اس کا زمانہ ماموں (م: ۲۱۸) سے پہلے کا ہے اس بنا پر مرزا قزوینی اس روایت کو ممکن نہیں سمجھتے۔

(لمع چہار ص - ۷)

شہرت پاتا ہے۔ اس کی شاعری فارسی روایت کی مکمل نمائندگی کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایرانیوں نے عربی اوزان میں اپنی طبائع کے اعتبار سے تصرفات کر لئے تھے۔ گویا فارسی عروض ارتقا کی منزلیں نہ صرف طے کر رہی ہے بلکہ بڑی حد تک طے کر چکی ہے۔ غرض ابوحفص کی شعر کہنے کی اولین روایت باطل ہے پھر تاریخ سیستان میں محمد بن وصیف، بسام کورد اور محمد بن مخلد کے اشعار کے جو نمونے درج ہیں، ان سے ابوحفص کی اولیت کا قیاس سراسر غلط قرار پاتا ہے، اس لیے کہ ان شعرا کا عروج اواسط تیسری صدی ہجری تک ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد شیرانی صاحب محمد بن وصیف سگزی کی دو نظمیں نقل کرتے ہیں۔ یہ نظمیں ڈاکٹر عباس آشتیانی نے تاریخ سیستان سے، جس کا ایک حصہ ۴۴۵ھ میں لکھا جا رہا تھا، شائع کی تھیں۔ محمد بن وصیف، یعقوب بن لیث صفار (م: ۲۶۵) کے دربار سے وابستہ تھا۔ ۲۵۳ھ میں ہرات پر قبضہ کر کے سیستان لوٹا تو اس کا پرزور استقبال ہوا۔ شعرا نے مبارکباد میں قصائد لکھے۔ یہ قصائد عربی میں تھے، یعقوب عربی نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ ایسی زبان میں، جس کو نہیں جانتا، کیوں قصائد لکھے جاتے ہیں۔ اس پر محمد بن وصیف نے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔ وہی پہلا شاعر ہے جس نے فارسی میں شعر کہے۔ ایران میں خسروانی کا رواج تھا۔ جب ایران فتح ہوا تو عربی میں شعر کہے جانے لگے اور یعقوب سے قبل کسی کے لئے فارسی میں شعر نہیں لکھے گئے۔ تاریخ سیستان کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے:

> "پس یعقوب نے کہا جو چیز میں نہ سمجھوں (یعنی قصیدہ عربی) وہ کیوں کہی جائے۔ پس محمد بن وصیف سگزی نے فارسی شعر کہنا شروع کیا اور عجم میں سب سے پہلے اس نے کہا، اس سے پیشتر کسی نے نہیں کہا تھا" (تاریخ سیستان ص ۲۱۰)

---

[۱] مرزا محمد نے بیست مقالہ کے مقالے "قدیم ترین شعر فارسی بعد از اسلام" میں اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔

محمد بن وصیف کے قصیدے کے چھ شعر نقل کرنے کے بعد تاریخ سیستان میں آیا ہے۔

"یہ شعر (قصیدہ) طویل ہے، اس میں سے تھوڑا میں نے نقل کیا ہے اور بسّام کورد ان خوارج میں سے تھا جو صلح کے لیے یعقوب کے پاس آیا تھا۔ جب اس نے وصیف کے شعر کا انداز دیکھا تو اس نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا اور عمّار کا واقعہ شعر میں بیان کرتا ہے (۵ شعر) محمد بن مخلد بھی سگزی تھا۔ وہ مرد فاضل اور شاعر تھا۔ اس نے بھی فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا اور یہ اشعار کہے (تین شعر)۔ اس کے بعد ہر شاعر اس انداز میں شعر کہنے لگا۔ لیکن شروع کے یہی لوگ تھے۔"

(ایضاً۔ ص ۲۱۱ - ۲۱۲)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی میں ادبی شعر کی روایت محمد بن وصیف[1] سے قبل کی نہیں ملتی لیکن یہ بیان اس لیے صحیح نہیں کہ محمد بن وصیف کے جو اشعار تاریخ سیستان

---

[1] نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں حنظلہ بادغیسی کا حسب ذیل قطعہ نقل کیا ہے۔

مہتری در یکام شیر در است ــ رو خطر کن ز کام شیر بجوی

یا بزرگی و عزّ و نعمت و جاہ ــ یا چو مردان مرگ رو یاروی

یہی وہ شعر ہیں جن کو پڑھ کر احمد بن عبداللہ خجستانی کے دل میں ترقی کی خواہش پیدا ہوئی تھی اور وہ ترقی کرتے کرتے "خر بندگی" سے امارت کے درجہ تک پہنچ گیا خجستانی اوّل اوّل طاہریوں سے وابستہ رہا۔ ان کے زوال کے بعد صفاریوں سے منسلک ہو گیا۔ آخر کار آزادی کا اعلان کر دیا اور ۱۸ سال تک خراسان کے بعض علاقوں پر قابض رہا۔ ۲۶۸ھ میں نیشاپور میں ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ (تاریخ سیستان، ص ۲۲۸-۲۲۹۔ ابن اثیر ج ۷، ص ۲۰۰-۲۷۴)

حنظلہ بادغیسی طاہریوں کا معاصر تھا۔ اس بنا پر اس کے اشعار وصیف بن سگزی کے ۲۵۲ھ والے اشعار سے قبل ہی لکھے جا چکے تھے۔ موجودہ تحقیق کی رو سے یہ بات تقریباً مسلم ہے کہ حنظلہ فارسی کے اولین شعرا میں تھا۔

میں نقل ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی عروض نے ارتقا کی چند منزلیں طے کرلی ہیں اور وہ عربی عروض سے کسی حد تک آزاد ہو چکا ہے۔ وصیف کے چار قصیدوں کے اشعار چار جگہ پر درج ہیں اور چاروں میں زحاف کا عمل ہوا ہے مثلاً صفحہ ۲۵۳ پر جو دو شعر درج ہیں۔ ان کا وزن مفعول، مفاعیل، مفاعیلن اور بحر ہزج مسدس اخرب مکفوف ہے اور ص ۲۶۰ پر جو قصیدے کے اشعار ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ان کی بحر سریع مسدس مطوی موقوف ہے اور وزن مفتعلن مفتعلن فاعلات ہے۔ اس بنا پر نہ محمد وصیف کو فارسی کا پہلا شاعر اور نہ اس کے اشعار کو فارسی شاعری کا قدیم ترین نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ شیرانی صاحب کا یہی نقطۂ نظر ہے جیسا کہ وہ کادہ میں چھپے ہوئے اشعار کی بنا پر فرماتے ہیں:

> "محمد بن وصیف اور اس کی شاعری اگرچہ فارسی ادبیات کا ایک فراموش شدہ ورق مانے جا سکتے ہیں لیکن محمد وصیف اس زبان کا پہلا شاعر ہے اور نہ اس کی نظمیں فارسی کی اولین نظمیں مانی جا سکتی ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ سیستان میں وہ پہلا شاعر ہو۔ بات یہ ہے کہ اس کی شاعری ایسے دور کی یادگار ہے جب کہ فارسی عروض نے عربی اوزان کے اتباع سے آزادی حاصل کر کے اپنے لیے مختلف شاہراہ اختیار کر لی ہے۔"
>
> (ج ۵، ص ۲-۶۹۳)

اس کے بعد شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ دراصل یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ شاعری کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اس کے قدیم نمونے کس قسم کے تھے۔ ان کے نزدیک جب عرب فاتحین ایران میں آباد ہوئے اور کچھ مدت کے بعد نئے وطن کی زبان سیکھی تو تفنن طبع کے لئے اپنی تحریروں میں فارسی کے موزوں کلمات داخل کرنے لگے۔ دراصل یہیں سے فارسی شاعروں کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے مرزا محمد قزوینی کے مضمون شامل رسالہ کادہ سے ابن مفرغ کا قصہ نقل کیا ہے جو ابن قتیبہ کی طبقات الشعرا، طبری کی تاریخ کبیر اور اصفہانی کی کتاب الاغانی سے ماخوذ ہے۔
مجھے ذاتی طور پر فارسی شاعری کی ابتدا کا یہ نظریہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

اس لیے کہ جب عرب تفنن طبع کے لئے اپنی عربی تحریروں میں فارسی تک بندی کے نمونے داخل کر رہے تھے۔ تو ایرانی مسلمان جس کی زبان فارسی تھی اور جس نے عربی میں عبور حاصل کر لیا تھا، اس وقت وہ کیا کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ چونکہ اس سلسلے کا کام ابھی ابتدائی مراحل سے آگے نہیں بڑھا اور سوائے ابن مفرّغ کی طرح کے چند اور شاعروں کی تک بندیوں کے، فارسی شاعری کے قدیم نمونے دستیاب نہیں ہیں، اس بنا پر یہ نظریہ کہ عربوں کے ذریعہ فارسی شاعری وجود میں آئی، قائم ہوا۔ یقیناً اگر تحقیق کا دائرہ وسیع ہوگا۔ ایرانی اور فارسی نژاد مؤرخین اور رادیوں کی عربی کتابوں کی چھان بین کی جائے گی تو یقیناً ان آخرالذکر کی تصانیف فارسی شاعری کے ابتدائی نمونے ضرور ملیں گے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تاریخ سیستان میں، جہاں وصیف سگزی، بسّام کورد محمد بن مخلد سگزی کو فارسی کا اوّلین شاعر قرار دیا ہے، اس کے ساتھ کے چند فقرے نہایت قابل توجہ ہیں۔

"اما ابتدا را ایشان بودند و کس بزبان پارسی شعر یاد نہ کردہ بود الا ابونواس میان شعر خویش سخن فارسی طرز را یاد کردہ بود"

(ص ۲۱۳)

تاریخ سیستان میں دو اصطلاحیں ملتی ہیں۔ شعر گفتن و شعر یاد کردن۔ اول الذکر تو واضحاً شاعری کرنے کے معنی میں اور آخرالذکر شعر یا کلام کے درمیان کچھ فارسی نما شعر لے آنا اس طرح کے نیم فارسی شعر سب سے پہلے ابونواس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ سیستان کے متن میں "فارسی طرز" ہے جو محققین کے نزدیک طرز کی تصحیف ہے۔ دراصل تاریخ سیستان کے بیان میں اور پروفیسر شیرانی کے نتیجے میں کوئی اختلاف نہیں یعنی اوّل الذکر نے جو ابتدائی شعراء کی حد بندی کی ہے تو اس سے اس نے اس امر کی نفی نہیں کی کہ دراصل ابتدائی نمونے جو فارسی شاعری کی خام مثالیں ہوں گی، اس سے فارسی خالی ہے۔ یہی شیرانی اور دوسرے ایرانی نقادوں کا خیال ہے۔ مرزا محمّد نے بیست مقالۂ قزوینی کے مقالۂ اولین شعر فارسی میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ اس فرق کے

ساتھ کہ ان کے یہاں عرب نژاد شاعروں کی قید نہیں۔ ملک الشعراء بہار نے تاریخ سیستان میں ابونواس کے "سخن پارسی طرز" پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ نہایت قابل توجہ ہے:

"اعراب کلمات فارسی راازروی تتبع درشعر آوردہ اند چنانکہ درکتاب البیان والتبیان، ج ۱، ص ۱۰۹، فصلی درذیل این کلام، : قد یتلمح الاعرابی بان یدخل فی شعرہ شیئاً من کلام الفارسیۃ ..... ذکر کردہ واشعاری ازعمانی وغیرہ آوردہ وحی گوید : ومثل ھذا الموجود فی شعر العذافر الکندی ویجوز ایضاً ان یکون الشعراء الحروالشاذ واسودابن ابی کریم کما قال یزید بن مفوغ۔ آبست نبید است عصارات زبیب است الخ وقال اسودبن ابی کریم۔

لزم الغرّام ثوبی — بکرۃ فی یوم سبت
فتمایلت علیہم — میل زنگی بمست "

(تاریخ سیستان، ص ۲۱۲ ح)

مرزا محمّد قزوینی نے تاریخ سیستان کے اشارے پر دیوان ابونواس سے اس کے کچھ نیم فارسی اشعار جمع کئے مگر ان کی قرأت بڑی غلط تھی۔ انھوں نے مطبوعہ نسخہ سے ان کی تصحیح کرنی چاہی مگر ممکن نہ ہوسکا۔ یہ اطلاع قزوینی صاحب نے اپنے ایک خط کے ذریعے بہم پہنچائی ہے جو انھوں نے تقی زادہ کے نام ۱۰ فروری ۱۹۲۴ کو پیرس سے لکھا تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ ادھر ابونواس کا جو دیوان ایڈٹ ہوا ہے اس میں ان نیم فارسی اشعار کی نشاندہی نہ ہوسکی۔

ابونواس (م: ۱۹۶) اگرچہ عربی کا شاعر تھا۔ لیکن اس کی پیدائش ایران کے صوبہ خوزستان کے مشہور شہر اہواز میں ہوئی جہاں اس کا باپ آکر سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ اس کی ماں بھی اہوازی تھی اور اس کا دادا اجراح بن عبداللہ حکمی والی خراسان کے موالی میں تھا۔ ان وجوہ سے ابونواس کا فارسی سے گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر اس نے فارسی میں نیم اشعار کہے ہوں تو تعجب کی کیا بات ہے۔

میں ذرا اپنے موضوع سے کچھ الگ سا ہو گیا تھا۔ بہرحال شیرانی صاحب نے جو دلچسپ تاریخی بحث چھیڑی ہے وہ تحقیق کا نہایت اہم موضوع ہے جو نئے اور حوصلہ مند محقق کو دعوت عمل دیتا ہے۔

شیرانی صاحب نے اپنے مضمون کے بعد والے حصے میں مجلّہ کاوہ کے حوالے سے یزید بن مفرغ کے یہ تین مصرعے نقل کئے ہیں:

آب است نبیذ است　　عصارات زبیب است　　سمیہ روسپیذ است

دراصل مجلّہ کاوہ کا یہ مضمون مرزا محمد قزوینی کا ہے جو بعد میں بلیست مقالۂ قزوینی میں شامل ہوا، جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں، چونکہ ابن مفرغ، یزید بن معاویہ (۶۰۔ ۶۴ھ) کے دور میں تھا۔ اس بنا پر اس کو اب تک کے دریافت شدہ نمونوں میں قدیم ترین نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ پھر طبری کی تاریخ سے ایک تاریخی نمونہ نقل کیا ہے۔ ۱۰۸ھ میں ابومنذر اسد بن عبداللہ والی بلخ نے ختلان پر حملہ کیا لیکن وہاں کے حاکم نے اس کو شکست فاش دی۔ عبداللہ بحالت تباہ بلخ پہنچا۔ اس پر لڑکے کوچہ و بازار میں یہ نظم گاتے پھرتے نظر آئے۔

از ختلان آمدیہ　　برو تباہ آمدیہ
ابار باز آمدیہ　　خشک نزار آمدیہ

یہ بحر ہزج مربع مخبون ہے۔ یہ واقعہ بھی محمد قزوینی کے مقالے میں مندرج ہے

اس کے بعد شیرانی صاحب کے مضمون میں چند اور اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک سے ابوالینبغی العباس بن ترخان کی مثنوی کے طرز کے دو شعر نقل ہیں۔

۲۔ محمد بن بعیث بن جلیس (م: ۲۳۵) کے فارسی اشعار کے بارے میں طبری کی ایک روایت۔

۳۔ ابوالاشعث قمی کے فارسی اشعار کا ذکر معجم الادبا میں۔

شیرانی صاحب کے مقالے کا پہلا حصہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا حصہ فن وغیرہ

کے ارتقا پر ہے۔ یہ حصّہ بھی نہایت محققانہ ہے۔ اس میں انھوں نے ان تمام صورتوں کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے فارسی عروض عربی عروض سے متفاوت ہوئی اور یہ تفاوت بعض اوقات اتنا زیادہ ہوجاتا ہے کہ اصل سے کاملاً مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ عربی بحروں میں ایرانیوں نے جو تبدیلیاں کیں۔ ان کے ذکر کے ساتھ بعض نوایجاد بحروں کا بھی تذکرہ ہے اور وہ عوامل بھی بیان کئے ہیں جن کی وجہ سے اہل ایران نے عربی عروض میں تبدیلی پیدا کی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزنویوں سے قبل یعنی چوتھی صدی ہجری کے اواسط تک فارسی عروض تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دو صدی کے اندر عروض نے جتنی منزلیں طے کرلی تھیں، اتنی بعد کی نو صدیوں میں طے نہیں ہوسکی ہیں۔

شیرانی صاحب کا یہ مقالہ نئے زاویہ نگاہ سے لکھا گیا ہے اور اردو اور فارسی کے دانشور کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

یہیں پر میں آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

(۳)

شیرانی صاحب کا تیسرا اہم کارنامہ ہندوستانی فارسی ادبیات کی تحقیق سے متعلق ہے لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ ان کا اصل میدان یہی ہے۔ دراصل ان کا دائرۂ عمل فارسی ادب کے تمام ادوار کو محیط ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فارسی کا وہ ادب جو کلاسیکی کے نام سے موسوم ہے، اس پر انھوں نے زیادہ کاوش کی تھی۔ شاہنامہ فردوسی کو لیجیئے۔ اس کا انھوں نے جیسا عمیق مطالعہ کیا اور اس سے جو نئے نئے نتائج نکالے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر تنقید شعر العجم کے لئے ان کو شہید بلخی سے لے کر کمال اسماعیل تک کے منتخب شعراء کے دواوین کے علاوہ ان سے متعلق سارے منابع کا بڑی دقیق نظری سے مطالعہ کرنا پڑا۔ صرف عطار ہی کو لیجیئے۔ ان کا صرف اصل ہی کلام ہزاروں صفحے کو حاوی ہے اور جو منسوب اور مشتبہ کلام ہے وہ اس سے کئی گنا ہے اس کا انھوں نے بڑا صبر آزما مطالعہ کیا تھا جیسا کہ ان کی طرف منسوب دو

کتابوں جواہر الذات اور ہیلاج نامہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"کتابیں کیا ہیں دریائے اعظم ہیں، جن کی گود میں تیس تیس ہزار اشعار موجیں مار رہے ہیں۔ فارسی ادبیات میں شاید اس قدر تھکا دینے والی، عنبر دلچسپ اور دل اچاٹ کر دینے والی کوئی کتاب نہ ہوگی جیسی کہ یہ کتابیں، جو عطار کی طرف خدا جانے کس گناہ ہیں دنیا نے منسوب کی ہیں۔ علمی و ذہنی لحاظ سے ان کا شمار ادنیٰ درجے کی تصانیف میں ہونا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود کوشش بلیغ ہیں ان مثنویوں کو پورا ختم نہ کر سکا۔ نہ مجھ میں، حالانکہ مجھ کو اقرار ہے کہ کتابوں کے معاملے میں خاصہ تحمل ہے، اس قدر تاب تھی کہ ان کو پورا پڑھ سکوں۔ ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب ذوق جن میں مجھ سے زیادہ استقلال ہے، ان کے نشیب و فراز اور معلومات سے ہم کو اطلاع دیں۔"

اور یہی نہیں کہ انھیں صرف زیادہ پڑھنا ہی پڑا ہے، بلکہ انھوں نے بہت سے مفروضات جو مسلمہ حیثیت حاصل کر چکے تھے، ختم کیے اور بعض نئی دریافتیں بھی کیں۔ غرض ان وجوہ سے مجھے اس بات سے اتفاق نہیں کہ انھوں نے فارسی ادب و فن کے اس حصے کو اپنی کوششوں کی جولاں گاہ بنایا ہے، جس کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ لیکن بہرحال ہندوستانی فارسی ادب پر انھوں نے جو داد تحقیق دی ہے وہ بھی ستائش سے بالاتر ہے۔ ذیل میں بعض امور کی صراحت پیش کی جاتی ہے۔

دیوان معین الدّین چشتیؒ

شیرانی صاحب کا ایک نہایت شاندار تحقیقی کارنامہ دیوان معین الدین چشتیؒ کے صحیح مصنف کا تعیّن ہے۔ ایک مدّت سے یہ دیوان چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ معین الدین حسن سجزی کے نام سے مشہور رہا ہے۔ انھیں کے نام سے یہ دیوان چھپا بھی ہے۔ بعض تذکروں میں ان کے نام سے دیوان میں شامل اشعار بھی مندرج ہیں خصوصاً تذکرۂ حسینی اور روز روشن وغیرہ میں۔

لیکن جناب شیرانی صاحب نے اپنی دقیق نظری سے اس انتساب کا ابطال کیا اور

اپنے دعویٰ پر ایسے مستحکم دلائل پیش کیے کہ ان کے دعویٰ کی تصدیق و توثیق کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں اور اب ان کا نتیجہ ایسی مسلمہ حقیقت بن چکا ہے کہ اس کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ منجملہ اور دلائل کے ایک[1] ٹھوس دلیل یہ ہے کہ اس دیوان کے بیشتر اشعار معین مسکین ہروی صاحب معارج النبوۃ وغیرہ کی دوسری تصانیف میں مختلف موضوعات کی تشریح کے ضمن میں خود معین مسکین کے نام سے نقل ہوئے ہیں۔ اتفاق سے شیرانی صاحب کے پیش نظر ان کی مدارج النبوۃ کے ایک نسخے کے علاوہ دوسری کتاب اعجاز موسوی تھی۔ ان دونوں کتابوں میں بیسیوں غزلیں لمولفہ غفر اللہ لہ، لمولفہ فی ہٰذا المعنی وغیرہ فقرات کے ساتھ نقل ہوئی ہیں جن سے یہ راز کھلتا ہے کہ کتاب کا مولف اور شعر کا لکھنے والا ایک ہی شخصیت ہے۔ ان بیسیوں منظومات کے علاوہ جو مصنف کا قطعی طور پر تعین کرتی ہیں، متعدد ایسی مثالیں ان کتابوں میں ہیں جو مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں۔ جب دیوان کی اتنی غزلیں معین الدین فراہی کی ہیں تو بقیہ غزلوں کو لازماً انھیں کا سمجھنا چاہیئے۔ شیرانی صاحب نے مضمون کے خاتمے پر لکھا ہے کہ ممدوح کثیر التعداد تصانیف کے مالک ہیں۔ اگر ان کی تصانیف میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین و وثوق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا ان میں پتہ لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ اور سینکڑوں نئی غزلوں کا اس میں پتہ لگے گا جو دیوان حجم کو المضاعف کر دیں گی۔

یہ قیاس بالکل صحیح ثابت ہوا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار نے رسالہ اردو کراچی جولائی ۱۹۵۰ء میں ایک مضمون دیوان معین کے جعلی انتساب کے موضوع پر شائع کیا ہے۔ اس میں مجالس النفائس مولفہ میر علی شیر نوائی میں معین مسکین کے نام سے ایک غزل کی نشاندہی

---

[1] پروفیسر محمد اسلم نے بھی اشعار کی نشاندہی کی ہے، جو معین ہروی کے نام سے درج ہیں، جن میں اکثر دیوان معین الدین چشتی میں شامل ہیں۔ یہ مزید ثبوت قابلِ توجہ ہے۔

ل ہے جو دیوان میں موجود ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ دیوان معین مسکین ہروی فراہی کا ہے نہ حضرت معین الدین چشتی کا، اس سے بڑھ کر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پروفیسر ڈار کو معین مسکین کی ایک تصنیف سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ایک نسخہ ہاتھ آیا۔ اس میں بیس غزلیں جو دیوان میں موجود ہیں، نقل ہیں ان میں سے اکثر، چنانچہ فقیر می گوید، مولفہ قال الفقیر الضعیف معین المسکین، چنانکہ فقیر تو گفتہ است وغیرہ کی تخصیص کے ساتھ نقل ہوئی ہیں۔ ایک آدھ غزلوں کے کچھ اشعار دیوان میں شامل نہیں۔ غرض ان اشعار کی تعیین سے یہ بات بالکل متحقق ہو جاتی ہے کہ مطبوعہ دیوان کا حضرت معین الدین چشتی اجمیری سے کوئی واسطہ نہیں۔

راقم الحروف کو مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں معین الدین مسکین فراہی کی تین کتابوں کے قلمی نسخوں کے سرسری طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک تفسیر سورۂ یوسف ہے، جو ۳۰۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی کے اشعار کثرت سے نقل ہوئے۔ ان میں اکثر خود معین مسکین ہی کے ہیں۔ ورق ۲۴۷ و پر ان کی دو غزلوں کے اشعار درج ہیں۔ پہلی غزل ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

چنانکہ فقیر گوید:

محبوب خود ای عاشق از غیر چرا جوئی   او را ہم از و خواہی گر مرد خدا جوئی (۴ شعر)

دوسری غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:

چنانکہ فقیر گوید:

اگر بوادی ایمن برون بری راہی   تو ہم ز خود شنوی نعرۂ انا اللّٰہی (۵ شعر)

دوسری کتاب حضرت موسیٰ کے حالات میں بطرز سوال و جواب ہے (عبدالسلام کلکشن ۱/۲ فارسی)۔ اس کے ورق ۲۷ و پر تفسیر سورۂ یوسف میں منقول غزل پوری کی پوری نقل ہے۔ یہ غزل نہایت دلکش اور عارفانہ جذبات سے مملو ہے۔ اس بنا پر یہاں نقل کی جاتی ہے۔

و فقیر را نیز درین معنی سری بر خاطر خطور کردہ است، عرضہ می دارم:

اگر بوادی ایمن برون بری راہی | توہم زخود شنوی نعرہ اناالٰلہی
ز قید تن بدرآ و فضای عالم جان | ببین زرد زن دل تا بحفر نقش راہی
بظلمت شب ہجران ز مطلع غیبی | عجب مدار کہ سر بر زند یکی ماہی
زچشمہ دلت آب حیات بر جو شد | چنانکہ طلعت یوسف برآمد از چاہی
تو غافلی چہ شناسی ز سرّ نور وجود | کہ نیست مظہر آن جز ضمیر آگاہی
حجاب ظلمت نور از میان تو برداشت | اگر ہزار بود فی المثل یکی آہی
بہ باغ قدس بہر دم گلی دگر شکفد | از آن نفس کہ برآید ز دل سحرگاہی
برفت جان ز معینی و تن بکوی تو ماند | کہ تا سگاں تو یادی کند گہی گاہی
مزید حشمت و جاہ است اگر ز روی کرم | گہی تفقدی حال گدا کند شاہی

یہ غزل اور تفسیر کی پہلی منقولہ غزل، دونوں دیوان سے خارج ہیں۔ لیکن دونوں کے معین مسکین فراہی کی تصنیف کے مطالعے سے دیوان کا حجم بڑھ جائے گا۔

تیسری کتاب نعوت احمد ہے جس کا ایک ناقص نسخہ (ذخیرہ شیفتہ ۵۸/۶۲) میرے مطالعے میں آیا۔ اس میں قدم قدم پر فارسی کے اشعار منقول ہیں۔ اس میں ایک غزل، جو دیوان (ص ۹۸) میں بھی شامل ہے، پوری نقل ہوئی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

عالم نمی از رشحۂ بحر کرم اوست | آدم کف خاکی ز غبار قدم اوست

معین الدین فراہی اچھے کاتب اور خوشنویس تھے۔ وہ نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی خطاطی کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ مظہر محمود شیرانی مرتب مقالات شیرانی نے بطور استدراک مقالات کے آخر میں ص ۴۱۸ کے تعلیق کے طور پر خطاطی کے رسالوں سے ان کی خطاطی کا حال نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ حبیب السیر میں بھی ہے: "اکثر خطوط را در غایت جودت بر صحیفۂ تحریر می نگاشت"

اور ابوالفضل نے ان کا نام مشہور خطاطین کے ذیل میں درج کیا ہے۔

راقم حروف کو معین فراہی کے خط میں ایک اہم مخطوطہ دستیاب ہوا ہے اور وہ ہے درج الدرر تالیف سید اصیل الدین عبداللہ بن عبدالرحمٰن شیرازی (م: ۸۸۳ھ)۔

سیرت رسول صلعم پر یہ کتاب ۸۶۷ھ میں بارہ مجلسوں میں مکمّل ہوئی۔ زیر نظر مخطوطہ ۲۸۸ اوراق پر مشتمل ذخیرۂ فرہنگی محل ۹۹/۴۴، کتاب خانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ معین مسکین ہروی نے ذی الحجہ ۸۸۹ ہجری میں مصنف کی وفات کے چھ سال کے اندر اس کو نقل کیا۔ تاریخ کتابت اکثر مجلسوں کے شروع میں درج ہے گیارہویں مجلس کے شروع اور کتاب کے خاتمے پر کاتب کا نام مع تاریخ کتابت اس طرح ملتا ہے۔

"تمت الکتاب الدرج الدرر فی شہر ذی الحجہ سن تسع وثمانین وثمانمائۃ بحمد اللہ وحسن توفیقہ بسعی العبد المحتاج الی رحمۃ اللہ المتین معین المسکین ختم اللہ عمرہ بالخیر"۔

ہر مجلس کے شروع میں اس کے مباحث کے عنوان، تاریخ تصنیف، نام مصنّف مقام تصنیف خط نسخ جلی میں درج ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ملتا ہے کہ یہ اصل مصنّف کے خط کی ہو بہو نقل ہے۔

بحر الفضائل

فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ بحر الفضائل کے عنوان سے شیرانی صاحب کا مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۲۸ میں پڑھا گیا تھا جو بعد میں دو قسطوں میں رسالہ مخزن (مارچ و اپریل ۱۹۲۹) میں شائع ہوا اور مقالات کی جلد اول میں شامل ہے۔ بحر الفضائل کا مصنف محمد بن قوام رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بہ کرئی ہے۔ اس نے اس فرہنگ میں اردو کے سینکڑوں الفاظ مترادفات کے طور پر درج کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک الگ باب ان ہندوستانی الفاظ کا ہے جو نظم میں استعمال ہوتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون میں ایسے تمام لفظوں کی ایک جامع فہرست شامل کر دی ہے۔ اس مضمون میں محمد بن قوام کرئی کی دوسری تالیف "شرح مخزن" سے بھی بحث کی گئی ہے۔ دراصل نولکشور پریس میں یہ شرح ایک دوسرے شارح ظہور الحسن بٹھوری کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ شیرانی صاحب نے متعدد دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ دراصل شارح کا نام محمد بن قوام بن رستم کرئی ہے، ظہور الحسن بٹھوری نے جعل کیا ہے

اور مطبع والے اسی جعل کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد شیرانی صاحب نے یورپی مستشرقین اسپرنگر، ایتھے، ریو وغیرہ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جنھوں نے بحر الفضائل کو گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف قرار دیتے ہوئے محمد بن قوام کو گیارہویں صدی ہجری کا ایک مصنّف قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ شیرانی صاحب کے دلائل سے اب اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ مولف بحر الفضائل محمد بن قوام آٹھویں نویں صدی کی شخصیت ہے۔ وہ وہی ہے جس نے شرح مخزن اسرار بھی لکھی تھی۔

معارف اعظم گڑھ بابت ماہ جولائی اگست ۱۹۴۱ء میں محترم عرشی صاحب کا ایک مضمون بعنوان، ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ، شائع ہوا۔ اس میں عرشی صاحب نے اس کے جعلی شارح ظہور الحسن ٹھوری کی قلعی کھولی ہے جس کے نام سے نول کشور میں شرح مخزن "ظہور الاسرار" کے عنوان سے چند بار شائع ہو چکی ہے۔ عرشی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ دراصل اس شرح مخزن کا شارح بدر الدین بن قوام بن رستم البلخی الکرئی ہے جس نے ۷۹۵ھ میں یہ شرح لکھی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شارح فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ـــ۷۹۰) کے دور کا مشہور شاعر مطہر کڑہ ہے جس کا دیوان کافی شہرت رکھتا ہے۔ یہ قیاس سراسر بے بنیاد ہے۔ دراصل شیرانی صاحب کا مضمون جو ۱۲ سال قبل چھپ چکا تھا، مولانا عرشی صاحب کی نظر سے نہیں گذرا ورنہ وہ اس طرح کی غلط فہمی میں نہ پڑتے۔ بہر حال عرشی صاحب کے مضمون کے پہلے حصّے کے وہی نتائج ہیں، جو شیرانی صاحب کے ہیں یعنی یہ کہ مخزن کا شارح بلخی کرئی ہے (گو نام میں اختلاف ہے، عام طور پر وہ محمد بن قوام بن رستم کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن عرشی صاحب کے یہاں بدر الدین مطہر بن قوام ملتا ہے۔) اور یہ کہ وہ فیروز تغلق کے دور کا مصنف ہے اور یعنی آٹھویں صدی ہجری کا، گیارہویں صدی کا نہیں ہو سکتا مگر مضمون کے دوسرے حصّے کا نتیجہ کہ شارح اور مطہر کڑہ ایک ہی ہیں، غلط ہے۔ عرشی صاحب یہ نہ معلوم کر سکے کہ شارح مخزن کی ایک دوسری تالیف بحر الفضائل نامی فرہنگ بھی ہے۔ عرشی صاحب کے نزدیک شارح مخزن اور مطہر کڑہ کے ایک شخص ہونے کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ دونوں کا زمانہ ایک ہے۔
۲۔ کم از کم شرح مخزن کے ایک نسخے میں شارح کا نام مطہر بن قوام ہے۔
۳۔ دیوان مطہر میں جن شعرا کا ذکر ہے ان کا ذکر شرح مخزن میں بھی ہے۔
۴۔ شارح مخزن نصاب العقلا کا مولف ہے۔ اسی طرح ایک کتاب نصیب اخوان مطہر کی تصنیف ہے۔
۵۔ مطہر نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بعد کسی بزرگ رکن حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ جو شرح مخزن کے رکن الدین ابو الفتح ہو سکتے ہیں۔
۶۔ دونوں شاعر اور عالم تھے۔

دراصل ان سارے دلائل میں کوئی دلیل قطعی نہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شرح مخزن کا کرتی وہی ہے جو بحر الفضائل کا مولف ہے اور جس طرح شرح کے تقریباً تمام نسخوں میں (صرف عرشی صاحب کے ایک نسخے کو چھوڑ کر) شارح کا نام بن قوام بن رستم ملتا ہے اور اسی مؤلف کی دوسری کتاب بحر الفضائل ہے جس کے متعدد نسخوں کا پتہ چلا ہے اور سب میں فرہنگ نگار کا نام محمد بن قوام بن رستم ہی آیا ہے)۔ اس لئے دونوں کے ایک ہونے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں۔ شرح مخزن کی تاریخ ۷۹۵ ہے۔ اور بحر الفضائل کی ۸۲۷ جیسا کہ شیرانی صاحب نے اپنے مقالے میں تحریر فرمایا ہے۔ اسی بنا پر موصوف نے شرح مخزن کو محمد بن قوام کے ابتدائی دور کی اور بحر الفضائل کو، جو ۳۲ سال بعد لکھی جاتی ہے، آخری دور کی تصنیف قرار دی ہے۔ اب ذرا مطہر کڑہ کی زندگی پر نظر ڈالیں وہ فیروز شاہ کے دور کا شاعر ہے لیکن اس کے دیوان سے ظاہر ہے کہ اس کی شاعری فیروز شاہ کے قبل ہی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس کے متعدد قصیدے عین الملک کی تعریف میں ہیں۔ جس نے محمد تغلق کے خلاف بغاوت کی تھی اور ۷۴۰ میں شرقی علاقے سے دہلی بلا لیا گیا۔ عین الملک کے مدحیہ قصیدے سے واضح ہے کہ وہ غازی پور کے علاقے میں مقیم ہے اور جیسا کہ معلوم ہے کہ وہ اودھ اور ظفر آباد ہی کا حاکم تھا جس میں غازی پور بھی شامل تھا۔ اس سے واضح ہے کہ مطہر کے اکثر قصیدے ۷۴۰ھ سے قبل کے ہیں۔ اس

اس تاریخ میں مطہر کی عمر ۳۰ سال کے حدود میں رہی ہوگی۔ اس کا ایک قوی قرینہ یہ ہاتھ آگیا ہے کہ اس نے حضرت چراغ دہلی کا ایک مرثیہ ۷۵۹ میں لکھا، اس وقت اپنی عمر ۷۳ سال کی بتائی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی پیدائش ۶۸۶ھ قرار پاتی ہے۔ اب بحر الفضائل کی تاریخ تالیف ۸۰۷ پر غور کریں اگر وہ مطہر کی تصنیف قرار دی جائے تو شاعر کی عمر ۱۲۱ سال کی ہوگی اور اس سال کے بعد بھی وہ زندہ رہا ہوگا۔ اتنی طویل عمر کا قیاس بغیر کسی واضح قرینے کے نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال مطہر کڑہ بحر الفضائل کا مولف نہیں ہو سکتا۔ راقم نے رسالہ معارف بابت جنوری ۱۹۶۷ء میں اس موضوع پر ایک مفصل گفتگو کی ہے جس کا خلاصہ اوپر درج کر دیا ہے۔

ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ شیرانی صاحب کی طرح عرشی صاحب نے شارح مخزن کے اس قول کا ذکر کیا ہے کہ محمد تغلق نے خرگاہ کو خرم گاہ کہنے کا حکم دیا تھا۔ مگر انھیں اس دور کی کتابوں میں خرم گاہ کا لفظ نہیں مل سکا تھا حالانکہ شیرانی صاحب ۱۱ سال قبل شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (ص ۱۷) سے یہ جملہ نقل کر چکے ہیں۔

"تا خواجۂ جہاں را درین چوڈول سوار کنند و بخرم گاہ برند"

راقم حروف نے معارف والے مضمون میں اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ خرم گاہ کا لفظ فارسی میں خاصہ قدیم ہے۔ چنانچہ خاقانی عمید لویکی، شمس جندی کے یہاں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ بعد میں شیرانی صاحب کو فوائد الفواد میں جو محمد تغلق کے عہد سے قبل کی تالیف ہے خرم گاہ کے استعمال کی مثالیں ملیں اور انھوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس سے ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح محمد بن تغلق کے عہد سے قدیم ہے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ ہندوستان میں وضع ہوا"

شیرانی صاحب کا یہ آخری قیاس اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ خاقانی کہتا ہے۔

تابش رخسار تو از راہ چشم — کرد خرم گاہ دل از ارغوان

رشیدی نے اپنی فرہنگ میں خرم گاہ کو غلط قرار دیتے ہوئے صحیح لفظ خورنگاہ د

خورنگہ بنایا ہے۔ اس کا یہ قیاس درست نہیں لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب

پروفیسر شیرانی نے دو کتابوں پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک شمس العلماء عبدالغنی کی کتاب "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" اور دوسرا ایک امتحانی مقالہ ہے ڈاکٹر اقبال حسین (پٹنہ یونیورسٹی) نے یہ مقالہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھا تھا جو بعد میں "ہندوستان کے قدیم شعراء" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ان کتابوں پر پروفیسر شیرانی کے تبصرے ایک ضخیم کتاب پر بھاری ہیں۔ یہ تبصرے بیش بہا معلومات کے ذخیرے ہیں۔ دراصل اول الذکر کتاب میں بڑی کوتاہیاں رہ گئی تھیں، بعض واقعات غلط درج ہو گئے تھے اور بعض امور سے یکسر صرف نظر ہوا تھا۔ اقبال حسین صاحب کی کتاب بڑی قابلِ توجہ ہے۔ پروفیسر شیرانی اس کے قائل تھے۔ یہ دونوں تبصرے تبصرہ نگار کی غیر معمولی علمی قابلیت اور ان کی محققانہ صلاحیت اور عمیق مطالعے کے مظہر ہیں۔ ان میں اتنا وافر مواد قلمی اور مطبوعہ ماخذوں سے فراہم کر دیا گیا ہے کہ مغلوں سے قبل کے فارسی ادب کی عمدہ تاریخ مدوّن ہو سکتی ہے۔ ان تبصروں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تبصرہ نگاری کے کیا اصول ہیں۔ حقیقی تبصرہ نگاری عمیق مطالعے اور دقیق فنی بصیرت چاہتی ہے۔

اب میں "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" کے تبصرے کے بعض امور کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیرانی صاحب کا یہ تبصرہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے زبردست ہدایت نامہ ہے اس لئے اس پر کچھ اور لکھنے کا موقع نہیں البتہ ادھر چند سالوں میں کچھ نیا مواد سامنے آگیا جس کا اعادہ تبصرے کی افادیت میں اضافے کا موجب ہوگا۔

ص ۸۴

خان آرزو نے غالباً مثمر میں شعر بالا بحوالہ دبستان المذاہب نقل کیا ہے۔

یہ قیاس بالکل صحیح ہے۔ مشمر کے کئی نسخے مل گئے ہیں اور مسلم یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے "مشمر" کا تنقیدی متن تیار کر دیا۔ دبستان المذاہب میں بھی یہ واقعہ درج ہے۔

ص ۵۲

ابو صالح منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۶)، دول اسلامیہ میں منصور بن نوح کا زمانۂ حکومت یہی ہے لیکن زین الاخبار گردیزی (طبع حبیبی، ص ۱۶۴) میں اس امیر کی وفات کی تاریخ ۱۱ شوال ۳۶۵ھ درج ہے اور ص ۶۸ پر اس کے جانشین نوح بن منصور پر تاریخ تخت نشینی ۳۶۵ ہجری دی ہوئی ہے۔

ص ۵۳

ابو منصور کا ذکر ابن الاثیر اور زین الاخبار میں ملتا ہے ابو منصور کے حالات کے مآخذ مرزا محمد قزوینی نے یہ لکھے ہیں:

زین الاخبار گردیزی، تاریخ بخارائے نرشخی، یتیمۃ الدھر ثعالبی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم مقدسی اور کامل ابن اثیر۔

اور انھوں نے ان ماخذ کی رو سے ابو منصور بن عبد الرزاق طوسی کے حالات کی تفصیل مع مقدمۂ شاہنامہ قدیم کے ایک استفادی متن کے ایک مقالے میں پیش کی ہے یہ مقالہ بیست مقالۂ قزوینی (ج ۲ ص ۲ بعد) میں شامل ہے۔

ص ۵۷

تاریخ سیستان کی تالیف ۴۴۸ میں نہیں بلکہ سن ۴۴۰ میں شروع ہوتی ہے۔ ملک الشعراء بہار نے اس کی تالیف کا زمانہ ۴۴۵ تا ۷۲۵ھ مقرر کیا ہے۔ اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں اس قول سے ہدایت ملتی ہے۔

"خطبہ کردن امیر طغرل محمد بن میکال ادام اللہ ملکہ بہ سجستان یوم الجمعہ الثامن

المحرم سن خمس واربعین واربعمائۃ "۔ (ص ۲۷۳)

بہر حال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف ۴۴۵ھ میں کتاب کی تالیف میں مصروف تھا۔ پس اس کے شروع کرنے کی تاریخ اس سے کچھ قبل سمجھنا چاہیئے۔

ص ۵۷

وہ (ابوحفص سغدی) ایک فارسی فرہنگ کا مولف ہے۔ فرہنگ ابوحفص سغدی پر قاضی عبدالودود کا ایک مقالہ مجلہ علوم اسلامیہ، ج ۱، نمبر ۱، میں شائع ہوا ہے جس میں اس کے زمانے وغیرہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور اس فرہنگ کے بعض مندرجات فرہنگ سروری، جہانگیری اور مؤید (؟) دری سے حاصل کیے گئے ہیں۔

ص ۱۳۵

عمید سنامی کی نسبت تولکی بیان کی ہے مگر اس نام کا کوئی قصبہ معلوم نہیں۔

صحیح نسبت لویکی ہے اور لویک، غزنہ اور کابل کے (غزنوی سلاطین سے قبل کے) حکمرانوں کا خاندان تھا۔ اس کی تفصیل بعد میں پیش کی جائے گی۔

ص ۱۵۸

فخر مدبر کی کتاب "آداب الحرب والشجاعۃ" اس کتاب کی دو روایتیں تھیں۔ پہلی کا عنوان "آداب الحرب والشجاعہ" ہے۔ اس میں ۳۴ ابواب ہیں۔ اس کے نسخے مل جاتے ہیں۔ رام پور اور برٹش میوزیم کے نسخے اسی روایت کے ہیں۔ بعد میں فخر مدبر نے اس پر نظر ثانی کی اور اس میں چھ ابواب کا اضافہ کر کے اس کا نام "آداب الملوک وکفایۃ المملوک" رکھا۔ اس کا ایک اہم نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانے میں ہے[1]۔ آقای احمد سہیلی خوانساری

---

[1] پروفیسر شیرانی کے ذخیرے میں جزو دوم کا ایک نسخہ موجود ہے جس کی کتابت ۷۰۱ھ کی ہے (شمارہ ۱۵۴/۲۵۸۱)

نے "آداب الحرب" کا ایک انتقادی متن تہران سے ۱۳۳۶/۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے بنیاد فرہنگ کی طرف سے باقی چھ ابواب محمد سرور مولائی کی تصحیح سے الگ شائع ہو گئے ہیں۔ یہ کتاب عرصے سے علمار و فضلار کی مرجع توجہ رہی ہے چنانچہ ہندوستان، ایران، افغانستان وغیرہ میں اس پر متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً۔

عبدالحی حبیبی (افغانستان) آریانا، ج ۶، شمارہ ۷۔

سرور گویا (افغانستان)	کابل، ج ۹، شمارہ ۱۲
عبدالحسین میکدہ (ایران)	مہر، ج ۲
	دانش، ج ۲
پروفیسر محمد شفیع (پاکستان)	اورینٹل کالج میگزین، ج ۱۴
آغا عبدالستار (پاکستان)	اسلامک کلچر حیدرآباد، اکتوبر ۱۹۳۸ء
ڈاکٹر ممتاز علی خاں (ہندوستان)	"تیرھویں صدی کے نثر نویس (انگریزی) علی گڑھ ۱۹۷۰
ڈاکٹر محمد صابر خاں (ہندوستان)	انڈو ایرانیکا، کلکتہ ۱۹۷۹ء

(صابر صاحب اس کے بعض اجزار کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔)

ص ۱۵۸

مویدجاجرمی کا احیار العلوم کا ترجمہ

یہ ترجمہ بنیاد فرہنگ تہران کی طرف سے چھ جلدوں میں چھپ چکا ہے اس کا انتقادی متن خدیوجم نے تیار کیا ہے اور پہلی جلد ۱۳۵۱ شمسی/۱۹۷۲ء میں چھپی ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ مترجم کا نام موید الدین محمد خوارزمی چھپا ہے۔ یہ نام اور نسبت سب غلط ہے دراصل اس کا نام مجد الدین ابو المعالی موید بن محمد جاجرمی تھا جیسا کہ قدیم ترین مخطوطے سے، پروفیسر محمد شفیع کے کتاب خانے میں ہے، ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں:

"مترجم مولانا علامہ مجد الملۃ والدین قدوۃ المحققین خاتم المجتہدین امام النقل والعقل الہادی الی اللہ ابو المعالی موید بن محمد الجاجرمی قدس اللہ روحہ العزیز"

اورینٹل کالج میگزین ۵۳ ۱۹ء)۔

ایک جگہ یہ نام اختصاراً اس طرح ملتا ہے۔

"موید محمد جاجرمی کہ مترجم این کتابست"

واضحاً موید محمد میں اضافت بنی ہے یعنی موید بن محمد۔

امیر خسرو دہلوی مجد الدین جاجرمی کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ انھوں نے احیاالعلوم کے ترجمے کو ایک نمائندہ سبک قرار دیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"طریقۂ دوم علمائے محقق، یہ طریقہ (روش یا سبک) ایسا ہوتا ہے کہ علم کے شاہراہ کے سالک عبارت کے چشموں کو اپنے تبحر علمی کی موجوں سے ایسی چاشنی دیتے ہیں کہ مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں جیساکہ مولانا بحر المعانی محمد غزالی کی فارسی تصانیف اور امام متبحر مجد الدین جاجرمی کا ترجمۂ احیا۔" (رسائل اعجاز خسروی، ص ۵۵، ۵۶)

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ مترجم احیاء العلوم مجد الدین جاجرمی تھے۔ موید الدین محمد خوارزمی سے ان کے نام کا کوئی تعلق نہیں۔ بخوبی ممکن ہے کہ امیر خسرو کی ابتدائی زمانے میں ان سے ملاقات بھی ہوئی اور اس میں تو شبہ نہیں کہ ان کو مصنف کے عہد کے نسخے تک رسائی رہی ہوگی۔ اس بنا پر ان کا قول ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہے۔ واضح قرائن کی بنا پر راقم نے بنیاد فرہنگ کے سربراہ ڈاکٹر خانلری صاحب کو ایک خط کے ذریعے اس غلطی کی طرف متوجہ کیا۔ حسین خدیوجم مصحح ترجمۂ احیاء نے لاہور آکر پروفیسر محمد شفیع کا نسخہ دیکھا، مجھ سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کو مطمئن کر دیا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ انھوں نے واپس جاکر ایک یادداشت میرے خط کی تردید میں چھاپا اور مترجم کے نام وغیرہ پر ان کا اسی طرح اصرار رہا مجبور ہو کر میں نے ایک مختصر سا جوابی مضمون سعید سیرجانی کے پاس مجلۂ سخن میں چھاپنے کے لئے اس غرض سے بھیجا کہ اس ترجمے کی کئی ہزار جلدیں ایسی فاحش غلطی سے محفوظ رہیں مگر وہ سب جلدیں غلط نام اور نسبت سے چھپ کر عام ہو چکی ہیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است۔

مگر میری کوشش تمام تر رائیگاں نہیں گئی۔ حبیبی صاحب سے معلوم ہوا کہ انھو
نے بھی میری تائید کرتے ہوئے خدیو جم صاحب کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا تھا مگر وہ
مانے بہرحال حبیبی صاحب کی تائید سے مجھے بڑی تقویت ہوئی۔

ص ۱۶۰

"دستور الشعراء مرتبہ ۸۰۳ھ مبارک شاہ والی جونپور کے نام پر لکھی جاتی ہے۔"

ص ۱۶۵

"دستور الشعراء جونپور میں ۸۰۲ھ میں تدوین ہوتی ہے۔ یہ اشعار کی بیاض ہے
اور نسخۂ اصل برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس میں بعض ہندوستانی شعراء کا کلام ہے۔"
راقم الحروف کو اس بیاض کے دو نسخوں کا حال معلوم ہے۔ ایک تو برٹش میوز
والا نسخہ جس کا تعارف ریو نے فہرست مخطوطات فارسی، تتمہ شمارہ ۲۷۴ کے ذیل میں
کیا ہے۔ دوسرا نسخہ کابل یونیورسٹی کی ادبیات کی فیکلٹی میں موجود ہے۔ برٹش میوزیم
نسخہ قدیم ہے لیکن شروع اور آخر سے ایک دو ورق غائب ہیں۔ کابل کا نسخہ مکمل ہے
اس کا دیباچہ بھی موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس بیاض کا نام دستور الشعراء نہیں
بلکہ مجموعہ لطائف و سفینۂ ظرائف ہے اور مرتب سیف جام ہروی ہے۔ یہ مجموعہ ایک طو
مدت میں مکمل ہوا۔ فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ - ۷۸۹ھ) کے زمانے میں یہ کام شروع ہو
جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے، جس میں مرتب سلطان کو درازیٔ عمر کی دعاء دیتا ہے
ظاہر ہے کہ:

"این بیت در وصف بنای قصر درگاہ بقاجوی، شہنشاہ اعظم فیروز معظم خلد ا
ملکہ و سلطانہ و اعلی امرہ و شانہ، شاعری بنشستہ است۔"
اس کے بعد لکھنوتی اور ٹھٹھہ کی مہم کا ذکر آیا ہے اس سے یہ بات پایۂ تحقیق
پہنچ جاتی ہے کہ فیروز شاہ سے مراد تغلق خاندان کا تیسرا سلطان فیروز شاہ تغلق ہے۔

دوسرا واقعہ جس سے مجموعے کی تاریخ میں مدد ملتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ سیف جام ہروی نے جونپور کے شرقی حکمران مبارک شاہ کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کئے ہیں ۔

"این شعر از گفتار خانزادہ عزیز اللہ بسطامی است دام فضلہ کہ بمدح سلطان الشرق خلد اللہ ملکہ بنشتہ است "

اور سلطان الشرق کا نام اس بیت میں آیا ہے ۔

کمال ذات او وا فر مبارک شاہ ظلّ حق الخ

اسی مناسبت سے شیرانی صاحب نے اس بیاض کو جونپور کی تالیف قرار دیا ہے۔ مگر اس کے بعض اور مندرجات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مرتب اس کی ترتیب میں بہت بعد تک مصروف رہا ہے ۔ راقم نے اس بیاض کے تعلق سے کئی مضامین لکھے ہیں ۔

ایک مضمون تغلق دور کے شعراء سے متعلق "نذر رحمٰن" لاہور اور فکر و نظر (اکتوبر ۱۹۶۵ء) علی گڑھ، میں شائع کیا ہے۔

ایک دوسرا مضمون جس میں اس بیاض میں شامل حافظ کی ۱۲۷ غزلوں سے بحث کی گئی ہے، ایران سوسائٹی کلکتہ کے مجلّے انڈو ایرانیکا ج ۲۹ بابت ستمبر ۱۹۶۶ء میں اس عنوان سے شائع ہوا ہے ۔

"A VERY OLD SOURCE OF HAFIZ'S GHAZAL"

حافظ کا انتقال ۷۹۲ھ میں ہوا ۔ اس زمانے میں سیف جام اپنی بیاض کی ترتیب میں مشغول تھا ۔ اور اگرچہ یہ معلوم ہے کہ مرتب نے حافظ کی وفات کے بعد اس کا کلام انتخاب کیا ہے لیکن حافظ کے دیوان کے قدیم ترین نسخے مفقود ہیں اور اگر ہم حافظ کے کلام سے انتخاب کی تاریخ ۸۰۳ ہجری کے نواح میں مقرر کریں تو بھی یہ حافظ کے کلام کے سلسلے کا شاید قدیم ترین نمونہ ہو، اس لئے کہ حافظ کے دیوان کا اتنا قدیم نسخہ نہیں ملتا ۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ حافظ کی منتخب غزلوں میں ایک غزل ایسی ہے جو اب تک کے دیوانوں خواہ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، میں شامل نہیں ہے ۔ یہ غزل لطائف کے دونوں نسخوں میں شامل ہونے کی وجہ سے آسانی سے جعلی قرار نہیں دی جاسکتی ۔

چند سال قبل مشہور ایرانی محقق پروفیسر مجتبیٰ مینوی مسلم یونیورسٹی میں آئے۔ میں نے اس نئی غزل کا مسئلہ چھیڑا۔ غزل سن کر فرمایا کہ اس کا سبک حافظ سے مختلف ہے لیکن جب ان سے یہ بات کہی گئی کہ یہ بیاض کے دونوں نسخوں میں موجود ہے، اس بنا پر یہ بات تو قطعی ہے کہ مرتب نے دیوان حافظ کے جس ہم عصر نسخے سے اشعار انتخاب کئے، اس میں حافظ کے نام یہ غزل تھی۔

اس غزل کا مطلع حسب ذیل ہے۔

ای وصل جان نوازت معمار خانۂ دل ¤ ای جان و دل زعلت مقصود کرده حاصل

یہ غزل محمود شاہ کے نام ہے۔ وہ شاہ شجاع کا بھائی تھا اور مبارز الدین محمد بانی سلطنت المظفر کا بیٹا تھا۔ شاہ شجاع سے سلطنت کے حصول کے سلسلے میں جنگ بھی ہوئی اس کا انتقال ۷۷۶ھ میں ۳۹ سال کی عمر میں ہوا۔ اس غزل پر ڈاکٹر ماریہ بلقیس (مسلم یونیورسٹی) نے ایک مقالہ "فکر و نظر" (مجلہ مسلم یونیورسٹی) ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ہے جس میں اس غزل اور اس کے ممدوح کے بارے میں مفصل بحث ملتی ہے۔

اسی بیاض کی رو سے ملک عزیز احمد بسطامی کا وہ قصیدہ موشح مجلہ فکر و نظر میں شائع کیا ہے جس کا تذکرہ شیرانی صاحب نے ص ۱۶۴ پر کیا ہے۔ یہ قصیدہ مبارک شاہ شرقی کی مدح میں ہے۔

چند اور مقالوں میں اس بیاض سے مدد لی گئی ہے۔ خصوصاً عمید لویکی والے مضمون میں جو فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ص ۱۶۰

"عہد علائی میں فخر الدین مبارک قواس غزنوی مولف فرہنگ نامہ ایک مشہور شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔"

دوبارہ صفحہ ۱۶۷ پر اس فرہنگ کی مختصر سی ترتیب کا بھی ذکر ہے۔ اس وقت شیرانی صاحب اس فرہنگ کے واحد نسخے کا مطالعہ کر چکے تھے لیکن پنجاب میں اردو لکھتے

وقت اور مقالات جلد اول کی ترتیب کے مواقع پر وہ اس فرہنگ سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے بعض بیانات میں کچھ سہو داخل ہو گیا ہے مثلاً پنجاب میں اردو میں لکھتے ہیں:

"ہندی فرہنگ نگاروں میں سب سے مقدم مولانا فخرالدین مبارک غزنوی قواس یا کمان گر ہیں جو علاءالدین خلجی کے زمانے کے مشہور و معروف شاعر ہیں ہندوستان میں ان کا فرہنگ نامہ فارسی لغات کا سنگ بنیاد ہے۔ ہماری نظر میں اس کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے وقت بعض موقعوں پر مصنف نے ہندی الفاظ بالخصوص دواؤں اور دیگر اشیاء کے نام دیئے ہیں۔"

اس کے بعد حسب ذیل آٹھ نو الفاظ کی فہرست اسی فرہنگ کے حوالے سے دی گئی ہے۔

اظفار الطیب کے لیے لکھتے ہیں: ہندش دکر ملکہ گویند، دوسرے معنی لکھتے وقت کہا ہے: بپارسی ناخن پریاں، ہندش نکھ نامند۔

ابر نیسان کے واسطے کہتے ہیں: اہل ہند آن را باران سورتی نامند۔

برستو، مرغی کہ ہندش بھکراج گویند۔

تاک، ہندش چھیکا نامند۔

چغوک قبرہ یعنی مالوزک و بہندوی منترہ گویند

کت، تخت ہندوان باشد میان بافتہ۔

قاقلہ سایہ پرورکہ بہندش الائچی گویند۔

ہفوش چیزی است خوردنی ..... ہندش بھاکہ نامند (منقول از موید الفضلا)

شیرانی صاحب نے یہ ساری تشریح موید الفضلا سے لی ہے جیساکہ وہ خود لکھتے ہیں:

"اگرچہ اصل لغات میری نظر سے نہیں گذرے ہیں لیکن مؤید الفضلا جس کو نول کشور نے چھاپ دیا ہے، میرے زیر نظر ہے۔ اس کی سند پر فرہنگ نامۂ قواس کے بعض الفاظ گذشتہ سطور پر نقل کئے ہیں۔"

اصل میں موید الفضلا میں فرہنگ قواس کے حوالے سے جو مندرجات ہیں، ان میں سے اکثر غلط ہیں اور جب موید کے قلمی نسخے اور مطبوعہ نسخے کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ آخر الذکر میں بعض ایسی غلطیوں کا اضافہ ہو گیا جو نسخۂ اصل میں نہ تھیں۔ بہر حال صاحب موید الفضلا کی قواس کی نسبت سے یہ غلطیاں شک پیدا کرتی ہیں کہ شاید صاحب موید نے براہ راست فرہنگ قواس سے استفادہ نہیں کیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے اس فرہنگ کا صراحتہً مقدمے میں ذکر نہیں کیا ہے۔

فرہنگ قواس خالص فارسی کا لغت ہے۔ اس میں عربی کے الفاظ شامل نہیں اور صاحب موید نے اس کے حوالے سے متعدد عربی الفاظ کے علاوہ بعض ترکی الفاظ درج کر دیے ہیں۔ ان میں سے کوئی لفظ قواس میں شامل نہیں۔ یہی حال اظفار الطیب کا ہے جس کے ذیل میں قواس کے یہاں ایک اردو مترادف بتایا گیا ہے۔

پنجاب میں اردو میں فرہنگ قواس کے حوالے سے جو آٹھ لفظ بتائے گئے ہیں، ان میں سے چھ اس فرہنگ سے غائب ہیں۔ صرف، کت، اور چغوک قابل ذکر ہیں۔ کت، کھاٹ، کھٹ کا معرّس ہے، جو مدتوں پہلے فارسی میں رائج ہو چکا تھا۔ دوم اس کی حیثیت فرہنگ قواس میں الگ لفظ کی ہے، معنیٰ کی نہیں اور اس کو فارسی کا لفظ قرار دیا گیا ہے۔ چغوک کی یہ تشریح مطبوعہ نسخے میں ملتی ہے۔

"چغوک پرندہ ایست آبی کہ آن را چرز گویند و در فرہنگ نامہ است
چغوک قبرہ یعنی مانورک و بہندی ممرہ گویند و بواو فارسی نیز گویند کذا
فی زفان گویا۔"

لیکن یہ بیان قلمی نسخے سے سراسر مختلف ہے اور اس اختلاف کی توجیہ سے میں سراسر قاصر ہوں۔ دو مخطوطوں کی عبارت چغوک کے سلسلے کی یکساں، یہ ہے:

"چغوک پرندہ ایست کہ آن را سرخاب نیز گویند کذا فی زفان گویا۔"

بہر حال چغوک کے مترادف "ممرہ" سے فرہنگ قواس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرہنگ قواس میں اردو / ہندی کے الفاظ ہیں، جن کی

تفصیل راقم حروف نے ارمغان علی ۱۹۷۱ء کے مقالے "فارسی کی قدیم فرہنگوں میں ہندوستانی عنصر" پیش کی ہے۔ فی الحال حسب ذیل آٹھ لفظ فرہنگ قواس کے نسخے میں ملتے ہیں:

۱۔ خرچکوک : بھتل (گیاہ)
۲۔ کوم : کھیل (گیاہ)
۳۔ خرزہرہ : کنیر
۴۔ بکول : جھج (جھجّا)
۵۔ دردک : جھر
۶۔ کلنبہ : لڈو
۷۔ بادکش : پکھ (پنکھا)
۸۔ پنجک : گالہ (گالا)

ان میں آخری چھ لفظ خاصے قابل توجہ ہیں۔ ان میں کنیر، جھجّر، لڈّو، گالا بعینہٖ اسی صورت میں آج بھی مستعمل ہیں۔ جھج اور پکھ میں ذرا تغیّر ہو گیا ہے لیکن سات سو برس کی طویل مدّت کے لحاظ سے یہ تغیر کچھ بھی نہیں۔ البتہ بھتل اور کھیل آج متروک ہیں۔

ارمغان علمی کے مقالے کے دوسرے حصّے میں دستور الافاضل میں شامل سات اردو/ہندی لفظوں کی مفصّل بحث شامل ہے۔

فرہنگ قواس اور دستور الافاضل راقم حروف کی ترتیب سے تہران سے شائع ہو گئی ہیں۔ اول الذکر بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب سے ۱۹۷۴ء میں اور دستور، بنیاد فرہنگ کی طرف سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

مطبوعہ فرہنگ قواس کے مقدمے میں موید الفضلا کے غلط مندرجات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ص ۱۶۵، ۱۶۷

اس کی تالیف کا سن ۹۲۴ھ ہے جیسا کہ مقالات ج ۶، ص ۱۶۷ پر موجود ہے۔

اس موقع پر یعنی ۲۴ ۱۹ء میں اس لغت کا واحد ناقص نسخہ، جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے، شیرانی صاحب کے سامنے ہے لیکن اس سے قبل وہ اس کا ذکر دوسری کتابوں کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اسی بنا پر سال تالیف ۷۷۲ اور دور فیروز شاہ تغلق غلط درج ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے ج اول، ص ۱۰۲ و ۲۱۷۔ اس فرہنگ کا ایک ناقدانہ ایڈیشن راقم کی ترتیب اور مقدمے کے ساتھ بنیاد فرہنگ، تہران نے ۱۳۵۲ شمسی میں شائع کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے (ناقص) مقدمے میں فرہنگ قواس کے مقدمے کی عبارت منقول ہے۔ اور خود فرہنگ قواس کا مقدمہ ابتدا سے ناقص تھا۔ اب آخرالذکر کے مطبوعہ نسخے میں اس نقص کا جبران دستورالافاضل کے مقدمے سے کر دیا گیا ہے۔

دستورالافاضل، استاد آباد، دکن (موجودہ گوگی) میں ۷۴۳ھ میں بہمنی حکومت کے قیام کے قبل ہی لکھی جا چکی ہے۔ اس بنا پر یہ دکن میں فارسی کی دریافت شدہ کتابوں میں سب سے قدیم تصنیف ہوگی۔ اس فرہنگ کے سلسلے کے دو تاریخی امور خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔ (۱) ممدوح یعنی شمس الدین خجیری کی شخصیت کے تعین کا مسئلہ۔ (۲) استاد آباد کے والد احمد بن علی خجیری کی بنا کردہ ایک مسجد کا کتبہ ۷۲۷ھ کا مل گیا ہے اس سے شمس الدین کی شخصیت کا باقاعدہ تعین ہو گیا۔ پھر استاد آباد کے قلعے کی تعمیر کا کتبہ ۷۳۸ھ کا مل گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس سال یہ قلعہ ملک الشرق قوام الدین قتلغ خاں استاد محمد بن تغلق شاہ کے حکم سے تعمیر ہوا۔ اس سلسلے کی ساری تفصیل فرہنگ دستورالافاضل کے مطبوعہ نسخے کے مقدمے میں راقم نے درج کر دی ہے۔ مقدمے ہی میں اس میں پائے جانے والے ہندی اردو الفاظ کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے لیکن اس سے زیادہ مفصل بیان ارمغان مالک والے مضمون میں پایا جاتا ہے، جس کا دوسرا حصہ دستورالافاضل کے ہندی اردو الفاظ ہی پر ہے۔

ص ۱۶۹

زفان گویا از مصنفات ملا رشیدی برادر جد ابراہیم فاروقی۔

شیرانی صاحب کو زفان گویا کے ہندوستانی الفاظ موید الفضلا کے وسیلے سے ملے تھے جس کے بارے میں انھوں نے پنجاب میں اردو میں اشارہ کیا ہے۔

اب زفان گویا کے دو نسخے مکشوف ہو گئے ہیں۔ ایک بانکی پور، پٹنہ اورینٹیل پبلک لائبریری میں، دوسرا لینن گراڈ (روس) کے کتاب خانے میں۔ اول الذکر کا تعارف پروفیسر سید حسن کے توسط سے جولائی ۱۹۶۲ء کے مجلہ فکر و نظر میں ہوا۔ دوسرا نسخہ روسی مستشرق س۔ا۔ بایفسکی کے ذریعہ پیام نوین، شمارہ ۹، تہران، ۱۳۴۴ شمسی میں متعارف ہوا۔ بعد میں میرے ایک مضمون کے وسیلے سے بایفسکی کو پٹنہ کے نسخے کا علم ہوا تو اس نے اس کا عکس حاصل کیا اور ۱۹۷۴ء میں اس کے الفاظ کی فہرست، روسی نسخے کے غائب اوراق کے مندرجات اور آخر میں روسی نسخے کا عکس، ایک روسی مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ مطبوعہ نسخہ اغلاط سے پُر ہے۔ غرض اس فرہنگ کے انتقادی متن کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے راقم کے پاس دونوں نسخوں کا عکس موجود تھا۔ بنا بریں اس کا ایک انتقادی متن تیار ہو گیا ہے، مگر پبلشر کی تلاش میں اب تک یہ کتاب تعویق میں پڑی ہوئی ہے۔

زفان گویا کا مولف بدر الدین ابراہیم ہے جو اس کے مختصر دیباچے میں اپنا نام بدر ابراہیم لکھتا ہے۔ بظاہر اس فقرے میں اضافت اپنی صرف ہوئی ہے یعنی مؤلف کے باپ کا نام ابراہیم ہوگا۔ شیرانی صاحب کے یہاں سہواً مولف کا نام ملّا رشیدی لکھا ہے۔ اور اس کو ابراہیم بن قوام فاروقی صاحب شرفنامہ کے دادا کا بھائی قرار دیا ہے۔ یہ آخری اطلاع شرف نامہ کی ہے اور غالباً صحیح ہوگی۔ لیکن اسی فرہنگ کے کسی جملے سے مؤلف کے نام میں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ فرہنگ جہانگیری میں بھی زفان کے مولف کا نام بدرالدین آیا ہے۔

راقم نے پروفیسر شیرانی کے تتبع میں دو فرہنگوں یعنی زفان گویا اور ادات الفضلا میں شامل اردو/ ہندی الفاظ کی بنیاد پر رسالہ اردو، کراچی میں دو مقالے لکھے ہیں۔ ان فرہنگوں اور ان کے مولفین کے متعلق ضروری معلومات بھی مختصر طور پر شامل کر دی گئی ہیں۔

ص ۱۶۱

حمید قلندر ایک شاعر گذرے ہیں، خیر المجالس ان کی تدوین ہے۔
حمید قلندر کے چند قصیدے اور متفرق اشعار جو مجموعہ لطائف و سفینۂ ظرائف، خیر المجالس وغیرہ میں نقل ہیں، ان کی رو سے راقم نے ایک یادداشت نذر رحمٰن اور پھر فکر و نظر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دی ہے۔ خیر المجالس کا ایک انتقادی متن پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کر دیا ہے۔

ص ۱۶۲

مظہر کے دیوان کی ترتیب میرے ایک شاگرد ڈاکٹر عبدالرزاق، لکچرار مسلم یونیورسٹی کے ذریعے عمل میں آگئی ہے مگر ابھی یہ کتاب چھپ نہیں سکی ہے۔
مظہر کا نصاب "نصیب اخوان" راقم کے اعتبار سے مجلّہ علوم اسلامیہ، دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ص ۱۶۳

غنیۃ المنیہ، ہندی موسیقی پر ایک قابل قدر تالیف ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ کتاب جناب شہاب سرمدی کی توسط سے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کی طرف سے چھپ گئی ہے۔

ص ۱۶۴

ملا داؤد کی چنداین جو لورک اور چندا کے قصے پر مبنی ہے، چھپ گئی ہے مگر ہندی رسم خط میں۔ اس پر ہندی میں کافی کام ہو چکا ہے۔ مشہور مورخ پروفیسر سید حسن عسکری نے بھی شروع میں بیش قیمت مقالے لکھے تھے۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی "لورک و

چند ہندوی فارسی روپ میں" کے عنوان سے انڈو ایرانیکا ۱۹۶۶ء میں ایک مقالہ سپرد قلم کر چکے ہیں۔

ص ۱۶۴

مولانا جمالی کی مثنوی مہر و ماہ پاکستان میں چھپ چکی ہے۔ کلیات کا نسخہ رام پور میں موجود ہے۔ قصائد کا ایک اچھا نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ اس پر دو امتحانی مقالے بھی لکھے گئے۔ ایک تہران میں، دوسرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں۔

سکندر لودی کے زمانے کی ایک قابل قدر فارسی تالیف لمحات سکندر شاہی ہے۔ یہ ضخیم کتاب ہندوستانی موسیقی پر ہے۔ اس کے دو ناقص نسخے معلوم ہیں۔ ایک لکھنؤ یونیورسٹی میں جس کا تعارف راقم حروف نے اسلامک کلچر ۱۹۵۶ء میں کرایا تھا، دوسرا مدراس گورنمنٹ اورینٹیل لائبریری میں۔

ص ۱۶۵

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی کا ترجمہ ہزاری باغ کے ایک مشنری فاضل نے انگریزی میں کیا ہے۔ وہ امریکہ سے شائع ہونے والا تھا، شاید ہو بھی گیا ہو۔ ادھر امریکیوں میں اسلامی تصوف کے مطالعے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے اس سلسلے کی ایک کڑی ایک امریکی استاد رابرٹ بروس ہے، جس نے سودمند مقالے تصوف کے موضوعات پر شائع کیے ہیں۔ ہزاری باغ والے مشنری نے پٹنہ یونیورسٹی سے شیخ منیری پر پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کی ہے۔

ص ۱۶۶

عمید لومکی کی جگہ عمید لوکی صحیح ہے۔

ص ۱۶۶

جمال الدین استاجی، مغیث ہانسوی اور اخشان صدر علا کے مکشوف اشعار کی بنا پر راقم نے ایک مضمون انڈو ایرانیکا میں شائع کیا ہے۔ ان کا اہم ماخذ مجموعۂ لطائف ہی ہے۔

ص ۱۶۶

شرح مخزن کی مفصل شرح نہیں ملتی۔
برٹش میوزیم میں مولانا محمد بن قوام بن رستم کرئی کی شرح مخزن کا نسخہ ہے۔ اس کا ایک عکس راقم نے منگایا تھا اور وہی زیر مطالعہ رہا۔

ص ۱۶۹

مولانا محمد داؤد شادی آبادی کے مفتاح الفضلا کا ایک مصور نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس پر ایک مضمون میوزیم کے جرنل "برٹش میوزیم کوارٹرلی ۱۹۶۵ء (ج ۲۹، ص ۱۵ - ۱۹) میں نورتھو۔ م۔ ٹٹلے نے لکھا تھا۔ انجمن اساتذہ فارسی کے دسمبر ۱۹۷۹ء والے سشن منعقدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک مضمون ڈاکٹر ماریہ بلقیس نے اسی فرہنگ پر پڑھا تھا۔ اس کے ایک نسخے کا حوالہ فرہنگ نظام جلد اوّل میں ملتا ہے۔ مگر اب حیدرآباد کے کسی کتب خانے میں اس نسخے کا پتہ نہیں۔

ص ۱۶۸

استان آباد غلط ہے، استاد آباد ہونا چاہیئے۔
یہاں بعض ایسی کتابوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو شیرانی صاحب کے تبصرے یعنی ۱۹۴۳ء کے بعد سے دریافت ہوئی ہیں۔

التمش کے دور میں ابوبکر کاسانی نے بیرونی کی کتاب صیدنہ کا ترجمہ، جو مفردات طب پر ایک اہم تصنیف ہے، فارسی میں کیا تھا۔ اس کے اب متعدد نسخے ایران اور یورپ میں مل گئے ہیں۔ راقم الحروف نے ۱۹۶۱ میں انڈوایرانیکا میں اس ترجمے پر ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ پھر اس کا ایک عکسی ایڈیشن بھی مع ایک تفصیلی مقدمے کے تیار کیا جو تہران میں ناقص طور پر چھپنے کی وجہ سے عام نہیں ہوسکا۔ اس کے نصف اوّل کو ایرج افشار نے بغیر مقدمہ کے شائع کر دیا ہے۔ عربی صیدنہ ہمدرد وقف بورڈ نے کراچی سے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ہے، اس کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ اس کا دوسرا جز انگریزی میں ہے، اس کے مرتبہ SMITHSONIAN انسٹی ٹیوٹ واشنگٹن کے پروفیسر سامی ہمرنہہ (SAMI-K-HAMARNEH) ہیں۔ یہ حصہ مقدمہ، تفسیر اور تنقید پر مشتمل ہے۔

عوارف المعارف مولفہ شیخ شہاب الدین سہروردی کا سب سے قدیم فارسی ترجمہ اچہ میں قاسم داؤد خطیب اچہ کے توسط سے ہوا۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے اشارے سے یہ ترجمہ وجود میں آیا تھا اور وہاں کے آزاد حکمران تاج الدین ابوبکر ایاز کے نام معنون ہوا۔ اس بنا پر اس کا زمانۂ تالیف ۶۳۹ھ کے بعد ہے۔ اس ترجمے کے دو نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ایک کتاب خانہ آصفیہ میں، دوسرا مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں ہے۔ پہلے نسخے پر سخاوت مرزا کی مختصر یادداشت مجلہ فکر و نظر میں شائع ہوئی۔ راقم نے بطور تتمہ مترجم کے حالات اور ممدوح کی شخصیت پر کافی مواد اسی مجلے میں شائع کیا۔ اس ترجمے کے ذریعے اس دور کی دو اہم سیاسی شخصیتیں، یعنی سلطان تاج الدین ابوبکر ایاز اور ان کے والد ایاز منکبرنی، تاریخ کے صفحات پر ابھریں۔ اسی سلطان تاج الدین ابوبکر کی مدح میں عمید لویکی کے چند قصیدے بھی موجود ہیں۔

علاء الدین محمد خلجی (۶۹۵ - ۷۱۵) کے دور کی ایک تصنیف، جامع الحکایات کا ایک نسخہ ماسکو کے موسسات مطالعات شرقی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ اس میں فرضی حکایتیں ضحاک، بزرجمہر، نوشیرواں اور بہرام گور وغیرہ کی ہیں۔ چند حکایتیں

حیوانات سے بھی متعلق ہیں۔کتاب سات باب میں ہے۔اس میں محمد بن تغلق کا نام بھی آیا ہے، گو کتاب کا تعلق علاء الدین سے ہے ماسکو کا یہ نسخہ آٹھویں صدی ہجری کا ہے۔اس کی ایک نقل شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔

محمد بن تغلق کے دور کی ایک مشہور تصنیف بساتین الانس نام کی ہے۔اس کے مولف کا نام محمد صدر علاء دبیر عبدوسی ملقب بہ تاج و مشہور بہ اختسان الہندی ہے۔ یہ کتاب ۷۲۵ھ میں یعنی محمد تغلق کی تخت نشینی کے پہلے سال ہی تصنیف ہوئی۔ اختسان اس دور کی اہم شخصیت ہے۔محمد بن تغلق نے اس کو ایران کا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔اس کا ذکر مجمل فصیحی میں موجود ہے۔ راقم نے اس خط و کتابت کا پتہ چلا لیا ہے جو اختسان کے ذریعے ایران کے بادشاہ ابوسعید کے نام بھیجا گیا تھا۔

بساتین الانس کے تین نسخے مکشوف ہوئے ہیں۔ایک نسخہ ماسکو کے موسسات مطالعات شرقی میں ہے جو ۲۷ ذی الحجہ ۸۳۶ھ میں ہرات میں لکھا گیا۔کاتب قوام بن محمد مازندرانی ہے۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔اس کی کتابت صفر ۱۰۷۴ھ میں ہوئی۔اس نسخے کی بنیاد پر پروفیسر حسن عسکری نے ایک تفصیلی مقالہ بہار ریسرچ سوسائٹی جرنل ۱۹۶۲ء (سیکشن ۲، ص ۱-۲۹) میں شائع کیا تھا۔راقم نے اپنے ایک مضمون مشمولۂ انڈو ایرانیکا بعنوان THREE LITTLE KNOWN POETS OF PERSIAN میں اختسان کے چند قصائد بساتین اور مجموعۂ لطائف سے منتخب کر کے شائع کئے ہیں۔بساتین کا ایک تیسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے، جس کا تعارف پروفیسر نکہت سعیدی نے کابل کے مجلۂ کتاب، سال دوم، شمارہ ۴، ۱۳۵۸/۱۹۸۰ء میں شائع کیا ہے۔راقم اس کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ متعدد کتابیں کشمیر، گجرات، دکن، مالوہ وغیرہ میں لکھی گئیں۔ان میں سے بعض خاصی قابل توجہ ہیں اور ان کے ذکر سے تاریخ ادب فارسی خالی نہ ہونا چاہیئے۔مثلاً دکن میں حضرت گیسو دراز کی تصانیف، عبدالعزیز بن شیر ملک واعظی کی دو کتابیں جو دو عارفوں یعنی حضرت گیسو دراز اور شاہ نعمت اللہ ولی سے متعلق ہیں۔

دیوان نظیری طوسی، دیوان عیانی ۔ ریاض الانشا د مناظر الانشا تالیف محمود گا واں وغیرہ یا گجرات کی تاریخیں از قسم طبقات محمود شاہی، تاریخ گجرات مولفہ شرف الدین محمد بن احمد بخاری، مآثر محمود شاہی وغیرہ ۔ مالوہ کی مآثر محمود شاہی، کالپی کی تاریخ بہادر خانی وغیرہ اہم تصانیف ہیں ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شمس العلماء عبدالغنی کی تاریخ ادب فارسی میں بڑی خامیاں پائی جاتی ہیں ۔ شیرانی صاحب کا ہندوستان کے فارسی ادب پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی خامیوں کا ازالہ کیا ۔ یہ خامیاں معلوم مواد کے غلط طور پر برتنے اور خاصی تعداد میں اس دور کے مواد سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں شیرانی صاحب نے ان غلطیوں کی اصلاح اور بہت سے نئے مواد کی طرف رہنمائی کر دی ہے ۔ اس کی وجہ سے یہ تبصرہ ایسا ہے جس سے تبصرہ نگاری کے اصول مرتب ہو سکتے ہیں دراصل یہ کام نہایت مشکل ہے اور بڑی دقت نظری اور عمیق مطالعے کا متقاضی ۔

شیرانی صاحب کے تبصرے کو تقریباً ۲۰ سال گزر چکے ہیں ۔ اس درمیان میں متعدد کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں ۔ ان میں سے بعض کی طرف راقم حروف نے اشارہ کیا ہے تاکہ تاریخ ادب لکھنے والوں کو تاریخ نویسی میں مدد ملے ۔ بعض کتابیں جو قلمی شکل میں تھیں اور اب چھپ گئی ہیں، ان کا ذکر بھی کر دیا ہے ۔

آخر میں ڈاکٹر اقبال حسین کی کتاب "قدیم فارسی شعراء" پر شیرانی صاحب کے تبصرے کے ایک مختصر جائزے پر میں اپنی گفتگو قارئین کرام کی معذرت کے ساتھ ختم کر دوں گا ۔

اقبال صاحب کی کتاب میں چھ شاعروں پر تبصرہ ہے یعنی نکتی، رونی، مسعود سعد، ریزہ، شہاب مہمرہ، عمید ۔ شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر چند شاعر از قسم حمید الدین مسعود شالی کوب، منہاج سراج بلکہ ناصر الدین قباچہ سے وابستہ شعراء شامل کر دیے جاتے تو کتاب زیادہ وقیع ہو جاتی ۔ اس کتاب پر تبصرے کے موقع پر شیرانی صاحب نے ان چھ شاعروں کے دواوین کے علاوہ ان سے متعلق جو مواد ادھر اُدھر پھیلا تھا ۔ اس پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور اس بنا پر ڈاکٹر اقبال صاحب کی کتاب پر خاطر خواہ

اضافہ کیا ہے۔

ابوالفرج رونی کی وفات کے بارے میں شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ وہ ۴۹۲ھ کے کافی بعد فوت ہوا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو قصیدوں سے نئے طرز سے استدلال کیا ہے۔ ایک قصیدے میں آبان اور عید کے ایک ساتھ وقوع سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ جشن ۱۰۔ آبان ۴۷۱ یزدجردی کو منایا گیا جو ۱۱۔ ذی الحجہ ۴۹۵ھ کے مطابق ہے۔ اس سے رونی کی حیات ۴۹۵ھ کے بعد تک ثابت ہے۔ ایک دوسرے قصیدے میں ماہ تیر اور روزہ کشائی وعید کا ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رمضان تیر ماہ میں واقع ہوا تھا۔ تقویم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۰۔ تیر ۴۷۲ یزدجردی کو ۴۹۷ھ کے رمضان کی پہلی تاریخ تھی اس سے مزید ثابت ہوا کہ رونی ۴۹۷ھ تک تو یقیناً زندہ رہے۔

مسعود سعد سلمان کا حال ڈاکٹر اقبال نے زیادہ تر مرزا محمد قزوینی کے رسالہ مسعود سلمان سے لیا ہے۔ شیرانی صاحب نے آخرالذکر رسالے کی روشنی میں اقبال صاحب کے بیان کو جانچا تو اس میں کافی فرق ملا۔ شیرانی صاحب کو شکایت ہے کہ اقبال صاحب قزوینی صاحب کے ممنون ہیں لیکن انھوں نے اپنی ممنونیت کے اظہار سے گریز کیا ہے۔ موصوف قزوینی اور اقبال صاحب کے بیانات کو جانچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال صاحب، جہاں جہاں مرزا (قزوینی) سے مختلف الرائے ہوئے ہیں۔ مطلق کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ الٹے مشکلات میں گرفتار ہو گئے۔

تاج ریزہ کے ذیل میں ڈاکٹر اقبال کی اس لغزش کا ذکر کرتے ہیں۔ جس میں ڈاکٹر صاحب تعقی اوحدی اور ہدایت کے قول کو رد کرتے ہوئے ریزہ کے قصیدے افزود باز رونق ہر مرغزار گل الخ کو انوری کی ملکیت قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ انوری کے دیوان میں الحاق کے معاملے سے بے خبر تھے۔ وائے رے بے خبری۔

ان کوتاہیوں کے باوجود شیرانی صاحب کے یہ عادلانہ بیان ملاحظہ ہوں:

"اور جس قدر ذرائع معلومات ان شعراء کے لئے میسر ہیں، ڈاکٹر اقبال حسین

نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور سارے مواد کو خوش اسلوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے ۔" (مقالات، ج ۶، ص ۱۰)

"قدیم شعرائے ہند پر قلم اٹھانا کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مترادف ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین اس سنگلاخ اور بنجر زمین میں اپنی تیشہ زنی اور جگر کاوی پر مستحق مبارکباد ہیں ۔" (ایضاً، ص ۹ - ۱۰)

"تاج ریزہ، شہاب مہمرہ اور عمید سنامی کے سلسلے میں تمام ذرائع سے ضروری اطلاع فراہم کر لی گئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دراز عرصے تک ان شعراء پر جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے، اس پر جدید اضافہ نہیں ہو سکے گا ۔"
(ایضاً ص ۳۲)

شیرانی صاحب کے اس آخری جملے سے متاثر ہو کر میں نے اس دور پر تھوڑی سی توجہ کی تو چند دنوں کی کوشش سے عمید سنامی کے حالات و کلام کے کئی نئے ماخذ سامنے آئے ۔ ڈاکٹر اقبال صاحب کے پیش نظر منتخب التواریخ، خلاصۃ الاشعار اور عرفات العاشقین کے علاوہ عمید کے کلام کا کوئی اور ماخذ نہ تھا ۔ مجھے ان کے علاوہ حسب ذیل کتابوں میں عمید کا کافی کلام مل گیا ۔

۱ ۔ مونس الاحرار کلاتی، تالیف ۷۰۲ھ، واحد نسخہ، ذخیرۂ حبیب گنج، کتاب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔
۲ ۔ مونس الاحرار جاجرمی، تالیف ۷۴۱، مطبوعہ تہران، در دو جلد ۔
۳ ۔ مجموعۂ لطائف و سفینۂ ظرائف، نسخۂ موزۂ برطانیہ و دانش گاہ کابل ۔
۴ ۔ خلاصۃ الاشعار تقی کاشی، ضمیمہ نسخہ، کتاب خانہ بانکی پور، پٹنہ ۔
۵ ۔ مجلۂ ارمغان، ج ۲۱، مطبوعہ تہران ۔
۶ ۔ فرہنگ جہانگیری ۔ اس میں کئی سو اشعار الفاظ کی تشریح کے ضمن میں نقل ہوئے ہیں ۔

ان منابع کی روشنی میں راقم نے ایک مقالہ فکر و نظر، بابت اکتوبر ۱۹۶۴ میں

لکھا ہے اور عمید کے جدید کلام پر جو ڈاکٹر اقبال کے دریافت کئے ہوئے کلام کے تقریباً برابر ہوگا، تنقیدی بحث کی۔ اس میں عمید کے ممدوحین کا بھی تذکرہ کیا ہے اس کے ممدوحین میں سلطان تاج الدین ابوبکر ایاز کا نام ملتا ہے۔ یہ وہی سلطان ہے جس کے نام داؤد خطیب اچہ نے عوارف المعارف کا فارسی ترجمہ معنون کیا تھا۔ اس سلطان کی شخصیت پر تاریکی کا پردہ تھا۔ راقم نے پہلی بار فکر و نظر، جولائی ۱۹۶۳ء میں اس کی شخصیت کے باقاعدہ تعین میں کامیابی حاصل کی۔ پھر عمید سنامی کے دو مدحیہ قصیدوں کی بنا پر اس نوجوان سلطان کی شخصیت اور بھی زیادہ روشن ہوگئی۔

راقم حروف کو عمید کی طرف منسوب آٹھ قصیدوں کے بارے میں شک رہا لیکن بعد میں ان میں سے حسب ذیل چار قصیدوں کی جو مونس الاحرار کلاتی میں ایک ساتھ نقل ہیں، فراہانی کی مشکلات انوری کی وجہ سے اصالت متعین ہوگئی۔

۱۔ گفتم چہ سری داری گفتا سر وفا الخ

۲۔ چون است حال من بمن امروز یار گفت الخ

۳۔ پیام دادم نزدیک آن بت دلبر الخ

۴۔ اگر نہ مست شد بلبل فغاں چندین چرا دارد الخ

ان میں دوم اور چہارم کے اشعار مشکلات انوری میں عمید کے نام سے درج ہیں البتہ حسب ذیل چار قصیدوں کا عمید کی طرف انتساب غلط ہے۔

۱۔ آہن دنی چون پدید آمد ز صنع کردگار۔

(منقول در خلاصۃ الاشعار (دوبار) و مونس الاحرار کلاتی)۔

لیکن یہ معزی کا ہے۔ اس کے دیوان میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ سوزنی نے اس کے مطلع کی تضمین کی ہے۔

۲۔ زلف نگار گفت کہ من از قیر و عنبرم (منقول در خلاصۃ الاشعار و مونس الاحرار)

یہ قصیدہ کمالی کا ہے۔ لباب الالباب اور حدائق السحر میں کمالی کے نام سے درج ہے۔

شمسی بنام عمید از روی سفینۂ کہن سال) ۔ مگر یہ معزی کا ہے اور اس کے دیوان چاپ عباس اقبال، ص ۵۹۵ میں شامل ہے ۔ اس کے علاوہ شمس قیس رازی نے المعجم (چاپ مدرّس) ص ۲۷۷ میں اس کو معزی ہی کا بتایا ہے ۔

۴۔ ای خط مشکین شمائل روی تو سیمین سپر۔ یہ قصیدہ مجلہ ارمغان میں قصیدہ نمبر ۳ کے ساتھ آیا ہے ۔ چونکہ اس کی نسبت غلط ہے اس وجہ سے اس کا نمبر بھی غلط ہو گیا لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کا ہے ۔

۱۹۷۲ء میں عمید کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ممبئی سے ملا ۔ اس سے عمید کی زندگی کے بعض گوشے پوری طرح روشن ہوئے ۔ مثلاً اس کا نام فضل اللہ تھا ۔ اس کا ایک بیٹا محمّد شیر تھا جو شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا ۔ عمید نے طویل عمر پائی ۔ اس کو نعتیہ کلام سے دلچسپی تھی ۔ مشہور قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے ۔

چہ بہر مرا زمانہ بکف از چمانۂ غم　　　بہ بساط بزم گیتی قدح ستم دمادم

اور جو مجموعۂ لطائف و سفینۂ ظرائف میں نظامی کے نام سے نقل ہے، عمید ہی کا ہے اس لئے کہ دیوان میں شامل ہے اور اس میں یہ شعر بھی موجود ہے ۔

نسب از عمر پذیرم حسب از تبار لویک　　　بکدام سلک دیدی دو گہر چنین منظّم

اس سے اس کی دو نسبتیں یعنی فاروقی (جو اور دوسری ابیات سے بھی ثابت ہے) اور لویکی واضح ہیں ۔ لویکی نسبت لویک کی طرف ہے، جو غزنویوں کی فتح غزنہ سے قبل کابل اور غزنین کا حکمران خاندان تھا، جیسا کہ حبیبی صاحب کے ایک رسالہ لویکان غزنہ اور تعلیقات طبقات ناصری، ج ۲، صفحہ ۲۹۱، ۲۹۳) سے واضح ہوتا ہے ۔ یہ آخری اطلاع اکتوبر ۱۹۷۷ء میں خود حبیبی صاحب نے مجھے بہم پہنچائی اور ان دو منابع کی طرف رہنمائی کی یہی وجہ ہے کہ انڈو ایران سوسائٹی کی طرف سے شائع کردہ کتاب INDO IRANIAN STUDIES میں شامل میرے مقالے AMID LOIKI A COUNTRY PERSIAN POET میں یہ نسبت مجہول ہی تھی ۔ تاریخ محمّدی مؤلفہ بہادر خانی میں عمید کے اس قصیدے تک رسائی ہوئی جو اچہ میں منگولوں کی پسپائی کے موقع پر سلطان علاء الدّین مسعود دسپر رکن الدین

فیروز شاہ کی مدح میں ہے ۔ اس کا مطلع مع چند شعر درج ذیل ہے ۔

منت ایزد را کہ شاہ ہفت کشور می رسد ۔ رایت اعلاش منصور و مظفر می رسد
ظل حق سلطان علاء الدین و دنیا کز علو ۔ پایۂ قدرش برین نہ طاق اخضر می رسد
پادشاہ بحر و بر مسعود شاہ تاج بخش ۔ آنکہ شاہان بندہ کسرش چا کر می رسد
یارب آن ساعت کہ در گوش ملاعین اوفتاد ۔ این ندا ناگہ کہ شاہ ہفت کشور می رسد
زان طرب در حصن اچہ شد درون پیک صبا ۔ "البشرو" گویان کہ امداد موفر می رسد
منہزم رفتہ ملاعین ناچشیدہ زخم تیغ ۔ زخم تیغ شاہ کی بر ہر سگ تر می رسد

اس واقعے کا ذکر طبقات ناصری (ج ۱، ص ۷۴۱) میں کئی بار آیا ہے ۔

"در ماہ رجب (۶۴۳ھ) از طرف بالا خبر لشکر کفار مغل رسید کہ بطرف اچہ آمد اند و سر آن جماعت منکوتہ لعین بود، سلطان علاء الدین بر عزیمت دفع کفار لشکر ہای اسلام از اطراف جمع کرد و چون بکنار آب بیاہ رسید کفار از پای اچہ برخاستند و آن فی بر آمد ۔"

عمید لوئکی کے بارے میں زیادہ تفصیل ہوگئی لیکن اس بنا پر کہ وہ خالص ہندی نژاد شاعر تھا جو سرزمین پنجاب سے اٹھا تھا ۔ اگر پنجاب کے علمی حلقے میں اس کا تعارف کرایا گیا تو نامناسب نہ تھا ۔

ان سطور کا مقصد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ تھوڑی توجہ سے عمید لوئکی کے بارے میں اتنا مواد جمع ہوگیا ہے کہ اس پر ایک اچھا خاصہ رسالہ تیار ہو سکتا ہے دیپ مسلم یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے ام ۔ فل کے لیے اس پر ایک مختصر سا رسالہ ۱۹۶۵ء میں لکھا تھا ۔ راقم نے عمید لوئکی کے کلام کا ایک انتقادی متن تیار کرلیا ہے اور پبلشر کے نہ ملنے سے یہ کام تعویق میں پڑ گیا ہے ۔

عمید سے کچھ پہلے ایک دوسرا شاعر سراج الدین خراسانی دہلی میں گذرا ہے جو التتمش اور اس کے علم دوست وزیر نظام الملک محمد جنیدی سے وابستہ تھا ۔ اس کا تعلق خراسان سے تھا مگر تذکروں میں سراجی سگزی کہلاتا ہے ۔ بہرحال ہندوستان آنے سے

قبل وہ مکران میں عرصے تک رہا تھا۔ چنانچہ اس کے دیوان میں وہاں کے سلاطین اور اُمراء کی تعریف میں اتنے قصیدے ہیں کہ اس سے مکران کی تاریخ پر ایک کتابچہ تیار ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ دہلی آیا اور یہیں باقی عمر گذار دی۔ اس کے دیوان کے دو نسخے راقم کو دستیاب ہوئے اور ان کی مدد سے ۱۹۷۲ء میں ایک انتقادی متن شائع کیا جس کی ضخامت پونے سات سو صفحے کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے یہ دیوان شائع ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۶۲ء میں اس دیوان کا تعارف مجلہ فکر و نظر میں کرایا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اورینٹلسٹس کی کانفرنس میں مکران کی نسبت سے ایک مقالہ پیش کیا جو بعد میں اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا تھا۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکے گا کہ قدیم شعرائے ہند کی تحقیق کا موضوع اگرچہ سنگلاخ اور بنجر زمین کے مانند ہے۔ لیکن اگر توجہ سے اس کی آبیاری کی جائے تو اس سے نئے گل بوٹے کھلنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

شیرانی صاحب کی تحقیق راہ ہدایت کی شمع ہے۔ انھوں نے موجودہ نسل کی رہنمائی کے لئے بہت کافی سامان اکٹھا کر دیا ہے۔ ان کے اور ان کے رفقا کے ذریعے تحقیق کی ایک زبردست روایت قائم ہوچکی ہے۔ ہمارے محققین و نقاد ان کا فرض ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھائیں۔ ان کے زمانے میں لاہور میں ایسے عالم اور دانش ور جمع ہو گئے تھے کہ یہ شہر اسلامی علوم والسنہ کا سب سے بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ آپ حضرات کی ذمّہ داری ہے کہ اس کی مرکزیت کو نہ صرف برقرار رکھیں۔ بلکہ اس کو مزید تقویت بخشیں۔ یہی کوشش شیرانی کی سب سے بڑی یادگار ہو گی۔ اگر آپ شیرانی اور ان کے رفقاء کے راستے پر نہ چل سکے تو تاریخ آپ کی کوتاہی کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ اس تاریخ ساز شخصیت کے لئے سب سے بڑا اخراج تحسین یہی ہے کہ آپ تحقیق کی اس روایت کے حامل بن جائیں جس کے بنانے میں ان کا زبردست ہاتھ ہے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جدید دور کا کوئی محقق یا نقاد، ہند و پاکستان میں

ایسا نہیں ہے۔ جس کو شیرانی کی تحریر سے رہنمائی نہ ملی ہو۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدای بخشندہ

پروفیسر بھگوت سروپ

پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔ایک مشفق استاد عالم بے بدل اور عالی نفس انسان

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے شیرانی صاحب کے قدموں میں فارسی زبان وادب کی تحصیل کی سعادت حاصل ہوئی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے ہم میں سے اکثر لوگ اس مخزن علم وفضل سے پوری طرح فیضیاب نہ ہو سکے۔اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ ان ایام میں لاہور علم وادب اور ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔پنجاب لٹریری یونین کے زیرِ اہتمام ہر روز کسی نہ کسی تقریب کا انعقاد ہوتا تھا اس میں ہم لوگ شرکت کیے بغیر نہ رہتے اور بالنتیجہ مطالعہ میں یک جہتی سے منہمک نہ ہو پاتے۔

جن صاحبان علم وادب سے ہمیں مستفید ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ان میں نمایاں شخصیتیں تھیں پروفیسر شیرانی۔ پروفیسر اقبال۔ پروفیسر شاداں بلگرامی اور پروفیسر کے ایم مبترا۔ان سب میں سے جس شخصیت نے ہمارے دل ودماغ پر سب سے گہرا اور پائیدار نقش چھوڑا وہ پروفیسر شیرانی تھے۔

ان کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے پورے اہتمام سے متن کی تصحیح کرتے تھے۔ خصوصاً متقدمین کے کلام کی تصحیح کے لیے متعدد مخطوطات کا مقابلہ کرنے کے بعد صحیح متن متعین

کرتے ۔ پھر طباعت کی غلطیوں کی اصلاح کی جاتی ۔ کچھ تو کاتب حضرات کی لاپروائی اور کچھ رسم الخط کی نوعیت ایسی کہ اعراب اور نقاط کی خفیف غلطی سے پُردل بزدل ۔ جاحظ حافظ اور نامزد نامرد ہو جاتا ہے ۔

ایران کے شعرائے متقدمین مختلف علوم مثلاً فلسفہ ۔ تاریخ ۔ ریاضی ۔ نجوم ۔ ہیئت طب وغیرہ میں ماہر ہوتے تھے اور ان علوم کی اصطلاحات بہ کثرت اپنے کلام میں لاتے تھے ۔ اس لیے شعر کا پوری طرح مطلب سمجھنے کے لیے ان علوم سے تھوڑی بہت واقفیت ہونا بہت ضروری ہے ۔ الفاظ کے معنی بتا کر شعر کا ترجمہ کرنا کافی نہیں ۔ بلکہ جن ادبی اور علمی معلومات کا شعر میں ذکر کیا گیا ہے ان کی مفصّل تشریح کرنی ضروری ہے تاکہ متعلّم، زبان وادب کے علاوہ شاعر کے تبحر علمی سے بھی بقدر استطاعت مستفید ہو سکے ۔ علاوہ ازیں اسناد کے لیے ایران کی مفصّل تاریخ سے واقف ہونا لازمی ہے تاکہ ان سلاطین اور اُمرا کے حالات سے آگاہی حاصل ہو جاتے جن سے شعرا وابستہ رہے ہیں ۔

چنانچہ شیرانی صاحب اس طرح پڑھاتے تھے کہ طلبہ کا علم صرف الفاظ کے معنی اور شعر کے مفہوم تک محدود نہ رہے بلکہ شعر کے متعلّق شاعر کا ما فی الضمیر کلیتہً قاری کے ذہن میں منتقل ہو جائے ۔

مثال کے طور پر جب وہ خاقانی کا اخستان بن منوچہر کی مدح میں کہا ہوا قصیدہ جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

صبح خیزان بین قیامت در جہان انگیختہ
نعرہ ہا شان نفخ صور از ہر دہان انگیختہ

پڑھا رہے تھے تو جب ان اشعار پر پہنچے :

برسر دریای نیلیں تیغ کان رو نیاس — تا جزیرہ رونیاس دلبران انگیختہ
در جزیرہ ماندہ یک دریا زخون روستان — موج ازان دریای خون کوہ کلان انگیختہ

تو سب سے پہلے صحیح نسخہ بتایا :

برسر دریا ز نیلی تیغ کان رو نیاس — تا جزیرہ رونیاس دلنبران انگیختہ

درجزیرہ راندہ یک دریا زخون روسیان　　موج ازان دریای خون کوہ کلان انگیختہ

پھر روناس کی مفصل تشریح کی۔ روناس ایک پودا ہوتا ہے جس سے سرخ رنگ بنایا جاتا ہے نیز یہ کہ روناس ایک جزیرہ کا نام ہے۔ اس کے متعلق استخری کی مسالک الممالک اور ابوالفدا کی تقویم البلدان کے حوالے سے بتایا کہ بحر خزر میں دریای کُر کے دہانے کے بالمقابل ایک جزیرہ ہے جہاں روناس بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ آج کل یہ جزیرہ ساری کہلاتا ہے۔ ۵۷۰ھ میں روسیوں نے بغاوت کی۔ خاقان نے ان کی سرکوبی کی اور وہ باغی اس جزیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔

لنبران آج کل ایک قصبہ ہے جو شماخی اور شوشہ کے راستے میں دریای کُر سے ڈھائی میل جنوب کی جانب واقع ہے۔

امتحان سے فراغت پاکر شیرانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے صلاح دی کہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لوں اور ان کی رہنمائی میں ریسرچ کروں۔ لیکن کچھ عرصہ دیال سنگھ کالج میں کام کرنے کے بعد دہلی آگیا اور وہ منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔ دہلی آنے کے بعد شیرانی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ حسن اتفاق ایسا ہوا کہ میں دریا گنج میں کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ سامنے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی تھی جس میں انجمن ترقی اردو (ہند) کا دفتر دکن سے منتقل ہوکر آگیا تھا۔ یہاں دتاتریہ کیفی اور مولوی عبدالحق سے مراسم ہوگئے۔ شیرانی صاحب بھی انجمن سے وابستہ ہوگئے تھے۔ جب پہلی بار انجمن کے دفتر آئے تو ان بزرگوں سے میرے متعلق پوچھا اور انھوں نے فوراً مجھے بلوایا۔ مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا میرے پاس آتے رہا کرو۔ یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی جو مجھے اُستاد سے دوبارہ فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جب وہ دہلی آتے مجھے اطلاع کر دیتے اور میں شام کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا تھا۔ کھل کر باتیں کرتے تھے۔ ان سے ملنے کے بعد مجھے ان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہوا۔

تنقید کے متعلق شبلی کے عقیدتمندوں کو شکایت ہے کہ شیرانی صاحب نے شبلی کی

تنقیص کی ہے۔ یہ شکایت بے جا ہے کیونکہ تنقید پر قلم اٹھانے سے بیشتر استاد مرحوم شبلی کی ادبی خدمات کا اعتراف کر چکے ہیں۔ اور تاریخ و تنقید کے میدان میں شبلی کا مقام بہ حیثیت ایک پیش رو کے تسلیم کر چکے ہیں۔ اگر لہجہ میں درشتی ہے تو وہ شبلی کے لئے نہیں بلکہ تحقیق کی رائج الوقت روش پر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تحقیق بلا تدقیق بے معنیٰ ہے۔

چنانچہ دوران گفتگو میں کہا: آغا باقر سلطانی نبیرۂ آزاد میرے عزیز شاگرد ہیں۔ ایک بار میرے پاس آئے اور خواہش ظاہر کی کہ آب حیات پر کچھ لکھوں۔ ایک مقالہ ہی لکھا تھا، کہ دوڑتے ہوئے آئے اور بولے "حضور بس کیجئے۔ اتنا ہی کافی ہے" حق گوئی میں مروّت کو کوئی دخل نہیں۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ تنہا بیٹھے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ بولے "کالج والے زبانیں پڑھانے والوں کو بہت کم تنخواہ دیتے تھے میں اسلامیہ کالج میں تھا بمشکل گزارا ہوتا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے بھی درخواست بھیج دی۔ انٹرویو کے لیے بلایا۔ میں نے دریافت کیا کہ انٹرویو میں آپ سے کیا سوال کیے۔ جواب دیا "عجیب قماش کے لوگ تھے۔ مزدک کے متعلق سوال کیے۔ وہ کون تھا؟ کس دور میں ہوا؟ کن عقائد کی تلقین کرتا تھا؟ اس کا کیا حشر ہوا؟ لاہور میں دوست احباب میرے وہاں جانے کے خلاف تھے کہاں کالے کوسوں جاؤ گے؟ سال میں ایک بار بھی ٹونک آئے تو ایک ماہ کی تنخواہ ختم ہو جائے گی ادھر یونیورسٹی کے حکام بالا کو راضی کر لیا کہ اُردو پنجابی اور ہندی میں ریڈر مقرر کئے جائیں مجھے اردو کا کام ملا۔"

شیرانی صاحب نہایت متشرع بزرگ تھے۔ ایک دن باتیں ہو رہی تھیں سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولے "ولایت میں سگریٹ نوشی کی لت لگ گئی اب چھوڑنا مشکل ہو گیا ہے روزے کے دنوں میں پانی کی پیاس برداشت کر لیتا ہوں سگریٹ سے ہاتھ روکنے میں طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔"

شیرانی صاحب تنہائی پسند اور کم آمیز تھے۔ جہاں تک میرا مشاہدہ تھا سراج الدین آذر اور پروفیسر اقبال کے سوا کسی اور سے گہرے دوستانہ مراسم نہیں تھے۔ اول الذکر اسلامیہ کالج میں شیرانی صاحب کے جانشین تھے۔ بعد میں دہلی کے سیکنڈری بورڈ کے سکریٹری ہو کر

دہلی آ گئے تھے یہیں جواں مرگ ہوئے ۔ اقبال تو دل وجان سے ان کے مرید تھے۔ مگر دونوں
کے مزاج متضاد تھے۔ شیرانی صاحب موسیقی سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور اقبال موسیقی کے
دلدادہ تھے۔ شیرانی صاحب کا واحد شوق شکار کھیلنا تھا اور اقبال نہایت نرم دل تھے! ایک
دن میں ملنے گیا تو بتایا کہ اقبال مجھے لاہور آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ میرا دل شکار کرنے کے لئے
بیتاب ہوتا ہے وہ روکتے ہیں۔ بے زبان جانور کو ناحق کیوں مارتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ
قدرت کا یہی قانون ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ باپ روکتا ہے میں بیٹے کو
لے کر نکل جاتا ہوں۔ دسترخوان پر شکار رکھا جاتا ہے تو اقبال ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔
میں نے عرض کیا کہ اقبال صاحب فطرتاً رقیق القلب ہیں۔ بولے دیکھو یہ خط آیا ہے۔ لکھتے
ہیں بھلمنساہٹ سے لاہور آجاؤ نہیں تو ...“ میں نے پوچھا ”نہیں تو“ آخر کیا دھمکی دی ہے،
مسکرا کر چپ ہو گئے۔ مزاج الگ الگ مگر دلوں میں اتنی یگانگت۔ شیرانی صاحب کا دل
محبت کا خزانہ تھا۔ جس کسی کو ان سے واسطہ پڑتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ایسے انسان ناپید
تو نہیں کمیاب ضرور ہیں۔

یا تو وہ گوہر نہیں تھا گوہرِ انسان سے　　یا نکلتے ہی نہیں ایسے جواہر کان سے

۱۲۸

غزلیاتِ غالب

(فارسی)

PERSIAN GHAZALS OF GHALIB

English Translation of Selected Persian Ghazals

of

MIRZA GHALIB

translated by

Dr. YUSUF HUSAIN KHAN

قیمت: ۸۰ روپے

ڈاکٹر خلیق انجم

محمود شیرانی کا قیامِ لندن

اردو کا پہلا باقاعدہ محقق اور متنی نقاد ہونے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے انھوں نے "تنقید شعر العجم" لکھ کر محققین میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرے "مجموعۂ نغز" کا تنقیدی اڈیشن تیار کر کے متنی تنقید کا قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا۔ "پنجاب میں اردو" اور لسانیات کے موضوعات پر خاصی تعداد میں مضامین لکھ کر لسانیات کے میدان میں نئی سمتوں کی نشاندہی کی۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اُن کے بعد سے اردو میں اتنا بڑا اور کوئی محقق پیدا نہیں ہوا، افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ شیرانی صاحب کے مستند سوانح لکھ کر کتابی صورت میں شائع کرا دیتا۔ یہی حال اردو کے صف اوّل کے دوسرے محققین یعنی قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی کا ہے۔ قاضی صاحب پر تو مضامین کے دو مجموعے شائع بھی ہو گئے ہیں لیکن عرشی صاحب پر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ مالک رام صاحب پر مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اُن کا بھی حق ابھی ادا نہیں ہوا۔

خدا بھلا کرے حافظ محمود شیرانی کے پوتے مظہر محمود شیرانی صاحب کا جنھوں نے آٹھ

جلدوں میں شیرانی صاحب کے مقالات مرتب کر کے لاہور سے شائع کر دیے ہیں۔ انھوں نے ان مقالات کی پہلی جلد میں شیرانی صاحب مرحوم کے سوانح لکھے ہیں لیکن میرے پاس جو جلد ہے، اس میں کچھ صفحے تو ٹھیک ہیں، باقی نہ جانے کون سی جلد کے فرمے لگا دیے گئے ہیں۔ (صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ اس جلد سے شیرانی صاحب کے آبا و اجداد کے بارے میں تو پتا چلتا ہے، باقی خود اُن کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں ملتا، کیوں کہ صفحات کسی اور جلد کے شامل ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی لائبریری میں پہلی جلد نہیں باقی سب ہیں۔ کوشش کے باوجود پہلی جلد مجھے کہیں اور نہیں ملی۔

شیرانی صاحب نے یقیناً سیکڑوں کی تعداد میں خطوط لکھے ہوں گے، لیکن افسوس ہے کہ مکتوب الیہم نے تمام خطوط ضائع کر دیے۔ ہمیں شیرانی صاحب کے پوتے مظہر محمود شیرانی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے شیرانی صاحب کے ایک سو اٹھارہ خطوط جمع کیے اور انھیں بہت اچھے انداز میں مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ ان خطوط کے چوبیس مکتوب الیہم ہیں۔ ان میں سے ۴۸ خطوط لندن سے طالب علمی کے زمانے میں لکھے گئے۔ شیرانی صاحب نے لندن سے ۳۴ خطوط اپنے والد محمد اسماعیل خاں صاحب، ایک خط بڑے بھائی محمد ابراہیم خاں صاحب، گیارہ خطوط چھوٹے بھائی محمد مسعود خاں اور ایک خط ٹونک کے سید حسن مجتبیٰ کے نام لکھے ہیں۔

مکاتیبِ حافظ محمود شیرانی کے تمام خطوط کسی نہ کسی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ابتدائی ۴۸ خطوط اُن کے سوانح نگار کے لیے بہت اہم ہیں، باقی خطوط میں بیشتر ایسے ہیں، جن میں علمی معاملات پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان خطوط کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحقیقی اور لسانی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں اور ہر محقق کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

ابتدائی ۴۸ خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں شیرانی صاحب کے قیامِ لندن کے حالات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان پر برطانوی حکومت کے زمانے میں جو طلبہ تعلیم کے لیے لندن جاتے تھے اُن کے رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں ہمیں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ نیز لندن کی سماجی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے میں نے اس مقالے میں خود کو صرف ان ۴۸ خطوط تک محدود رکھا ہے۔

شیرانی مرحوم نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اردو اور فارسی کی مروّجہ کتابیں گھر پر اُستادوں سے پڑھیں اور قرآن شریف حفظ کیا۔ جب اردو اور فارسی میں خاصی استعداد حاصل ہوگئی تو والد نے ٹونک کے "دربار ہائی اسکول" میں داخل کر دیا۔ جہاں انھوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ چوں کہ شیرانی صاحب نے فارسی میں بہت اچھی مہارت حاصل کر لی تھی، اس لیے منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے لیے انھوں نے لاہور جا کر اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ انھوں نے منشی فاضل اور انٹرینس کے امتحان پاس کیے اور انگریزی میں خاصی مہارت حاصل کی اب یہ شوق پیدا ہوا کہ لندن جا کر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا جائے۔ شیرانی صاحب کے والد نے حوصلہ افزائی کی اور ۴ر اکتوبر ۱۹۰۴ء کو وہ تعلیم کی غرض سے لندن پہنچ گئے۔ "مکاتیبِ حافظ محمود شیرانی" میں لندن سے شیرانی صاحب کا اپنے والد کے نام پہلا خط ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۴ء کا ہے۔ اس خط میں شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ: "آج میرا یہ تیسرا خط ہے جو آپ کی خدمت میں لندن سے آرہا ہے۔" اس کا مطلب ہے کہ شیرانی صاحب کے ابتدائی دو خط ضائع ہو گئے ہیں۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۴ء کے خط میں شیرانی صاحب نے لکھا ہے: "میں اس وقت مذبذب ہوں کہ کیا کروں اس وقت میرے سامنے دو صیغے ہیں۔ ایک قانونی دوسرا زراعتی۔ میں نے اپنے خیالات وہاں بھی جناب پر ظاہر کیے تھے کہ ایگریکلچر یعنی زراعتی صیغہ اچھا ہے، یہاں آکر جو اس کے لیے میں نے خط و کتابت کی تو اس کی وقعت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی...."۔ میں اس کے متعلق اوروں سے صلاح لینے والا ہوں۔" شیرانی صاحب کے بعد کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زراعت پر قانون کی تعلیم کو ترجیح دی۔

اگرچہ شیرانی صاحب نے ہندوستان میں انگریزی خاصی پڑھی تھی، لیکن اتنی مہارت نہیں ہوئی تھی کہ اس کے ذریعے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے۔ ۲۱ اکتوبر کو انھوں نے اپنے والد کے نام خط لکھا تھا۔ اس خط کے آخر میں اپنے چھوٹے بھائی محمد مسعود خاں کے نام چند سطریں لکھی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ: "میں یقین کرتا ہوں کہ تم خیریت سے ہو گے اور اپنی انگریزی کے لیے سخت ترقی کر رہے ہو گے، مجھ پر بھی بہت مشکلات پڑ رہی ہیں اسی وجہ سے کہ میری ایسی زیادہ لیاقت نہیں ہے، اس لیے تم برابر کوشش کیے جاؤ کہ جلد انگریزی میں بات چیت اور نوشت خواند کرنے لگو۔"

اس خط کے چار پانچ مہینے بعد یعنی ۲۴ مارچ ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں شیرانی صاحب۔ اپنے والد کو لکھتے ہیں کہ:"اس وقت میں جس کالج میں ہوں اس میں تقریباً تمام ایم۔اے، بی۔اے ہیں۔ ڈھائی سو کے قریب انگریز ہیں، باقی پچاس میں ہندوستانی، جاپانی، افریقی، حبشی، برمی اور سیلونی ہیں اور یہ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی تمام عمر انگریزی سیکھنے میں بسر کی ہے... ان کے مقابلے میں میری حالت یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء میں انگریزی شروع کی۔ ۱۸۹۸ء میں مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی میں لگ گیا۔ منشی فاضل کے بعد پھر انگریزی دیکھنا شروع کی۔ اس صورت میں کیوں کر ان کے مقابلے کے قابل ہو سکتا ہوں اور پھر اللہ اکبر انگریزی جیسی وسیع اور مشکل زبان۔ املا، اصوات سے بالکل اجنبی، تلفظ سخت، جو تلفظ میں نے ہندوستان میں سیکھا، یہاں آکر میں اس کو غلط پاتا ہوں اور مجھ کو کس قدر افسوس ہوتا ہے، جب میں اسی تلفظ کو دوبارہ یاد کرتا ہوں۔"

شیرانی صاحب نے بہت جلد انگریزی تحریر اور تقریر پر قابو پالیا، وہ لندن کے مقامی باشندوں سے بے تکلف انگریزی بولنے لگے اور بہت اچھی انگریزی لکھنے لگے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: سب سے بڑا کام جو میں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی میں میں اچھا ہو گیا ہوں۔ شیرانی صاحب بہت ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرنے لندن گئے تھے، مگر اُن کی بدنصیبی کہ لندن پہنچنے کے چند ہی مہینے بعد وہ ایک عجیب وغریب اور خطرناک بیماری کا شکار ہو گئے۔ اُن کے دونوں کان اندر سے پک گئے۔ پورا سر سوج گیا اور چہرے پر ورم آگیا۔ ۵ جنوری ۱۹۰۵ء کے خط میں شیرانی صاحب نے اپنے والد کو اس بیماری کی تفصیل ان الفاظ میں لکھی ہے۔

"میں اس وقت مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں اور مجھے یہ بھی خبر نہیں ہے کہ جب تک یہ عریضہ جناب کی خدمت میں پہنچے گا میں اس دنیا میں ہوؤں گا یا اُس دنیا میں۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میری موت مجھے انگلستان لے کر آئی تھی جہاں گھر والے تو درکنار دوست احباب کے ہاتھ سے کفن و قبر بھی نصیب نہیں ہوگا۔

ابا جان میں اس دو ہفتے کی بیماری کے عرصہ میں بہت رویا ہوں اور میں نے آپ سے غائبانہ معافی مانگی ہے، اپنے گناہوں کی۔ میں نے آپ کا روپیہ ہمیشہ برباد

کیا، انگلستان آکر ادر بھی برباد کیا۔ ہمیشہ آپ کی نافرمانی کی اور اس وقت ایسے مقام پر ہوں جہاں موت کی سرحد بالکل قریب ہے اور زندگی کا ہمسایہ کوسوں دور ہے۔ ابا جان میں آپ کی بدنصیب اولاد ہوں۔ اگر مر جاؤں تو آپ مجھے معاف کر دینا۔ مجھے اپنی زندگی کی کچھ امید نہیں رہی ہے۔ میرا تمام سر سوج رہا ہے، چہرہ پر ورم ہے۔ یہ بیماری میں نے کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھی اور نہ سنی۔ ناک اور منھ سے خون جاری ہے اور دونوں سے رات دن پیپ بہہ رہی ہے۔ درد کی یہ شدت ہے کہ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا جب ڈاکٹر دو تین روز میں سونے کی دوا دے دیتا ہے تو چھ سات گھنٹے کے لیے سو رہتا ہوں ورنہ وہی بے قراری اور وہی تڑپنا۔ ڈاکٹر نے دو نرسیں یعنی دو ملازم عورتیں جو ہسپتال میں کام کرتی ہیں، بھیج دی ہیں۔ وہ اُٹھاتی بٹھاتی سلاتی ہیں۔

میں دل میں کیا کیا امیدیں لے کر یہاں آیا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ یہاں میرا موت سے سامنا ہوگا۔ تمام سر پک رہا ہے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ میں کفایت شعاری سے رہوں گا۔ اسی خیال سے یہاں آکر کپڑے نہیں بنوائے۔ اب بھگت رہا ہوں ڈاکٹر اور نرسیں مجھ کو تباہ کر دیں گی۔ ڈاکٹر کی فیس ایک دفعہ آنے کی دس شلنگ ہے۔ وہ دن بھر میں دو دفعہ آتا ہے اور آج دو ہفتے سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا۔ اور خدا جانے میں کب تک بیمار رہوں۔ یہ خیالات ہیں جو مجھے ذبح کر رہے ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا میں اچھا ہو جاؤں گا یا میری بیماری کا نتیجہ موت ہوگا لیکن ابا جان آپ مجھے دل سے معاف کر دینا اگر میں مر جاؤں گا۔ اگرچہ میں آپ کا نافرمان اور فضول خرچ بیٹا تھا۔ آپ میری والدہ سے بھی کہہ سن کر مجھے معاف کروا دینا اور حمیدہ سے مہر بخشوا دینا اور اس کی بابت جو کچھ آپ مناسب سمجھیں کرنا کیونکہ آپ کو اس کا مجھ سے زیادہ خیال ہے۔"

اجنبی ملک میں پہنچتے ہی ایسی بیماری میں مبتلا ہونے سے انسان جس طرح مایوسی کا شکار ہوتا ہے اور جس طرح زندگی سے ناامید ہو جاتا ہے، اس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے۔

اس خط کے پانچ دن بعد یعنی ۱۰ جنوری کو شیرانی صاحب نے والد کو بیماری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بیماری کی وجہ سے سخت مالی دشواریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ اور حالت یہ ہو گئی تھی کہ انھیں اپنی بیماری سے کہیں زیادہ ڈاکٹر اور نرسوں کی فیس کی پریشانی تھی۔ اور یہ پریشانی اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ خدا سے اپنی موت کی دعا مانگنے لگے۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

"جمعہ کے روز سے میری یہ حالت ہے کہ ہر وقت شدت درد کی وجہ سے نشہ کی حالت میں رہتا ہوں، آنکھیں کھلتی نہیں، کانوں سے سماعت موقوف، دانتوں سے کوئی چیز نہیں چبتی۔ تمام چہرہ سوج گیا، سینہ پر ورم آن پہنچا، ان پچھلے دنوں میں مجھے تو اپنی زندگی کی امید بھی نہیں۔ آدمی کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ آخر کل ڈاکٹر نے دونوں کانوں کے قریب شگاف دیا۔ کوئی آدھ سیر کے قریب خون اور پیپ نکلی۔ درد میں اب وہ اگلی سی شدت نہیں لیکن ابھی تک دونوں کانوں سے خون اور پیپ جا رہے ہیں۔ دن اور رات میں شفاخانہ کی عورتیں (نرسیں) دس بارہ مرتبہ دونوں کانوں کو دھوتی ہیں اور صاف کرتی ہیں، دوا ڈالتی ہیں، روئی کے پھاہے چڑھاتی ہیں لیکن کانوں کا درد اب تک بدستور جاری ہے۔ جس دن شگاف لگایا اس دن تو کسی قدر نیند آئی لیکن اس کے پہلے اور اس کے بعد خواب آور دوا دینے کے باوجود بھی نیند نہیں آتی ہے۔ رات کے تین بجے چار بجے اگر آنکھ لگ گئی تو ایک دو گھنٹوں کے لیے آرام ہو گیا ورنہ وہی درد ہے وہی ٹیسیں ہیں مجھ کو تمام عمر میں اس قدر تکلیف نہیں ہوئی جیسی آج کل برداشت کر رہا ہوں۔ آج اور دنوں کی نسبت کوئی دو گھنٹہ سے طبیعت بہت اچھی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ جناب کو خط لکھ دوں کل خدا جانے کیا پیش آوے۔ میرے پاس خرچ بالکل نہیں ہے اور بیماری کا خرچ اس کے متعلق میں نے ابھی کچھ ادا نہیں کیا ہے۔ نہ ڈاکٹر کو فیس دی ہے اور نہ نرسوں کو کچھ دیا ہے۔ دوا وغیرہ یہ بھی سب ڈاکٹروں کی معرفت آ رہی ہیں۔

میں نہیں جانتا اگر خرچ دیر میں آیا تو میری کیا حالت ہوگی۔ اور مجھے آپ سے مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ میں نہیں جانتا میں کیا کروں۔ اللہ تعالیٰ موت دے دے تو اچھی بات ہے۔ مجھے کس قدر شرم آتی ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میں چار ہزار پچاس روپیہ لے کر گھر سے نکلا تھا اور آج چار مہینہ بعد وہ تمام روپیہ خرچ ہوگیا اور میں آپ سے پھر مانگ رہا ہوں۔ ابا جان اگر آپ دل میں یہ خیال کریں گے کہ میں نے فضول خرچی کی ہے تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔ تقریباً تین ہزار تو کرایہ جہاز اور فیس کالج میں چلا گیا باقی رہا ایک ہزار اس کے اندر ہی تین مہینہ گزر گئے۔ کتابیں خریدیں اور کچھ چیزیں یہاں کی رسم کے مطابق خریدیں۔

پھر بھی میں نے دس پونڈ اصل میں سے نکال کر علیحدہ سیونگ بنک میں رکھ دیے ہیں صرف اسی خیال سے کہ موت ہے زیست ہے خدا جانے کیا وقت پڑے۔ اور یہ ارادہ کر رہا تھا کہ ہر سال اتنی ہی رقم بچا بچا کر سیونگ بنک میں رکھتا جاؤں اور جب میں یہاں سے جانے لگوں گا تو اس وقت میرے پاس تیس پونڈ فالتو ہوں گے اور اگر مر گیا تو گور و کفن کے لیے کافی ہوں گے کیونکہ اگر میں مر جاؤں تو بنک میرے حساب میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے گا کیونکہ وہ زیادہ تر دستخط مانگتے ہیں اور یا وہ میرا باقی روپیہ میرے وارثوں کے سپرد کر دیں گے۔

اس ہفتے سے ان دس پونڈ پر گذارہ ہے مگر تابکے۔ ڈاکٹر کی فیس دس شلنگ روزانہ۔ نرسوں کی فیس پانچ پانچ شلنگ روزانہ۔ یہ میری لینڈ لیڈی بہت اچھی ہے جس نے مجھ کو اس قدر بیماری پر بھی اپنے مکان میں رہنے کی اجازت دی ورنہ انگریز لوگ بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ جہاں کسی کو زیادہ بیمار پایا، ہسپتال بھیج دیا۔ اگر وہ بالکل مفلس ہے اور ڈاکٹر کی فیس ادا نہیں کر سکتا تو خیراتی شفا خانے میں بھیج دیا جہاں اس کی موت و زیست صرف ان لوگوں کے

رحم پر منحصر ہے ۔جوان اور بچے تو خیر، ضعیف اور بوڑھے تو اکثر مر کر ہی نکلتے ہیں۔
ہر روز ان مرنے والوں کی اخباروں میں فہرست ہوتی ہے کہ فلانے ہسپتال میں
اتنے آدمی مرے اور فلانے میں اتنے اگر فیس ادا کر سکتا ہے تو سرجری میں بھیج
دیا جہاں خرچ کا کچھ حساب نہیں ہے اور بیمار مجبور کہ ان کی فیس وغیرہ کے
علاوہ ان کو دیتا رہے ورنہ طرح طرح سے اس کو ستایا جاوے گا۔ انگریز
صرف کہنے کو مہذب ہیں اور ہمدرد ہیں ورنہ ان میں دونوں باتیں مفقود
ہیں۔ یہ صرف ایک چیز جانتے ہیں، روپیہ روپیہ ان کا خدا ہے، روپیہ ان کا
ایمان ہے ۔غرض روپیہ کے سوا یہ کچھ نہیں جانتے .میری لینڈ لیڈی، اگرچہ اس
کو انگلینڈ میں رہتے تمام عمر گزر گئی لیکن ہمیشہ یہی کہا کرتی ہے کہ انگریز ہمیشہ
خودغرض ہوتے ہیں۔ یہ عورت آئرش ہے یعنی آئرلینڈ کی رہنے والی۔ کہتی
ہے کہ میں تم پر بہت رحم کرتی ہوں کہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر اتنی دور یہاں
آن پڑے ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک بیٹا نو سال سے ہندوستان میں ہے
اگر میں دوسروں کی اولاد کو تکلیف دوں گی تو ممکن ہے کہ خدا میری اولاد
کو تکلیف دے ۔

اباجان یہ شفاخانوں کی بابت جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے، میں نے سنا ہے۔ خدا
نہ کرے کہ میں وہاں جاؤں ۔لیکن یہ تمام مصیبت ان لوگوں کے لیے ہے جو مسافر
ہیں یا جو گھر بار نہیں رکھتے یا جن کے رشتہ دار نہیں ہیں۔ اباجان آپ اس
بات کا ہرگز خیال ہی نہ کرنا کہ اس قسم کی بیماری سے میں گھبرا جاؤں گا، واپس
ہندوستان آنے کی خواہش کروں گا یا ہندوستان سے کسی کو اپنی تیمارداری
کے لیے بلاؤں گا۔ پچھلی بات تو بالکل فضول ہے ۔رہی پہلی بات ہندوستان
آنے کی بابت ۔میں مرجانا قبول کروں گا، اس سے دس گنی بیماری برداشت
کرلوں گا بہ نسبت اس کے کہ میں بے نیل مرام ہندوستان آؤں اور آپ کو اپنی
منحوس صورت دکھاؤں ۔اگر انگلستان میں میری موت لکھی ہے تو کوئی

اسے مٹا نہیں سکتا ورنہ اس طرح اگر پچاس مرتبہ بھی بیمار ہوؤں تو کچھ پروا نہیں۔ دست از طلب ندارم تا کام بر نیاید۔

۲ رمئی ۱۹۰۶ء کو شیرانی صاحب نے والد کے نام خط میں اپنی بیماری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"میرے زخم بھر چکے ہیں، لیکن ڈاکٹر کے ہاں جانا موقوف نہیں کیا ہے۔"

۱۲ مئی کے خط میں شیرانی صاحب نے اطلاع دی ہے:

"میں نے ڈاکٹر کے ہاں جانا بند کر دیا ہے، زخم انگورے آئے ہیں۔"

تقریبًا ساڑھے چار مہینے بعد شیرانی صاحب کو بیماری سے نجات ملی۔

شیرانی صاحب کسی بڑے جاگیردار کے لڑکے نہیں تھے اور عیش کرنے لندن نہیں گئے تھے۔ اُن کے والد کا متوسط طبقے سے تعلق تھا۔ شیرانی صاحب سگے اور سوتیلے ملا کر سات بھائی تھے، دو والدائیں، غرض دس گیارہ گھر کے لوگ جن کا خرچ آسان نہیں تھا، اس لیے انھیں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ اور پھر شیرانی صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ لندن پہنچتے ہی انھوں نے قانون میں داخلہ لے لیا۔ قانون کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھنی پڑ رہی تھی۔ ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں شیرانی صاحب اپنے والد کے لیے لکھتے ہیں کہ:

"مجھ کو اب اس قدر بھی فرصت نہیں ہے کہ کسی ہندوستانی سے ملوں۔ دس بجے ناشتہ کھا کر کالج گیا۔ وہاں سے ایک بجے گھر پہنچ کر کھانا کھایا۔ پھر کالج روانہ ہوا۔ پانچ بجے، چھ بجے، بعض اوقات سات بجے وہاں سے لوٹا لیکچر وغیرہ کی نقل کی۔ کچھ یاد کیا۔ نو بجے کھانا کھا کر پروفیسر کے پاس گیا۔ دو گھنٹے اس سے پڑھا۔ وہاں سے آیا۔ بارہ بج چکتے ہیں۔ آتے ہی سو جاتا ہوں کبھی چھ بجے آنکھ کھل گئی کبھی سات بجے کبھی آٹھ بجے۔ پیشاب پاخانے گیا۔ ہاتھ منھ دھویا، کپڑے پہنے، اتنے میں نو بج چکتے ہیں، ناشتہ کیا اور کالج پہنچا۔ بس یہ میری زندگی کا دستور ہے۔ اب اس حالت میں جب کبھی مجھ کو موقع مل جاوے گا، اپنے مفصّل حالات لکھ دیا کروں گا ورنہ اپنی صحت کے متعلق

لکھ سکوں گا۔ اس وقت لنچ کھا کر ارادہ کر رہا تھا کہ کالج جاؤں۔ پھر یاد آیا کہ آج جمعہ ہے، گھر خط لکھنا ضروری ہے۔ گھر گیا اور یہ خط لکھنا شروع کیا۔

۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کو شیرانی صاحب نے والد کو خط لکھا ہے۔ انھیں لندن آئے ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔ اس خط میں انھوں نے اپنی تعلیمی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

میرے اوقات اشغال تعلیم میں بسر ہو رہے ہیں، قانون حسب معمول میں ۴ اکتوبر آئندہ کو جس کو صرف پانچ چھ روز باقی ہیں، مجھ کو لندن میں آئے پورا ایک سال ہو جائے گا۔ کیوں کہ میں ۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں لندن پہنچا تھا۔ اس عرصہ میں میں نے کیا کیا۔ بظاہر کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کو میں مثال میں یہاں پیش کروں۔ چار ماہ بیماری میں گزرے۔ باقی رہے آٹھ مہینے، ان مہینوں میں میں نے کیا کیا۔ گو میں موجودہ صورت میں سوائے الفاظ کے اور کسی ذریعے سے آپ کو یقین نہیں دلا سکتا لیکن مطمئن ہوں کہ میں نے بہت کچھ کر لیا ہے۔ میں نے اس قدر کیا ہے جس کی میں خود امید نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے بڑا کام جو میں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی میں میں اچھا ہو گیا ہوں، ایک عرصے سے جس کا مجھ کو اشتیاق تھا۔ میری لندن کی زندگی کے دو سال اور باقی ہیں اس عرصے میں اسی طرح اگر چلتا رہا تو بہت اچھا ہو جاؤں گا۔ میرا رومن لا اچھا تیار ہے۔ اکتوبر شروع ہونے پر جب کالج کھلے گا، کریمنل لا (قانون فوجداری) کے لیکچر سنوں گا۔ میں امتحان میں اس سال شریک نہیں ہوؤں گا اوّل تو امتحانات مشکل ہیں لیکن اگر مضمون تیار ہیں تو بھی مجھ کو ابھی انگریزی طرزِ تحریر کی مشق باقی ہے اور اس مضمون میں خام ہوں۔ کتاب اور کتاب کا مضمون تیار ہے لیکن امتحان کے وقت مضمون کو لکھنا، ممتحن اس کا بھی بہت خیال کرتے ہیں۔ انگریز تو خیر انگریز ہیں لیکن دوسرے ممالک کے طلبا طرزِ تحریر نہ جاننے کی وجہ سے اکثر فیل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تاوقتیکہ میں تحریر پر پورا ملکہ پورا نہ کر دوں گا، امتحانات میں شریک نہ ہوں گا۔"

اس خط میں شیرانی صاحب نے توقع ظاہر کی ہے کہ ابھی ان کے دو سال باقی ہیں اور انہی دو سالوں میں وہ چاروں امتحانات پاس کرلیں گے۔ اسی خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ قانون کے ساتھ ساتھ انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ ٹینی سن اور لانگ فیلو کا بھی مطالعہ کر رہے ہیں۔

۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ شیرانی صاحب دسمبر کے امتحان میں شریک ہونا چاہتے تھے، لیکن ابھی انھیں خود پر بھروسا پورا نہیں تھا، اس لیے ارادہ ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ مارچ ۱۹۰۶ء میں ہونے والے امتحانات میں شریک ہوں گے۔

۲۰ مارچ ۱۹۰۶ء کے خط سے ہمیں شیرانی صاحب کی تعلیمی زندگی کے بارے میں بہت اہم حقائق کا علم ہوتا ہے۔ یہ اقتباس طویل ہے، لیکن اہم ہے، اس لیے نقل کیا جارہا ہے۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

"آج ۲۰ مارچ ہے۔ تین روز امتحان میں اور باقی ہیں۔ شنبہ، یک شنبہ، دو شنبہ درمیان میں ہیں۔ سہ شنبہ کو امتحان ہے۔ امتحان دس بجے شروع ہو کر ایک بجے ختم ہوگا گویا تین گھنٹہ رہے گا۔ دوسری ڈاک سے گویا آپ کو میرے امتحان کی بابت مفصل حالات معلوم ہوں گے کہ پرچے کیسے گزرے۔ کامیاب ہونے اور فیل ہونے کا نتیجہ امتحان سے ایک ماہ بعد معلوم ہوگا۔

میرے خیال میں میری خواندگی خوب نبا رہے۔ ایک چھوڑ سات کتابیں اسی مضمون کی دیکھی ہیں۔ توقع تو ہے کہ پاس ہوجاؤں، آگے تقدیر ہے۔ اصل یہ ہے کہ لاطینی زبان کی اصطلاحات نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ ان کو یاد کرتے کرتے دق ہوگیا ہوں۔ ایک غیر مانوس زبان، نہ جس کے صرف و نحو سے واقف اور نہ لغات سے۔ لمبے چوڑے الفاظ یاد کرنا ہوتے ہیں اور پھر بعد میں مغالطہ میں پڑ جاتا ہوں کہ فلاں لفظ کے فلاں معنی ہیں، لیکن جب دیکھا تو میں غلط تھا۔ دو چار اصطلاحات ہوں تو خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ قریباً دو ہزار کے قریب لغات، الفاظ، اصطلاحات اور ضرب الامثال ہیں۔ اگر امتحان میں

ان اصطلاحات کے معنی غلط لکھ دیے تو پھر خیر نہیں۔ تمام محنت اکارت جاتی ہے۔

ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں ایک تہائی پرچہ لکھنے سے طالب علم پاس ہو جاتا ہے۔ یہاں کی یونیورسٹیوں میں ممکن ہے یہ قاعدہ ہو لیکن قانونی امتحانات میں ایک تہائی پرچہ کی کوئی سند نہیں۔ اس کا دارو مدار صرف ممتحن کی مرضی پر ہے۔ اس کے خیال میں جس کا پرچہ اچھا ہے، وہ پاس ہے باقی فیل ہیں۔ میرا پہلا امتحان ہے ممتحن کے معیار سے اس وقت تک بالکل ناواقف ہوں۔ پھر ہمارے ریڈر مسٹر بیٹ ایک دشوار پسند ممتحن ہیں۔ طلبا ان کے طرزِ سوال سے ہمیشہ شاکی ہیں۔ ان کے سوال کرنے کا ڈھب بھی دنیا جہاں سے نرالا ہے۔ طالب علم کو تمام کتاب حفظ ہے۔ اسی میں سے انھوں نے ایک سوال دیا۔ لیکن سوال کا سمجھنا مشکل ہے۔ جب کوئی سوال ہی نہ سمجھے تو طالب علم جواب کیا خاک دے۔ ان کے طرزِ سوالات کو سمجھنے کے لیے میں نے گزشتہ سالوں کے پرچے خرید ے۔ انہی میں ایک سوال تھا کہ" ایک غلام کے فطرتی اور قانونی مالکان کے حقوق میں کیا فرق ہے۔ ان کی کیا کیا چارہ جوئیاں ہیں مفصل جواب بحوالۂ اقوال جسٹینین دو" (جسٹینین شہنشاہ روم کا نام ہے بہت بڑا مقنن تھا۔ اس کی کتاب انسٹیٹیوٹ آف جسٹینین برائے نام ہمارے امتحان میں داخل ہے۔) میں نے اپنی تمام کتابوں کو اِس سرے سے اُس سرے تک اُلٹ ڈالا لیکن کہیں اس سوال کا جواب نظر نہیں آیا۔ کالج کے کتب خانہ میں گیا۔ وہاں بھی ناکامیاب رہا۔ آخر مسٹر ایڈورڈ بیرسٹرائٹ لا کے پاس گیا۔ ان سے پوچھا۔ وہ بولے، واللہ اگر خود جسٹینین اپنی قبر سے اُٹھ کر آوے تو اس سوال کا جواب نہیں دے سکے گا۔ یہ سوال کیا ہے، صرف صاحب ممتحن کے دماغ کا نتیجہ ہے۔

الغرض میری ہر طرح ہی سے مشکل ہے۔ تین گھنٹے کا تحریری پرچہ ہو گا۔ اس کے

بعد تقریری امتحان ہوگا۔ اس تقریری امتحان سے جدا روح کانپ رہی ہے
دیکھئے اس وقت کیسی بنے۔ اگر جواب وقت پر یاد نہ آیا تو بس خاتمہ ہے میں
اس امتحان کے ختم ہونے پر نتیجہ کا انتظار نہیں کروں گا، خواہ پاس ہوؤں یا فیل
اپنی پڑھائی دوسرے امتحان کی اس امتحان کے ختم ہوتے ہی جاری کر دوں گا
اس امتحان میں اگر پاس تو فھوالمراد ورنہ آئندہ دونوں امتحانوں میں شریک
ہونا ہوگا۔ اب تو ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم ۔ فیل ہوؤں یا پاس
مجھ کو چاروں امتحان پاس کرنا ہیں۔ میں فیل ہونے سے ڈرتا نہیں لیکن اس
بات سے شرم آتی ہے کہ میں اس سے پہلے کبھی فیل نہیں ہوا۔ ۔۔۔۔ امتحان اور
پڑھائی کے سوا مجھ کو دنیا جہاں کی خبر نہیں ہوتی، بریک فاسٹ کھا کر کرسی
پر ایسے بیٹھتا ہوں کہ رات کے گیارہ بجے وہاں سے اٹھتا ہوں۔ بستر میں بھی
کتاب ہے، پڑھ رہا ہوں۔ جب نیند نے غلبہ کیا، تب سو گیا۔ رات بھر کچھ
اسی قسم کے خواب آتے رہتے ہیں۔

شیرانی صاحب نے رومن لا، کرمنل لا، کانسٹیٹیوشنل لا اور لیگل ہسٹری کے امتحانات
میں کامیابی حاصل کی۔ وہ اپنے والد کے حکم پر بیرسٹری کا امتحان دینے گئے تھے، اس لیے والد
کی وفات کے بعد انھوں نے قانون کی تعلیم ترک کر دی اور لائبریریوں میں رہ کر قدیم فارسی
ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔

لندن یونیورسٹی سے انھوں نے فارسی میں امتحان دیا اور اول آنے پر انھیں اوزلے
اسکالرشپ ملا۔ جس سے انھوں نے پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی رہنمائی میں ایک سال تک
عربی زبان کا مطالعہ کیا۔

یہ خطوط کئی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ان سے شیرانی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں
لندن میں اُن کی سرگرمیوں، لندن میں ہندوستانی طلبہ کی حالت اور اُس شہر کی سماجی زندگی
پر روشنی پڑتی ہے اور پھر یہ سب کچھ ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ انگلینڈ میں
والینٹر فوج کا ایک صیغہ تھا۔ شیرانی صاحب اس صیغہ میں شامل ہونا چاہتے تھے، اس کے بارے

میں ۱۲ مئی ۱۹۰۵ء کے خط میں اپنے والد کو لکھتے ہیں:

"یہاں والنٹیر فوج کا ایک صیغہ ہے جس میں ہر ایک انگریز شامل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ غیر ملک کے رہنے والوں میں انگریزی رعایا کو بعض خاص شرائط کے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ میں نے اس فوج کے کرنل سے ملاقات کی ہے۔ بعد میں اس نے مجھ کو شریک ہونے کے قواعد بھیجے۔ چندہ داخلہ تین پونڈ ہے اور دس شلنگ جو سالانہ ادا کرنا پڑے گا۔ قد اور سینہ کی شرط میں پوری کر سکتا ہوں کیونکہ اس میں شرط ہے کہ قد پانچ فٹ پانچ انچ اور سینہ تینتیس انچ چوڑا ہو۔ یہ دونوں میں پوری کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط یہ ہے، جو ذرا سخت ہے، کہ چار سال تک اس میں مشق کی جاوے۔ اس شرط کو میں پورا نہیں کر سکتا کیونکہ میں شاید تین ساڑھے تین سال سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ دوسرے یہ کہ ہفتہ میں تین مرتبہ قواعد وغیرہ سیکھنا ہوتے ہیں۔ یہ بھی آسان ہے کیونکہ میں پریڈ سے بہت قریب رہتا ہوں۔ اس میں قواعد اور نشانہ مارنے سکھائے جاتے ہیں۔ آپ فرماویں گے تو سہی کہ مجھے کیا سوجھی ہے جو فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں لیکن اصل یہ ہے کہ والنٹیر ہونے کی صورت میں مجھ کو ہندوستان میں اکثر مفید صورتوں کی امید ہے۔ اس صورت میں مجھ پر ہر ایک انگریز مہربان ہو گا اور میری عزّت کرے گا اور میں اپنے حقوق ہر جگہ ثابت کر سکوں گا۔ دوسرے جسمانی لحاظ سے مجھ کو ورزش کی عادت ہو جاوے گی، مضبوط ہو جاؤں گا جو مجھ جیسے ضعیف القویٰ شخص کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان میں یہ موقع حاصل نہیں ہو سکتا اور والنٹیر ہونے کی صورت میں بندوق کے لیے لائسنس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے تو آپ جانتے ہیں کہ ہتھیار کے لیے ہندوستان خصوصاً انگریزی علاقہ میں سخت قانون ہیں۔ آپ اس کے لیے کیا رائے دیتے ہیں۔ یہ بھی لحاظ رہے کہ ہندوستان میں اگر یہ موقع کہیں ہے تو وہ صرف رئیسوں کے لیے ہے جیسے کریڈٹ کورٹ میرٹ میں، جس کے ممبر دربار صاحب جودھ پور ہیں۔ وہاں عام لوگوں

کے لیے کوئی اس قسم کا سلسلہ نہیں ہے۔
۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس صیغے میں داخلہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا لکھتے ہیں۔

"والنٹیری کی بابت آپ اجازت دیتے ہیں، لیکن میں گزارش کر چکا ہوں کہ میں نے اس کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اس میں ہفتے کی تین بار کی حاضری کی پابندی بُری ہے اور میں جب کہ قانون میں داخل ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض وقت ایسا آوے کہ ایک ہی وقت میں دونوں مقام پر میری حاضری ضروری ہے۔ دوسرے یہاں یعنی والنٹیری میں محنت اور جفاکشی پوری پوری ہے وردی پہننا۔ پورا سپاہی بننا۔ بندوق اٹھانا اور صبح ہی صبح قواعد کے لیے جانا، نشانہ بازی، دوڑ دھوپ۔ مطلب یہ ہے کہ مشکل ..... اس لیے میں والنٹیری کو تو خیرباد کہتا ہوں۔"

شیرانی صاحب چین سے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ والنٹیری کا خیال ترک کیا۔ فری میسن میں شریک ہونے کا ارادہ کر لیا۔ فری میسن کے بارے میں اپنے والد کو ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"رہا فری میسن کا معاملہ، یہ صحیح ہے آسان ہے۔ اس کا اثر بہت معنی خیز اور پایدار ہے۔ اس کی ہمدردی ہندوستان اور انگلستان ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام حصہ پر اس کا اثر ہے۔ اس کا ممبر کبھی بھوکا نہیں رہے گا اور اس لیے غریب اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس کا اثر ہندوستان میں بھی اس قدر مضبوط ہے کہ کالے اور گورے کے حقوق کو اس میں ایک نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی اور انگریز برابر ہیں۔ سب میں بڑی وجہ اس کے مفید ہونے کی یہ ہے کہ انگریز ہندوستانی سے وہی سلوک کرے گا جو انگریز سے کرے گا۔ انہی حقوق کو تمام ہندوستانی روتے ہیں۔ ہندوستانی بے وقوف ہیں جو اس میں شامل ہونے سے ڈرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب جاتا رہے گا۔ ہندوستان میں انگریزوں

کے فری میسن کے اشاعت پانے سے یہ ایک راز ہے جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کو اندرونی طور پر مضبوط کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک خفیہ جماعت ہے اور اس کے مقاصد دنیا میں ہم خیالی اور ہمدردی پھیلانا ہیں۔ قدیم تاریخ میں اس قسم کی بہت مثالیں ملیں گی جس میں قوموں نے اپنی خفیہ جماعتیں قائم کرکے زبردست سلطنتوں کو برباد کر دیا ہے۔ عرب میں اسی قسم کی جماعت نے دولت بنو امیہ کا خاتمہ کیا۔ مصر میں خلفاے عبّاسی نے اسی قسم کا پہلو اختیار کیا۔ اس وقت دنیا اخلاقی اصولوں میں خام تھی۔ سو اس قسم کی جماعتوں اور خفیہ کوششوں کے اثر کا استعمال صرف سلطنتوں کی بربادی میں کیا جاتا تھا لیکن اب دنیا شائستہ ہے اور اس خفیہ اثر سے مفید نتائج حاصل کئے جاتے ہیں خواہ وہ ملکی ہوں یا قومی۔ اس زمانے میں روس میں اسی قسم کی ایک جماعت جو حکمران حال خاندان کے خلاف ہے۔ یہ جماعت نہلسٹ کہلاتی ہے لیکن اس کی طاقت کا اور اثر کا آپ اس سے اندازہ کرلیں کہ روس جیسی طاقت ور سلطنت اس جماعت کا کچھ نہیں کرتی اور روس میں جس قدر فساد اور سرکشیاں آپ سنتے ہیں اس کے موجد نہلسٹ ہیں اور ایک زمانہ آوے گا (جو شاید نہایت ہی قریب ہے) جب کہ روس جیسی قومی سلطنت کو یہی نہلسٹ برباد کر دیں گے۔ خیر یہ تو اس خفیہ اثر کی بری مثال ہے۔ فری میسن کو نہلزم یعنی نہلسٹ فرقہ سے کوئی تعلّق نہیں اور نہ کوئی مشابہت۔ لیکن ان کے اصول ایک ہی بنیاد پر ہیں اس لیے کچھ مشابہت دے سکتے ہیں۔ جماعت فری میسن ایک روشن جماعت اور نہایت ہی شائستہ فرقہ ہے اس میں شک نہیں کہ تمام اغراض ہمدردی اور بہتری پر مبنی ہیں۔ اس کے خواہ کچھ ہی قانون ہوں لیکن وہ خفیہ ہیں۔ ان میں کچھ علامتیں ہیں جن سے ایک ممبر دوسرے ممبر کو پہچان سکتا ہے۔ بس اس میں داخلہ کو ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن نہ اس شرط پر جو آپ نے پیش کی ہے۔"

شیرانی صاحب نے ۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو والد کے نام خط میں لکھا ہے کہ وہ بادشاہ کی مدح میں قصیدہ کہنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک حساس، ذہین عالم فاضل لیکن ایک محکوم قوم کے نوجوان کے خیالات ہیں۔ ایک ایسے نوجوان کے جو زندگی میں مادی ترقی اور آسائش کا متمنّی ہے۔ اور شیرانی صاحب کا تصوّر ہمارے ذہنوں میں ایک محقق، نقاد، ماہر لسانیات اور ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار کا ہے۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ ابتدائی زندگی میں انھوں نے کبھی کبھی شعر بھی کہے ہیں، لیکن اس خط میں وہ ایک پختہ اور اعلیٰ درجے کے شاعر نظر آتے ہیں۔ اگر وہ خود کو شاعری کے میدان میں محدود کر لیتے تو اپنے عہد کے ممتاز شاعروں میں شامل ہوتے، اب اس خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"اب میں ایک اور امر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں اور امید ہے کہ آپ اس کو اپنے ہی تک رکھیں۔ بادشاہ کی مدح میں میرا ارادہ قصیدہ لکھنے کا مدّت سے تھا لیکن اب میں آمادہ ہو گیا ہوں کہ آئندہ سال وہ قصیدہ تحریر کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ اس خیال کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس تکلیف بے جا سے مجھ کو کوئی معتد بہ امید نہیں۔ بجز اس کے کہ یہاں کے چند اخبارات اس کے متعلق رائے زنی کریں اور ایک خط بادشاہ سلامت کا میرے نام پہنچے۔ بہر حال یہاں یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن ہندوستان کی نگاہ میں یہ بہت بڑی چیز ہو گی۔ کچھ نہیں تو ہندوستان میں چرچا ضرور ہو جاوے گا ہندوستان میں بہتیرے شاعر قصیدہ گو ہیں۔ لیکن دو وجوہ سے میں اس قصیدہ کو نئی چیز کر دکھاؤں گا اوّل تو یہ کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کراؤں گا، تاکہ یہاں کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کے شعرا اگر قصیدہ لکھتے بھی ہیں تو کسی کو اس قدر حوصلہ نہیں ہوتا کہ بادشاہ سلامت کو بھیجے۔ ان کی انتہائی دوڑ وائسرائے ہند ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ کو یہاں یہ موقع ہے کہ بادشاہ سلامت کو بھی بھیجوں۔ خود دربار میں جانا اور قصیدہ پیش کرنا، ممکن اگرچہ یہ بھی ہے اور اس کے ذرائع بھی میرے ہاتھ میں ہیں، لیکن اس میں کم از کم دو

ڈھائی سو پونڈ کا خرچ ہے۔ اس لیے اس خیال سے تو میں درگزر کرتا ہوں اور صرف بھیجنے کی تدبیر کو کام میں لاتا ہوں۔ قصیدہ کی چھپوائی وغیرہ میں پانچ اور دس پونڈ کے درمیان خرچ ہوگا لیکن اس سے کچھ زیادہ ہی فائدہ ہو رہے گا اور یہ قصیدہ میرا پہلا عریضہ مہاراجہ جودھپور کے پاس بھی جاوے گا۔ یعنی پہلے دربار کو قصیدہ بھیجوں گا اور اس کے ساتھ ہی عرضی، اور دربار اس کا جواب قطعی دیں گے۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ بہت مؤثر ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ قصیدہ میں دیگر اُن افسرانِ ہندوستان و رؤسا وغیرہ کو بھیجوں گا جس کے جواب میں وہ شکریہ کی چٹھی تو کم از کم ضرور لکھیں گے۔ غرض یہ ہے کہ شہرت اس سے اچھی خاصی ہو جاوے گی۔ ادھر ہندوستان والوں کی نگاہ میں نئی بات ہوگی۔ اسی طرح انگلستان والوں کے لیے یہ امر نوادرات سے ہوگا۔ الغرض میری نگاہ میں یہ چھوٹا سا معاملہ بہت اچھا ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی اس میں میرے ہم خیال ہوں گے۔ قصیدہ ہونے کے لحاظ سے بھی اس قصیدہ میں کئی باتیں نئی ہوں گی۔ اوّل تو یہ کہ تمہید تمام قصیدہ گویوں سے جدا ہوگی اور علیٰ ہذا خیالات جدا۔ قصیدے کے لیے میں تمہید یا تشبیب مدت سے تلاش کر رہا تھا۔ ہمارے فارسی شاعروں کی جس قدر تمہیدیں ہیں وہ مشرقی مذاق کی ہیں۔ مغربی لوگ اس سے کوئی دلچسپی نہیں لے سکتے۔ عشقیہ تمہیدیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ یورپ اور ایشیا دونوں اس کو پسند کریں لیکن اس میدان میں میری رسائی نہیں اور نہ ہی زورِ طبیعت دکھا سکتا ہوں۔ اس لیے کسی اور زمین کی تلاش ہوئی اور آخر بدقتِ تمام مل گئی۔ اب زمین مل گئی ہے خیال آفرینی ہو جاوے گی۔ یہ یہ تشبیب زیادہ تر انگریزی مذاق سے ملتی جلتی ہوگی لیکن خیالات مشرقی ہوں گے۔ یونان کے دیوتاؤں کی پرستش یونان میں بھی نہیں ہوتی ہوگی جس قدر انگریزی ادب میں ہم ان کا ذکر پاتے ہیں۔ اس لیے میں نے اس خیال کو اپنے ذہن نشین کیا ہے۔ تمہید میں انہی دیوتاؤں کا ذکر ہوگا اور کہیں مصری

بتوں کا، کبھی عربی بتوں کا۔ ہندوستان کے دیوی دیوتا بھی فراموش نہیں ہوں گے اور اس طرح سے تمہید ختم ہوگی۔ میرے خیال میں یہ تمہید نہایت اعلیٰ ہوگی۔ شاعر شعر کہتے وقت مذہب بھول جاتا ہے، بھولتا نہیں بلکہ مذہب کا دشمن ہوتا ہے۔ جس مذہب کا وہ ہے، سب سے پہلے اسی مذہب پر حملہ کرتا ہے۔ غالبؔ امام حسینؑ کے مرثیہ میں لکھ رہے ہیں۔ تمہید کا شعر:

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بُت کدہ سازند حرم را

نعتیہ قصیدہ کی تمہید میں محسن کاکوروی تحریر کرتے ہیں:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

مطلب یہ ہے کہ شاعر کا مذہب شعر کہتے وقت شعر ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کہہ سکتا ہے اور کوئی اس کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں کہ علمائے اسلام نے بوعلی سینا اور امام غزالی جیسے علما کو کافر اور مرتد کہا لیکن عرفی اور فیضی کو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ مولویوں میں بھی یوں ہی عزیز تھے جس طرح دہریوں میں، الغرض یہ تمہید عذر تمہید میں تھی کیوں کہ میری تمہید نئی ہوگی اور نئے خیالات۔ زمین اور بحر مجھ کو اس وقت تک دلچسپ نہیں ملے۔ قافیہ کی پابندی بہت مشکل ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے انگریزی نام مجھ کو تحریر کرنا ہوں گے مثلاً ایڈورڈ ہفتم، کوئین الیگزینڈرا، آسٹریلیا، پارلیمنٹ پرنس آف ویلز وغیرہ وغیرہ۔ ہماری بہت سی شگفتہ بحروں میں یہ نام نہیں آسکتے مگر جو بحر اس وقت ملحوظ خاطر ہے، ممکن ہے کہ اس میں آجادیں۔ یہ بحر تو بہت اچھی ہے لیکن اس کا قافیہ مشکل ہے عرفی کا قصیدہ آپ کو یاد ہوگا:

صباح عید چو در تکیہ گاہ نازو نعیم
گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

اس وقت یہ زمین مناسب معلوم دیکھتا ہوں۔ لیکن اس کے قافیہ اکثر غیر مانوس ہیں۔ قافیہ بدلنے میں زمین شان سے گرتی ہے۔ الغرض جیسا مناسب معلوم ہوگا کروں گا۔ اس وقت دو چار شعر مشتے نمونہ از خروارے لکھ دیتا ہوں۔ آپ اس سے بھی واقف ہیں کہ مجھ کو فرصت بالکل نہیں ہے۔ اس لیے اس قصیدے کی جلد تیاری کی امید نہ رکھیں۔ دیر آید درست آید۔ اور جلدی بھی کیا ہے آئندہ ماہ جون تک ہر حالت میں یہ قصیدہ طیار ہو جاوے گا، جون میں بادشاہ کی سالگرہ پر، تمہید کا شعر حسبِ منشا اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا ہے لیکن جو ملا ہے وہ لکھتا ہوں:

بشر ہے نوع مری میرا شیوہ ہے تسلیم
ازل نے کی ہے مجھے رسم بندگی تعلیم
بتوں کے آگے مرا سر جھکا ہے صدیوں تک
گواہ جس کی ہے تاریخ سالہائے قدیم
تمیز صانع و مصنوع سے نہ تھا واقف
میں فلسفی نہ تھا مشکل تھی اس قدر تفہیم
ابھی ہوئے نہ تھے یزدان و اہرمن پیدا
عدم میں محو تھا افسانۂ بہشت و جحیم
جہاں میں چار سو سکہ تھا دین آزر کا
خلیل بن کے نہ آیا تھا اب تک ابراہیمؑ
بہت زمانہ تھا درکار اس کو جب ہوتا
ظہور واقعۂ طور و داستان کلیم
یہ کل کی بات ہے تثلیث کہیے یا توحید
مرے زمانہ میں ان کی ہوئی نہ تھی تقسیم

عجیب زمانہ تھا یادش بخیر عہد قدیم
بتوں پہ ختم تھی ساری خدائی کی تقسیم

الغرض آگے بتوں کی تمہید ہوگی۔کیوپڈ، ڈائنا، جوپیٹر، اپالو (یہ یونانی اور رومی دیوتا ہیں) لات، منات، عزیٰ، ہبل، بعل (عربی دیوتا) وغیرہ کا ذکر ہوگا۔"

یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ شیرانی صاحب کا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔

شیرانی صاحب لندن کی تعلیمی زندگی اور وہاں کی سماجی زندگی کے بعض نئے پہلوؤں کے بارے میں بھی لکھتے رہتے تھے۔مثلاً لندن میں طلبہ کو کچھ عام ڈنر اور ہر سال ایک گرانڈ ڈنر دیا جاتا تھا، اس کی غیر معمولی اہمیت تھی۔شیرانی صاحب نے والد کے نام خطوط میں ان ڈنروں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔شیرانی صاحب کے مالکِ مکان کے بھانجے کا انتقال ہوگیا۔شیرانی صاحب نے والد کو اس موت کی خبر دی اور اس موقع پر جو رسمیں انجام دی گئیں، انھیں تفصیل سے بیان کیا۔جس سے ہمیں انگریزوں کی موت کی رسموں کا اندازہ ہوتا ہے۔اسی خط میں شیرانی صاحب نے انگریزوں اور مشرقی لوگوں کی قبروں کے کتبوں پر بھی معلوماتی گفتگو کی ہے۔ایک دن شیرانی صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ لندن کے ایک میلے میں گئے۔ ۲ مئی ۱۹۰۶ء کے خط میں والد کو اس میلے کی تفصیلات بہت دلچسپ انداز میں بیان کی ہیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کلاس میں جو لیکچر ہوتا تھا، شیرانی صاحب اس کا خلاصہ والد کے نام خط میں لکھ دیا تھا۔میرے خیال سے اس کے دو مقصد تھے، ایک تو یہ کہ لیکچر کا خلاصہ لکھنے سے تمام حقائق اُن کے ذہن نشیں ہوجانے اور دوسرے وہ اس طرح اپنے والد کی معلومات میں اضافہ کر دیتے۔

کلاس میں "رومیوں کی قوم میں مالکِ خانہ کے حقوق اس کی اولاد پر" لیکچر ہوا تو شیرانی صاحب نے ۲۰ جون ۱۹۰۵ء کے خط میں اس کا خلاصہ لکھا۔ایک دفعہ رومی قانون کی تاریخ پر لیکچر ہوا تو ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء کے خط میں اس کا خلاصہ لکھ کر والد صاحب کو بھیجا۔

۴ فروری ۱۹۰۶ء کے خط میں رومیوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ خط کے ساتھ رومن لا پر ایک دو ورق منسلک کئے ہیں۔ شیرانی صاحب نے خطوط میں ہندوستانیوں کی رسموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً انھوں نے ۲۹ نومبر ۱۹۰۵ء کے خط میں لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمان لندن میں کس طرح عید مناتے ہیں اور ۱۵ فروری ۱۹۰۶ء کو عید الاضحیٰ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

۱۹۰۶ء میں شیرانی صاحب کے والد کا انتقال ہوگیا۔ شیرانی صاحب ہندوستان آئے کچھ دن رہ کر دسمبر ۱۹۰۶ء میں پھر لندن واپس چلے گئے۔ جب تک والد حیات رہے، انھیں مالی دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن والد کی وفات کے بعد چھوٹے بھائی مسعود خاں نے اخراجات بھیجنے میں کوتاہی کی۔ بلکہ ایک خط میں محمود شیرانی صاحب کو لکھا کہ "والدہ کہتی ہیں کہ یہ پیسے آخر کب تک بھیجے جاتے رہیں گے۔" اس خط کے جواب میں محمود شیرانی نے ۲ جنوری ۱۹۰۸ء کے خط میں انھیں لکھا:

"بوا کی اور تمھاری شکایتوں کے جواب کیا دوں۔ تم لوگ اگر سوچو تو ان کا خود ہی جواب پیدا کر سکتے ہو۔ اگر نہ سوچو اور سمجھو تو میرے جوابات بھی تم کو تشفی نہیں دے سکیں گے۔ تمھاری اور بوا کی بے آرامی اور تفکرات، اس کا میں جواب کیا دوں۔ تم کو اگر غیروں نے فرضاً تکلیفیں دی ہیں تو ان کی اس میں غرض تھی یا فائدہ تھا لیکن تم نے مجھ کو جو پریشانیاں دی ہیں اس کا کیا جواب ہے۔ طرفین میں سے اس میں کسی کا نفع بھی متصور نہیں بلکہ دونوں طرف نقصان متصور ہے۔ جب میں ہندوستان تھا تو تم اس قدر فیاض بن گئے کہ میرے اخراجات کا بوجھ خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا اور اس کے بعد جس طرح تم نے اپنا وعدہ نبھایا ہے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ تم پر جو بلائیں آئیں وہ تمھارے نامہربان بھائیوں کے طفیل لیکن میری مصیبتیں میرے مہربان بھائیوں کی وجہ سے ہیں۔ بہرحال میری وہی کیفیت ہے مردہ بدست زندہ۔ جب تمھارا جی چاہے مجھ کو خرچ بھیج دو اور پھر لطف یہ کہ احسان کا احسان، شکایت کی

شکایت ہے " تم ۱۹۰۴ء میں گئے تھے " لیکن تم یہ بھول گئے کہ میں یہاں اکتوبر
میں پہنچا تھا اور دسمبر میں بیمار ہو گیا تھا۔ اگر تمھارے دل ہوتا اور آنکھیں
ہوتیں تو معلوم کر لیتے کہ آخر اس ڈیڑھ مہینے میں میں کیا کیا کر لیتا۔ اس کے بعد
میں نے بیماری سہی۔ خیر اس وقت اگر تمھیں یقین نہیں آیا تو نہ آیا لیکن جب
تم نے اپنی آنکھوں سے اور ابوا نے میری کیفیت دیکھ لی تو تم کو یقین آنا چاہیے
تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں میں ہندوستان آیا۔ یہ مانا کہ میں نے حماقت کی،
لیکن وقت تو اس میں ضائع گیا۔ ہندوستان جب میں آیا تو میری آٹھ ٹرمیں
پوری ہوئی تھیں۔ چار اور باقی تھیں اور تمھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اکتوبر
۱۹۰۶ء کی ٹرم ضائع گئی۔ آخر میں مارچ ۱۹۰۷ء کی ٹرم میں شریک ہوا۔ تو
بہر حال مجھ کو مارچ ۱۹۰۸ء تک ٹھہرنا چاہیے۔ یہ باتیں تو معمولی عقل کی ہیں
ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے لیکن خدا نے تم کو عقل دی ہوتی تو یہ باتیں کاہے کو
ہوتیں۔ تمھیں اگر باپ کے کفن کی شرم ہوتی، تمھیں اگر بھائی کا درد ہوتا
تو تم سمجھتے کہ آخر میں جو ڑ لا ڑ لا کر خرچ بھیج رہا ہوں تو وہ کم بخت لندن میں
کس طرح گزارہ کر رہا ہو گا۔ وہ اکیلا ہی نہیں ہے اس کے ساتھ ایک اور
تحفۂ علت بھی ہے۔ آخر کار اس پر کچھ نہ کچھ خرچ ضرور آتا ہے۔ تمھاری
اس دیدہ دلیری کا کیا علاج کہ میں جو تم کو لکھوں اس کو جھوٹ مانو، بیہودہ
سمجھو اور پھر کہے جاؤ کہ اس قدر خرچ ہو گیا۔ آپ کو اپنی سعادت مندی اور
بوا کی تابعداری کا خیال میرے ہی معاملہ میں آتا ہے۔ والد کے انتقال کے
بعد اب تک آپ نے جو فیاضی میرے ساتھ کی ہے وہ میرے حق سے زیادہ
نہیں کی ہے۔ اس قدر تو میرے حصہ ہی میں غالباً آجاتا اور ساتھ ہی مشہود
کا بوجھ میں نے اپنے سر لیا۔ تمھارا صرف ایک اصول ہے کہ روپیہ کمایا جاوے
لیکن کس طرح اور کیونکر اس سے بحث نہیں۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ
اس کے لیے بھی لیاقت ذاتی اور لیاقت علمی درکار ہے۔ تمھیں اگر علم اور لیاقت

سے نفرت ہے تو ہو لیکن دوسرے جو اس طرف متوجہ ہیں ان کو کیوں روکتے ہو خالی روپیہ کسی کام کا نہیں۔ تمھارے اپنے گھر میں تمھارے دو بڑے اور دو چھوٹے موجود ہیں۔ ان کی مثال سے تم بہت کچھ نصیحت لے سکتے ہو۔ تم کو اگر مشہود کی تعلیم میں دلچسپی نہیں تو مجھے تو ہے۔ ٹونک میں رہ کر وہ بھی تباہ ہوتا۔ اس کے واسطے تمھیں اور بوا کو دو پونڈ ماہوار بھی گراں گزرتے ہیں اگرچہ یہ لندن ہی کا خرچ کیوں نہ ہو۔ مجھے لندن پہنچے تیرھواں مہینہ گزر رہا ہے، یاد رکھو تیرھواں مہینہ۔ اب سولہ کو تیرہ میں ضرب دے کر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے، دو سو آٹھ پونڈ۔ منجملہ ازیں تم نے مجھے بھیجے ہیں ماہواری خرچ کے لیے۔
آتے وقت ستر پونڈ دیئے جن میں سے صرف ۲۵ پونڈ مجھ کو لندن کے مصارف کے لیے بچے۔ الغرض جنوری سنہ ۷ میں ۳۵، مئی میں ۶۵، اگست میں ۵۰۔
جن کی کل میزان ہوتی ہے ۱۵۰ پونڈ۔ جب یہ رقم ۲۰۸ پونڈ میں سے تفریق کی جاتی ہے تو باقی نکلتے ہیں ۵۸ پونڈ اور میں اس وقت تک ۷۰ پونڈ کا قرضدار ہوں۔ اس کے علاوہ تین ماہ اور مجھ کو اپنے امتحان میں لگیں گے۔ ان تین مہینوں کا خرچ ۴۸ پونڈ ہوگا۔ علاوہ ازیں ۹۰ پونڈ مجھ کو بیرسٹر کی ڈگری ملنے پر ادا کرنا ہوں گے۔ الغرض کلھم بیرسٹر ہونے تک مجھ کو ۲۰۸ پونڈ پہنچنا چاہئیں، یاد رکھو ایک سو اٹھتّر پونڈ۔ اس رقم سے گریز نہیں خواہ میں روؤں اور خواہ تم۔
یہ رقمیں ضروری ہیں تمھیں بھیجنا ہوں گی۔ اور اگر نہیں بھیجو تو ہمیں اپنی تقدیروں پر چھوڑ دو اور جواب جلد دو۔ والسّلام"

غالباً مسعود خاں صاحب نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش ہو گئے اور رقم بھیجنی بند کر دی۔ شیرانی صاحب سخت پریشان تھے۔ اُن پر خاصا قرض تھا اور آمدنی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک دن وہ کسی کباڑیے کی دُکان پر کھڑے پرانی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ کہ اچانک ایک ایسی کتاب پر نظر پڑی، جو اُن کے خیال سے بہت قیمتی تھی۔ دُکان دار نے کتاب کے دام اتنے ہی مانگے، جتنے شیرانی صاحب کے جیب میں تھے۔ کتاب خرید کر شیرانی صاحب

لوزک اینڈ کمپنی میں پہنچے ۔ یہ کمپنی پرانی چیزوں کا کاروبار کرتی تھی۔ کمپنی نے کئی پونڈ میں یہ کتا
خرید لی۔ اس واقعے کے بعد شیرانی صاحب نے پرانی چیزوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ نیز ترج
کا کام شروع کیا اور کچھ طلبہ کو بھی پڑھانے لگے ۔ اس طرح ان کی مالی دشواریاں دور ہوگئی
پرانی اشیا کے کاروبار نے انھیں عتیقیات کا ماہر بنا دیا۔ انھوں نے علم سکہ شناسی، کتب
شناسی، مہر شناسی، تصویر شناسی، قدیم کاغذ، روشنائی، آرائش، نقش و نگار، او
علم خط میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ لوزک اینڈ کمپنی نے انھیں معقول تنخواہ پر باقاعدہ ملا
رکھ لیا۔ ۱۹۱۳ء میں اس کمپنی نے انھیں ہندوستان بھیجا کہ وہ یہاں سے نادر اشیا خرید کر
کمپنی کو بھیجیں۔ ہندوستان آکر کچھ عرصے تک وہ کمپنی کا کام کرتے رہے، لیکن پھر نہ جانے
کیوں انھوں نے کمپنی کی ملازمت ترک کر دی۔ اور ہندوستان میں مستقل قیام کر لیا۔

۱۴۴

غالبؔ کے خطوط (جلد سوئم)

مرتبہ: خلیق انجم

صفحات : ـــــ ۴۸۲
قیمت : پچھتر روپے
طباعت : ـــــ آفسٹ

اُردو کے مشہور و مُمتاز مُحقق ڈاکٹر خلیق انجم نے غالبؔ کے تمام اُردو خطوط کا پہلی بار چار جِلدوں میں سائنٹی فک طریقے سے تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

چوتھی جلد زیرِ طبع ہے۔

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

فارسی اردو تحقیق کا مکتب شیرانی

صدر محترم اور معزز حاضرین!

گرچہ خردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

آج میں آپ کے سامنے ایک ایسے فاضل و عالم محقق کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جسے مکتب شیرانی کا نامور ترین فرد مانا گیا ہے، اس ناچیز کو بھی کم از کم طفل دبستاں کی حیثیت سے ہی سہی اس عظیم مکتب سے ایک گونہ وابستگی کا شرف حاصل ہے۔

حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے علم و فضل، تحقیق و تنقید وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، جب تک ہندوستان و پاک و بانگلادیش برصغیر میں فارسی اردو تحقیق کا رواج رہے گا تب تک شیرانی صاحب کا نام اس میدان کے شہسوار اول کی صف اول میں بلکہ سرفہرست رہے گا۔

شیرانی مکتب تحقیق کی مخصوص روایات اردو و فارسی تحقیق کا اہم جزو بن چکی ہیں

لیکن خود شیرانی صاحب کے بڑے قابل شاگردوں میں بہت کم تھے یا ہیں جنھوں نے ان کی مخصوص تنقیدی تحقیق کو اپنی صلاحیت کے لئے جولانگاہ اور اپنے ادبی نصب العین کا آماجگاہ بنایا، ان کی قائم کردہ روایات اور ان کے طریق تحقیق کو بجا طور پر ان کا مکتب تحقیق کہا گیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس اسکول کے صحیح معنوں میں پیروؤں کی تعداد بہت ہی کم نظر آتی ہے، ان کے باقاعدہ عالم و فاضل شاگردوں کی تعداد کافی ہے، مثلاً ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر آغا عبدالستار یاسین خاں نیازی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، پروفیسر بھگوت سروپ، ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ، پروفیسر شریف علی وغیرہ، جنھوں نے اردو فارسی زبان و ادب اور درس و تدریس اور تحقیق و تبصرہ کے کسی نہ کسی میدان میں بہت نمایاں خدمات انجام دیں لیکن یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ ان میں سے کسی نے شیرانی صاحب کے مخصوص مسلکِ تنقید و تحقیق کو تخصص کا درجہ نہیں دیا، البتہ ان میں سے کچھ شاگردوں کے بارے میں میری اطلاعات نسبتاً کم ہیں اس لئے اپنے اس بیان پر مجھے اصرار نہیں ہے۔

بہر حال صحیح معنوں میں شیرانی صاحب مرحوم کے اس مخصوص میدان میں جانشین ہونے کا سہرا ایک ایسے شخص کے سر ہے جو روایتی معنوں میں یعنی باقاعدہ طور پر ان کا شاگرد نہ تھا لیکن عمر بھر اُن کو اپنا استاد مانا کیا۔

بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ جو لاہور میں شیرانی صاحب کے جانشین ہوئے۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم تحقیق و تنقید میں شیرانی اسکول کے ممتاز ترین فرد تھے، ڈار صاحب مرحوم جن کے ادنیٰ شاگرد ہونے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ پنجاب کے مشہور شہر امرتسر میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے، ان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم وہیں ہوئی، میٹرک کے امتحان میں وہ پورے صوبے میں کل مسلم طلبہ میں اوّل رہے، خالصہ کالج امرتسر سے عربی میں بی اے کرنے کے بعد ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں مشہور عربی کے عالم و فاضل ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ وغیرہ ان کے ہم کلاس تھے، عربی میں ڈار صاحب نے باقاعدہ طور پر تعلیم پرنسپل محمد شفیع صاحب سے حاصل کی اور وہ ان کے محبوب شاگرد تھے اور محض انھی کے کہنے سے انھوں نے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات دیے اور ان میں اعلیٰ نمبر سے کامیاب ہوئے، ایم۔ اے عربی میں وہ درجۂ اوّل میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۲۸ء سے

۱۹۳۱ء تک پنجاب یونیورسٹی کے مک لاڈ عربی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے انھوں نے شفیع صاحب مرحوم کی نگرانی میں جاحظ کی کتاب البخلا کا انگریزی ترجمہ کیا، اسی دوران میں انھوں نے جاحظ اور اس کی تصنیفات وغیرہ پر مضامین لکھے جو اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوئے انھی دنوں میں ڈار صاحب کو شیرانی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تنقید شعر العجم شائع ہونے کے ساتھ ہندوستان میں بالخصوص لاہور میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ ایک روز کسی ادبی تقریب میں شیرانی صاحب اپنی تقریر کے بعد ہال سے باہر آئے تو ڈار صاحب ان سے مخاطب ہوئے اور اپنے مخصوص انداز اور لہجے میں یہ کہتے ہوئے گزر گئے کہ شیرانی صاحب تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے، شیرانی صاحب پر اس چبھتے ہوئے جملے کا بڑا اثر ہوا اور کچھ روز گزرنے کے بعد انھوں نے ڈار صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور اس مسئلے پر مفصل گفتگو کی اور انھیں اپنے موقف سے آگاہ کیا، اس گفتگو نے ڈار صاحب کو نہ صرف مطمئن کیا، بلکہ وہ شیرانی صاحب کی شخصیت، علمیت، بصیرت وغیرہ سے نہایت متأثر ہوئے، اس دن سے وہ شیرانی صاحب کو اپنا استاد ماننے لگے اور افادہ اور استفادہ کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آخر عمر تک جاری رہا۔ شیرانی صاحب سے ان کی والہانہ عقیدت روز بروز بڑھتی گئی اور ادھر شیرانی کو بھی ان سے لگاؤ پیدا ہوا اور اسی طرح بڑھتا گیا اس لگاؤ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اپنے آخری دنوں میں انھوں نے اپنی پوتی یعنی اختر شیرانی صاحب کی صاحبزادی اور پروفیسر مظہر محمود صاحب شیرانی کی ہمشیرہ کو بڑی تاکید سے ہدایت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع ابراہیم صاحب کو ضرور دینا۔

شیرانی صاحب کے فیض صحبت اور ان سے بے انتہا عقیدت نے ڈار صاحب کی صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیئے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے ان صلاحیتوں کے ساتھ سونے پر سہاگے کا کام کیا، یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ڈار صاحب نے بھی اپنے استاد کی طرح مختلف عوامل وحالات کے تحت کم از کم اپنی علمی اور تحقیقی زندگی کا آغاز کافی دیر سے کیا اور اپنے تقریبًا بائیس سال کے درس و تدریس کے بمشکل آخری پانچ سال کام کر پائے تھے کہ موت کے ظالم اور بے پناہ ہاتھوں نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔

ریسرچ سکالرشپ کے تین چار سال ملاتے ہوئے دیکھا جائے تو ڈار صاحب نے اپنی کل نو دیر سال کی مختصر علمی زندگی میں اردو اور انگریزی زبانوں میں تیس پینتیس معرکہ آرا مضامین لکھے جن میں سے ہر ایک بلا مبالغہ ان کی ہمہ گیر علمی طبیعت وسیع مطالعہ، استیعاب، نقد و نظر اور اظہار بیان کی خوبی پر شاہد عادل ہے، بقول ڈاکٹر سید عبداللہ جن کے ڈار صاحب سے گہرے مراسم بھی رہے ہیں۔ شیرانی صاحب کی ممتاز خوبیاں، وسعت نظر، جزئیاتی تفصیلات تنقیدی گرفت، طرز استدلال اور طریق بحث ڈار صاحب کی تحریروں میں نمایاں ہیں، نیز شیرانی صاحب کی تاریخی اور مناظراتی تحریروں میں جو ادبی لطف ہے وہ ان کی تحریروں میں بھی ہے، متانت اور قطعیت کے ساتھ تحریر کی شگفتگی اور کشادگی اور دلنشیں اور لطیف طنز قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔

ان کی تدریسی زندگی کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں ہوئی جب ان کا تقرر صوبۂ بمبئی کے شہر احمد آباد کے گورنمنٹ کالج گجرات کالج میں فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا اور وہ وہاں تقریباً آٹھ سال فارسی اور اردو پڑھاتے رہے، ان کی علمی اور تحقیقی زندگی کی کچھ سرگرمیاں لاہور میں ریسرچ اسکالرشپ کے زمانے میں تھیں وہ احمد آباد آکر تقریباً ختم سی ہو گئیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ احمد آباد میں ایک گونہ شعر و شاعری کے چرچوں کے سوا خالص علمی اور ادبی ماحول کالعدم سا تھا، چنانچہ ڈار صاحب نے اپنی پوری توجہ درس و تدریس پر مرکوز کی اور اپنے اس کام میں تن دہی سے مصروف رہے، ساتھ ساتھ شہر کی محدود ادبی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے رہے، بلکہ کچھ دنوں میں انھوں نے شہر کے اہلِ ذوق حضرات اور طلبہ کو اپنے علم و فضل کے ساتھ حسن خلق اور خوش طبعی سے اپنا گرویدہ بنا لیا، گو بحیثیت مجموعی ان کی تحقیقی صلاحیتیں یہاں پورے طور پر بروئے کار نہ آسکیں تاہم انھوں نے اپنے علمی ذوق و شوق اور تجسس و تحقیق کے لئے کچھ راہیں ضرور نکال لی تھیں، احمد آباد میں وہ عربی فارسی اور گوجری ادب کی کتابوں کی کھوج میں لگے رہتے، انہی دنوں بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی جن سے ڈار صاحب کے لاہور کے زمانے کے مراسم تھے اور جو شیرانی صاحب کو ڈار صاحب کی طرح اپنا استاد مانتے تھے ان دونوں کو

بڑودہ کھمبات وغیرہ مقامات کے کتاب خانوں کی سیر بھی کرائی، خود شیرانی صاحب نے بھی احمد آباد وغیرہ کا دورہ ان کی دعوت پر کیا، احمد آباد سے ہی انھوں نے مولوی عبدالحق اور شیرانی صاحب کے لئے قاضی محمود دریائی (دسویں صدی نصف اوّل) کے گوجری دیوان کی نقلیں تیار کروائیں، احمد آباد میں ہی انھوں نے جہاں آرا کی تصنیف رسالہ صاحبیہ کا نسخہ دریافت کر کے ایک مضمون میں اس کا خلاصہ اور مقدمہ اورینٹل کالج میگزین لاہور کے اگست ۱۹۳۷ کے شمارے میں شائع کیا، ساتھ ساتھ انھوں نے گجرات کالج میں اپنے ایک رفیق کار استادِ تاریخ پروفیسر مانکشا کا مسریات جو انگریزی میں سلاطین گجرات کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ ان کی فارسی عربی آخذ مثلاً کتبے، حاجی دبیر کی عربی تاریخ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ وغیرہ کے مواد کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اعانت کرتے رہے۔ یوں ان کو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع ملا اور اس میدان میں بھی انھوں نے کافی معلومات حاصل کیں۔

احمد آباد سے ڈار صاحب ۱۹۳۹ء میں تبادلے پر اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی تشریف لے گئے جہاں ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی ڈاکٹر حسین الہمدانی (جو بعد میں پاکستان کے اوّل سفیر مصر ہوئے)، پروفیسر مولوی وغیرہ جیسے عربی فارسی اور اردو کے عالم فاضل اساتذہ موجود تھے۔ بمبئی شہر میں بھی مولانا مہر محمد خان صاحب شہاب مالیر کوٹلوی سید شہاب الدین دسنوی وغیرہ جیسی ذی علم شخصیتوں سے رابطہ قائم رہا، جو تا مرگ بدستور جاری رہا، ۱۹۴۵ء میں پھر وہ احمد آباد واپس تشریف لائے اور پھر ۱۹۴۸ء میں دوبارہ بمبئی منتقل ہوئے جہاں پانچ سال کے بعد ۴۹ سال کی عمر میں وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

ڈار صاحب نے غیر معمولی حافظہ پایا تھا، بلا مبالغہ وہ جو چیز ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے وہ انھیں ازبر ہو جاتی تھی، ہمارے ایم۔ اے کے کلاسز میں منجملہ دیگر کتابوں کے قصائد انوری پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ آنکھوں کی کچھ تکلیف تھی (ویسے ان کی ایک آنکھ موتیا یا کالا پانی کے آپریشن کے بعد بصارت کھو چکی تھی)۔ اس لیے وہ تقریباً پورا ہفتہ

قصیدوں کے اشعار بالترتیب اپنے حافظے سے زبانی پڑھ کر ان کی تشریح کرتے اور پڑھاتے رہے، نہایت ہی خلیق، منکسر المزاج، قناعت پسند اور بردبار طبیعت پائی تھی، آشنا پروری اور دوست نوازی میں احمد آباد اور بمبئی میں مشہور تھے، شیرانی صاحب کی طرح وہ بھی اپنے شاگردوں سے بڑی محبت کرتے اور ان کی علمی اور دیگر قسم کی اعانت کرتے۔

بمبئی میں وہ عربی بھی پڑھاتے تھے، عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی اور ان کے ادب پر نہایت گہری نظر رکھتے تھے، فرض شناسی کا شدید احساس تھا، تدریس ہو یا تحریر اگلے روز کے سبق کی تیاری یا مضمون کے مواد کی فراہمی کے لئے وہ اپنا بیشتر وقت کالج کے کتب خانے میں گزارتے، تلاش و تحقیق پر زور دیتے، گھر پر بھی شام گئے رات تک شاگرد احباب موجود رہتے، صحیح معنوں میں وہ فنا فی العلم تھے۔ بے انتہا علمی شغف اور قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان میں لاہور اور دیگر مقامات سے بہتر مشاہرے پر اسامیوں کی آفر بھی آئیں لیکن نہیں گئے۔

آغا خاں مرحوم کے نبیروں کی تعلیم و تربیت کے لئے ان پر نظر انتخاب پڑی، لیکن انھوں نے منظور نہیں کیا اسی طرح شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ نے کشمیر میں مجوزہ تاریخی انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹرشپ کے لئے ان کو منتخب کیا لیکن انھوں نے انکار کیا۔

۱۹۴۸ء مابعد یعنی بمبئی کے قیام دوم کو ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے، اگرچہ یہاں کے قیام اوّل کے زمانے میں وہ شمس العلماء محمد عبدالغنی صاحب کی "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" پر شیرانی صاحب کے تبصرے کے تکملے کے طور پر ایک مضمون رسالہ اردو میں شائع کر چکے تھے لیکن ان کی طبیعت میں بقول خود ان کے لکھنے کی طرف کچھ عدم میلان اور تساہل کو دخل تھا، بمبئی کے اسی قیام دوم کے دوران اسمٰعیل کالج میں ان کے ایک فاضل و عالم اور ہونہار رفیق کار ڈاکٹر باقر علی ترمذی تھے جن کی ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں جامعہ ازہر میں عربی کی اعلیٰ تحصیل کے دوران ناتجربہ کار Internee سرجن ڈاکٹروں کے ہاتھوں بے وقت موت ہوئی، ان کی رغبت، فرمائش اور پیہم اصرار نے ڈار صاحب کے اشہب قلم کے لئے مہمیز کا کام کیا،

چنانچہ شمس العلماء کی کتاب پر دوسرے مبسوط تفصیلی مضمون کو چھوڑ کر ان کے اکثر مضامین اسی اصرار کے نتیجے میں لکھے گئے یا ان کے خاکے تیار ہوئے، غرض بمبئی کے اس قیام دوم کے پانچ سال کے عرصے میں غیر معمولی علمی اور تحقیقی سرگرمی کے نتیجے میں تیس پینتیس تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھ کر ڈار صاحب نے علمی دنیا میں اپنا مقام بنایا ۔

اس سے قبل میں ان کے لاہور کے عربی ریسرچ سکالر کی حیثیت سے لکھے ہوئے مضامین اور احمد آباد کے قیام اوّل کی یادگار شہزادی جہان آرا کے غیر معروف رسالہ صاحبیہ والے مضمون کا ذکر کر چکا ہوں، ان کا دوسرا مضمون شیخ فریدالدین عطار کے حالات اور تصانیف کے متعلق ہندوستان وایران کے علماء کی تحقیقات پر ہے، یہ غلط انتساب سے متعلق ہے، اس میں انھوں نے مشہور ایرانی عالم اور محقق محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے تذکرۃ الاولیا، عطار کے مقدمہ انتقادی میں عطار کی تصنیفات پر جو کچھ لکھا ہے اور اس کے بعد شیرانی صاحب کی تنقید شعر العجم میں عطار کے حالات اور ان کی تصنیفات پر جو مفصّل تذکرہ ہے اس کا حوالہ دیتے ہوئے ان تحقیقات کے معرض وجود میں آنے کے کئی سال بعد ایران کے مشہور محقق اور عالم سعید نفیسی نے اپنی کتاب جستجو در احوال و آثار فریدالدین عطار نیشاپوری میں عطار کی تصنیفات کے بارے میں جو تحقیقات کی ہیں ان کا مفصّل جائزہ لیا ہے۔ سعید نفیسی صاحب کی تحقیقات اکثر و بیشتر وہی تھیں جن کے مشمولہ امور و نتائج پر شیرانی صاحب سالہا پیش پہنچ چکے تھے، یہ کتاب جب ڈار صاحب نے اپنے استاد کو ٹونک بھیجی تو انھوں نے ایک خط کے ذریعے اس کے کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ ڈار صاحب نے ان کمزور پہلوؤں کا بخصوص سعید نفیسی کے بعض مبہم اور غیر واضح بیانات اور ان کے عطار کی جعلی کتابوں کے حقیقی وارثوں کے بارے میں خیالات کا تنقیدی جائزہ لے کر ان میں سے چند حضرات کے ناموں کا تعین کرنے کی کوشش کی ۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ یہ دونوں مضامین شیرانی صاحب کے رنگ میں ہیں اور ان ہی کی جامع اور گہری تحقیق اور اسلوب بیان کا عکس لئے ہوئے ہیں ۔

فارسی ادب سے متعلق شیرانی صاحب کے ہی رنگ میں شمس العلماء عبد الغنی صاحب کی کتاب پر مفصل و مبسوط مضمون ہے جس کا ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ یہ ڈار صاحب کا شاہکار ہے اور اس کی جزئیات و تفصیلات، طرز استدلال اور طریق بحث اور ان کی وسعت نظر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور دل میں ایک حسرت سی پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش ایسے ہونہار فاضل کو کچھ دیر اور کام کرنے کا موقع ملتا، شمس العلماء کی "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" کتاب پر شیرانی صاحب کے تبصرہ کے تکملہ کے طور پر ڈار صاحب ۴۴ ۱۹ء میں ایک مضمون شائع کر چکے تھے جیسے کہ پہلے اس کا ذکر کر چکا ہوں شمس العلماء نے شیرانی صاحب کے تبصرے کا جواب لکھ جو ۴۵ ۱۹ء میں یا اس سے قبل رسالہ معارف اعظم گڑھ کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوا، ڈار صاحب کو اتفاقاً دسمبر ۴۵ ۱۹ء میں یہ جواب پرنسپل ڈاکٹر محمد بذل الرحمن صاحب کے پاس دیکھنے کو ملا، انھوں نے ۴۶ ۱۹ء جنوری کے آغاز میں یعنی شیرانی صاحب کے انتقال کے بمشکل ڈیڑھ ماہ قبل ان سے دریافت کیا کہ کیا یہ جواب ان کی نظر سے گذرا ہے اور نفی میں جواب آنے پر ڈار صاحب نے شیرانی صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں انھیں بھیجا اور اپنے استاد کی علالت کے پیش نظر اپنی طرف سے اس کا جواب لکھنے کے لئے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں انھوں نے یہ مضمون تحریر کیا جو نا تمام صورت میں تقریباً ڈیڑھ سو مطبوعہ صفحوں پر محیط ہے اور جو تقسیم ہند کے بعد کے حالات کی وجہ سے پورا نہ چھپ سکا اور اس کا غیر شائع شدہ حصہ بھی اورینٹل کالج لاہور کے دفتر میں شاید اِدھر اُدھر ہو گیا، یہ پورا مضمون انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے رسالہ اردو میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا لیکن ۴۷ ۱۹ء میں انجمن کے کتب خانے اور دفتر کے ساتھ یہ مضمون بھی نذر آتش ہو گیا، ڈار صاحب نے اس مضمون کو دوبارہ لکھا اور اورینٹل کالج میگزین لاہور میں اشاعت کے لئے بھیجا وہاں اس نا تمام مضمون کی آخری قسط ۴۹ ۱۹ء کے نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی، اس مضمون میں شیرانی اسکول کے تنقیدی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور ادبی اور علمی حیثیت سے یہ مضمون ہندوستان کے

تنقیدی ادب میں بلند مقام کا حامل ہے، اس کی موجودہ شائع شدہ صورت میں یہ مضمون نامکمل ہے اور مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ڈار صاحب مرحوم نے یہ مضمون مکمل کر لیا تھا۔

ڈار صاحب کے کم از کم دو مضامین اقبال سے متعلق ہیں، وہ اقبال پر ایک مستقل کتاب بھی لکھنا چاہتے تھے لیکن اجل نے مہلت نہ دی، ان دو مضامین میں سے ایک "اقبال اور عربی شعرا" ہے، جیسا کہ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ نے لکھا ہے یہ اقبالیات میں ایک اچھوتا موضوع تھا اور غالباً اب بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہی الفاظ میں اقبال کی نوائے عربی کو سمجھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی بالخصوص عربی شاعری اور عربی ادب سے استفادہ کی داستان تو کسی نے چھیڑی ہی نہیں، ڈار صاحب غالباً پہلے ہی شخص ہیں جنھوں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، اقبال اور ان کی وطن دوستی والا مضمون بقول ڈاکٹر سیّد عبد اللہ ناتمام اور محتاج تکمیل ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ یہ کسی حد تک سیاسی جوش کے ساتھ لکھا گیا ہے محل نظر ہے، یہ سچ ہے کہ ڈار صاحب اور ان کے دو بھائی جن میں ایک مشہور سیاسی لیڈر مولوی عبد الغنی صاحب ڈار مرحوم تھے ابتدا سے ہی کٹر نیشنلسٹ تھے اور ان کے سیاسی خیالات کو ناگزیر ان کے اس جائزے میں دخل ہو گا لیکن اس مضمون میں انھوں نے جوش میں آ کر نہیں لیکن متانت اور پختگی اور غیر جانبداری کے ساتھ اقبال کے نظریۂ وطن پرستی پر خامہ فرسائی کی ہے۔

عربی ادب سے گہرا لگاؤ ہونے کے باوجود ڈار صاحب اپنے ابتدائی دور کے بعد اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے، جاحظ وغیرہ پر شائع شدہ مضامین کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ان پر کچھ کہنا ممکن نہیں نہ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ نے مضامین ڈار کے مقدمے میں ان سے متعلق مزید تفصیلات دی ہیں، لیکن ڈار صاحب کا اس موضوع پر ایک اور مضمون "اسپین کی اسلامی تاریخ کا ایک ورق اشبیلیہ کا نامور تاجدار المعتمد علی اللہ" کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل ہے، اسی المعتمد علی اللہ کی ایک عربی نظم کا ترجمہ اقبال نے بالِ جبریل میں کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اس شاعر بادشاہ کی دلکش اور جاذب، عظیم المرتبت شخصیت کی نہایت دلآویز تصویر کھینچی ہے، ان کے بعض دوسرے مضامین

کی طرح یہ مضمون اردو انشا پردازی کے بھی اچھے نمونوں میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔

اردو ادب سے متعلق ان کا ایک مضمون "حیات شبلی پر ایک نظر" بھی مبصرانہ ادب میں انفرادی مقام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ڈار صاحب نہایت اچھے مقرر بھی تھے اور انھوں نے بمبئی کے ایک علمی ادارے کی دعوت پر سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کی کتاب پر ایک لکچر بغیر کسی تحریر کے زبانی دیا تھا اور بعد میں جب ان سے سہ ماہی نوائے ادب بمبئی میں اشاعت کے لئے تقاضا کیا گیا تو انھوں نے اس کو قلمبند کیا، اکتالیس صفحے پر پھیلے ہوئے اس مضمون میں انھوں نے حیات شبلی پر عالمانہ اور فاضلانہ تبصرہ کیا ہے اور کتاب کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

اپنے مضمون "باقر علی مرحوم" میں انھوں نے اپنے اس رفیق کار اور دوست کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس کا قاہرہ میں عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقر علی علمی افق پر ابھرتے ہوئے آفتاب تھے، عربی کے وہ طالب علم اور استاد تھے لیکن فارسی اور اردو میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا اور عہد وسطی کی تاریخ سے بھی ان کو دلچسپی تھی، ان کے کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں، گجرات کا عربی ادب ان کی ریسرچ ڈگری کا مقالہ ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوا۔

ڈار صاحب مرحوم نے انگریزی زبان میں بھی متعدد مضامین لکھے ہیں۔ جو اسلامک کلچر حیدرآباد اور دیگر علمی رسائل میں شائع ہوئے، عہد خلجی میں گجرات، سلاطین گجرات کے عہد کی علمی اور ثقافتی سرگرمیاں، خواجہ محمود گاوان کی ریاض الانشا مرتبہ شیخ چاند پر مفصل تبصرہ، گجرات کا گوجری ادب، مرآۃ سکندری کا سنہ تصنیف، الغزالی اور تعلیمی مسائل بو علی سینا وغیرہ مضامین شائع ہو چکے ہیں، مضامین ڈار کے مقدمے میں ان کے "مرآۃ احمدی کے ماخذ" مضمون کا ذکر ہے لیکن یہ میری نظر سے نہیں گذرا، ہندوستان کے فارسی ادب کے عنوان پر انھوں نے پونہ کے مشہور تحقیقی ادارہ بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام زیر ترتیب WORLD LITERATURE ENCYCLOPAEDIA (عالمی ادب کا

انسائیکلوپیڈیا) کے لئے بھی اپنی جان لیوا طویل علالت سے قبل مضمون لکھا تھا یہ بھی میری نظر سے نہیں گذرا، ان میں سے صرف دو مضامین "عہد خلجی میں گجرات" اور "سلاطین گجرات کے عہد میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں" کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں، متذکرہ مضامین میں سے دو ایک کا اردو ترجمہ بھی رسالہ اُردو کراچی میں شائع ہُوا تھا۔

ڈار صاحب نے دساتیر، برہان قاطع، اقبال، وغیرہ موضوعات پر مستقل کتابیں لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور انھوں نے اس کے لئے کچھ مواد بھی جمع کر لیا تھا لیکن وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے، ان چیزوں کے علاوہ ڈار صاحب کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر مفصل اظہار خیال کیا جو شائع نہیں ہُوا، یعنی بعض مشاہیر کے ساتھ اپنی خط و کتابت میں انھوں نے کئی علمی اور ادبی مسئلوں پر بڑے پتے کی باتیں بتاتے ہوئے یا نظریوں سے اختلاف کرتے ہوئے مفصل خیالات قلمبند کئے ہیں، چوں کہ ڈار صاحب طبعاً نام و نمود سے گریز کرتے تھے اس لئے ہندوستان کے چوٹی کے عالم اور محقق حضرات سے اپنے اختلاف رائے کو انھوں نے خط و کتابت تک ہی محدود رکھا اور کبھی رسائل و جرائد کے ذریعے اس کو پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے خطوط میں اپنے مطمح نظر کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے تھے اور گوجری اور دساتیر جیسے موضوعات پر تو اس قسم کی خط و کتابت کا باقاعدہ سلسلہ ہو جاتا تھا مثلاً ولی گجراتی اور دیگر مسائل پر مشہور عالم اور محقق قاضی احمد میاں اختر مرحوم، دساتیر اور دوسرے موضوعات پر قاضی عبدالودود صاحب مرحوم، شبلی نامہ پر شیخ محمد اکرام مرحوم سے ان کی مستقل خط و کتابت ہوتی رہی، مولانا ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر، تذکرہ وغیرہ کتابوں کے بعض اندراجات بخصوص عربی فارسی اشعار کے متن یا ان کے بارے میں ان کا مولانا آزاد سے بالمشافہ اور بذریعہ خط، تبادلۂ خیالات ہوا، ان کا مولانا آزاد کے نام کم از کم ایک خط اور اس کا جواب "مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط اور جوابات آزاد" مؤلفہ اجمل خاں صاحب مرحوم میں شائع ہوئے ہیں، مولانا آزاد نے ان کی علمیت اور عربی دانی سے متاثر ہو کر ڈار صاحب کو اس وقت نئی تشکیل شدہ انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کا رکن بھی نامزد کیا تھا۔

افسوس کہ ڈار صاحب کے کاغذات، ان کے نوٹس اور ان کے خطوط (وہ اپنے خطوں کی بھی نقل رکھ لیا کرتے تھے) اور ان کے جوابات کا انتہائی کوشش کے باوجود پتہ نہ چل سکا، ان میں بلاشبہ علم و ادب کے کئی گوشے روشن ہوئے ہوں گے۔

شیرانی اسکول کے اس عظیم رکن کے شاگردوں نے بھی فارسی درس و تدریس اور تحقیق میں نمایاں رول ادا کیا ہے ان میں دو ایک تو اپنے میدان میں بین الاقوامی شہرت کے بھی مالک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی اپنے استاد کی گرد تک نہ پہنچ سکا۔

پروفیسر عبدالغفّار شکیل

محمود شیرانی اور مسئلۂ آغازِ زبانِ اُردو

محمود شیرانی بحرالعلوم تھے، اُن کی علمی معلومات، تاریخی ولسانی تحقیقات، ادبی وشع
تخلیقات اور اُن کے تنقیدی نظریات کا احترام واعتراف اُن کے عہد کے اکثر وبیشتر عالموا
اور ادیبوں نے کیا۔ وہ عالم، معلّم، مورّخ، محقق، مصنف اور شاعر تھے۔ " عتیقیات کے منف
ماہر تھے۔ علم سکہ شناسی، کتبہ شناسی، قدیم کاغذ، روشنائی، آرائش، نقش و نگا
اور علم خط کی شناخت کے علاوہ ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس میں مہارت ک
وجہ سے تصنیفات کے تاریخی مغالطوں کو کامیابی سے دور کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔" ا
وہ نئی دریافتوں کے شائق تھے انھوں نے نئی نئی باتیں دریافت کیں بہت سے تاریخی مغا
کو دور کیا جو مسلمات کا درجہ رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو کے اہم شاہ کاروں سے متعلق پیچ
مسئلوں پر قلم اُٹھا کر انھوں نے نئے حقائق کا انکشاف کیا جن سے کئی عقدے حل ہوئے او
کئی مغالطے دور ہوئے۔

شخصیت وسیرت کے اعتبار سے وہ عمیم الاحسان اور کثیرالافادہ انسان تھے۔ اُن
کے علمی ذوق و تجربے سے بہت لوگوں نے فائدہ اُٹھایا۔ اُن کی علمی معلومات اور تحقیقی خدمات

کی گیرائی و گہرائی اور اُن کی محنت و شہرت پر کچھ اہلِ علم حضرات کو رشک آیا۔ کچھ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے آرزومند ہوئے، بعض کو حیرت ہوئی اور بعض کو حسرت۔

محمود شیرانی کی زندگی کا بیشتر حصہ علمی و تحقیقی کاموں میں گزرا۔ اپنے علمی ذوق کی تسکین اور نایاب کتابوں کی جستجو میں انھوں نے ہندوستان اور انگلستان میں در در کی خاک چھانی۔ اُن کی وسیع معلومات اور علمی و تحقیقی خدمات کا زندہ ثبوت مختلف موضوعات پر اُن کی کتابیں اور مقالات ہیں جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ اُن میں سے یہاں صرف ایک موضوع کو زیرِ بحث لایا جا رہا ہے جس کا تعلق اردو لسانیات کے ایک اہم اور عرصہ دراز سے لاینحل مسئلے سے ہے وہ ہے مسئلۂ آغازِ زبانِ اُردو۔

مسئلۂ آغازِ زبانِ اُردو پر محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی بڑے زور شور سے پذیرائی ہوئی۔ اہلِ علم کے تحقیقی رجحان پر اس کتاب اور اس میں جو طریقۂ تحقیق و استدلال اختیار کیا گیا اُس کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس کتاب میں محمود شیرانی نے آغازِ اردو کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اور جو دلائل پیش کیے اُن کو سمجھنے اور پرکھنے سے پہلے اُن کے پیش رووں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا اُس کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ محمود شیرانی کے معاصرین نے اُن کی تحقیقات سے اتفاق کیا یا اختلاف۔ اس کے بعد اس موضوع پر مزید تحقیق کرنے والوں کے بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھنا ہے کہ شیرانی کے خیالات اور استدلال کی تائید، تقلید، تردید اور تنقید نے مسئلۂ آغازِ اردو کو کہاں سے کہاں پہنچایا۔

اُردو زبان کا آغاز کب ہوا، کیسے ہوا، اُس کی ابتدائی شکل کیا تھی، کون سی زبان اس کا ماخذ ہے، کن لسانی، سماجی و تاریخی اسباب و علل نے اردو کے ظہور و ارتقا کے لیے راہ ہموار کی؟ یہ سوال اُردو کی ابتدائی و ارتقائی تاریخ کے بڑے دلچسپ اور اہم سوال ہیں۔ اردو کی تعمیر و تشکیل میں مختلف تاریخی، لسانی اور سماجی اثرات کارفرما رہے ہیں، اُن کی مسلسل و مربوط تاریخ کے فقدان سے عرصۂ دراز تک آغازِ اردو زبان کے سوال پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ اُنیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں بعض غیر ملکی اور ملکی اہلِ علم مثلاً

ن گلکرسٹ، جان شیکسپیر، ڈنکن فاربس، جان بیمز، میر امن، انشاء اللہ خاں انشا،
رسید، امام بخش صہبائی وغیرہ کے علاوہ شعرا کے تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں آغازِ
ردو زبان کے بارے میں کچھ مبہم اشارے یا چند جملے ملتے ہیں۔ ان میں قیاس آرائیاں
یا اور حقیقت نہیں اس لیے علمی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔
سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر سب سے پہلے قلم اٹھانے کا سہرا محمد حسین آزاد
ے سر باندھا جاتا ہے چنانچہ کہا گیا کہ:

"ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مردِ میدان آزاد ہیں جنھوں نے سب
سے پہلے آبِ حیات میں اُردو زبان کی تاریخ کو سلسلے وار بیان کرنے
کی کوشش کی ہے" (۲)

میں یہاں اس حقیقت کا انکشاف کروں گا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ ہمارے یہاں
سانی تحقیق کے مردِ میدان آزاد نہیں، راجہ شیو پرشاد ہیں جنھوں نے آزاد سے پہلے اس
وضوع پر علمی انداز میں قلم اُٹھایا۔ آزاد کی کتاب "آبِ حیات" جس میں انھوں نے اردو
ربان) ابتدا وارتقا کی داستان اپنے ڈھنگ اور آہنگ میں پیش کی ۱۸۸۸ء میں
شائع ہوئی۔ راجہ شیو پرشاد نے اس سے بیس سال پہلے ۱۸۶۸ء میں ایک کتابچہ "بیان کچھ
پنی زبان کا" کے عنوان سے بنارس سے شائع کرایا۔ جس میں اردو زبان کی ابتدا و
ارتقا کی تاریخ کا سلسلہ پراکرت کے واسطے سے سنسکرت اور قدیم آریاؤں کی زبان سے
ملاتے ہوئے بتایا کہ اہلِ اسلام کی ہند میں آمد اور فارسی عربی الفاظ کی یہاں کی زبان میں
آمیزش کے عمل سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ مزید لکھتے ہیں:

"اب اس نئی زبان کو یعنی اُس پراکرت کو جس کو فارسی عربی ملی ہوئی
ہندی کہو، چاہے ہندوستانی بھاکا کہو چاہے برج بھاکا، ریختہ کہو چاہے
کھڑی بولی، اردو کہو، چاہے اردوے معلّیٰ، اُس کے تخم تبھی سے بوئے
گئے جب کہ محمود غزنوی نے چڑھائیاں کیں اور اہلِ اسلام کی اس ملک پر
توجہ ہوئی آٹھ سو برس سے زیادہ گزرتے ہیں" (۳)

راجہ شیو پرشاد کی اس تحقیق کے سلسلے میں راقم الحروف کا مضمون "راجہ شیو پرشاد اور اردو زبان کا تحقیقی مطالعہ" مطبوعہ نیا دور لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۶۲ء ملاحظہ ہو۔ راجہ شیو پرشاد کے مقالے میں لسانی حقائق اور تفصیلات کی بہت کمی ہے اس کے باوجود اس اوّلین کوشش کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں محمد حسین آزاد اور چرنجی لال نے اردو زبان کی تاریخ کے کام کو آگے بڑھایا اور برج بھاشا کو اردو کا ماخذ بتایا۔ چنانچہ آزاد نے آبِ حیات میں سب سے پہلا یہ جملہ لکھا:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے ...... اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔" (۴)

اپنی اس بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے آزاد نے تفصیل سے بعض تاریخی ولسانی دلائل کو اپنی رنگیں بیانی سے کچھ اس طرح پیش کیا کہ علمی حلقوں میں یہ نظریہ آزاد کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کئی ایک اہلِ علم نے اپنی تحریروں میں اس نظریے کی حمایت کی جن میں حکیم شمس اللہ قادری مصنف اردوے قدیم بھی ہیں وہ آزاد کے نظریے کی ہمنوائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیّر ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔" (۵)

بیسویں صدی کے ربع اوّل کے اختتام تک ذہنوں پر آزاد کا نظریہ ہی چھایا رہا۔ ۱۹۱۶ء میں سر جارج گریرسن نے اپنے گراں قدر "لسانیاتی جائزۂ ہند" میں اپنے پیش رووں کی آغاز اردو زبان کے بارے میں کی گئی قیاس آرائیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ہند آریائی زبان کے تاریخی تسلسل کی نشاندہی کی اور جدید ہند آریائی زبانوں کے باہمی رشتوں کو بتایا غیر ملکی ہونے کی وجہ سے گریرسن ہندوستان کی زبانوں کے اختلافات کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کئی ایک متضاد باتیں بھی لکھ دیں۔ آغاز اردو کے بارے میں ایک جگہ لکھا کہ کھڑی بولی، برج اور پنجابی کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ ایک اور جگہ بتایا کہ "قدیم ہندوستانی

اردو) کا ڈول اور کینڈا دوسری بولیوں کی بہ نسبت برج سے زیادہ قریب ہے۔" (۶)

۱۹۲۸ء میں محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" منظر عام پر آئی۔ سارے ملک میں اس کا چرچا ہوا۔ اس میں دو اہم باتیں تھیں ایک آزاد سے منسوب نظریے کا بطلان اور دوسرے بقولِ شیرانی "اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش خصوصاً ان مسائل پر جن کی رو سے پنجاب اس زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کا گہوارہ مانا جا سکتا ہے"۔ (۷)

ارباب علم، اساتذہ اور طلبہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد محمود شیرانی کی تحقیقات سے اتفاق کرنے لگے اور علمی حلقوں میں یہ نظریہ، نظریۂ شیرانی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اردو دنیا جواب تک یہ سمجھتی ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی والا نظریہ سب سے پہلے محمود شیرانی نے پیش کیا غلط ہے اس نظریے کو سب سے پہلے وضاحت کے ساتھ شیر علی سرخوش نے اپنے تذکرۂ اعجاز سخن میں پیش کیا۔ اس لیے اوّلیت کا سہرا محمود شیرانی کے سر نہیں شیر علی سرخوش کے سر ہے۔ اس کا اعتراف خود شیرانی نے اپنی کتاب میں "عرض حال" کے تحت کیا ہے:

> "اردو زبان کے آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدۂ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی سرخوش اپنے پر لطف تذکرہ "اعجاز سخن" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔" (۸)

"تذکرۂ اعجاز سخن" محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اُردو سے پہلے شائع ہوا اس میں سرخوش نے اردو کی اصل یا اساس پنجابی کو ٹھہرایا ہے۔ سرخوش سے بہت پہلے انشا نے "دریائے لطافت" میں اردو کو کئی زبانوں کا عطر بتاتے ہوئے پنجابی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ راجہ شیو پرشاد نے پنجاب میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اختلاط و ارتباط کا جو تذکرہ کیا ہے وہ اوپر آ چکا ہے۔ مگر ان لوگوں نے پنجاب کا نام اردو کے آغاز کے سلسلے میں اس لیے لیا ہے کہ مسلمان دہلی میں حکومت قائم کرنے سے پہلے پنجاب میں حکمران تھے۔ اس سلسلے میں کوئی لسانی

شہادتیں انھوں نے پیش نہیں کیں۔ سرخوش نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کچھ تاریخی ولسانی شواہد کی روشنی میں اردو کا ماخذ پنجابی کو بتایا۔

تذکرۂ اعجاز سخن میں شیر علی سرخوش نے اردو کی ابتدا کے مسئلے کو یوں اُٹھایا ہے:

"تذکرۂ آب حیات سے مجھ کو اس امر میں خاص طور پر اختلاف ہے کہ اس کے قابل مصنف نے پنجابی زبان کی اہمیت اور اردو زبان کے ساتھ اس کا جو آبائی تعلق ہے اس پر کماحقہٗ توجہ نہیں کی حالانکہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی ابتدا ایک ہے۔" (۹)

اپنی اس بات کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں سرخوش نے مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت بحث کی ہے: ۱۔ تاریخ زبان اردو ۲۔ زبان اردو اور اہل پنجاب ۳۔ اہل زبان کی پنجابی سے ناواقفیت ۴۔ اردو اور پنجابی کی مماثلت ۵۔ اردو اور ریختہ اور اُس کی اصلیت ۶۔ اردو نظم ریختہ میں پنجابی عنصر۔ پہلے عنوان "تاریخ زبانِ اردو" کے تحت سرخوش لکھتے ہیں:

"اردو زبان کی اصلیت اور اس کی وجہ تصنیف عموماً یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو وہ عربی فارسی ترکی زبانیں بولتے تھے ادھر ہندوؤں کی عام زبان ہندی یا بھاکا تھی اس لیے جب ان دونوں قوموں کا میل جول روز بروز بڑھنے لگا تو شاہجہاں آباد یعنی دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ زبان بنام "اردو" پیدا ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ زبان اردو نے قریب قریب اسی طرح جنم لیا ہے مگر اس اصول موضوع کی عملی تشریح اور مفصل توضیح کرنے میں صوبہ پنجاب جہاں سب سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتصال ہوا اور جہاں فاتح مسلمانوں نے دہلی یا ہندوستان کی طرف قدم بڑھانے سے قریباً دو سو برس پیشتر سکونت اختیار کی تھی اس کی اہمیت اور اردو زبان سے اس کے ابتدائی تعلق کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔" (۱۰)

سرخوش نے آزاد کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے اسی تذکرے میں لکھا ہے:

"سب سے زیادہ پنجابی زبان کی اصلیت سے ناواقفیت کا اظہار مولانا محمد حسین آزاد نے کیا ہے جو باوجودیکہ برسوں پنجاب میں رہے مگر پنجابی کو اردو زبان سے غیر متعلق بتاتے رہے۔" (۱۱)

سرخوش کے تذکرۂ اعجاز سخن میں اردو کے پنجاب سے ماخوذ ہونے کے نظریے کا زیادہ چرچا نہ ہوا مگر محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو کی اشاعت سے اس نظریے کو شہرت عام نصیب ہوئی کیونکہ اس میں شیرانی نے نہایت تفصیل سے اردو اور پنجابی کی مشترکہ لسانی خصوصیات کو اُجاگر کر کے اپنے نظریے کو غیر معمولی اہمیت دلائی، ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے مولانا آزاد کے نظریے کا بطلان بھی کیا۔

محمود شیرانی ماہر لسانیات تو نہیں تھے لیکن لسانی بصیرت رکھتے تھے یہ بات اُن کے معاصرین میں بہت کم لوگوں میں تھی۔ انھوں نے برج بھاشا اور اردو کے صوتی و صرفی اختلافات کا تقابلی موازنہ و تجزیہ کر کے آزاد کے نظریے کی تردید کی اور بتایا:

"ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں اردو جہاں اپنے اسما و افعال الف پر ختم کرتی ہے برج داو پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اردو میں افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں اس لیے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا۔"

شیرانی کو اپنی تحقیقات کے لیے اشارہ سرخوش کے تذکرۂ اعجاز سخن میں مل چکا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے نظریے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دو طرح کے استدلال پیش کیے ایک تاریخی دوسرا لسانیاتی اُن کا تاریخی استدلال یہ ہے کہ:

"آلِ غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے

اس عرصے میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدہ داروں اور ملازمین کے لیے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضہ میں تمام پنجاب سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی۔ سرسی اور میرٹھ تک اُن کے قبضے میں تھے بلکہ یوں کہیے کہ قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقے کے مالی و ملکی انتظام کے لیے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی چونکہ لاہور ہند کا دارالسلطنت تھا اس طرح ظاہر ہے کہ اس خطے کی زبان کو اس عہد کی حکومت اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے انھوں نے کسی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دہلی گئے تب برج بھاشا اختیار کی ایک ناقابل قبول خیال ہے جو عقل و درایت کے منافی ہے اس لیے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی ضرورت تھی بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ گروہ کے لیے یہ مشکل فارسی نے حل کر دی تھی، لیکن ان کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو اُن کی آبادی کا جزو اعظم تھا فارسی سے قطعًا نابلد تھا۔ یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے انھوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا۔" (۱۳)

شیرانی کا لسانیاتی استدلال یہ ہے کہ پنجابی اور اردو میں درج ذیل مشترک لسانی خصوصیات ملتی ہیں: (۱۴)

۱۔ مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے، یعنی علامت "نا" امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔

۲۔ تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔

۳۔ اعلام و اسما اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں جب کہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں، جیسے:

پنجابی : منڈا ، گھوڑا ، وڈا
اردو : لڑکا ، گھوڑا ، بڑا

۴۔ اسمائے صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً :

اردو : میرا لڑکا ، چھوٹی لڑکی ، بڑے لڑکے ، چھوٹی لڑکیاں
پنجابی : میرا منڈا ، نکی کڑی ، وڈے منڈے ، نکی کڑیاں

۵۔ خبر تذکیر و تانیث ، واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے :

اردو : یہ بات بھلی نہیں   یہ باتیں بھلی نہیں
پنجابی : یہ گل چنگی نہیں   یہ گلاں چنگیاں نہیں

۶۔ فعل تذکیر و تانیث ، واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے :

اردو : گھوڑا آیا   گھوڑے آئے   عورت آئی   عورتیں آئیں
پنجابی : گھوڑا آیا   گھوڑے آئے   بڈھی آئی   بڈھیاں آئیاں

۷۔ اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق ہوتی ہے :

اردو : اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کی۔
پنجابی : اُہ دے وِچ کوٹھریاں رنگ برنگیاں بعضیاں چاندی دیاں۔

۸۔ ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے مثلاً وہ آیا ، وہ آئے ، وہ آئی

۹۔ ماضی قریب فعل امدادی کی تعریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اردو میں اختلاف ہے۔

۱۰۔ ماضی بعید بھی توابع کی تعریف سے بنتی ہے :

اردو : وہ آیا تھا   وہ آئے تھے
پنجابی : او آیا سی   وہ آئے سیں

۱۱۔ ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں بالکل ایک ہے :

اردو : وہ کھاتا ہو   وہ کھاتے ہوں

پنجابی : وہ کھاندا ہووے   وہ کھاندے ہوں ۔

۱۲۔ مضارع دونوں میں ایک ہے ۔

اردو : وہ آئے   تو آئے   تم آؤ

پنجابی : او آوے   او آون   تسی آؤ

۱۳۔ فعل حال کی تعریف دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پر ہے ۔ ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی دال اور تے آپس میں بدلتی ہیں ۔

۱۴۔ مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی واحد و جمع میں گا اور گے کے اضافے سے بنتا ہے ۔

۱۵۔ امر کا قاعدہ اردو اور پنجابی میں بالکل ایک سے

۱۶۔ مصدر بمعنی امر دونوں زبانوں میں مستعمل ہے مثلاً آنا جانا ۔

۱۷۔ گا پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے اردو میں اگرچہ اب متروک ہے : ہے گا ۔ ہیں گے ، ہے گی اردو کے پرانے کلام میں موجود ہے : ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر ۔ بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے اور پیمانے پر ۔

(میر تقی میر)

۱۸۔ دعائیہ اردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے ۔

۱۹۔ لازمی و متعدی کا دونوں زبانوں میں وہی اصول ہے اور متعدی بالواسطہ کا بھی وہی قاعدہ ہے ۔

اردو : سیکھنا ، سکھانا ، سکھلانا

پنجابی : سکھنا ، سکھاؤنا ، سکھلاؤنا

۲۰۔ معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے ۔ پنجابی میں بھی " جانے " کی تعریف سے مجہول بنایا جاتا ہے ۔

اردو : لڑکی ماری گئی   لڑکا مارا گیا

پنجابی : کڑی ماری گئی   منڈا مارا گیا

۲۱۔ ندائیہ میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔

اردو: اے لڑکو　　　　پنجابی: اے منڈیو

۲۲۔ نفی کے لیے وہی معمولی کلمے نہ، نا، نہیں، نئی،نا ہی،نا ہیں پنجابی میں بھی آتے ہیں جو ایک زمانے میں اردو میں بھی مستعمل تھے۔

۲۳۔ امدادی افعال کے ذریعے سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں اس کے لیے آنا، ہونا چکنا، رہنا، لگنا، سکنا ... وغیرہ ان میں سے اکثر افعال پنجابی میں بھی یہی مطلب دیتے ہیں جیسے کر سکنا، منڈا رہندا اہے۔

محمود شیرانی سے پہلے کسی نے اس طرح اردو اور پنجابی کا موازنہ نہیں کیا تھا شیرانی کی اس نئی کوشش میں بڑی کشش تھی اُس عہد کے بڑے بڑے عالم شیرانی کی تحقیق اور دلائل سے متاثر و مرعوب ہوئے۔ رسالوں میں ان کی کتاب پر تبصرے شائع ہوئے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے معارف میں ایک طویل تبصرہ اس کتاب پر کیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے پُر زور الفاظ میں شیرانی کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے لکھا:

"یہ عجیب بات ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت کسی یوروپی ماہر لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا۔ اس کی طرف سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہلِ قلم ہی نے اردو اور پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا۔ ..... حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا" (۱۵)

ڈاکٹر زور پنجاب میں اردو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کتاب کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھا میرے مطالعے اور تلاش و جستجو میں یہی بات بے نقاب ہوئی تھی۔ فرق

صرف اتنا تھا کہ میں نے واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی۔
اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق پایا
جاتا تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود
میں آئیں۔" (۱۶)

اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" مطبوعہ ۱۹۳۲ء میں یہ بھی لکھا تھا۔

"اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس
حصہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی
سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح
ہے اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں
بولی جاتی تھی مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں
ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی
کیونکہ نئے ہند آریائی دور کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں
میں بہت کم فرق تھا ..... اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی
سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے
کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے لیکن
مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے اس لیے اردو
زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔

یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی کا بھی
قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں
انبالہ کے اطراف اس علاقے میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے
ہوئے راستے میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں
کے ہمراہ اسی علاقے کے رہنے والے بہیر و بنگاہ کی حیثیت سے دہلی اور
اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح و مفتوح کے میل

جول سے جو زبان بنتی چلی آ رہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہوتا گیا۔" (۱۷)

محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" کی اشاعت اور شہرت نے مسئلہ آغاز اردو زبان پر مزید تحقیق کرنے پر اہل علم کو اکسایا۔ سید سلیمان ندوی، بابائے اُردو مولوی عبدالحق نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر سینتی کمار چیٹر جی وغیرہ نے اس مسئلے پر اپنی اپنی آرا پیش کیں اور نتیجے میں اردو زبان و ادب کی کچھ صوبائی تاریخوں کا سلسلہ چل پڑا جیسے دکن میں اردو، مدراس میں اردو (نصیر الدین ہاشمی) بہار میں اردو (اختر اورینوی)۔

۱۹۳۹ء میں سید سلیمان ندوی کے مضامین کا ایک مجموعہ "نقوش سلیمانی" شائع ہوا جس میں ان کے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۹ء تک لکھے گئے مضامین اور خطبے شامل تھے۔ ۱۹۳۳ء کے ایک مقالے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ:

"قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔" (۱۸)

ایک اور مضمون میں مولانا نے یہ رائے ظاہر کی:

"یہ مخلوط زبان، سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ پیدا ہوئی۔" (۱۹)

مولانا سید سلیمان ندوی کی قیاس آرائیوں کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے ایک دوسرے کی زبان پر جو اثر پڑا اس کے نتیجے میں جو زبان عالم وجود میں آئی وہ اردو نہیں سندھی ہے جو دوآبہ کی زبانوں سے مختلف ہے اس لیے اردو کے آغاز کو سندھ کی سرزمین سے نہیں ملایا جا سکتا (۲۰) علمی حلقوں میں مولانا ندوی کی قیاس آرائی شیرانی کے نظریے کی چمک دمک کے آگے ماند پڑ گئی۔

محمود شیرانی سے پہلے کسی نے اتنی محنت اور عرق ریزی سے اس موضوع پر اتنی تفصیل سے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ اُن کی کتاب کی اشاعت کے بعد دو دہائیوں تک کچھ لوگوں نے ان کے نظریے کی پر زور تائید کی اور کچھ نے تقلید۔ اس عرصے میں پروفیسر جیولز بلاخ، ڈاکٹر زور، پروفیسر سینتی کمار چیٹر جی نے بھی مسئلہ آغاز اردو پر اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔

۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو محمود شیرانی کی وفات ہوئی اس کے بعد سے اب تک آغاز اردو زبان کے بارے میں تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری ہے ۔ ڈاکٹر زور، پروفیسر مسعود حسین، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، سہیل بخاری اور راقم الحروف (۲۱) نے اس مسئلے پر اپنی تحقیقات اور خیالات پیش کیے ہیں ان سب میں پروفیسر مسعود حسین اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تحقیقات بہت اہم ہیں کیونکہ ان میں آزادا در شیرانی کے نظریوں پر تنقید ہی نہیں ان کی تردید بھی لسانیاتی حقائق کی روشنی میں کی گئی ہے ۔ یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شیرانی کے تاریخی دلائل زیادہ مضبوط نہیں ان میں قیاس آرائیاں کچھ ضرورت سے زیادہ در آگئی ہیں وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں مثلاً :

"اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں ۔

اس نظریے کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں لیکن سیاسی واقعات اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔" (۲۲)

اور لسانی شہادت کے بارے میں شیرانی یہ کہتے ہیں :

"ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف میں پنجابی و ملتانی زبان کے بہت قریب ہے ۔ دونوں میں اسما و افعال کے خاتے میں الف آتا ہے دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک یہاں تک کے دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں پنجابی اور اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔" (۲۳)

اس کے علاوہ شیرانی نے پنجابی اور دکنی اردو کی بعض مشترک خصوصیات کی مثالیں بھی اپنے دعوے کی تائید میں پیش کی ہیں ان کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین نے لکھا ہے :

"شیرانی فارسی کے جیّد عالم ہوتے ہوئے بھی ہند آریائی لسانیات کے بارے میں بہت محدود علم رکھتے تھے۔ تقابلی مطالعے کے وقت ان کی نظر میں ہند آریائی السنہ کی مکمل تصویر نہیں تھی۔ جزدی مماثلتیں جو اس خاندان السنہ کی ہر دو زبانوں میں مل جائیں گی اس بات کا ثبوت نہیں بنائی جاسکتیں کہ ایک زبان دوسرے سے ماخوذ ہے۔" (۲۴)

اس میں شک نہیں کہ محمود شیرانی ہند آریائی لسانیات کے بارے میں محدود علم رکھتے تھے اس میں اُن کا قصور نہیں اُس وقت جبکہ شیرانی نے پنجاب میں اردو لکھی، ہمارے ہاں تاریخی لسانیات اور اُس کے اصول وطریق کا علم عام نہیں ہوا تھا۔ اپنی محدود لسانی بصیرت کی روشنی میں شیرانی نے اپنی معلومات کی بنیاد پر جو نتائج اخذ کیے ان کے پیش رو دں میں کسی نے نہیں کیے تھے۔ شیرانی کا نظریہ حرف آخر نہیں اسے سرے سے غلط نہیں کہا جاسکتا اس میں مزید تحقیق کی گنجائش خود شیرانی نے رکھی۔ انھیں اس کا احساس تھا اس لیے انھوں نے اپنے مقدمے میں سب سے پہلے یہ لکھا:

"ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لیے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا۔" (۲۵)

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ـــ مقدمہ مقالات حافظ محمود شیرانی (مرتبہ مظہر محمود شیرانی) جلد اوّل ص ۳

۲۔ پروفیسر مسعود حسین ـــ مقدمہ تاریخ زبان اردو (جدید ایڈیشن ۱۹۸۷ء) ص ۸۸

۳۔ راجہ شیو پرشاد ـــ بیان کچھ اپنی زبان کا مطبوعہ ۱۸۶۸ء بنارس

۴۔ محمد حسین آزاد ـــ آبِ حیات، ص ۶

۵۔ حکیم شمس اللہ قادری ـــ رسالہ تاج قدیم اردو نمبر

۶ - سرجارج گریرسن ـــ لسانیاتی جائزۂ ہند
۷ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو " عرض حال" طبع سوم مکتبہ معین الادب لاہور
۸ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو " عرض حال" طبع سوم مکتبہ معین الادب لاہور
۹ - شیر علی سرخوش ـــ تذکرۂ " اعجاز سخن، ص ۲"
۱۰ - شیر علی سرخوش ـــ تذکرۂ " اعجاز سخن، ص ۱"
۱۱ - شیر علی سرخوش ـــ تذکرۂ " اعجاز سخن، ص ۶"
۱۲ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو ص ۲
۱۳ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو ص ۵۶ - ۵۷
۱۴ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو ص ۸۴ تا ۱۰۳
۱۵ - محی الدین قادری زور ـــ اردوے معلّٰے لسانیات نمبر ص ۵۹
۱۶ - محی الدین قادری زور ـــ اردوے معلّٰے لسانیات نمبر ص ۵۹
۱۷ - محی الدین قادری زور ـــ ہندوستانی لسانیات ص ۹۵ - ۹۶
۱۸ - سیّد سلیمان ندوی ـــ نقوش سلیمانی ص ۱۴
۱۹ - سید سلیمان ندوی ـــ نقوش سلیمانی ص ۲۵۱
۲۰ - عبدالغفار شکیل ـ دکنی اردو مشمولہ زبان و مسائل زبان ص ۱۷
۲۱ - عبدالغفار شکیل ـ اردو زبان کا آغاز
۲۲ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو ص ۴
۲۳ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اردو ص ۴ - ۵
۲۴ - پروفیسر مسعود حسین ـــ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ مطبوعہ فکر و نظر بابت ۱۹۶۹
۲۵ - محمود شیرانی ـــ پنجاب میں اُردو ص ۱

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

پنجاب میں اُردو۔ ایک جائزہ

حافظ محمود خاں شیرانی اردو تحقیق کے معمارِ کارداں تھے۔ وہ عمدہ تحقیقی حس اور مزاج لے کر آئے تھے۔ علم کا جو شوق اور شغف اُن کے یہاں تھا، کم لوگوں کو میسّر آتا ہے۔ نئی سے نئی معلومات کے حصول کے لیے وہ کوشاں رہتے تھے اور عموماً اپنی بات پر اَڑتے نہیں تھے۔ اُن کے مقالات علمی تحقیق کا اچھا نمونہ ہیں۔ اُن سے حافظ صاحب کی لیاقت اور علمی بصیرت میں ارتقا کا ثبوت بھی ملتا ہے، البتّہ کامیابی اور ناکامی، شہرت اور گمنامی کے لیے کوئی ضابطہ یا معیار بجز اس کے معلوم نہیں ہوتا کہ قادرِ مطلق جسے جو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ حافظ صاحب کے نام کو اردو دنیا میں جس نے زندگیِ جاوید عطا کر دی، وہ اُن کی اوّلین تصنیف "پنجاب میں اُردو" ہے۔ اِس کتاب کا آغاز اُنھوں نے اِس جملے سے کیا ہے:

"جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اُردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کے لیے ارشاد کیا تو میں نے اُن سے عرض کی تھی کہ مضمون اگرچہ دلچسپ ہے لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اُٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لیے شاید ابھی

ایک عرصہ درکار ہو گا۔" (ص ۶)

اِس معروضے کے باوجود حافظ صاحب نے کتاب لکھی۔ موضوع سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

"پنجاب میں اُردو، اردو زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے، جس کا مطالعہ اب تک کسی نے نہیں کیا ہے۔ خود اہلِ پنجاب بھی عموماً اس سے بے خبر ہیں۔"

(ص ۲۲۹)

لیکن انتساب میں یہ اعتراف موجود ہے کہ:

"آج کل پنجاب میں اردو زبان اور اُس کے علم و ادب سے غیر معمولی دلچسپی نظر آتی ہے۔"

اور "عرضِ حال" کے تحت کہا گیا ہے کہ:

"اردو زبان کے آغاز کا سرزمینِ پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔"

جو بھی ہو اِس میں شبہ نہیں کہ پرنسپل کی فرمائش بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہی نہیں ہُوا کہ اردو کو "پنجاب میں اُردو" کے نام سے ایک اچھی کتاب مل گئی، بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ شیرانی جیسے صاحبِ علم، صاحبِ استعداد شخص کو "صحیح اطلاعات کی بہم رسانی" کا شوق پیدا ہوا اور نتیجے کے طور پر کتنی ہی ایسی چیزیں سامنے آگئیں جن سے اردو دنیا ناواقف تھی۔ اقتباساتِ بالا سے ظاہر ہے کہ اِس کام کا مقصد متعین تھا اور اس مقصد کی صراحت خود حافظ صاحب نے بھی کر دی ہے۔ "عرض حال" میں ہے:

"اس تالیف میں اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، خصوصاً اُن مسائل پر جن کی رُو سے پنجاب اِس زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کا گہوارہ مانا جا سکتا ہے۔" (ص ۴)

انتساب میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ یہ تالیف "از اوّل تا آخر پنجاب اور اردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے۔" لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کی اصل اور ابتدا کے

بارے میں اُن کا عقیدہ بھی قدیمی روایت کے مطابق ہی معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔" (ص ۷)

مقصد اور عقیدے کے اِس تضاد نے حافظ صاحب کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اپنے بیانات میں ربط پیدا کرنے کے لیے اُنھیں طرح طرح سے تاویل کرنی پڑی ہے مثال کے طور پر کہتے ہیں:

"جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برج ہے، نہ پنجابی، نہ راجستھانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اُردو ہے جو اُس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔" (ص ۲۱۶)

دوسری جگہ لکھا ہے:

"ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مصنف کی مراد بھاشا و اودھی زبانیں وغیرہ نہیں ہیں بلکہ اردو ہے جس کا قدیم نام ہندی ہے۔" (ص ۲۱۷)

اِس قسم کے بیانوں سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے یہ ہے کہ (الف) اردو زمانۂ قدیم سے مذکورہ تمام بولیوں سے مختلف اور ممیز زبان ہے، یا (ب) یہ اُن سب سے مرکّب ہے اور اِس کی اپنی اصل کچھ بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی اردو کو بھی جدید ہندی (جو دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے) کی طرح اُردو کو بھی مختلف اور متعدد زبانوں کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ ذیل کے اقتباس میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

"وہ (مسلمان) ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں، عام اِس سے کہ پنجابی ہو، برج ہو یا پوربی، اردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔ آج ہندوؤں نے بھی ہندی کے ذیل میں برج، قنوجی، اودھی، بندیلی، مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل کرلیا ہے۔" (ص ۱۱۹)

وہ اردو کے آغاز و ارتقا کو بلکہ خود اردو کو مسلمانوں سے پوری طرح وابستہ و متعلق سمجھتے ہیں۔ اِس کی قدامت سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میرے خیال میں اِس کا وجود اُنھی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان

میں آباد ہیں۔" (ص ۶)

کتاب میں اس خیال کا اعادہ مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ "خشتِ اوّل" ہے جس پر حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی تحقیق کی عمارت اٹھائی ہے، اور اِسی کی مدد سے انھوں نے اپنے مذکورہ عقیدے اور مقصود میں بظاہر ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے نظریے کو ترتیب دیا ہے کہتے ہیں:

"اُردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے، اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔" (ص ۸)

یہ بات بھی کتاب میں بار بار دُہرائی گئی ہے، مثلاً:

"اُردو جس کو (مسلمان) اپنے ساتھ پنجاب سے لے گئے۔" (ص ۱۱۹)

اور اسی لیے اُن کا کہنا ہے کہ:

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً مسلمانی عہد کے تاریخی واقعات پر بالخصوص جو دہلی اور پنجاب کے تعلّقات پر روشنی ڈالتے ہیں، ایک نظر ڈالتے چلیں۔"

(ص ۴۵)

اِس نظریے کی رو سے یہ تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ اردو اپنی ابتدائی صورت میں زمانۂ قدیم سے پنجاب میں موجود تھی۔ مسلمانوں نے وہاں رہ کر اِس زبان کو اس حد تک اپنا لیا تھا کہ جب وہ پنجاب سے نکلے تو دہلی ہی نہیں بلکہ ملک کے طول و عرض میں بھی اُنھوں نے اِس کو رائج کر دیا۔ حافظ صاحب کو یہ احساس تھا کہ:

"اس نظریے کے ثبوت میں ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں ہے۔"

(ص ۸)

اور اُن کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ:

"ساتویں صدی ہجری میں اِس (اردو) میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف اِس کو پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہیں۔" (ص ۱۱)

اُن پر یہ حقیقت بھی منکشف تھی کہ :

"اردو اور پنجابی کا وہ عنصر جو قدیم سے اِن میں مشترک تھا، رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا۔" (ص ۹)

یہی نہیں بلکہ اُنھیں اِس بات کا بھی اعتراف تھا کہ :

"اردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا، اِس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے۔" (ص ۱۱۰)

لیکن جس کام پر اُنھیں مامور کیا گیا تھا، اُسے انھوں نے مکمّل کر کے ہی چھوڑا۔

اپنی کتاب کی وجہِ تسمیہ بیان کرتے ہوئے حافظ محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے :

"اِس تالیف کا نام اِس کے آخری باب "پنجاب میں اُردو" کی رعایت سے رکھا گیا ہے جو تمام و کمال پنجاب کے اردو گو شعرا کے ذکر و اذکار سے مملو ہے۔" (ص ۴)

کتاب کے اِس حصّے میں یہ دعوا کیا گیا ہے کہ :

"پنجاب میں نظم سب سے بیش تر لکھی گئی ہے۔" (ص ۲۳۷)

پھر یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ :

"پنجاب میں اردو شاعری دکن کے بعد اور دہلی کے معاصر شروع ہو جاتی ہے۔" (ص ۲۳۸)

اِسی طرح یہ دعوا کیا گیا ہے کہ :

"شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے، اردو کی قلمی یادگاریں گیارھویں صدی ہجری سے قدیم نہیں ملتیں۔" (ص ۲۳۱)

تقریباً یہی بات ذیل کے اقتباس میں بھی کہی گئی ہے :

"شمالی ہند میں سب سے پہلے محمد افضل پانی پتی ہیں جو ۱۰۲۵ھ میں بعہدِ جہانگیر وفات پاتے ہیں۔" (ص ۱۲)

لیکن اسی کتاب میں خواجہ امیر خسرو کا اردو کلام بھی پیش کیا گیا ہے جنھوں نے ۷۲۵ھ میں وفات پائی تھی۔ اُن کے بعد کے بھی کئی اردو شاعروں کا ذکر اسی کتاب میں موجود ہے۔

کتاب کے اس حصے میں جو کچھ ہے اُس کے مآخذ کے بارے میں مولف نے بتایا ہے کہ:

"زیادہ تر عام شائقین کی بیاضوں سے حاصل کی گئی ہے، اس لیے یہ اطلاع مختصر، ناکافی اور غیر متعین ہے۔ اِن کے زمانوں کے متعلق بھی ضرورتاً قیاس و احتمال سے کام لیا گیا ہے۔ اِن کے تقدم و تاخر کی بابت بھی نکتہ چینی کی گنجائش ہے اور یہ خامیاں اِس لیے ہیں کہ اس خاص مضمون پر اطلاع حاصل کرنے کا بظاہر کوئی ذریعہ معلوم نہیں ہوتا۔" (ص ۲۲۲)

مجہول مآخذ کے استعمال کے باوجود اس حصۂ کتاب میں درجِ ذیل اہلِ قلم ایسے ہیں، جن کے بارے میں مولف کو اعتراف ہے کہ اُن کے حالات معلوم نہیں ہو سکے:

شیخ جنید (ص ۲۴۰)، موسیٰ (ص ۲۵۴)، شاہ مراد (ص ۲۶۳)
میاں احمد (ص ۲۶۹)، محمد (ص ۲۷۰)، رحمٰن (ص ۲۷۷)
نعمت اللہ (ص ۲۷۸)، رام کشن (ص ۳۱۳) وغیرہ

مولف نے غالباً اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے جگہ جگہ نہایت مبالغہ آمیز کلمات کا استعمال کیا ہے مثلاً:

"پنجاب میں حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے نام پر ایسی ہزاروں مناجاتی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بارھویں صدی میں پنجاب کی سیاسی ابتری نے اور بھی اِن کو فروغ دیا۔" (ص ۲۵۶)

"شیخ نصیر الحق ... اُردو میں اِنھوں نے خصوصاً بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔" (ص ۲۶۱)

"بارھویں قرن کا ربعِ آخر پنجاب میں بے شمار شعرا دیکھتا ہے، جو کثرت کے ساتھ اُردو میں شاعری کرتے ہیں۔" (ص ۲۷۸)

مبالغہ آمیز لفظوں کا غیر محتاط استعمال مولف نے بہت کیا ہے۔ بعض مثالیں یہ ہیں:

"بارھویں صدی کے نصف دوم کے تمام واقعات اِن (دلشاد) کی آنکھوں

کے سامنے ہوئے ہیں، اور اُن واقعاتِ عصری کی جھلک اِن کے کلام میں موجود ہے۔" (ص ۲۸۸)

"پنجابی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت یہ ہے۔" (ص ۹۸)

یہی معاملہ ذیل کے اقتباس کا بھی ہے کہ:

"اس میں بھی شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔" (ص ۲۲۹)

کتاب کا موضوع اور مقصود اِس کے نام سے ظاہر ہے، اور اقتباساتِ بالا میں بھی اِس کی صراحت موجود ہے۔ لطف یہ ہے کہ ابتدائی دور کے جن لوگوں کا حال اور کلام تفصیلاً مذکور ہے، اُن کے نام ترتیب وار یہ ہیں:

امیر خسرو، شرف الدین یحییٰ منیری، کبیر داس، شیخ باجن، قطبن عبدالقدوس گنگوہی، علی جیو گامدھنی گجراتی، خوب محمد چشتی، احمد دکنی شیخ عثمان، بہاء الدین برناوی، افضل جھنجھانوی، محبوب عالم جعفر زٹلی، اٹل نارنولی وغیرہ۔

اِن میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے، جسے خود اِس کتاب میں پنجاب سے متعلق ثابت کیا گیا ہو۔

مقصود کی مناسبت سے کتاب میں اہم ترین ابواب یہ ہیں:

پنجاب، پنجابی اور اُردو، قدیم اردو پر پنجاب کا اثر

اِن ابواب میں مولف نے اپنے دعووں کے ثبوت میں جن شاعروں کے کلام سے استناد کیا ہے، اُن کے نام یہ ہیں:

خواجہ آتش، احمد دکنی، افضل جھنجھانوی، برہان الدین جانم
جعفر زٹلی، خوب محمد چشتی، خسرو، شاہ رفیع الدین
سودا، سورداس، شمس العشاق، علی جیو گامدھنی
غالب، محمد قلی قطب شاہ، محمد امین دکنی، محمد جائسی
میر، وجہی، ولی دکنی، عبدالحکیم

وارث شاہ، حکیم یوسفی وغیرہ۔

اِس فہرست میں بھی آخرالذکر دو تین کے سوا کوئی پنجابی نہیں ہے۔ یہی معاملہ اُن کتابوں کا بھی ہے، جن کے حوالے اپنے دعووں کے اثبات میں مولف نے دیے ہیں مثلاً شرفنامۂ احمد منیری کے مصنف کے بارے میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ وہ "بنگالہ کے رہنے والے ہیں"۔ (ص ۲۲۱)

پنجابی اور اردو میں اشتراک ثابت کرنے کے لیے جن اسما کا انتخاب کیا گیا ہے، اُن میں آنب یا اَنب (آم) بھی ہے (ص ۹) دلیل یہ ہے کہ "پنجاب میں انبہ آج بھی بولا جاتا ہے"۔ (ص ۱۱۶) یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ فارسی میں بھی آم کو انبہ ہی کہتے ہیں (غیاث ص ۴۵) آم کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ التمش نے یہ پھل پہلی بار بداؤں میں دیکھا تھا (مقالات جلد ا ص ۱۲۵) اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے بھی اِس بات پر اعتراض کیا ہے کہ آم کو پاکستان کے پھلوں میں شمار کیا گیا ہے (مقالاتِ تحقیق ص ۲۴۰)۔

لفظ برشکال بھی اسی سلسلے میں زیرِ بحث آیا ہے (ص ۴۶) جو اصلاً ورش کال ہے۔ یہ کلمہ وَرش (ورشا) اردو میں برس ہو گیا ہے اور پنجابی میں ورہا ہے۔ اِس تبدیلی کے بارے میں حافظ محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے:

> "پنجابی اور اردو میں بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں، مثلاً (الف) پنجابی کی 'واو' اردو میں 'بے' سے بدل جاتی ہے، (ب) پنجابی کی 'ہ' اردو میں 'س' سے، (ج) پنجابی کی 'ہ' اردو میں 'الف' سے، (د) پنجابی کی 'دال' اردو میں 'تے' سے بدل جاتی ہے، اور (ہ) بعض الفاظ میں حروف مقدّم موخّر ہو جاتے ہیں"۔ (ص ۱۰۸ تا ۱۰۹)۔

اردو اور پنجابی میں مطابقت ثابت کرنے کے لیے حافظ صاحب نے جو مثالیں دی ہیں، اُن میں سے مزید بعض کے بارے میں وضاحت مناسب ہے:

> (الف) "اردو میں چارپائی کو ہم کھاٹ کہتے ہیں پنجابی لہجے میں... کھٹ ہو گا... صاحب شرفنامہ نویں صدی ہجری کے مصنّف جو بنگالہ کے رہنے والے ہیں لکھتے ہیں 'کت بالفتح تختِ میاں بافتہ'۔" (ص ۱۱۱)

لفظ 'کت'، تمل لوگوں کی خاص چیز ہے جو وہ بُن کر تیار کرتے تھے۔ تمل زبان میں ہائیہ آوازیں موجود نہیں ہیں۔ اس کا صحیح تلفظ وہی ہے جو صاحب شرفنامہ نے لکھا ہے۔ پنجابی میں کھاٹ کو 'منجی' کہتے ہیں۔ (ہفت زبانی لُغت ص ۵۴۵)۔

(ب) "حکیم سنائی متوفی ۵۴۷ھ... ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح استعمال کر گئے ہیں۔ ع نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی" (ص ۵۲)

اس کلمہ کا یہ تلفظ پنجابی میں مروّج نہیں ہے۔ خود حافظ صاحب نے لکھا ہے:

"پانی دراصل پانڑی ہے۔ پنجاب میں آج بھی پانڑی بارائے مخلوطِ ہندی بولا جاتا ہے۔ اردو میں اس کی ثقالت دور کر دی گئی۔"

(مقالات جلد ۱ ص ۶۰)

پنجابی کے تلفظ کی قدامت کے لیے کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی ہے، البتہ بابر کا جو شعر نقل کیا گیا ہے، اُس میں بھی "پانی و روتی" نظم ہوا ہے۔ (ص ۴۳)

(ج) "دوسرا امیر 'تورا بانڈ' کہلاتا تھا... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن ایّام میں دہلی کے مسلمانوں میں پنجاب کا لہجہ غالب تھا۔" (ص ۱۱۱)

یہ فقرہ شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی سے لیا گیا ہے۔ موقع یہ ہے کہ سلطانِ بنگالہ نے ملک قبول سے اُس کا نام پوچھا۔ جواباً "گفت کہ تورا باند" یعنی اُس نے کہا کہ میں آپ کا غلام ہوں۔ بنگلہ میں بندی (مذکر: بندہ) کو 'باندی'، اور پنجابی میں 'گولی' کہتے ہیں۔ (ہفت زبانی لُغت ص ۹۴) اسی لیے غالباً شیرانی نے "تورا باند" کو نام سمجھ لیا۔

(د) "ایک فقرہ... تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں: برکت شیخ تھیا، اک موا، اک نہا" (ص ۱۱)

حافظ محمود خاں شیرانی نے اِس فقرے سے تفصیلی بحث کے بعد لکھا ہے کہ:

"اس جملے میں ایک خوبی یہ ہے کہ اسے سندھی بھی کہا جا سکتا ہے، پنجابی بھی اور اردو بھی۔"

اور یہ بھی کہا ہے کہ "اب میں یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اِس (نہا) کو ملتانی زبان کے مصدر

"تھیوناً" بمعنی ہوناکی ماضی مان لوں۔" لیکن بعد میں جب انھوں نے اِسی جملے کی قرأت اس طرح شائع کی کہ:

"برکت شیخ بیٹھا، اک موا، اک نٹھا[۱]" (مقالات جلد ۱ ص ۱۴۴)

تو "پنجاب میں اردو" کی مذکورہ تمام بحثیں از خود کالعدم ہوگئیں۔ اِس جدید قرات کے بارے میں ڈاکٹر مظہر محمود خاں شیرانی نے حاشیہ پر لکھا ہے:

"اصل نام شیخ حسین، عوام میں شیخ بیٹھا کے نام سے معروف تھے۔ ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ مزار ٹھٹھے کے قریب ہے۔"

زبانِ اُردو کی ابتدا کے بارے میں حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت، نیز دوسرے حالات اُس عقیدے کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

جن سیاسی واقعات کی طرف حافظ صاحب نے اشارہ کیا ہے، وہ چار معلوم ہوتے ہیں، یعنی (الف) پایۂ تخت کا لاہور سے دہلی منتقل ہونا، (ب) غیاث الدین تغلق، (ج) خضر خاں اور (د) بہلول لودی کا تخت نشین ہونا۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے:

(الف) زبان کی قدامت کا بیان کرتے ہوئے حافظ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"غوریوں کے عہد میں دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے۔" (ص ۱۰)

اِس کی تردید دوسرے مقام پر خود انھوں نے یہ کہہ کر کردی ہے کہ:

"قطب الدین ایبک ۶۰۶ھ (۱۰-۱۲۰۹ء) میں دہلی اور میرٹھ پر قابض ہوجاتا ہے۔ اس قبضے کے بعد پایۂ تخت لاہور و کہرام سے تبدیل ہوکر دہلی آجاتا ہے (ص ۵۵)

---

[۱] جناب نور احمد خاں فریدی نے اِس کی قرات اِس طرح شائع کی ہے:

"برحمت پیر بیٹھا، اک موپا، اک نٹھا۔" (اخبار اردو، کراچی۔ جولائی ۱۹۸۲ء ص ۶)

یہ بات کتاب میں بار بار کہی گئی ہے مثلاً:

"مسلمانوں کا کثیر گروہ جب قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا ہے تو اپنے ساتھ پنجاب سے کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے گیا ہے" (ص ۱۱۰)

اور یہ:

"قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں" (ص ۵۸)

لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ایبک کے بعد اُس کے بیٹے آرام شاہ کا بھی پایۂ تخت لاہور ہی تھا اور التمش کی تاجپوشی بھی وہیں ہوئی تھی۔ التمش کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بادشاہ ہونے سے پہلے یہ شخص بہار اور بدایوں کا صوبے دار رہ چکا تھا اور اس کے بادشاہ ہو جانے کے بعد سندھ پر ناصر الدین قباچہ اور پنجاب پر تاج الدین یلدوز نے قبضہ کر لیا تھا اور اِس طرح یہ دونوں علاقے الگ ہو کر دہلی کی سلطنت کے حریف بن گئے تھے۔

(ب) "غیاث الدین تغلق پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہوگا اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی اور پنجابی بولنے والے نظر آتے ہوں گے۔"

(ص ۶۰)

اِس سلسلے میں دو اہم واقعات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ ناصر الدین محمود جو بہرائچ میں قید رہا تھا، اور پھر وہاں کا اقطاع دار ہو گیا تھا، جب بادشاہ ہوا تو اُس کے ساتھ بہرائچ کے "پایک و سوار" بھی دہلی آئے تھے۔ پھر ملک علاء الدین خلجی جو کڑہ اور اودھ کا صوبے دار تھا، اپنے چچا کو قتل کرنے کے بعد اپنے علاقے کے لشکر کے ساتھ دہلی میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ غیاث الدین تغلق نے خلجی بادشاہ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ہی خسرو خاں پر حملہ کر کے اُسے قتل کیا تھا۔ اُس کی کامیابی کے اِس پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(ج) "پنجاب ایک مرتبہ اور خضر خاں کی صورت میں دہلی پر حملہ کرتا ہے" (ص ۶۲)

اِس سلسلے میں خود حافظ صاحب کے نقل کردہ اِس بیان پر نظر کی جانی چاہیے:

"سلطان فیروز تغلق نے اپنے عہد میں ایک لاکھ سے زیادہ غلام جمع کیے تھے جو زیادہ تر مشرقی ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ اِس قدر طاقت ور ہو گئے تھے کہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے لگے۔" (ص ۱۲ بر حاشیہ)

یہ درست ہے کہ وقتی طور پر ان پوربیوں کے اوپر دہلی میں بڑی تباہی آئی تھی لیکن اُن کے اثرات کو بالکل زائل کر دیا گیا تھا، یہ بات خلافِ قیاس ہے۔ اِس حقیقت کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ خضر خاں کے خاندان کو دہلی میں کماحقہٗ استحکام حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ لسانی اور علمی معاملوں میں بھی اُس کے اثرات کو پایدار نہیں سمجھنا چاہیے۔

(د) "(بہلول لودی) بادشاہِ دہلی بن گیا۔ اگرچہ اُس کے لشکر میں زیادہ تعداد افغانوں کی تھی لیکن یہ افغان وہ تھے جو زیادہ تر پنجاب میں آباد تھے۔"

(ص ۶۴)

بہلول کی تخت نشینی کے بعد سے ہی سلاطین شرقیہ کی طرف سے آویزشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اُس کے ابتدائی زمانے میں ہی محمود شاہ شرقی نے دو لاکھ فوج سے دہلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ بہلول کو بھی اپنے لشکر کے ساتھ بار بار پورب کے علاقوں میں جانا پڑا تھا اور جونپور کی تباہی کے بعد وہاں سے دہلی کی طرف مسلمانوں کے ہجرت کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ شیخ عبدالقدوس ردولوی نے بھی ترکِ وطن کر کے شاہ آباد (دہلی) اور پھر گنگوہ میں اقامت اختیار کی تھی۔

شیرانی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ مختلف تاریخی واقعات زبان میں تبدیلی اور نتیجے کے طور پر ارتقا کا سبب بنتے ہیں لیکن واقعات اُتنے سادہ نہیں ہوتے جتنے بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے معاملات سے قطع نظر خود مسلمانوں کو کوئی ایک نسلی جماعت یا لسانی وحدت خیال نہیں کرنا چاہیے۔ ابتدائی دور کے سلاطین ترک تھے۔ خضر خاں سے سادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُنھیں عرب کہا جا سکتا ہے۔ لودی پٹھان تھے اِس طرح یہ الگ الگ تین نسلی اور لسانی جماعتیں تھیں۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے بارے میں حافظ محمود خاں شیرانی

نے لکھا ہے :

" ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر کے دہلی آئے۔ اُن میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک ، خراسانی ، خلجی ، افغان اور پنجابی لیکن اُن میں زیادہ تعداد موخرالذکر کی تھی " (ص ۵۸)

اول تو ایبک کے ساتھ ہجرت کی بات خیالی ہے۔ دویماً ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد مقامی آبادی سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ سویماً حاکم کی حیثیت میں تُرک تھے۔ پنجابی اُن کے ملازم یا پیشہ ور لوگ تھے۔ وہ بہت زیادہ موثر نہیں ہو سکتے تھے۔

دہلی سے زبانِ اردو کا تعلق ظاہر کرنے کے لیے حافظ محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے کہ :

" یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ امیر خسرو دہلی کی زبان کو دہلوی لکھتے ہیں "

(ص ۸)

اور اپنے اِس دعوے کے لیے اُنھوں نے مثنوی نہ سپہر کا حوالہ دیا ہے (ص ۱۲۲) لیکن اُس مثنوی میں لفظ " دہلوی " نظم نہیں ہوا ہے۔ اُس میں جو کہا گیا ہے، یہ ہے ع

دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد

اور یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے۔

خسرو کے بعد دوسرا نام حافظ صاحب نے باجن کا پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

" اب شیخ باجن بھی اِس کو دہلوی کہتے ہیں " (ص ۸)

باجن کی ایک نظم نقل کر کے حافظ محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے :

" صفتِ دنیا بزبانِ دہلوی گفتہ۔ یہ اشعار میں نے ایک ایسے نسخے سے لیے ہیں جو سخت غلط ہے اور بارھویں صدی کے خاتمے کے قریب لکھا گیا ہوگا۔ باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کو زبانِ دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے " (ص ۳۸)

باجن کو " پہلا " کہہ کر اُس بات کی جو خسرو کے بارے میں کہی گئی تھی گویا خود تردید کر دی ہے۔

شیرانی کے مذکورہ نسخہ کے بارے میں جناب خورشید احمد خاں نے اطلاع دی ہے کہ:

"کتاب کا نام گلستانِ رحمت یا خزائنِ رحمت ہے۔" (ص ۲۳۱)

اور ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے اِس مخطوطے کا تعارف اِس طرح کرایا ہے:

"گلستانِ رحمت۔ در ذکر و مقاماتِ شیخ رحمت اللہ با مسائلِ فقہی و تصوف مصنفۂ شیخ بہاء الدین بن معز الدین باجن، با دوہرہ ہائے دکنیِ خود کہ در متنِ کتاب درج نمودہ۔ ناقص الطرفین۔" (فہرست جلد ۲ ص ۳۰۰)

کتاب کا صحیح نام "خزائنِ رحمت اللہ" ہے۔ خود باجن کا کہنا ہے کہ:

"ایں فقیر بہاء الدین الملقب بہ باجن... بعضے کلمات از زبانِ حضرتِ ایشاں (شیخ رحمت اللہ) واز کلماتِ مشائخ سلف و مناقبِ ایشاں کہ منقول از کتبِ معتبرہ جمع کردہ بود و آنچہ در طبعِ ایں فقیر گنجید و سنجید، تحریر یافت، و ایں رسالہ خزائن رحمت اللہ نام نہاد۔"

اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کا "ناقص الطرفین" نسخہ اصل کتاب کا "سخت غلط" خلاصہ تھا اور وہ اصل تصنیف کے تقریباً تین سو برس بعد کا لکھا ہوا تھا۔ ایسے نسخے کے اندراج پر اعتماد کر کے انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

"باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کو زبانِ دہلوی کے نام سے یاد کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اُن ایام میں بھی برج بھاشا سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ اُن کے ہاں صرف ایک نمونہ اِس اردو کا ملتا ہے۔"

(ص ۱۶۳)

اِتنا ہی نہیں بلکہ حافظ صاحب نے اپنے اِس خیال کو مزید ترقی دے کر یہ بھی لکھا کہ:

"اہلِ گجرات اِس (اردو) کو نویں صدی ہجری میں زبانِ دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔" (ص ۱۱)

صحیح یہ ہے کہ خزائنِ رحمت اللہ میں ایک جگہ بھی لفظ دہلوی نہیں آیا ہے۔ شیرانی نے جو نظم نقل کی ہے، اُس کا عنوان اِس کتاب میں اس طرح ہے:

"درصفتِ دنیا ایں درویش بہ زبانِ ہندی گفتہ است ۔"

اِس مقام پر ایک اصولی نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ ہر قلمی تحریر لازماً معتبر نہیں ہوتی، اور مخطوطات میں لکھے ہوئے لفظوں پر بہت احتیاط کے ساتھ غور و فکر کے بغیر اعتماد کر لینا بڑی غلطی کا سبب بن سکتا ہے۔

حافظ محمود خاں شیرانی زبانِ اردو کی بحث میں برج بھاشا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ:

"دوآبے میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اردو نے اِن علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے جس طرح ہریانے کے علاقے سے۔" (ص ۸)

بلکہ وہ اس زبان کے عمل کو مزید وسعت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بھاشا شاعری کی زبان تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اِس سے کہ اودھی ہو، گجراتی، مالوی یا بہاری شعر لکھتا تھا۔" (ص ۱۱۹)

اور اسی خیال سے انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"آج دوآبے میں اردو بولی جاتی ہے لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقے کی یہ زبان نہ تھی بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔" (ص ۷)

اِس بیان میں خود حافظ صاحب کے خیال کے مطابق دو طرح سے قباحتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ:

"جب کہ مسلمان ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں، نیز اُس کے بعد کی تین صدیوں تک کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے۔" (ص ۱۱۰)

"برج بھاشا کوئی قدیم نام نہیں ہے۔ قدما اِس کو گوالیاری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔" (ص ۱۱۹)

اِس قسم کے بیانوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ باوجود اِس کے کہ شیرانی کے سامنے حقائق آرہے تھے کتاب کا مقررہ مقصود اُنھیں برابر اُلجھن میں ڈال رہا تھا چنانچہ اُن کا یہ بیان بھی اِسی قبیل سے ہے کہ:

"مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارنپور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی

باوجودیکہ ایسے علاقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں آج اردو مادری زبان ہے لیکن وہ اپنے ہندی اشعار میں ایسی زبان لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔"

(ص ۷)

شیخ عبدالقدوس کا گنگوہ سے بس یہ تعلق ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری سال یہاں گذارے تھے۔ اصلاً وہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے اور وہیں پر انھوں نے اپنا رشد نامہ مکمل کرلیا تھا۔ اُس کتاب میں اُن کا جو کچھ کلام ہے وہ سب ردولی کی ہی زبان میں ہے۔ اُسے برج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خود "پنجاب میں اردو" میں اُن کا جو کلام منقول ہے اُس میں ایک "سرود در پردۂ پوربی" بھی ہے۔ (ص ۱۶۹)

زبانِ اُردو کے دکن تک پہنچنے کے بارے میں حافظ محمود خاں شیرانی نے قدیم، مروّجہ خیال ہی کو مان لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"اسلامی سلطنت چونکہ دہلی پہنچ کر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، اس لیے یہ زبان اسلامی لشکروں ... کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ خلجی اِس کو گجرات اور دکن پہنچاتے ہیں۔ محمد تغلق جب آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان دکن میں مسلمان نو آباد کاروں کی زبان بنجاتی ہے۔" (ص ۱۱)

اِس اقتباس میں جن "مسلمان نو آباد کاروں" کا ذکر ہے، وہ دہلی سے آنے والے تھے۔ اردو کے اِن کی زبان بنجانے کی بات عجیب ہے۔

حافظ صاحب نے خلجیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ملک علاءالدین خلجی نے جو کڑے کا حاکم تھا، پہلی مرتبہ اپنے علاقے سے جنوب کا راستہ دریافت کیا اور دکن جاکر دیوگیر کو فتح کیا۔ وہاں کے راجا رام دیو نے برار کا علاقہ اُس کے حوالے کر دیا۔ فیروز خلجی نے کامیابی کی خبر سنی تو خوش ہو کر ملک علاءالدین کو اودھ کا علاقہ بھی دے دیا۔ ملک علاءالدین نے فیروز کو قتل کرنے کے بعد کڑے اور اودھ کے لشکر کے ساتھ دہلی پر قبضہ کیا۔ دیوگیر میں یادو راجاؤں

کی حکومت خلجیوں کے عہد میں ختم ہو چکی تھی اور وہاں پوری طرح خلجیوں کو تسلّط حاصل ہو چکا تھا۔ ملک علاء الدین حاکم کڑہ کے زیرِ انتظام آجانے کے نتیجہ میں حاکموں کی زبان کی حیثیت سے، برار میں کڑے کی زبان مسلسل ترقی کرتی رہی تھی اور دکن کے دوسرے علاقے بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہے تھے۔ لسانیاتی تحقیق میں اِن تاریخی حقائق سے صرفِ نظر کرنے نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ محمد تغلق کے بارے میں بھی حافظ صاحب نے ایک اہم حقیقت کی نشاندہی کی ہے:

"محمد تغلق کو... دکن سے بے حد شغف تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں وہ بچشمِ خود دیکھ آیا تھا۔" (ص ۶۱)

حافظ صاحب نے معراج العاشقین کا بھی حوالہ دیا ہے (ص ۷۵) جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے ایک طویل مدّت تک منسوب رہی ہے۔ جدید تحقیقات کی رو سے اس کتاب کا بندہ نواز سے تعلق نہیں ہے۔

گذشتہ اوراق میں جن امور سے بحث کی گئی ہے، اُن کی حیثیت زبان کی اصل اور ابتدا کی جستجو میں محض تمہید کی ہے۔ حافظ صاحب کے ساتھ یہ زیادتی ہوگی اگر ان بحثوں کو ہی کُل سمجھ لیا جائے۔ کتاب "پنجاب میں اُردو" کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اطلاع دی ہے کہ:

"حافظ صاحب اِسے از سرِ نو لکھنا چاہتے تھے۔" (ص ۱)

اور معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد سے وہ یادداشتیں جمع بھی کر رہے تھے، چنانچہ اورینٹل کالج میگزین (لاہور) کے "شیرانی نمبر" میں ڈاکٹر وحید قریشی نے "پنجاب میں اردو کی بعض قدیم تصنیفات" کے عنوان سے جو مضمون شائع کیا ہے وہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ کتاب مکمل کرنے کے بعد گویا پنجاب میں اردو کے موضوع سے حافظ صاحب کو عشق ہو گیا تھا۔ اس کتاب کے مباحث سے متعلق اُنھوں نے متعدد نہایت مفصل مضامین لکھ کر شائع کیے۔ اُن مضامین کی روشنی میں اگر اس کتاب پر نظرِ ثانی کر لی گئی ہوتی تو نہ صرف کتاب کی ضخامت میں بہت اضافہ ہو جاتا، بلکہ اردو کی ابتدا اور اس کے قدیم سرمایے سے متعلق یہ بہترین معلومات کا خزینہ بن جاتی لیکن افسوس کی بات ہے کہ مصنف کی نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ

اِس کتاب کو مرتب ہونا نصیب نہیں ہوا۔ چند سال پیشتر جناب خورشید احمد خاں جب ہندوستان تشریف لائے تھے تو راقم سطور نے یہ عرض کیا تھا کہ "مقالاتِ شیرانی" کی روشنی میں اِس کتاب کی تصحیح کر دی جائے۔ ابھی خورشید صاحب کی تصحیح کے ساتھ صرف پہلی جلد چھپ کر آئی ہے ممکن ہے دوسری جلد میں انھوں نے یہ کام کیا ہو۔

یہ تو نہیں ہے کہ اردو میں زبان کے آغاز اور ارتقا سے متعلق فکر و تحقیق کا کام نہیں ہوا تھا، لیکن "پنجاب میں اردو" کی اشاعت کے بعد لسانی تحقیق میں باضابطگی پیدا ہوئی۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ اِس کتاب میں جو دلائل پیش کیے گئے تھے، بعد میں اُنھیں کی بنیاد پر "حضرتِ دہلی کو اردو کا صحیح مولد و منشا" قرار دیا گیا۔ ابتدائی کاوش ہونے اور ماخذ کی کمی کی وجہ سے "پنجاب میں اردو" جتنی غلطیاں ہو گئی تھیں تقریباً سب نئے نظریہ کی تشکیل کی دعوے دار کتاب میں اخذ کر لی گئی تھیں۔ کسی کتاب سے اِس طور پر نقل کیا جانا، ناقل کی بے علمی کے ساتھ ساتھ منقول عنہ کی غیر معمولی اہمیت کا اعتراف بھی ہوتا ہے۔

"پنجاب میں اردو" میں حافظ محمود خاں شیرانی نے فارسی کے اساتذۂ قدیم مثلاً فردوسی منوچہری، سنائی وغیرہ کے فارسی کلام میں ایسے لفظوں کی جستجو کی ہے جو قدیم اُردو میں مروّج تھے۔ انھوں نے کتبِ تاریخ اور لغات کو بھی اس مقصد سے کھنگالا تھا۔ شیرانی نے محض الفاظ شماری نہیں کی بلکہ اُن کو زمانی تقسیم کے ساتھ پیش کر کے صحیح نتائج تک پہنچنے کی راہ دکھائی تھی۔ پنجاب میں اردو میں کام کی محض ابتدا تھی۔ بعد میں انھوں نے لفظی تحقیق سے کام لے کر پرتھی راج راسا اور خالق باری کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اردو میں تحقیق کا ایک نادر لیکن نہایت مفید انداز سامنے آیا۔ شیرانی کے بعد اکثر لوگوں نے اس روش پر چلنا چاہا ع   مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اگرچہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی "آبِ حیات" میں کبیر، جائسی وغیرہ کا ذکر کیا تھا حافظ صاحب نے بہت قطعیت کے ساتھ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، کبیر، قطبن، عبدالقدوس عثمان وغیرہ کو اردو شاعروں کی صف میں جگہ دی۔ بعض اُن شاعروں کا بھی تعارف کرایا، جن سے اُس وقت تک اردو دنیا عام طور سے واقف نہیں تھی، مثلاً باجن اور علی جیو وغیرہ۔

بعد کے زمانے میں بھی اُنھوں نے اِس سلسلے کی تحقیق و تلاش جاری رکھی، چنانچہ اردو اور ہندی کی اوّلین معلوم تصنیف "چندراین" کا تعارف بھی شیرانی نے نہایت مفید انداز سے کرایا ہے۔ یہ بھی حافظ صاحب کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جائسی وغیرہ کے کلام کو زبانِ اردو کی شناخت کے لیے ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔ اِس سے یہی نہیں ہوا کہ اردو کی لسانیاتی تحقیق کو صحیح سمت ملی بلکہ اردو کے اُس سرمایے کو پھر اردو کے دامن میں سمیٹ لینے کی تحریک بھی ہوئی جسے غفلت نے اُس کے دائرے سے خارج کر دیا تھا۔

شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں رس بھوشن، رس رتنا گار، سندگار درپن اور بہت پرکاس جیسی کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ (ص ۱۳۰) اور اس طرح اپنے عمل سے یہ بات ظاہر کر دی کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس سے متعلق تحقیق کے لیے ملک کی دوسری زبانوں کے تحریری سرمایے کو بھی دیکھنا چاہیے۔

زبانِ اردو کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور چلی آتی تھیں۔ "پنجاب میں اردو" حافظ صاحب کی ابتدائی کتاب ہے۔ اُس وقت تک بہت سے حقائق نامعلوم تھے۔ اِس کے باوجود حافظ صاحب نے بعض نہایت مشہور حقائق سے انحراف بلکہ انکار بھی کیا ہے مثلاً خسرو کے نام سے ایک غزل نقل کر کے لکھتے ہیں:

"میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔" (ص ۱۳۹)

اسی طرح ایک غزل کے بارے میں کہتے ہیں کہ "یہ امیر کی طرف منسوب ہے۔" (ص ۱۳۷) پرتھی راج راسا اور خالق باری کے بارے میں اگرچہ اُس وقت تک انھوں نے اپنی تحقیق کے سلسلے کو شروع بھی نہیں کیا تھا، "پنجاب میں اردو" میں جو بحث کی ہے، اُس زمانے کے لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ کتاب میں ایسی بحثیں اور بھی ہیں۔ اِن بحثوں نے تحقیق و جستجو کی طرف ذہنوں کو مائل کیا اور نتیجہ کے طور پر بہتر اور صحیح تر حقائق کے سامنے لائے جانے کے لیے راہیں کھول دیں۔

ذاتی طور پر میرے نزدیک شیرانی کی وہ خوبی جس پر رشک کیا جانا چاہیے، یہ ہے کہ اپنے موضوع سے متعلق بظاہر بہت معمولی واقعات کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اردو

املا اور رسم خط کے ذیلی عنوان سے انھوں نے جو چند سطریں لکھی ہیں اور اُن کے بعد عہدِ عالم گیری کی ایک ترمیم کا بیان کیا ہے، اردو کی لسانی تاریخ کے سلسلے میں وہ بہت مفید اور اہم ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب ہماری اردو نے اپنے موجودہ لب و لہجہ کو اختیار کرنا شروع کیا تھا۔

اردو کے ناموں سے متعلق بحثیں بھی بہت نتیجہ خیز ہیں۔ شیرانی نے اس عام عقیدے کی کہ" دہلی کے اردو بازار کی بنا پر اس زبان کا نام اردو زبان ٹھہرا" (ص ۲۰) جس طرح تردید کی ہے، علم و فضل سے قطع نظر، اُس سے اُن کی محققانہ جرات اور حوصلہ مندی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ یہ جرات بلکہ جسارت محقق کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اردو کے بارے میں ایک عام عقیدہ یہ چلا آتا ہے کہ اس کا رشتہ بالآخر سنسکرت سے جا ملتا ہے۔ اُس ابتدائی زمانے میں قطعیت کے ساتھ کوئی دعویٰ کرنا شیرانی کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن انھوں نے ضمناً جا بجا حقیقت کی طرف اشارے کر دیے ہیں مثلاً:

(الف) خواجہ مسعود سعد سلمان کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے اور نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔" (ص ۵۴)

(ب) خواجہ امیر خسرو کے حالات میں کہا ہے کہ:

"میں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اِس معاملۂ خاص میں امیر خسرو سنسکرت بھاشا کے مرہونِ منت نہیں معلوم ہوتے کیونکہ خواجہ مسعود سعد سلمان سب سے پیشتر فارسی میں اِن نظموں کو رواج دیتے ہیں۔" (ص ۱۲۷)

یعنی ہیئتوں کے سلسلے میں بھی ہندوستان کی دوسری زبانوں کے سرمایۂ ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ضمناً حافظ صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"لفظ بُت بودھ (بُدھ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔" (ص ۴۶)

اِس کے لیے کوئی سند پیش نہیں کی گئی ہے لیکن اگر اس پر اعتماد کیا جا سکے تو یہ اردو کے آغاز کے سلسلے میں اہم بات ہوگی۔ بدھ مذہب ایک زمانے میں عالم گیر ہو گیا تھا۔ ترکستان میں جب اسلام

پہنچا تو اُسے اِسی مذہب سے سابقہ پڑا۔ کہتے ہیں کہ ترکی زبان میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں پہلی وہ ہے جس میں بدھ مذہب کی تردید کی گئی ہے۔ ہندوستان میں بعثتِ اسلام سے بھی پہلے سے تُرک حاکم رہے ہیں۔ شیرانی نے دلچسپ اطلاع یہ بھی دی ہے کہ:

"موجودہ بلوچستان کے ایک حصّے کا نام ایرانیوں نے توران رکھ دیا تھا۔"

(ص ۴۵)

اِسی طرح کہا جاتا ہے کہ بنگال میں لکھنوتی کا نام "غور" مقرر کیا گیا تھا۔ بدھ مذہب سے تعلق اور ترکوں کے اثرات کا اگر تفصیلاً جائزہ لیا جائے تو زبانِ اردو کی اصل تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

حافظ محمود خاں شیرانی کی "پنجاب میں اردو" میں اس قسم کے اور بھی بعض نکتے محفوظ ہیں۔ اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعے اور جائزے کی ابھی ضرورت ہے اور اِس سے لسانیاتی تحقیق کے کام میں بہت رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

مآخذ

پنجاب میں اردو (حصہ اوّل) حافظ محمود خاں شیرانی مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۸ء

فہرست مخطوطات شیرانی جلد ۲۔ مرتب ڈاکٹر محمد بشیر حسین۔ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء

مقالاتِ تحقیق۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۸ء

مقالاتِ شیرانی جلد ۱ مرتب ڈاکٹر مظہر محمود خاں شیرانی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء

ہفت زبانی لغت مرتب اشفاق احمد وغیرہ مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۴ء

غالب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء

مصنّف : ڈاکٹر معین الرحمان

غالب نے انقلابِ ۱۸۵۷ء سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے متفرق تحریروں کے علاوہ اِس موضوع پر فارسی میں ایک مستقل کتاب دستنبو بھی لکھی تھی مشہور غالب شناس ڈاکٹر معین الرحمان نے ایسی سب تحریروں کو اِس کتاب میں یک جا کر دیا ہے۔ دستنبو کی پہلی شاعت کا متن فوٹو آفسٹ کے ذریعے شامل کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس نہایت مشکل فارسی متن کا اُردو ترجمہ جناب رشید حسن خاں نے کیا ہے مصنّف نے اپنے نہایت مفصّل اور عالمانہ مقدمے میں دستنبو کے زمانۂ تحریر اور وجوہِ تحریر کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔

نوّاب معتمد الدّولہ آغا میر

مصنّف : ڈاکٹر انصار اللہ

تاریخِ ادب سے دل چسپی رکھنے والے نوّاب آغا میر کی شخصیت اور کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مصنّف نے اُن کے حالات اور ان سے متعلق جملہ معلومات کو نہایت سلیقے کے ساتھ اس کتاب میں یک جا کر دیا ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔

قیمت : ساٹھ روپے

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی

ڈاکٹر آزرمیدخت صفوی

موازنۂ یوسف زلیخا کی روشنی میں شیرانی کے انداز تحقیق پر ایک نظر

فارسی اور اُردو زبان و ادب کی تاریخ نقد و تحقیق مرتب کرتے وقت اگر کسی ایسے فرد واحد کو تلاش کرنا مقصود ہو، جس نے بیک وقت تحقیق اور تنقید دونوں کو نئے جہات اور امکانات سے روشناس کروایا تو ذہن میں بے ساختہ حافظ محمود شیرانی کا نام آتا ہے۔

فارسی اور اُردو کے اس متبحر عالم، نکتہ رس نقاد اور دور رس محقق نے اپنی سخن سنجی اور بینش سے بہت سے رازہائے سربستہ کی پردہ کشائی کی اور متعدد مفروضات ادبی کو باطل قرار دیا۔ فردوسی سے منسوب ہجو محمود، امیر خسرو سے انتساب یافتہ خالق باری، پرتھی راج راسا منسوب بہ چندر بردائی، فردوسی کا مذہب اور متعدد دیگر متنازع فیہ موضوعات پر شیرانی نے قلم اُٹھایا اور صدیوں سے قائم شدہ مفروضات کو اپنی تحقیق کے ذریعہ غلط یا کم سے کم مشکوک ثابت کرکے نئے نظریات کی بنا ڈالی اور اپنے بعد آنے والے منتقدین ادب کو غور و فکر کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض معروف اور مقبول کتب ہائے نقد و تحقیق پر منصفانہ اور بے لاگ محاکمہ اور تبصرہ کیا۔ اس سلسلے میں اُن کی تنقید شعر العجم اور تنقید آب حیات سرفہرست ہیں۔

مقالۂ حاضر میں فردوسی سے منسوب مثنوی یوسف و زلیخا پر شیرانی کے نقد کی روشنی میں

ان کے مخصوص اندازِ تحقیق کا جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔ لیکن اُن کے اندازِ تحقیق و تنقید پر بحث کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس وقت تک فارسی اور اُردو ادب میں عمومی طور پر رائج طرزِ نقد و تبصرہ پر ایک مختصر نظر ڈالیں اور اس پس منظر میں شیرانی کی تحقیق کو پرکھیں اسی صورت میں ہم کو اس بات کا کما حقہٗ اندازہ ہو گا کہ حافظ محمود شیرانی اپنے اندازِ فکر میں دوسرے ناقدین سے کس حد تک اور کیوں مختلف تھے۔

فارسی اور اُردو ادب میں تذکرہ نویسی کی روایت قدیم رہی ہے۔ عام طور پر یہ تذکرے شعرا اور اُدبا کو تاریخ کے تناظر میں دیکھتے اور ایک مخصوص دور میں ان کے مقام اور اہمیت کا تشخص کرتے تھے۔ بے شک یہ تذکرہ نگار اُن کے فن اور کلام پر تبصرہ بھی کرتے، مگر عموماً یہ تبصرہ ایک عمومی نظر سے زیادہ نہ ہوتا اور شاعر یا نویسندہ کے فن اور اسلوب کی دقیق پے گیری نہ کرتا؛ اور اس کے کلام پر کسی سوچی سمجھی تحقیق کے بعد اپنی رائے اگر دیتا تھا، تو عام طور پر اُس کی یہ رائے صنایع لفظی و معنوی اور تشبیہات کے پردے میں ملفوف ہوتی اور بسا اوقات اس کی تنقید اغراق آمیز تعریف سے آگے نہ بڑھتی کلام کی خوبیوں کو عموماً "دقّتِ معنی عذوبتِ بیان، ندرتِ فکر، جدتِ تعبیر، قشنگیِ تشبیہات، استعارات، انسجام و استحکام" وغیرہ جیسے ہمہ گیر اور وسیع (BROAD SPECTRUM) مرکبات توصیفی کے چارچوب میں بند کر دیا جاتا، اور خامیاں عموماً "ناہمواری بیان، عبارت ہائے غلو آمیز، آہنگ مصنوع و تعقید لفظی و معنوی" اور اسی قبیل کی دوسری تعبیرات میں محدود رہتیں۔ بے شک مولٰینا آزاد کی آبِ حیات اور شبلی کی شعر العجم نے شاعروں کو اُن کی منفرد اور مشخص خصوصیات کے ذریعہ متعارف کروانے کی کوشش کی اور نقد و تبصرۂ ادبی کو ایک نئے انداز سے برتا؛ اور اس اعتبار سے یہ دونوں بزرگ اُردو اور فارسی کے ناقابلِ فراموش محسن ہیں، لیکن اس کے باوصف صاحبانِ نظر کو شبلی اور شیرانی کے نقد کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ یہ فرق کیوں ہے اور اُس کے جہت و اسباب کیا ہیں؛ شیرانی کی تنقید یوسف زلیخا کو بطورِ نمونۂ نقدِ شیرانی سامنے رکھ کر اگر ہم اس تفاوت کا تجزیہ کرنے بیٹھیں، تو چند در چند نکات سامنے آتے ہیں۔

مثنوی یوسف زلیخا کا فردوسی سے انتساب ایک ایسا مسلمہ بن چکا تھا، جو ہر قسم کے شبہ

سے پاک سمجھا جاتا تھا۔ یہ مثنوی پہلی بار ۱۹۰۸ء میں نولدیکے کے مقدمہ کے ساتھ آکسفورڈ سے شائع ہوئی۔ ایتھے، پروفیسر براؤن اور اُن کے بعد کے دانشوروں نے بھی اس بات کی تائید کی، یہاں تک کہ شیرانی سے قبل، دورِ جدید کے ایرانی ناقدین نے بھی اس کا انتساب فردوسی کی طرف کیا۔ ایسی مسلّم اور گویا ثابت شدہ بات کے خلاف قلم اُٹھانے کے لئے بڑی جرأت اور استحکام نظر کی ضرورت تھی۔ شیرانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس غلط انتساب کے خلاف آواز بلند کی۔ فردوسی ایرانی قوم کا محبوب ترین شاعر ہے اور اُس کے فکر اور فن پر ایرانی منتقدین نے بھی بڑی تحقیق اور کاوش کی ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ یہ تمام تحقیق اور کاوش شیرانی کے "چار مقالہ بر فردوسی و شاہنامہ" سے نہ صرف مؤخر بلکہ کم تر بھی ہے۔ بے شک دورِ جدید کا ایرانی ناقد "یوسف زلیخا" کو فردوسی کی مثنوی تسلیم نہیں کرتا ہے لیکن سب سے پہلے اس انتساب کا رد شیرانی ہی نے کیا اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ایسے مستحکم اور وزنی دلائل پیش کئے کہ آج تک اُن پر اضافہ نہ ہو سکا؛ اور جیسی چونکا دینے والی اور زندہ تحقیق انھوں نے فردوسی کے بارے میں کی وہ اُس کے بعد سے اب تک کوئی ناقد نہ کر سکا۔ دیکھا جائے کہ اس کا سبب کیا ہے۔ مقالاتِ شیرانی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے عقائدِ ادبی کے استحکام اور اُن کے دلائل کی قطعیت کا ایک اساس اصلی ہے، شواہدِ داخلی۔ ایک شاعر یا نویسندہ کے اندازِ فکر، طرزِ بیان، اس مخصوص محیط اور ماحول پر اُس کا ردِ عمل اور اُس کے عقائد و افکار کا آئینہ اُس کے اپنے کلام سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؛ یہ وہ نکتہ تھا جس کا ادراک شیرانی نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت سے کر لیا۔ اُن کا خیال تھا، اور بجا تھا، کہ خارجی شہادت اضافی ہوتی ہے، اس کے برخلاف داخلی شہادت بیشتر شبہ سے پاک ہوتی ہے۔ اپنے نظریاتِ ادبی کی بُنیاد انھوں نے اسی اصول پر رکھی۔ یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلوانا چاہتی ہوں۔ شواہدِ داخلی۔ یہ دو لفظی اصطلاح بظاہر بڑی سادہ معلوم ہوتی ہے۔ یعنی وہ دلائل و شواہد جو بظا لکھنے والے کی تحریر سے برآمد اور اخذ کئے جا سکیں۔ شاعر کا کلام موجود ہے اُس کو پڑھنا کیا مشکل ہے اور پڑھ کر تو پھر گویا اس کی زندگی، اُس کا دور، اس کی طرزِ فکر ہمارے اوپر منکشف ہو ہی جائیں گی! لیکن سامعینِ گرامی، حقیقتِ حال یہ نہیں۔ اس بظاہر سادہ تعبیر میں تحقیق و تنقید، معلوماتِ زبان و ادب؛ تاریخ ادب اور زبان شناسی کی

ایک دنیا آباد ہے۔ ان شواہد کا استیعاب کرنے اور اُن سے استفادہ اُٹھانے کے لئے لازم ہے کہ ناقد ان تمام عوامل وعناصر سے بخوبی واقف ہو اور زبان وادب کے تغیرات ورجحانات اور لسانی تبدیلیوں پر کامل عبور رکھتا ہو۔ پروفیسر شیرانی فارسی زبان کی تاریخ اور لسانی پیشرفت، ہر دور میں رونما ہونے والی فکری اور اُسلوبی تبدیلیوں اور فارسی فنون پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ داخلی شہادت کو اپنا معیار نقد وتحقیق بنا کر اُس سے بے شمار نئے اور اہم نتائج ادبی اخذ کرسکے۔ اور یہی شہادت داخلی جس کو ہم آج کل کی اصطلاح میں اسلوب شناسی یا سبک شناسی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں یا یوں کہئے کہ جو مبنی ہے اُن کی سبک شناسی پر، شیرانی کے فن تنقید کا نقش نگین ہے اور اُن کی یہی خصوصیت اُن کو دوسرے ناقدین سے ممتاز ومتمایز کرتی ہے۔ دیکھا جائے کہ "یوسف زلیخا" میں انھوں نے کس طرح ان شواہد داخلی سے استفادہ کیا ہے۔

محاکمۂ یوسف زلیخا میں شیرانی نے شاہنامہ اور یوسف زلیخا کے مقایسۂ انتقادی کے لئے تین پیمانے یا معیار رکھے ہیں: لسانی - زمانی، جو بجوبۂ خود ناشی ہے شواہد لسانی سے؛ اور فکری - ان تینوں کے لئے شواہد، دلائل اور امثلہ شیرانی نے ان مثنویوں کے متون سے ہی فراہم کئے ہیں۔ ذیل میں ہر سہ کا جدا جدا جائزہ لیا جاتا ہے:

لسانی شیرانی نے مقایسۂ یوسف زلیخا کے مقایسۂ انتقادی میں اسلوب شناسی کے اس اصول اوّلین کو ہی اپنے محاکمہ کی بنائے اصلی قرار دیا ہے۔ انھوں نے دونوں نامبردہ مثنویوں کے ایک ایک لفظ، ایک ایک ترکیب کو زبان شناسی کی خوردبین سے دیکھا اور دونوں کی زبان اُن کے طرز بیان اور اُن کی مصطلحات کا، الفاظ وتراکیب کے دور بدور بدلتے ہوئے لسانی پس منظر میں جائزہ لیا۔ اور اس جائزہ سے جو نتائج مرتب ہوئے انھوں نے برسوں سے قائم شدہ مفروضہ کی جڑیں ہلا دیں! وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ امتداد زمانہ، تطور ایام، اور تغییر سیاسی، جس طرح اقوام وملل کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں، اُسی طرح یہ عوامل زبان وبیان پر بھی گوناگوں اثرات چھوڑتے ہیں ہر زمانے، ہر دور کی زبان اور طرز ادا کی ایک "ویژگی" خصوصیت ہوتی ہے جو ادوار ماقبل وآئندہ میں نظر نہیں آتی، اس لئے کسی شاعر کے کلام میں قضاوت کرتے وقت یا دوپارہ ہائے شعر وادب کی سنجش ادبی اور موازنۂ ومقایسہ باہمی کے لئے ناقد کا ان تمام پہلوؤں کو جاننا اور مورد محاکمہ قرار دینا لازم

ولابد ہے۔ نقد ادبی کے اس بنیادی لازمہ کی تفصیل ایران کے فاضل دانشور ملک الشعراء بہار نے اپنی معروف کتاب سبک شناسی میں یوں بیان کی ہے :

"ایک ماہر ناقد ادب وہ ہے جو واقف ہو اصطلاحات کے تجزیہ و تحلیل اور ہر دور اور ہر قرن کے استعمال لغوی و جملہ بندی سے، اور تاریخ قدیم، تمدن باستانی، زبانوں کے ارتقا اور تکامل، قدیم اور جدید لہجوں کے تفاوت، زندگانی مردم اور محیط انسانی کے تطور اور اثرات صرف و نحو زبان، اصطلاحات قدیم، انشائے امروز، کل اور آج کے لسانی اور اسلوبی فرق اور فکر و سبک شاعر کی انفرادیت کا ادراک رکھتا ہو۔

پروفیسر شیرانی کا انداز فکر اور لسانیات کی اہمیت کا احساس کامل طور پر اس ایرانی دانشمند اور زبان شناس سے مطابقت رکھتا ہے۔ "موازنۂ یوسف زلیخا" کا اقتباس ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں[۳۵] :-

"ہر زمانے اور ہر عصر میں ایک خصوصیت نظر آتی ہے جو اُس کو دوسرے ادوار سے ممتاز کرتی ہے۔ زبان کے مطالعہ کے لئے لازم ہے کہ ہم الفاظ کی تاریخ تبدل و تغیر اور اُن کی مرگ و زیست کے بارے میں علم رکھتے ہوں کیونکہ انسانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی پُرانے اور مندرس ہوتے جاتے ہیں اور ہم اُن کو پُرانے سکّوں کی طرح بے کار جاننے لگتے ہیں .... مزید یہ کہ جس طرح انسان شکل صورت، اخلاق، طبائع اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اُسی طرح وہ اپنے انداز بیان اور ادائے مطالب میں بھی تفاوت رکھتا ہے ..... یہی وجہ ہے کہ مثلاً دو انشا پرداز یا شاعر جنھوں نے ایک ہی موضوع پر طبع آزمائی کی ہو اور بظاہر ان میں ایک دوسرے سے مماثلت قریب نظر آتی ہو، غائر مطالعہ کے بعد اُن کے اسلوب اور بیان میں نمایاں فرق کا احساس ہوتا ہے۔"

اسی اصولِ نقد کو پیش نظر رکھتے ہوئے شیرانی نے یوسف زلیخا کے لسانی تقابل کو کئی شقوں

میں تقسیم کیا ہے : اسالیب خصوصی، اسالیب مقامی، اسالیب ایامی، افعال متعدی بہ دو مفعول
عربیت، عربی الفاظ کی ترکیب، کنایات و محاورات، عربی فارسی الفاظ کی ترکیب، اضافت کا استعمال
وغیرہ۔ ذیل میں ہم بطور یاد آوری، ان میں سے چند کی مثالیں پیش کر رہے ہیں تاکہ سامعین شیرانی کی
باریک نظری اور قوت ممیزہ کا نمونہ دیکھ سکیں :

اسالیب خصوصی : اس عنوان کے تحت شیرانی نے اُن الفاظ و تراکیب کی متعدد مثالیں
دی ہیں جن کو فردوسی اور صاحب یوسف و زلیخا نے اپنے شخصی ذوق یا بُعد زمانی و لسانی کے سبب
الگ الگ معنیٰ میں یا الگ الگ انداز سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً :۔
گوش داشتن یعنی گوش کردن و متوجہ شدن و کنایہ از حفاظت و نگہداشت۔[۵۳] شاہنامہ میں
عموماً بہ معنیٰ اوّل آیا ہے، یعنی بہ معنائے گوش کردن :

بگشتاسپ گفت ای پسر گوش دار
کہ تندی نہ خوب آید از شہریار (ج ۲۔ ص ۲۷۹)
کہ ای مادر مہربان گوش دار
کہ ما بی گناہیم زیں کارزار (ج ۴، ص ۳۲)

اس کے برخلاف[۵۴] یوسف زلیخا میں عام طور پر کنایتاً "حفاظت و نگہداشت" کے لئے آیا ہے :

نباید دراچوں شما گوش دار
کہ خود گوش داردو را کردگار (ص ۱۷۰)

گرہ بر زدن :۔ شاہنامہ میں اپنے معنائے لغوی یعنی گرہ لگانے کے معنی میں ہے
یوسف زلیخا میں بطور کنایہ، خاموش ہو جانے کا معنی میں آیا ہے۔ وغیرہ

اسالیب مقامی : وہ الفاظ جو کسی خاص علاقے سے مخصوص ہیں۔ مثلاً شاہنامہ میں
فردوسی "ساربان" کو "سار وان"، "نانبائی" کو "ناتوا" اور "برزیگر" کو "ورزیگر" کہتا ہے، جس
اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً فردوسی کے ہم وطن ان الفاظ کو "ب" کی جگہ ہائے ہوز سے تلفظ کرتے تھے
یوسف زلیخا میں یہ نظر نہیں آتا۔ شاہنامہ میں "خرید و فروخت" ہے۔ یوسف زلیخا میں "خرید و فروخ

یہ بھی مقامی فرق معلوم ہوتا ہے۔

اسالیب ایامی :۔ وہ الفاظ جو متروک ہوگئے اور شاہنامہ میں نظر آتے ہیں، یوسف زلیخا میں نہیں مثلاً : دیژگان ، وغیرہ، الفاظ جو شاہنامہ کے دورتالیف میں متروک تھے لہٰذا شاہنامہ میں نظر نہیں آتے، لیکن بظاہر ان کا رواج عصر سلجوقی میں دوبارہ شروع ہوا کیونکہ یوسف زلیخا میں وہ مستعمل ہیں، اور دیگر شعرا عصر سلجوقی کے کلام میں بھی نظر آتے ہیں، مانند عنصری وسنائی و منوچہری ایسے بے شمار الفاظ شیرانی نے لکھے ہیں، مثلاً غریو و غرنگ بمعنائے گریہ وزاری۔

یوسف زلیخا: ورا دید جُفت غریو و غرنگ
نہ در دل شکیب و نہ در چہرہ رنگ (ص ۱۲۰)

کہ ایں نالہ وزاری از بہر چیست
غریو و غرنگ تو از بہر کیست

افعال متعدی بہ دو مفعول : صاحب یوسف و زلیخا اکثر اپنی مثنوی میں افعال متعدی بہ یک مفعول کو متعدی بہ دو مفعول لاتا ہے۔ شاہنامہ میں عموماً ایسا نہیں ہے۔ مثلاً: پوشیدن بمعنی پوشایندن

یوسف و زلیخا: بر پوشید آن جامہ فرزند را
بہ شانہ زد آن موی دلبند را (ص ۵۱)

اس کے علاوہ اور متعدد مثالیں شیرانی نے دونوں شعراء کے لسانی اور اسلوبی خصائص اور فرق کو واضح کرنے کے سلسلے میں دی ہیں۔ اس ذیل میں انھوں نے لفظ "ارژنگ" سے جو بحث کی ہے اور جس طرح فی زمانہ اُس کے معنیٰ کا اختلاف اور دونوں شعرا نامبردہ کا اُس کو الگ الگ معنیٰ میں نظم کرنے کی تفصیل بیان کی ہے وہ نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ معانیات کی یہ پوری بحث شیرانی نے بڑی دقّت اور باریک بینی کے ساتھ لکھی ہے۔ خود شاہنامہ اور یوسف زلیخا کی سینکڑوں مثالوں کے علاوہ، فردوسی سے قبل کے ادوار سلجوقی دور اور اُس کے بعد کے شعراء کے کلام سے متعدد مثالیں بطور مقایسہ پیش کی ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ دونوں مثنویوں میں ایسی

لسانی مغایرت اور اُسلوبی تفاوت ہے کہ وہ نہ صرف ایک شاعر کی کہی ہوئی نہیں ہوسکتیں بلکہ اُن کی زبان کا باہمی فرق ایسا شدید اور زندہ ہے کہ اُس سے اُن کے زمان تالیف کا بُعد بھی ثابت ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شیرانی کے نقد کا یہ حصّہ ہم کو یورپ کے شیکسپیرین کریٹی سزم اور براڈلے جیسے ماہر ناقد کی یاد دلواتا ہے۔ جس طرح اُس نے انگریزی ادب کے اس نکتہ پرداز شاعر اور ڈراما نویس کے ایک ایک لفظ اور بلا مبالغہ ایک ایک حرف کو مورد نقد و تحقیق بنایا اور سینکڑوں سال کے ادبی، لسانی اور ذوقی رجحانات اور ماحول کو معیار و محک بنا کر اُس کے اثرات کو شیکسپیر کی تحریروں پر منطبق کیا، اُسی طرح ہندوستان کے اس ہوشمند نقاد نے بھی صدیوں پُرانی ایرانی زبان، اُس کے دستور، اُس کے ارتقا و تغییر، مروج و متروک الفاظ، اُن کی دلالت لغوی و معنوی اور اس قبیل کے تمام دیگر لسانی پہلوؤں کو جو ایک شاعر کے کالبدِ فن میں خون کی طرح جاری و ساری ہوتے ہیں، بلکہ جن پر اُس کے فن کا اساس ہوتا ہے، اپنے نقد میں مورد بررسی قرار دیا اور فردوسی کے مخصوص سبک سخنوری کو صاحب یوسف زلیخا کے طرزِ شعر گوئی سے بڑے منطقی دلائل اور واضح شواہد کی روشنی میں متمایز کیا۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے حماسہ سرائی[۵] اور ڈاکٹر عبدالعظیم قریب نے اپنے ایک[۶] مقالہ میں شاہنامہ اور یوسف زلیخا کے باہمی لسانی فرق کو بیان کیا ہے، لیکن شیرانی کی دقت نظر اور مدلّل طرز استدلال ان دونوں حضرات کے ہاں یکسر مفقود ہے اور اُن کا موازنہ بھی چند سطور سے زیادہ نہیں۔ ایران کے جدید ترین منتقد ادب ڈاکٹر خسرو خسرشید ورّد نے اپنی کتاب "در بارۂ ادبیات و نقد ادبی" میں فردوسی کی زبان اور طرز شعر گوئی کے بابت ایک علیحدہ باب قائم کیا ہے، لیکن آج بھی جب کہ زبان شناسی کے تازہ ترین اصول و ضوابط مرتب ہو چکے ہیں، ڈاکٹر خرشید ورّد شیرانی کے تجزیۂ لسانی فردوسی پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہ کر سکے۔

زمانی

نقد شیرانی کا دوسرا اہم پہلو تحقق زمانی ہے۔ ایک طویل مدّت تک ہمارے ناقد اس اہم نکتہ کی طرف سے بے پروا رہے کہ خواہ نظم ہو یا نثر اُس کے خصائص و اسلوب اور حسن و قبح کا صحیح نقد و تجزیہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُس فن پارہ کے وجود میں آنے کا صحیح یا تقریباً صحیح زمانہ معلوم نہ ہو جائے۔ زبان اور ادب مسلسل ارتقا اور تغییر کی

منزل میں رہتے ہیں، جو لغات واسالیب کل مقبول اور مروّج تھے، ممکن ہے آج مفقود اور مردود ہو جائیں لہٰذا شعر یا نثر کو مورد محاکمہ بنانے سے پیشتر یہ لازم ہے کہ اس بات کا تعیّن اور تیقّن کیا جائے کہ وہ کس دَور میں تخلیق ہوا؛ اُس مخصوص دور کے فکری اور لسانی رجحانات کیا تھے؛ زبان ارتقا کی کس منزل میں تھی؛ ان تمام پہلوؤں کی تحقیق کرنے کے بعد ہی ہم صحیح معنیٰ میں شاعر یا نویسندہ کے فن کو سمجھ کر اُس کی ارزیابی کر سکیں گے۔

پروفیسر شیرانی کا کارنامہ یہ ہے کہ اپنی طباعی اور ذہانت سے انھوں نے اس نکتہ کو پالیا کہ نقد و تحقیق ایک دوسرے سے مربوط بلکہ باہم دیگر لازم و ملزوم ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے شیرانی پر اپنے مقالہ میں لکھا ہے:

"اُن کی تحقیقات سے اس مفروضہ کی تکذیب ہوگئی کہ تحقیق محض گورکنی ہے"۔

تحقیق اور تنقید کے اس باہمی ربط کی گیرائی اور ہمہ گیری کا ادراک کر لینے کے بعد شیرانی نے اپنے نظریات ادبی کی بنا اسی ربط پر قائم کی اور یہی اُن کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ تحقیق کے بغیر تنقید گمراہ کُن ہے اور تنقید کے بغیر تحقیق بے روح۔ یوسف زلیخا کے زمانۂ نگارش کا تعیّن کرنے کے لئے انھوں نے تحقیق و تنقید کے اس رابطہ کو بڑے دلچسپ اور چند در چند طریقوں سے برتا ہے۔ کہیں اُن کی تنقید متن اُن کی تحقیق کو استحکام بخشتی ہے، تو کہیں اُن کی تحقیق اُن کے نقد سخن کی راہ ہموار کرتی ہے اور یہ دونوں باہم یوں ریختہ و آمیختہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے مشخص کرنا ناممکن ہے۔

فردوسی سے یوسف زلیخا کا انتساب سب سے پہلے شرف الدّین یزدی کے ظفر نامہ میں نظر آتا ہے (سال تالیف ۸۲۸ھ ق) اس کے علاوہ اس کا ذکر دیباچۂ بایسنغری (۸۲۹ ق) میں بھی ملتا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں ان دونوں کی تقلید میں بعد کے بہت سے تذکرہ نگاروں نے بھی اس مثنوی کو فردوسی سے منسوب کر دیا تھا اور عہد غزنوی کو اس کا زمانۂ تالیف قرار دیتے تھے۔

شیرانی نے تحقیق و تنقید کی آمیزش سے جو نسخہ سخن فہمی اور تعیّنِ زمانی کا ترتیب دیا اُس نے مردجہ مفروضہ کو منسوخ کر دیا۔ انھوں نے ان دونوں مثنویوں کے مابین کم سے کم نصف صدی

کا فاصلہ قائم کیا اور اُس کے زمانۂ تالیف کو سلجوقی دور اور اوّل قرن ششم ہجری قرار دیا فرماتے ہیں:[۵]

"ان دونوں مثنویوں کو پڑھنے کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ "شاہنامہ" اور "یوسف زلیخا" کے زبان و بیان میں بیّن فرق موجود ہے اور یہ دونوں ایک ہی عصر اور ایک ہی شاعر کی مثنویاں نہیں ہوسکتیں ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں کو دو مختلف العصر اور مختلف الوطن شاعروں کی تالیف کہیں۔"

اس تحقیق زمانی کے لئے انھوں نے زیادہ تر دونوں کے لسانی تفاوت کو نظر میں رکھا ہے، جس کی تفصیل اس سے قبل بیان ہو چکی ہے، مثلاً وہ الفاظ جو مخصوص ہیں سلجوقی دور سے اور شاہنامہ میں مفقود مگر یوسف زلیخا میں موجود ہیں، یا وہ نئے تراکیب و اصلاحات جو زبان کے ارتقا کے ساتھ یوسف زلیخا میں یعنی کسی دوسری نوعیت کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اس کے علاوہ شیرانی نے تقابلی مثالوں کے ذریعہ یہ بات ثابت کی ہے کہ یوسف زلیخا کی زبان مؤخر تر معلوم ہوتی ہے بہ سبب آرائش پیرایہ کے؛ اور اس میں شاہنامہ کی زبان سے زیادہ چمک دمک اور تراش خراش، جس کو انگریزی میں ہم FINESSE اور POLISH سے تعبیر کرسکتے ہیں، نظر آتی ہے جو دلالت ہے اس بات کی کہ فارسی زبان اُس وقت ارتقا کی اعلیٰ ترمنزل پر پہنچ چکی تھی۔ شیرانی کہتے ہیں کہ یوسف زلیخا کی زبان اور بیان ہمہ گیر تر اور اُس کا لسانی محیط کشادہ تر معلوم ہوتا ہے۔

ان داخلی اور لسانی شواہد کے ماورا شیرانی ایک خارجی شاہد بھی لاتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں کہ اگر یہ مثنوی فردوسی کی تھی تو گویا عہد غزنوی میں مکمل ہو چکی تھی۔ پھر کیا سبب ہے کہ نویں صدی یعنی ظفرنامۂ شرف الدین یزدی سے قبل اس کا ذکر کسی نے نہ کیا، اور متقدمین نے اس کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔

فکری

جدید یورپین اور مشرقی ناقدین کی نظر میں ایک شاعر یا نویسندہ کا فکری پہلو ہی اس کا جالب ترین اور اہم ترین پہلو ہے کیونکہ فکری عناصر ہی کسی فن پارہ پر اُس کے خالق کی شخصیت کی مُہر ثبت کرتے ہیں۔ فرانسیسی ناقد شارل بالی کہتا ہے: "فکر خود شاعر ہے۔"

ر وفیسر شیرانی بھی اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہیں اُن کا عقیدہ ہے :

ہر کجا اُفتادہ بینی خشت در ویرانہ ای
ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ ای

رماتے ہیں[۹] :

"اگر ایک صاحب بصیرت ایک خشت میں صاحب خانہ کا احوال پڑھ لیتا ہے تو پھر کتاب بھی نویسندہ کے افکار و معلومات، گفتار و پندار کی تجلی گاہ ہو سکتی ہے اور ہم اس کتاب کے غائر مطالعہ سے اُس کے لکھنے والے کی وضع زندگی طرز فکر اور انداز بیان سے آشنائی حاصل کر سکتے ہیں کہ اُس کا ہر ہر فقرہ ہر ہر لفظ اُس کے نویسندہ کے مافی الضمیر کا آئینہ دار ہوتا ہے جس طرح ایک باستان شناس ACRHAEOLOGIST ایک خرابے کو دیکھ کر اس کا زمانہ تعمیر اور اُس دور کی طرز رہائش کو بتا سکتا ہے ۔ اُسی طرح ناقد بھی دو الگ الگ کتابوں کو پڑھ کر اُن کے لکھنے والوں کی شخصیت کے فرق کا بخوبی ادراک کر سکتا ہے ۔"

لاریب، شاہنامہ کی ساٹھ ستر ہزار ابیات پڑھ کر ایک حساس خواندہ کے ذہن میں بہر طور ں عظیم حماسہ سرا کا ایک ہیولیٰ قائم ہوتا ہے ۔ اس کی فکر، اُس کا فلسفۂ حیات، واقعات و حادثات اُس کا ردِ عمل، اُس کی پسند و ناپسند، اُس کا مخصوص اندازِ تعقل ۔ مختصر یہ کہ ایک ہوشمند ناقد ے لئے یہ مثنوی نہ صرف ایران باستان کی تہذیب و معاشرت اور تاریخ کا آئینہ ہے ، بلکہ اس ے ابیات میں وہ طوس کے اس بزرگ منش شاعر کے نہاں خانہ دل کے اسرار کی بازیابی بھی کر لیتا ہے

شیرانی نے شاہنامہ اور یوسف زلیخا کے مقایسہ کا ایک اہم معیار ان دونوں شاعروں ی شخصیت اور فکر کے اسی فرق کو بتایا ہے اور یہاں بھی اُن کے استدلال کا تمام تر دار و مدار داخلی واہد ہی پر ہے ۔ مثلاً : اُن کی عقل اس بات کو قرین قیاس نہیں جانتی کہ وہ شاعر جس نے زندگی ے ۳۰، ۳۵ سال ایک شاہکار کی تخلیق میں صرف کر دیے ہوں، اپنے مَوقف کو یک لخت اور یکسر ل کر اپنی اُس جان کاہ کاوش کو "آئین دیوانگاں" سے تعبیر کرے گا اور شاہنامہ نویسی کو راہ وارثہ

(اُلٹی راہ) پر چلنے کے مماثل جانے گا اور گویا تائب ہو کر پیغمبروں کے احوال نظم کرنے میں نجات سمجھے گا!

یوسف زلیخا:۔
کنون چاره ای بایدم ساختن
دل از کار گیتی بپرداختن
گرفتن یکی راه فرزانگان
نرفتن به آئین دیوانگان
سراز راه داژونه برتافتم
که گم شد زمن عمر وغم یافتم
ز پیغمبران گفت باید سخن
که جز راستی شان نبد بیخ و بن ۔ (ص ۱۴)

کیا یہ وہ شاعر ہو سکتا ہے، جس نے شاہنامہ کہنے پر یوں فخر کیا ہو:

یکی بندگی کردم ای شهریار — که ماند زمن در جهان یادگار
بناهای آباد گردد خراب — زباران واز تابش آفتاب
بنا کردم از نظم کاخ بلند — که از باد و باران نیابد گزند

(شاہنامہ ج ۲، ص ۲۴۵)

مزید کہتا ہے:
بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زنده کردم بدیں پارسی ۔ خاتمہ شاہنامہ (خطی ۷۵۲ ق)

شاہنامہ میں فردوسی مدعی ہے کہ اساطیر عجم کو دروغ وافسانہ نہ سمجھا جائے اگر یہ قرین عقل نہ بھی ہوں تو بھی بڑے رمز وایما کے سمبل ہیں:

تو ایں را دروغ وفسانہ مدان
به یکساں روش در زمانہ مدان
ازو ہرچہ اندر خورد با خرد
دگر بر رہ رمز و معنیٰ برد — شاہنامہ ج ص

لیکن یہی فردوسی یوسف زلیخا میں گویا کلّی طور پر بدل جاتا ہے اور کہتا ہے:

یوسف زلیخا: کہ آن داستانہا دروغست پاک

دو صد شان نیرزد بہ یک مشت خاک (ص ۱۵)

وہ "جہاں پہلواں" جس کی تخلیق پر اُس کے خالق کو ناز ہے :

جہاں آفریں تا جہاں آفریں

سواری چو رستم نیامد پدید شاہنامہ ج ص

یوسف زلیخا میں اس طرح تیر ملامت کا نشانہ بنایا جاتا ہے :

بریں می سزد گر بخندد خرد زمن خود کجا می پسندد خرد

کہ یک نیمہ از عمر خود گم کنم جہانی پر از نام رستم کنم

دلم سیر گشت و گرفتم ملال ہم از گیو و طوس وہم از پور زال (ص ۱۴)

دونوں شاعروں کی دیدگاہ اور انداز فکر کا شدید فرق بلکہ تضاد شیرانی کو اس قدر بعید العقل اور غیر فطری معلوم ہوا کہ وہ بے ساختہ کہہ اُٹھے :

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

واقعاً شخصیات کا یہ فرق اس قدر نمایاں اور ایسا حیران کن ہے کہ اگر دور جدید کے روان شناس PSYCHIATRIST سے کہا جائے کہ یہ دونوں تحریریں ایک ہی شخص کی ہیں تو وہ یقیناً اُن کے نویسندہ کو "دوہری شخصیت" کا شکار کہہ دے گا !

یہ تھے وہ تین اُصول ارزشی جن کا التزام شیرانی نے "یوسف زلیخا" میں شواہد داخلی کی بنا پر کیا۔ ایک نکتۂ اہم کی طرف توجہ دلوائے بغیر یہ بحث ادھوری ہوگی : ان داخلی شواہد سے خاطر خواہ اور بھرپور استفادہ کرنے میں جو چیز اُن کی سب سے زیادہ ممد ہوئی وہ اُن کی بے پناہ قوت آخذہ POWER OF DEDUCTION اور منطقی طرز استدلال کی زبردست صلاحیت تھی ۔ ان دو غیر معمولی صفات نے اُن کے افکار و دلائل، علم و معلومات کی ایسی مستحکم اور منضبط شیرازہ بندی کی کہ اُن کے نظریات ادبی ایک زنجیر منطقی SYLLOGISM کی طرح منظم ہو گئے جس طرح وہ داخلی شواہد سے حقائق ادبی کا استخراج و استنباط کرتے ہیں وہ

نقد و تحقیق کی حد سے گذر کر منطق کے صغریٰ، کبریٰ اور نتیجہ اور دو اور دو چار جیسی قطعیت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ شیرانی کے انداز تنقید و تحقیق میں یہ انقطاعیت اور ضبط و تسلسل، ان کی اسی طرز استدلال کی وجہ سے ہی پیدا ہوا ہے۔

اس سے پیشتر کہ بحث پایان کو پہنچے، چند ایسے پہلوؤں کی طرف مختصراً اشارہ کرنا چاہتی ہوں، جن کو شیرانی نے اس مقایسہ میں حدود ارزیابی قرار نہ دیا۔ میرے فہم ناقص میں یہ وہ پہلو ہیں جو دونوں نامبردہ مثنویوں کے تفاوت کو مزید وضاحت کے ساتھ مشخص کرتے ہیں لہٰذا اس موازنہ میں اُن کو مورد بحث بنانا ضرور تھا۔ ذیل میں فقط چند کا نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر کا تعلق طرز فکر سے ہے:

(۱) داستان میں ذاتی عقائد و نظریات بیان کرنے کی بڑی گنجائش اور بہت میدان ہوتا ہے۔ چنانچہ فردوسی نے اس سے پورا فائدہ اُٹھایا اور بے شمار اخلاقی، سماجی اور دیگر موضوعات کے بارے میں قدم قدم پر اپنی رائے کا اظہار مستقیم یا غیر مستقیم طریقے سے کیا۔ شاہنامہ اس کا شاہد ہے۔

صاحب یوسف زلیخا اس سلسلہ میں بڑا محتاط نظر آتا ہے۔ ساڑھے تین ہزار ابیات سے زیادہ کی مثنوی میں بمشکل معدودی چند مقامات ہی پر وہ کسی مسئلۂ اخلاقی یا انسانی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

(۲) فردوسی کی دانش دوستی شاہنامہ کے سر کا تاج ہے:

خرد رہنمای و خرد دل کشای — خرد دست گیرد بہ ہر دو سرای
خرد افسر شہریاران بود — خرد زیور نامداران بود
کسی کو خرد را ندارد ز پیش — دلش گردد از کردۂ خویش ریش

اور اُس کی معروف بیت جو ضرب المثل بن چکی ہے اور شاہنامہ کا سرنامہ ہے:[۱]

بنام خداوند جان و خرد — کزین برتر اندیشہ برنگذرد

(منتخب شاہنامہ، ص ۱)

اس طرح کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ابیات میں فردوسی نے "خرد" کی ستائش کی ہے۔

برعکس اس کے یوسف زلیخا میں فقط آغاز مثنوی میں چند ابیات (غالباً شاہنامہ کی پیروی میں) "خرد" کی تعریف میں نظر آتی ہیں۔

(۳) کردار نگاری: یہ مخصوص وصف شاہنامہ کی جان ہے۔ اس عظیم داستان سرا نے ایسے جیتے جاگتے کردار تخلیق کئے جو آج بھی ہمارے ذہنوں پر نقش ہیں اور فردوسی کے جہان تخئیل کے نہیں، دنیای اصلی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں: فریدون، کیکاؤس، کیخسرو، رستم و سہراب، بیژن و منیژہ، پیران ویسہ، رودابہ، افراسیاب، سیاووش، ایرج:۔ اور بلامبالغہ سینکڑوں دوسرے کردار ہیں جو اپنی صفات مخصوص کی بنا پر ایک دوسرے سے ممتاز و متمایز ہیں۔

صاحب یوسف زلیخا پوری مثنوی میں صرف چند کردار سے ہم کو متعارف کرداتا ہے اور اُن کرداروں میں بھی کوئی جان نظر نہیں آتی۔

(۴) بشر دوستی:۔ یہ وہ جذبہ ہے جو شاہنامہ کی روح ہے۔ ایران کے مفاخر ملی پر ناز کرنے والا یہ شاعر انسان دوستی کے پاک اور آفاقی تصوّر کو ہر ہر موقع پر سراہتا ہے اور خوانندہ کو بنی نوع انسان کی بہتری اور بہبودی کے لئے ہمیشہ ساعی اور کوشاں رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

می لعل خور خون دل ہا مریز — تو خاکی چو آتش مشو تند و تیز
می لعل گون خوشتر است ای سلیم — زخونابہ اندرون یتیم

(ج ۱، ص ۲۳۴)

اور وہ مشہور بیت جس کو ایران کے دوسرے انسان دوست شاعر سعدی شیرازی نے یوں تضمین کر دیا:

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد — کہ رحمت برآن تربت پاک باد
"میازار موری کہ دانہ کش است — کہ جان دارد و جان شیرین خوش است"

"یوسف زلیخا" میں انسان دوستی کا کوئی واضح تصوّر نہیں ملتا۔

کیا اچھا ہوتا کہ پروفیسر شیرانی دونوں مثنویوں کے ان مابہ الامتیاز مضامین کو بھی

مورد مقایسہ قرار دیتے تاکہ ہم اُن کی ژرف نگاہی اور دوربینی کے مزید کرشمے دیکھ سکتے اور بہت سے سخن ہای گفتنی ناگفتہ نہ رہ جاتے۔

آخر میں: غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شیرانی کی تحقیق آج کل کے ناقدین کے لئے مشعل راہ ہے۔ اگر ہم اُن کے مقالات کو نقد ادبی کی کتب نصاب کا مقام دیں، ان کو "اُردو میں تحقیق کا پہلا معلم" قرار دیں تو بجا ہوگا۔

حواشی :-

۱ سبک شناسی، چاپ تہران، جلد ۱، ص ۱، مقدمۂ مصنف، "ید")

۲ چہار مقالہ بر فردوسی و شاہنامہ، چاپ و ترجمۂ عبدالحی حبیبی، افغانستان، ص ۸۹، ۱۸۸)

۳ یوسف زلیخای حکیم فردوسی، طبع مصور ایران، دار الطباعہ خاصۂ مدرسۂ مبارکۂ دار الفنون تہران۔ ۱۲۹۹ھ۔ق

۴ شاہنامۂ فردوسی، طبع مرزا محمد باقر، بمبئی، ۱۲۷۵ھ۔ق

۵ حماسہ سرائی، چاپ تہران، ۱۹۴۵ء، ص ۱۷۵ :
" امّا از سبک کلام و سُستی بسیاری از ابیات و استعمالِ اصطلاحات و کلمات و ترکیباتی کہ بسیاری از آنہا دور از سبک کلام فارسی در عہد سلطانی و اوائل عہد غزنوی است، چنیں برمی آید کہ گوینده ایں منظومہ فردوسی نیست"

۶ انڈو ایرانیکا، ج ۷، نمبر ۴، دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۶)

۷ اُردو، مجلّہ انجمن ترقی اُردو، پاکستان، جلد ۵۶، شمارہ ۴، ص ۶۱

۸ چار مقالہ بر فردوسی و شاہنامہ، ص ۲۵۱۔

۹ " " " " ص ۹، ۱۹۶

۱۰ منتخب شاہنامہ، باہتمام محمد علی فروغی، چاپ تہران

۱۱ کُلیات سعدی، باہتمام عباس اقبال، چاپ تہران، ص ۲۷۸

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

محمود شیرانی کا اسلوبِ نگارش

ادب اور اسلوب کا باہمی رشتہ اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ اس کی کوئی سادہ تعریف پیش کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ کارلائل نے تحریر اور اسلوب کے مابین جسم اور جلد کا تعلق بتایا ہے لیکن جلد کا تعلق جسم کی سطح سے ہے اور اسلوب کا واسطہ محض زبان و بیان ہی سے نہیں افکار و خیالات سے بھی ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر چونکہ افکار و خیالات کا اظہار کرنے والا انسان ہوتا ہے اس لیے اسلوب کا رشتہ مصنف کی شخصیت سے بھی استوار ہو جاتا ہے۔ مزید برآں اسلوب کے فنی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلوب کی مثال ایک منشور (PRISM) کی سی ہے کہ جب اس پر روشنی کی کرن پڑتی ہے تو سات رنگ منعکس ہوتے ہیں لیکن ان رنگوں کی الگ الگ کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی بلکہ ایک کل کے اجزا ہوتے ہیں اور اسلوب کی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تعریف کرنے والے نقادوں کا اختلاف مولانا روم کے اس شعر کا آئینہ دار ہوتا ہے:

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد　　　موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ اسلوب کوئی ایسی چیز نہیں جسے پہلے سے مقرر کر کے تحریر کا آغاز کیا جا سکے۔

یہ تو تحریر کا بے ساختہ پن ہوتا ہے جو مصنّف کی شخصیت، اس کے افکار اور اس کی زبان و بیان میں اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے جس طرح پھول میں خوشبو یا تلوار میں جوہر۔ اگر مصنف اپنے اسلوب کو شعوری طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کی تحریر میں تصنّع اور آورد کا عنصر پیدا ہو جائے گا جس سے خود اسلوب کا وجود ہی معرضِ خطر میں پڑ سکتا ہے۔ بقول سیموئل ٹیلر "میں نے اپنے اسلوب کے متعلق ذرا بھی تردّد نہیں کیا۔ یہ کبھی نہیں سوچا کہ میرا کوئی اسلوب ہے یا نہیں۔ مجھے تو اس بات سے غرض رہی ہے کہ رواں سلیس عبارت میں صاف اور کھری بات کہہ دوں میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب مصنّف شعوری طور پر اسلوب کے کوائف مدّ نظر رکھتا ہے تو کیا اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خود اسے بھی نقصان ہوگا اور پڑھنے والوں کو بھی" (۱)

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب کسی شخص کے جذبات و افکار کا، زبان کے واسطے سے، مخصوص انداز میں بے ساختہ اظہار کا نام ہے۔ بلا شبہ افکار کا کماحقہ ابلاغ اچھے اسلوب کی بنیادی صفت ہے تاہم اس میں انفرادیت کا عنصر بھی بڑا ضروری ہے کیونکہ یہی عنصر کسی مصنف کو صاحب اسلوب بناتا ہے۔ مرّے کا کہنا ہے کہ:

"A STYLE MUST BE INDIVIDUAL BECAUSE IT IS THE EXPRESSION OF AN INDIVIDUAL MODE OF FEELING"

اردو زبان میں وجہی کی "سب رس" سے لے کر حسین عطا خاں تحسین کی "نوطرزِ مرصّع" تک نثر رنگین کا دور دورہ رہا۔ آخر ضرورت کے تحت ہمارے ہاں سادہ زبان رائج کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کے اخلاف و معتقدین نے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر سادہ نویسی اختیار کی۔ سلیس اردو نثر انگریز حاکموں کی انتظامی اور سیاسی ضرورت بھی تھی چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اس طرف متوجّہ ہوئے۔ تاہم اردو میں علمی نثر کو روشناس کرانے کا قابلِ قدر کارنامہ سرسیّد نے انجام دیا اور ان کے اہل قافلہ نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ سرسیّد کی زندگی کا عملی پہلو فکری پہلو پر غالب رہا۔ اس سبب سے ان کی تحریروں میں کاروباری یا صحافتی انداز بیان در آتا ہے۔ اس کے علاوہ ماضی میں رائج لطافت بیان کے ردِّ عمل میں وہ کچھ زیادہ ہی متشدّد ہو گئے۔ لہٰذا ان کی سادگی بسا اوقات بے رنگی تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی کمزوری

نے سرسیّد کی نگارشات کو کلاسیکی ادب کے بلند درجے تک نہ پہنچنے دیا۔ اردو زبان ہند اسلامی تہذیب کے صدیوں کے رچاؤ کا نتیجہ تھی۔ سرسیّد کی زبان اینگلو انڈو اسلامک کلچر کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اس نئے دھارے کو پرانے دریا میں ملنے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ بہر حال سرسیّد کی نثر اردو کے جدید اسالیب بیان کا نقطۂ آغاز ہے۔ علمی تحقیق و تنقید کے اسلوب کو مدّ نظر رکھتے ہوئے سرسیّد کے فوراً بعد آنے والوں میں آزاد، شبلی اور حالی ارکانِ ثلاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آزاد کی نثر کی سحر کاری اور دلربائی نے ان کے اسلوب کو تحقیق کے کام کا نہیں چھوڑا۔ سرسیّد کی علمی نثر کا کھردراپن آزاد کی لطافت مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا اس لیے مولانا کے ہاں سرسیّد کے اسلوب کا ردّ عمل دیکھنے میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے گویا انھوں نے گھڑی کی سوئیوں کو الٹا پھرانے کی کوشش کی ہے۔

مولانا شبلی کے اسلوب میں چستی گھلاوٹ اور بے ساختہ پن ہے۔ ان کے ہاں سرسیّد کی درشتی مفقود ہے اور رنگین بیانی آزاد سے کم۔ ان کی طبیعت بھی آزاد کے مقابلے میں تحقیق سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی لیکن ان کے مزاج میں رومانوی عنصر غالب تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو یہ لکھنا پڑا کہ شبلی کا "اسلوب بیان ہی حقیقت نگار مؤرخ کا اسلوب نہیں کیونکہ جو شخص اپنے بیانات کی بنیاد ہی مبالغے پر رکھتا ہو اس کی عبارتوں میں تاریخی سچائی ایک ستم رسیدہ قیدی کی طرح سر پٹیتی دکھائی دیتی ہے۔" (۲)

مولانا حالی کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص ہے جو ان کی تحریروں کو پایداری عطا کرتا ہے۔ انھوں نے سادگی اور صفائی کو ہر جذبے پر ترجیح دی اور سرسیّد کی کرخت سادگی سے دامن چھڑا کر انداز تحریر کو زیادہ رواں، متوازن اور ادبی نکھار کا حامل بنا دیا ہے۔ ان خوبیوں کے باوصف حالی کا اسلوب علمی خیالات کے اظہار کے لیے مثالی اسلوب نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی نثر کے پھیکے پن اور یکسانیت سے قاری بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ مولانا اپنی تحریروں پر اپنے جذبات کا عکس نہیں پڑنے دیتے جس سے ان کی نثر کسی مشینی انسان ROBOT کی نثر معلوم ہوتی ہے۔ ان کی ایک اور عادت جو قارئین کو کھٹکتی ہے غیر ضروری انگریزی الفاظ کا

استعمال ہے۔ وہ "سلف ہلپ، فارن گورنمنٹ اور ہیریڈیٹری جینئیس جیسے ناموس الفاظ اپنی اردو عبارت میں داخل کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ موتیوں میں خزف ریزے ملا رہے ہیں" (۴) پھر مولانا حالی کی طبعی شرافت، خوش خلقی اور وضع داری کا اثر بھی ان کے اسلوب میں نمایاں ہے "ادبی مسائل میں جہاں کہیں بھی دو بزرگوں میں اختلاف کا موقع آیا، حالی اپنا اعتدال کا ترازو لے کر آگئے۔ حالی کی دُکانداری کا یہ انداز ان کی صلح جو طبیعت کا ترجمان اور ان کی شخصیت پرستی کا آئینہ دار ہے" (۵)

مولانا حالی سے بعد کی پشت میں علمی اسلوب کے اعتبار سے جو دو شخصیتیں نمایاں نظر آتی ہیں وہ مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی ہیں۔ یہ دونوں حالی سے بہت متاثر تھے چنانچہ ان کے اسالیب پر بھی مولانا کی چھاپ نظر آتی ہے۔ قابل اطمینان بات یہ ہے کہ دونوں کے ہاں اپنے پیش رو کے مقابلے میں بہتری کے آثار نمایاں ہیں۔ مولوی عبدالحق کے ہاں سرسیّد اور حالی دونوں کے اسالیب کی خوبیاں موجود ہیں۔ انھوں نے حالؔی کی یکسانیت کی جگہ سرسید کا لہجۂ خطابت اپنایا ہے چنانچہ ان کے ہاں ضرورت کے مطابق اتار چڑھاؤ بڑی حد تک موجود ہے ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی الفاظ و تراکیب کا بے جا استعمال، جو سرسیّد اور حالی دونوں کے ہاں ملتا ہے، روا نہیں رکھا۔ عبدالحق کی نثر یقیناً، حالی سے ایک قدم آگے کی چیز ہے لیکن اس میں ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ یہ کمی پوری کرنے کے لیے ایک قدم مولانا شبلی کی لطافت بیان کی طرف اٹھانا بھی ضروری تھا۔ شیرانی کا اسلوب نگارش اسی کمی کو پورا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پہلو پر ابھی تک کماحقہٗ کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے میدانوں کی طرح یہاں بھی وہ پورب اور پچھم کے مابین عصبیتی کشمکش کا شکار ہو گئے:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

شیرانی صاحب کے بارے میں جو مضامین و مقالات لکھے گئے ہیں ان میں موصوف کے انداز نگارش کے بارے میں محض چند اشارے ملتے ہیں مثلاً پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کہتے ہیں:

'ان کا وطن اگرچہ ٹونک تھا لیکن لکھنے اور بولنے میں ان کی اردو وہ تھی جس کو اردوے معلیٰ

کہا جاتا ہے۔ ان کا تلفظ اور محاورہ بالکل اہلِ دہلی کا سا تھا۔ زبان اُردو پر انھیں بے انتہا قدرت حاصل تھی۔" (۶)

یہاں صرف زبان کے معیار کا ذکر ہے۔ شیرانی کے اسلوب کی بابت ڈاکٹر مولوی محمد شفیع لکھتے ہیں:

"شیرانی صاحب کا اسلوب تحریر سادہ اور آرائش سے خالی مگر نہایت پختہ ہے۔ ان کا استدلال قوی اور مسکت ہے۔ وہ مسئلہ زیرِ بحث کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر قاری کے دخل ہائے مقدر کو ہر طرح سے رفع کرنے کی سعی کرتے ہیں اور مضمون کا ہر طرف سے احاطہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اعتراض کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ ان کا بیان متین ہوتا ہے لیکن اگر ہنسانا ممکن ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتے۔" (۷)

ان چند سطور میں ڈاکٹر شفیع نے شیرانی کے اسلوب کو متعارف کرانے میں بڑی بلاغت سے کام لیتے ہوئے لسانی، فکری اور نفسیاتی تینوں پہلوؤں پر نظر رکھی ہے۔

شیرانی صاحب کی نگارشات میں شگفتگی کے عنصر کا پروفیسر عابد علی عابد نے خصوصی نوٹس لیا ہے۔ ان کا بیان ہے:

"شیرانی بڑی شگفتہ نثر لکھتے تھے بشرطیکہ مضمون ہی ایسا نہ ہو کہ شگفتگی کی تاب نہ لائے۔ فردوسی پر چار مقالے، اور 'تنقید شعر العجم' میں ان کے اندازِ نگارش کی شگفتگی کی اتنی ہی مثالیں ہیں جتنے ان کتابوں کے صفحات۔" (۸)

شیرانی صاحب کے تحقیقی و تنقیدی مضامین نے اردو زبان و ادب کے سرمایے میں جو گراں بہا اضافہ کیا ہے اس کا اعتراف بڑی حد تک کیا جاتا رہا ہے تاہم اس حقیقت کی طرف کسی کا ذہن منعطف نہیں ہوا کہ ان کا اسلوب تحقیقی اور تنقیدی نگارشات کے لئے موزوں ترین نمونہ فراہم کرتا ہے۔ ان کی زبان معیاری ہے، بیان میں کوئی ابہام نہیں، سلاست نفاست شستگی قطعیت اور لطافت ان کے اسلوب کی مستقل خوبیاں ہیں۔ وہ لفاظی، رنگین بیانی اور عبارت آرائی کا سہارا کبھی نہیں لیتے تاہم بڑی وضاحت اور شگفتگی کے ساتھ اپنے افکار و خیالات بڑے مدلل اور متوازن انداز میں پیش کرتے ہیں بلکہ قاری کے ذہن میں اپنا مطمع نظر نقش کر دیتے

ہیں۔ان کے دل ودماغ میں تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ ذہن کی سوچ میں جذبۂ قلب بھی شامل رہتا ہے۔سرآرتھر کوچ نے اچھے اسلوب کے لئے

"THINKING WITH THE HEART AS WELL AS WITH THE HEAD" (۹)

کی جو شرط عائد کی ہے وہ شیرانی صاحب کی تحریروں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آزاد اور شبلی کی شاعرانہ طرز ادا علمی نثر کے لئے بالکل نامناسب ہے لیکن حالی اور عبدالحق کی خشک سادگی بھی اس مطلب کے لئے زیادہ موزوں نہیں۔تحقیق بذات خود بڑا خشک موضوع ہے۔اس کے نتائج تحریر کرنے میں اگر تھوڑی سی لطافت اور شگفتگی نہ ہو تو اس کا پڑھنا اور اس سے مستفید ہونا قاری کے لئے دوبھر ہو جاتا ہے۔تحقیقی نثر کا یہ تقاضہ شیرانی کے ہاں بطریق احسن پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ادبی اور تاریخی تحقیق کے مسائل جس کامیاب طریقے سے اور شاندار اسلوب میں انھوں نے پیش کئے ہیں بلاشبہ اردو زبان میں اسے مثالی حیثیت حاصل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علمی اور تحقیقی نثر کا منشا قاری کو لطف اندوز کرنا کبھی نہیں ہوتا۔اس کا بنیادی مقصد معلومات میں اضافہ اور علم کی نشر و اشاعت ہوتا ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ علمی تحریروں کے لئے پھیکا، سست اور بے مزہ ہونا ضروری ہے۔ایک تکنیکی مقالہ بھی پڑھنے میں مسرت بخش ہو سکتا ہے اور غیر متخصص شخص بھی اس سے حظ اٹھا سکتا ہے۔شرط بس یہ ہے کہ اس کے حقیقی مقصد پر حرف نہ آئے۔قعر دریا میں تختہ بند ہو کر دامن تر نہ ہونے دینا ساحری سے کم نہیں۔

تحقیقی نثر کی جملہ خوبیاں شیرانی صاحب کے ہاں موجود ہیں۔وہ آسان اور سادہ زبان لکھتے ہیں۔ان کے ہاں لفاظی اور فضل فروشی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔تاریخ و تحقیق بڑے وسیع موضوعات ہیں جن میں متعدد علمی و فنی اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے۔شیرانی صاحب عام فہم الفاظ و تراکیب سے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔مبالغے، رنگ آمیزی اور عبارت آرائی کا ان کے ہاں گزر نہیں پھر بھی ان کی تحریر پھیکی اور بے مزہ نہیں ہوتی۔اس کا بڑا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ علمی موضوعات پر کسی جبر یا لالچ کے تحت قلم نہیں اٹھاتے بلکہ یہ خود ان کی دلچسپی کی چیز ہوتی

ہے۔ خشک علمی حقائق پر بحث، ان کے قلم سے نکلتے ہوئے، فنی تکمیل کے مرحلے سے گزرتی معلوم ہوتی ہے۔ علمی اسلوب کی بنیادی صفت، جزرسی ان کی تحریروں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ہر فقرہ نپا تُلا اور دلیل مسکت ہوتی ہے۔ زبان نہایت واضح اور قطعیت کی حامل ہے۔ قلم پر اُن کا یہ عبور دراصل موضوع پر ان کے عبور اور رمز اولت کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ وہ قاری کو اپنا مطمع نظر نہ صرف پوری طرح سمجھا دیتے ہیں بلکہ اسے متفق بنا کر ہی دم لیتے ہیں۔ اس بارے میں وہ کسی ریاکاری، حاشیہ آرائی یا منطقی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیتے بلکہ بے کم و کاست وہ ساری رام کہانی قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں جو زیرِ نظر موضوع پر تحقیق و جستجو کے دوران میں ان پر گزری ہوتی ہے اور ساتھ ہی اپنے مستخرجہ نتائج بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریروں میں خلوص کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اور قاری کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ جاری و ساری نظر آتا ہے۔ یہ ان کے اسلوب کا کمال ہے کہ بظاہر خشک موضوعات پر ان کے مضامین و مقالات سے بڑے سے بڑا عالم اور ایک عام سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص یکساں مستفید اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

تحقیقی نثر کی سب سے بڑی خامی اس کی غیر واضحیت اور دھندلا پن ہے۔ اس کے دو بڑے اسباب ہیں۔ یا تو مصنّف نے خود اپنے موضوع کو ہضم نہیں کیا ہوتا یا اس کی زبان اس کے خیالات کی ادائگی سے قاصر رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف تحریر سے مصنّف کا مقصد واضح نہیں ہو پاتا بلکہ اس میں حشویات راہ پا جاتی ہیں اور یہ ناگوار، خشک اور اکتا دینے والی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قاری بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے اور تحریر سے مستفید ہونا تو درکنار اسے پوری طرح پڑھ بھی نہیں سکتا۔ شیرانی کا اسلوب ان خامیوں سے یکسر پاک ہے۔ موضوع کیسا ہی علمی اور تکنیکی کیوں نہ ہو، ان کا انداز بیان ایسا غیر مبہم، نکھرا ہوا اور دلچسپ ہوتا ہے کہ ایک بار شروع کرنے کے بعد اسے ادھورا چھوڑنا ممکن نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو کے خالص علمی اسلوب میں دلچسپی اور شگفتگی کی اس نئی جہت کا اضافہ شیرانی صاحب کی دین ہے۔ ان کی متانت بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگوار اور لطافت کی حامل ہے تاہم اس لطافت میں تصنّع کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ یقینی بات ہے کہ تحقیقی نثر صناعی

کی شعوری کوششوں کو نہیں سہار سکتی۔ اس اعتبار سے شیرانی کا اسلوب ساختہ و پرداختہ نہیں۔ بلکہ فطری اور بے ساختہ ہے۔ وہ اپنے مقالات میں قارئین سے گفتگو کرتے اور انھیں اپنا ہم راز بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر موضوع کی دقت کے باعث قاری ذرا بھی اکتاتا نظر آئے تو ایسے موقعوں پر وہ ہنسنے ہنسانے سے بھی نہیں چوکتے۔ انھوں نے ایک مقام پر انوری کی اخلاقی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"جس طرح ڈاکٹر کڑوی گولیوں کو شکر میں ملفوف کر کے ہمیں آسانی سے کھلا دیتا ہے۔ اسی طرح معالج اخلاق ان فرضی قصّوں کے ذریعے سے پند و موعظت کی تلخی کو قند و نبات بنا دیتا ہے۔" (۱۰)

میں سمجھتا ہوں کہ اسی طرح خود انھوں نے اپنی شگفتگی کی شیرینی سے تحقیق و تنقید کی تلخی کو قند و شکر بنا دیا ہے۔ ڈ وبری نے ایک کامیاب اسلوب کی جو تین ضروری صفات بیان کی ہیں" وہ شیرانی صاحب کے انداز نگارش میں بتمام و کمال پائی جاتی ہیں یعنی اپنے افکار سے وفاداری (یا بالفاظ دیگر دیانت داری کی مشکل صفت)، اظہار کی غرض سے صحیح اور مناسب الفاظ و تراکیب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اپنے اندازِ بیان کو روزمرّہ گفتگو کا رنگ دینا۔ ان تینوں خصوصیات کے مل کر یکجان ہونے سے اسلوب میں کمال فن پیدا ہوتا ہے۔ وقت کی قلّت کے پیشِ نظر میں یہاں شیرانی صاحب کے اسلوب کا مفصّل تجزیاتی جائزہ پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے لئے کثیر و طویل مثالیں ضروری ہیں۔ البتّہ ان کے اسلوب نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اردو زبان اس اعتبار سے انگریزی زبان کی مثیل ہے کہ اس کی عمر زیادہ نہیں۔ چنانچہ اظہار مطالب کے لئے جہاں انگریزی یونانی، لاطینی، وغیرہ زبانوں سے استعانت کرتی ہے، وہاں اردو عربی، فارسی اور دیسی زبانوں سے مستفید ہوتی ہے۔ شیرانی صاحب عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ و اصطلاحات سے استمداد جائز بلکہ ضروری خیال کرتے ہیں بشرطیکہ وہ ادق یا غریب نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں دیسی الفاظ و محاورات کے خلاف کسی قسم کا تعصّب نہیں پایا جاتا البتہ وہ اپنی تحریروں میں بغیر اشد ضرورت کے انگریزی الفاظ داخل کرنا نامناسب

سمجھتے ہیں۔اس بارے میں وہ کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے مقالات کی کئی جلدیں کھنگا لنے کے بعد میں انگریزی کے جو الفاظ جمع کر سکا ہوں وہ یہ ہیں:

جنرل، کپتان، ڈاکٹر، پنشن، نمبر، ہیرو، ایڈیٹر اور ریفارمر

صفات کے استعمال میں شیرانی صاحب تفضیلی صیغوں سے دامن بچاتے ہیں کیونکہ اس سے مبالغہ آرائی کا گمان پیدا ہوتا ہے۔ استعارات وتشبیہات وہ استعمال کرتے ہیں تاہم یہ آرائشی نہیں وضاحتی ہوتے ہیں۔ یہی حالت تمثیلوں کی ہے۔ کہیں کہیں اقوال وضرب الامثال مصرعے اور اشعار بھی لائے ہیں لیکن بڑے باموقع اور بے ساختگی کے ساتھ۔ اکثر ایسا طنز کے طور پر ہوا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں طنز کا استعمال شعوری طور پر نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا استدلال بے عیب ہوتا ہے اس لئے جب وہ دوسروں کی تحقیقات میں "حماقت آمیز چالاکی" یا "چالاکی آمیز حماقت" کا دخل پاتے ہیں تو برداشت نہیں کر پاتے اور ایسا کوئی موقع آنے پر طنز کا خود کار آلہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

واقعات کے بیان میں شیرانی صاحب چھوٹے چھوٹے سادہ اور مفرد فقرے استعمال کرتے ہیں لیکن سنجیدہ بحث واستدلال میں ان کے جملے طویل اور مرکب ہو جاتے ہیں۔ نحوی ساخت کے اعتبار سے یہ جملے ایک سے زائد چھوٹے چھوٹے فقروں کا مجموعہ ہوتے ہیں جن میں ایک مرکزی فقرہ ہوتا ہے اور باقی اس کے توابعات۔ ترتیب کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ یعنی آزاد اور میعادی۔ پہلی قسم میں مرکزی فقرہ شروع میں آجاتا ہے جب کہ دوسری قسم میں مرکزی فقرہ آخر تک مکمل نہیں ہو پاتا جس کے باعث میعادی جملوں میں معانی آخر تک معلق رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان جملوں میں ایک طرح کی انتظار کی کیفیت یا تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور اس کی توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی۔ شیرانی صاحب اس ترکیب سے اکثر کام لیتے ہیں۔ میں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

"اس افسانے سے، جس کو ڈرامائی رنگ آمیزی کے ساتھ، مولانا نے اپنے پُر زور قلم سے حقیقت نما بنا دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک الٰہی بخش خاں بڑے بھائی اور احمد بخش خاں چھوٹے بھائی ہیں، حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔"

"خواب کے متعلق رائے زنی کرنا ایک ادبی نقاد کے منصب میں داخل نہیں کیونکہ اس کے موضوع واقعات ہیں نہ ظنیات، اس لئے راقم اس کی معما کشائی سے اعراض کر کے اسی گزارش پر اکتفا کرتا ہے کہ میں یہ قصہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔"

استدلال کی خاطر جو مرکب جملے ان کے ہاں آتے ہیں ان میں رموز واوقاف اور عاطفوں کا خصوصی طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب نے شیرانی صاحب کے اسلوب کی بابت ایک مقام پر لکھا ہے کہ "جہاں تک انگریزی اثر کا تعلق ہے، انگریزی طرز ادا اور انگریزی انداز پر جملوں کی ساخت شیرانی کی تحریروں میں جابجا دیکھی جاسکتی ہے۔" (۱۲) اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انگلستان کے "ماحول میں آٹھ سال سے اوپر گزارنے کے سبب وہ اکثر انگریزی میں سوچتے تھے۔" میں ان کے اس خیال سے متفق نہیں۔ شیرانی صاحب کے ہاں انگریزی انداز کے جملے ان مقامات پر ملتے ہیں جہاں وہ انگریزی تحریروں کے اقتباسات کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں اور ابلاغ تام کی خاطر لفظی ترجمے کا التزام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "تنقید پرتھی راج راسا" میں ان کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ دوسرا عمومی موقع وہ ہوتا ہے جب طویل استدلالی جملوں میں، علامات اوقاف کا خصوصی خیال رکھتے ہوئے، مطالب پر زور دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سے خواہ مخواہ انگریزی نحوی انداز جھلکتا ہے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ انگریزی میں سوچتے تھے عاجلانہ تعمیم ہے۔

شیرانی صاحب ایک کامل محقق تھے۔ وہ محض واقعات کی دریافت سے دوسرے محققین کو مواد مہیا کرنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ صرف ناقدانہ توضیح و تشریح میں الجھ کر بھی نہیں بیٹھ رہتے کیونکہ اس سے علمی مسائل پوری طرح حل نہیں ہوتے۔ ان کی تحقیق کا مدعا اُلجھے ہوئے ادبی اور تاریخی مسائل کو سلجھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں حقائق کے ادراک اور بے عیب استدلال کے پہلو بہ پہلو ایک منضبط تخیل کا عنصر بھی کارفرما ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ واقعات کے تسلسل کی درمیانی گم شدہ کڑیوں کی اس تخیل کی مدد سے بازیافت کر کے، معلومہ واقعات کو مربوط شکل دی جا سکے اور بحث کی روانی میں کوئی بدنما خلا واقع نہ ہو۔ یہ تخیل بسا اوقات ماہرانہ رائے پر مبنی ایک اشارے کی حیثیت رکھتا ہے جو صورت حال کے مجموعی تقاضوں پر پورا

اثر ے کی اہلیت (TOTAL RESPONSE TO TOTAL SITUATION) کا آئینہ دار ہونا
ہے۔ شیرانی کے اس قسم کے عالمانہ قیاسات مستقبل کے رہروان علم و تحقیق کے لئے قیمتی سرمایہ ہیں۔

شیرانی صاحب اپنے افکار کی علمی اور منطقی بنیادیں پہلے قائم کر لیتے ہیں۔ پھر عالمانہ تخیل سے ضروری امداد لے کر یہ تمام روداد سہل اور صریح انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح فکری اعتبار سے ان کے اسلوب میں کوئی شتر گربگی نہیں پائی جاتی۔ تعبیر کی اساس فکری پیمانوں پر ہونے کے باعث ان کا قاری نہ مایوس ہوتا ہے نہ جھنجھلاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے بڑی چابک دستی سے قارئین کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قارئین سے ان کا ربط و تعلق بڑا گہرا ہے اور ان کی سہولت کا اُن کو حد سے زیادہ احساس رہتا ہے۔ وہ قاری کو مہمان سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنائیت سے پیش آتے ہیں۔ تحکمانہ انداز کبھی اختیار نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک قارئین جاہلوں یا احمقوں کے ٹولے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان باتوں کا اندازہ ان کی تحریروں میں قدم قدم پر ملنے والے فقروں سے ہوتا ہے۔ یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"ہم ناظرین کی توجہ اس شعر کے وزن کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتے ہیں...."

"میں اپنے سامعین کی توجہ اس فقرے... اور اس کے معنوں کی طرف مبذول کرنے کا مستدعی ہوں"

"ان سطور سے... آپ حضرات اندازہ کر سکتے ہیں کہ....."

"ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ....."

"میں ناظرین سے استدعا کرتا ہوں کہ ان اشعار کے معنوں پر غور نہ کیا جائے"

جب شیرانی صاحب کسی دوسرے مصنف کے کام پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں تو وہاں بھی قارئین کی صحیح رہنمائی پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً:

"یہ بڑی بے اصولی کی بات ہے کہ ایک مصنف قارئین کے ساتھ اپنے فرائض پس پشت ڈال دے"

"اس سے ان کے قارئین غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ لاہور اس کا دارالحکومت ہوگا"

بہرطور اپنی تحریروں میں وہ قارئین کے حواس کو مستعد اور چوکنا رکھتے ہیں۔ اس طرح نتیجہ مصنف

کے حسب منشا نکلتا ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک دلچسپ طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے کسی دعوے کے اثبات میں مختلف مآخذ سے شہادتیں پیش کرتے وقت سب سے موخر ماخذ سے ابتدا کرتے ہیں اور پھر بتدریج قدیم اور مضبوط مآخذ کے حوالے دیتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال وہاں دیکھی جا سکتی ہے جہاں انھوں نے "معیار الاشعار" کو محقق طوسی کی تالیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح کسی مسئلے پر استدلال کے وقت معمولی اور بیّن یا افتادہ دلائل سے آغاز کرکے زیادہ ٹھوس اور مسکت دلائل کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس طرح ایک تو ہر دلیل اہم نظر آتی ہے کیونکہ وہ سابقہ دلائل سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے، دوسرے قاری کی توجہ میں کمی نہیں آنے پاتی۔ ان کے اس طریقے سے کام لینے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی میخ جڑتے وقت پہلے دو تین ہلکی ضربیں لگائی جاتی ہیں تاکہ کیل اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائے، پھر چند سخت ضربیں لگانے کے بعد آخر میں ایک زوردار چوٹ رسید کی جاتی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال "مظہر العجائب" کو شیخ عطّار کی تصنیف تسلیم نہ کرنے کے دلائل میں موجود ہے۔ اس طرح قاری کو چونکا کر ہم خیال بنانے کا یہ انداز شیرانی کا خاص ہتھیار ہے۔ اس کی افادیت پر ان کو اتنا اعتماد تھا کہ علمی محاربات کے موقعوں پر بھی اپنے ابتدائی مضامین میں وہ ہلکے پھلکے دلائل پر اکتفا کرتے تھے۔ جب ان کے مضمون پر کسی حلقے سے اعتراض ہوتا تو اگلے مضمون میں محفوظ رکھے ہوئے دلائل سے کام لے کر معترض کو خاموش کر دیتے تھے۔ ایسا عام طور پر عروضی بحثوں کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ تاہم انتہا یہ ہے کہ شعر العجم پر تنقید کرتے ہوئے بھی انھوں نے اس ترکیب سے کام لیا تھا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار کے نام ایک خط میں جو زندگی کے آخری دور میں لکھا گیا ہے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں نے اس خیال سے کہ تنقید پر اعتراضات ہوں گے اور بحث چھڑے گی، بعض جدید امور کے لئے اطلاع بغرض مدافعت محفوظ کر لی تھی۔ اب مجھے افسوس ہے کہ وہ ساری باتیں میرے ذہن سے نسیاً منسیا ہو گئی ہیں۔ اس کا مجھ کو سخت افسوس ہے۔" (۱۳)

ڈاکٹر تاثیر نے جب ان کو "پیچ دار بزرگ" لکھا تھا تو ان کے ذہن میں غالباً شیرانی صاحب کا یہی طریق کار تھا۔

اسلوب میں مصنّف کی انفرادیت کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ تو اس کی

شخصیت میں سے خود بخود پھوٹتی ہے۔ اس لئے اگر وہ اسے چھپانا بھی چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا
شیرانی صاحب کی شخصیت کا خلوص، سادگی اور صداقت ان کی تحریروں میں پوری طرح جلوہ گر
ہیں۔ وہ قارئین کو کسی قسم کی غلط امید نہیں دلاتے، غلط بیانی سے کام نہیں لیتے۔ اگر کوئی کتاب
نہیں دیکھی تو واضح الفاظ میں اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر خواجہ زکریا
لکھتے ہیں:

"شیرانی کی جس بات کا میں سب سے زیادہ قائل ہوں، یہ ہے کہ جس ماخذ تک ان کی
رسائی نہیں ہوتی وہ صاف طور پر لکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق میں تعلّی، فریب، دروغ گوئی
اور اس قبیل کی خرابیوں کو قطعاً روا نہیں رکھا۔ تحقیق کو تلاش، محنت اور صداقت کا مبدا ان
بنا دیا۔" (۱۴)

شیرانی صاحب کے ہاں حوالوں کے اندراج میں احتیاط اور اقتباسات کی درستی بھی
ان کی دیانت داری کا پرتو ہے۔ وہ جس ماخذ سے کام لیتے ہیں اس کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ جس
معاصر تالیف سے استفادہ کرتے ہیں اس کا تذکرہ لازمی کرتے ہیں۔ تحقیق کے کام میں اگر کسی شخص
سے انھیں معمولی سی امداد بھی ملی ہو تو اس کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولتے۔ اسی دیانت داری
کی وہ دوسرے مصنفین سے بھی توقع رکھتے ہیں اور اس ضمن میں کوئی کوتاہی معاف نہیں کرتے۔
شیرانی کے اسلوب پر ان کی شخصیت کا ایک اور نمایاں اثر ان کے افکار و آرا میں عدل و
توازن ہے۔ وہ کبھی جیل جھپٹا قسم کی رائے نہیں دیتے اور ان کے محاکمے اور فیصلے نہایت متوازن
ہوتے ہیں۔ بے نوا اسنامی کے مخمّس پر مضمون میں اس نظم کی اہمیت کا تعین ان الفاظ میں
کرتے ہیں:

"اردو شاعری کے دبستان دہلی میں تاریخی شواہد کے شعر کے ذریعے سے بیان کی غالباً
یہ پہلی مثال ہے۔ اس لئے اس مخمس کو کسی قدر اہمیت حاصل ہے۔" شیخ باجن کے تعارف میں
ان کا یہ جملہ قابلِ لحاظ ہے:

"مختلف کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ باجن اپنے زمانے میں کسی قدر شہرت
کے مالک تھے۔"

امیر خسرو سے غلط طور پر منسوب ریختے پر انھوں نے نہایت ماہرانہ اور عالمانہ بحث کی ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ غزل خسرو کی ملکیت نہیں لیکن شیرانی صاحب اپنے محاکمے میں لکھتے ہیں:

"... اس طرح اس غزل کا انتساب امیر کی طرف بہت کچھ مجروح ہو جاتا ہے لیکن ہمیں آخری فیصلہ دینے کے لئے مزید شہادت کا انتظار کرنا چاہیے۔"

شگفتگی اور مزاح شیرانی صاحب کے مزاج کا ایک وقیع پہلو تھا۔ ان کی تحریروں پر اس کی جو گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اسلوب کا فنی پہلو کئی ذیلی عناصر پر استوار ہوتا ہے۔ ان میں جمالیاتی، نفسیاتی یا جذباتی اور تخیلی عناصر زیادہ اہم ہیں۔ جمالیاتی اعتبار سے شیرانی کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی اس کی ہم آہنگی اور توازن ہے۔ یہ توازن فکری توازن سے بالکل مختلف چیز ہے اور اس کا تعلق صوت و آہنگ سے ہوتا ہے۔ اس کا انحصار یوں تو الفاظ کے انتخاب، فقروں کے دروبست پاروں کی تقسیم اور لہجے کے اتار چڑھاو پر ہوتا ہے لیکن دراصل اس کا اساسی رابطہ اس چیز کے ساتھ ہے جسے صوتی سانچہ (PHONEMIC PATTERN) کہا جاتا ہے۔ اگر کسی تحریر میں یہ صفت موجود نہ ہو تو اس کی روانی مفقود اور تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ شیرانی کے ہاں یہ خوبی یوں تو عام طور پر پائی جاتی ہے لیکن جہاں خالص منطقی استدلال سے ہٹ کر وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو یہ توازن و تناسب بڑھ کر ترنم کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ کیجیے جن میں بعض حروف کی اتفاقی تکرار سے خاص قسم کی نغمگی پیدا ہو گئی ہے:

"قبائل غز ترکمانوں سے علاقہ رکھتے تھے اور ختلان علاقۂ بلخ میں ان کو مویشیوں کے لئے رمنے بنا دیئے گئے تھے۔ وہ چوبیس ہزار بکریاں بطور خراج سالانہ سلطانی مطبخ میں دیا کرتے تھے لیکن خوان سالار سلطانی کی زیادہ ستانی سے یہ لوگ تنگ آ کر آمادۂ جنگ ہو گئے اور نذرانہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔" ("ن" کی تکرار)

"نظم کیا ہے ایک سیلاب اشک ہے جو خراسان نے اپنے ایتام، شہدار، عصمت دریدہ عورات، سوختہ عمارات، غارت شدہ اماکن، بے چراغ بلاد، پامال شدہ حرمت اور تلف شدہ دولت

کے ماتم میں بہایا ہے :" ("ت" کی تکرار)

ترنم کا یہ انداز مصمتوں کے علاوہ مصوّتوں کی تکرار کی بنیاد پر بھی وجود میں آتا ہے مثلاً "ا" کی تکرار:

"سلطان سے جب وہ آخر کار مایوس ہوگیا تو اپنی مقصد برآری کے لئے امیر نصر بن ناصر الدین کی خدمت میں پہنچا۔ امیر نصر ان ایام میں امیر الجیوش خراسان تھے۔ فردوسی بہرحال ان کی خدمت میں پہنچتا ہے اور اشعار بالا سنا کر عرض پرداز ہے۔"

تحقیقی نثر یقیناً تحویلی (REFERENTIAL) ہوتی ہے جذباتی (EMOTIONAL) نہیں تاہم محقق انسان ہوتا ہے اسے کمپیوٹر بننا زیب نہیں دیتا۔ شیرانی صاحب اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں کہ کیفیات کی رنگا رنگی اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ کی چاشنی دیے بغیر قاری کو اپنے خیالات کی واضح تصویریں نہیں دکھائی جا سکتیں۔ ایک ہی تصویر مسلسل دیکھنے سے وہ بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ اس تلوّن پر مبنی مثالیں بہ طوالت کے باعث درج نہیں کر سکتا چند اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں:

زور بیان: "ہمارے تذکرہ نگاروں کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں ——— فردوسی کا یہ سفر سندباد بحری کے سفر سے کیا کم کہا جا سکتا ہے۔" ("فردوسی پر چار مقالے" ص ۲۸-۲۹)

گداز: "علاءالدین اپنے بھائی کے انتقام کے لئے خاندان غزنہ کے استیصال کی سعی میں شاید حق بجانب ہو۔

——— "صرف محمود، اس کے فرزند مسعود اور اس کے فرزند ابراہیم کی قبور اس بے حرمتی سے محفوظ رہیں۔" ("مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد پنجم، ص ۸۰۶ - ۸۰۷)

ڈرامائی عنصر: "اب عماد الدین پیروز شاہ خراسان کے افق پر ایک نئے ستارے کی طرح طلوع کرتا ہے۔

——— "کوش تا آب سلیمان بمیرزہ بری۔" ("تنقید شعر العجم" ص ۲۵۳-۲۵۴)

خطابت: "یہ انوری تھا جس نے سفارت نامہ کا مضمون نظم میں تیار کر کے دیا ——— بہترین شعراء میں کیا جا سکتا تھا۔" ("تنقید شعر العجم" ص ۲۴۳ - ۲۴۴)

شیرانی صاحب کے اسلوب پر مجموعی لحاظ سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان

کے افکار کی جدت نے ان کے اسلوب کو ابتکاری شان عطا کی ہے اور ان افکار کی ادائیگی میں انھوں نے جس فنی مہارت سے کام لیا ہے اس کے باعث ان کی تحقیقی نثر میں تخلیقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر بیدار نے شیرانی صاحب کے اسلوب کا ایک منبع مولانا محمد حسین آزاد کا طرز نگارش بتایا ہے بدیں دلیل کہ شیرانی کو آزاد کا انداز نگارش پسند تھا۔ لیکن میرے خیال میں پسندیدگی ایک چیز ہے اور پیروی بالکل دوسری چیز۔ اگر کوئی شخص کلاسیکی موسیقی سننے کا شوق رکھتا ہو تو ضروری نہیں کہ وہ خود بھی گائے یا فلم بینی کے رسیا کے لئے فلموں میں کام کرنا لازمی نہیں۔ آزاد اور شیرانی کے اسالیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ اعتراف تو خود بیدار صاحب کو بھی ہے کہ آزاد کے اسلوب میں جو عناصر تحقیقی نتائج کی پیش کاری کے لئے مُضر ہیں وہ شیرانی کی تحریروں سے مطلق غیر حاضر ہیں۔ ان کا بیان ہے :

"لیکن محمد حسینی طرز انشار کے مارے ہوئے ہونے کے باوجود شیرانی لفظوں کے ساتھ بہ نہیں جاتے، نہ ان سے کھیلتے ہیں بلکہ صرف اتنے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے ایسی نثر جو معیاری یا بنیادی نثر کہی جا سکے اور جس میں دلآویزی بھی آجائے باوجودیکہ اس میں کوئی لفظ بھرتی کا نہ ہو —— ایسی نثر لکھنا آسان نہیں۔ یہ زبان اور یہ اُسلوب کم از کم تحقیق کے میدان میں تو تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ ذرا بھٹکے اور گرے —— زبان اپنے بہاؤ کے ساتھ لکھنے والے کو اکثر بے بس کر کے بہالے جاتی ہے، ایسے کہ بہ جانے والے کو احساس تک نہیں ہوپاتا شیرانی کے اس قسم کے جملے تلوار کی ایسی ہی دھار ہیں جن پر چلنا اتنا دشوار ہے جو ناممکن کی سرحدوں کو چھوتا ہوتا ہے۔" (۱۵)

رشید حسن خاں صاحب، شیرانی کے اسلوب میں آزاد اور شبلی دونوں کے اثرات کارفرما دیکھتے ہیں۔

میں پھر یہی عرض کروں گا کہ اگر کوئی شخص تحقیق کے معیار کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے افکار کے نتائج دل نشین لیکن محتاط انداز میں پیش کرے تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مغرب میں اس حقیقت اور اس کی اہمیت کا اعتراف کیا جا چکا ہے اور ہمیں بھی اسے ماننے میں تامل

سے کام نہیں لینا چاہیے۔ لطف یہ ہے کہ اس معیاری تحقیق اور اس شگفتہ اسلوب کی محتاط یکجائی کو رشید حسن خاں صاحب نے بھی شیرانی صاحب کا ایسا کمال تسلیم کیا ہے جس کی پیروی محال ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"جو لوگ شیرانی صاحب کی تحریروں کو سرمشق کے طور پر سامنے رکھیں گے تو اس کا امکان بہرحال رہے گا کہ ان کے یہاں وہ احتیاط کارفرما رہے جو استاد کی تحریروں میں پائی جاتی ہے اس لئے اس پہلو کو پیش نظر رہنا چاہیے اور تحقیق کے طالب علم کو اس سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے"(۱۶)

ادھر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے دبستان لاہور کے محققین کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے بالکل مختلف بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یہ لوگ معیار پر بہت زور دیتے تھے۔ سہل انگاری اور صحافتی انداز بیان انھیں ناپسند تھا۔ شاعرانہ اسلوب کو بھی ان لوگوں نے خیرباد کہی اور اردو میں ایسی ACCURATE اور جامع زبان کی داغ بیل ڈالی کہ اس میں علمی باتوں کے بیان کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کی زبان اپنی غرابت کے باوجود ACCURACY کے اعتبار سے اردو کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے"(۱۷)

میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اور سب باتیں تسلیم لیکن کم از کم شیرانی صاحب کے اسلوب میں غرابت ہرگز نہیں ہے۔ ایسی ACCURATE زبان لغات و قاموس و دائرۃ المعارف ہی کے کام کی چیز ہے۔ تحقیقی مقالات کو خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ معیار کے کیوں نہ ہوں یہ غرابت غریب تر کر دیتی ہے۔ قاضی عبدالودود مرحوم جیسے معیاری محقق کو ان کے اسلوب نے جو نقصان پہنچایا کیا اہل علم کے سامنے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین(۱۸) اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار(۱۹) کی آرا آپ کی نظر سے یقیناً گزری ہوں گی۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان میں تحقیق کا ابتدائی کام کرنے والوں نے، جن میں آزاد اور شبلی سرفہرست ہیں، اپنے نتائج فکر انشا پردازانہ انداز میں پیش کئے۔ اس کے ردعمل میں مولانا حالی اور مولوی عبدالحق کی خنکی و خشکی مولوی شفیع صاحب اور قاضی عبدالودود مرحوم کے

ہاں برودت و یبوست تک پہنچ گئی۔ شیرانی صاحب کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہاں اعتدال پایا جاتا ہے۔ ان کی تحقیق کامل تحقیق ہے اور ان کا اسلوب مثالی اسلوب۔ ان کا انداز نگارش تحقیقی بھی ہے اور تخلیقی بھی اور علم و فن کے اس بہترین امتزاج کو بلاشبہ اعجاز کہا جا سکتا ہے۔ آخر میں شیرانی کے اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی رائے درج کر کے اجازت چاہتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ ان کی تحریر بڑی دلکش ہوتی ہے۔ اس بنا پر خشک مضمون بھی دلکش ہو جاتے ہیں۔ ان کی تحقیقات سے دو تین قدیم مفروضات کی تکذیب ہو گئی۔

۱۔ محقق نقاد نہیں ہو سکتا۔
۲۔ تحقیق کی زبان میں ادبیت غلط نتائج پر ڈال دیتی ہے۔
۳۔ تحقیق محض گورکنی ہے۔ زندگی سے اس کا تعلق نہیں۔" (۲۰)

حواشی

۱۔ "اسلوب" ص ۵۹، سید عابد علی عابد، لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء

۲۔ "THE PROBLEM OF STYLE", P. 15, MIDDLETON MURRAY, OXFORD UNIVERSITY PRESS, 1922

۳۔ "وجہی سے عبدالحق تک" ص ۲۴۲، ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور، ۱۹۷۷ء

۴۔ "ارمغان حالی" (مقدمہ)، ص ۲۹، پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور، ۱۹۷۱ء

۵۔ "مطالعہ حالی" ص ۵۷، ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، ۱۹۶۱ء

۶۔ "مرحوم علامہ شیرانی" مطبوعہ سہ ماہی "اردو" دہلی، اکتوبر ۱۹۴۶ء

۷۔ "مرحوم حافظ محمود خاں شیرانی" مطبوعہ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور، فروری ۱۹۴۷ء

۸۔ "حافظ محمود شیرانی" "نقوش" (شخصیات نمبر)

۹۔ ON THE ART OF WRITING P. 248 SIR ARTHUR QUILLER COUCH CAMBRIDGE 1917

۱۰۔ "تنقید شعر العجم" ص ۲۸۶، دہلی، ۱۹۴۲ء

۱۱۔ MODERN PROSE STYLE P. 229 BONAMY DOBREE LONDON 1950

۱۲۔ "دو ہم آہنگ محقق" مشمولہ "حافظ محمود شیرانی" ص ۲۹۸، پٹنہ، ۱۹۸۲ء

۱۳۔ "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" ص ۲۹۶، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۴۔ "حافظ محمود شیرانی اور مجموعۂ نغز" مطبوعہ "ماہ نو" کراچی، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء

۱۵۔ "دو ہم آہنگ محقق" (محولہ بالا)

۱۶۔ "شیرانی کی تاریخی اہمیت" مشمولہ "حافظ محمود شیرانی" ص ۳۲ (پٹنہ)

۱۷۔ "کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ" ص ۱۲، لاہور، ۱۹۶۵ء۔

۱۸۔ "تحقیق کے تقاضے" مشمولہ "آج کل" (تحقیق نمبر)، دہلی، اگست ۱۹۶۷ء

۱۹۔ "دو ہم آہنگ محقق" (محولہ بالا)

۲۰۔ "فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات" مطبوعہ سہ ماہی "اردو" (شیرانی نمبر)، کراچی، ۱۹۸۰ء

دیوانِ غالؔب

غالؔب کا اُردو دیوان آج بھی اردو کی مقبول ترین کتاب ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے دیوانِ غالب کا یہ نیا اڈیشن بہت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اِس کا متن اُس نسخے پر مبنی ہے جو مرزا صاحب کی زندگی میں مطبعِ نظامی کان پور میں بہت اہتمام کے ساتھ چھپا تھا۔ غالؔب کی زندگی میں دیوانِ اردو کے جو نسخے چھپے ہیں، اُن میں مطبعِ نظامی کا اڈیشن سب سے زیادہ معتبر ہے۔

غالب کے ابتدائی عہد کا کلام جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہے، اپنی الگ حیثیت اور اہمیّت رکھتا ہے اور اُس کے مطالعے کے بغیر غالب کے ذہنی ارتقا کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس غیر متداول کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو جواہر ریزوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے اِس خاص اڈیشن میں نسخۂ حمیدیہ میں شامل اس کلام کا انتخاب بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اِس طرح دیوانِ غالؔب کے اِس نئے اڈیشن کی اہمیّت بہت بڑھ گئی ہے۔ متن کی صحت پر خاص کر توجّہ کی گئی ہے اور توقیف نگاری کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دبیز سفید کاغذ، بے حد خوب صورت گرد پوش اور مضبوط جلد۔

صفحات :— ۲۴۰

قیمت :— ۲۵ روپے

ملنے کا پتا : غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی

تنقید شعر العجم

علّامہ شبلی نعمانی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے فارسی شاعری کو نقادی نظر سے دیکھا، نیز اس کو صرف ہندوستانیوں کے لئے نہیں بلکہ ایرانیوں، افغانیوں، تاجیکیوں اور دوسرے فارسی کے عاشقوں کے لئے پوری طرح روشناس کرایا۔ شعر العجم کا فارسی ترجمہ ایران اور افغانستان میں شائع ہو چکا اور بہت مقبول ہوا ہے، نیز فارسی کے علما اور دانش مندان کی عظمت اور بزرگی کے قائل ہیں۔

علّامہ شبلی کا مطالعہ نہایت وسیع اور متنوع تھا، ان کو ہم محقق نہیں کہہ سکتے ہیں، بلکہ وہ تو ادبی اسٹیج پر اپنے ہیرو کو پورے جلال و جمال سے ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف وہ شعر العجم جیسی ادبی اور تنقیدی کتاب لکھتے ہیں، تو دوسری طرف "موازنۂ انیس و دبیر" لکھ کر میر انیس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف الفاروق لکھتے ہیں، تو دوسری طرف اپنے ادبی ذوق کو فارسی اور اُردو اشعار میں رونما کرتے ہیں۔ فارسی زبان و ادب پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی، مگر شعر العجم کی جگہ، جو بنی ہوئی ہے، وہ بنی رہے گی، نیز علّامہ کی تنقید اور فارسی ادب کے شغف کو کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، سب سے پہلے گلستان و بوستاں اور پھر جب آگے بڑھے تو شعر العجم سے اپنی پیاس کو بجھایا۔ مجھے ایک عرصہ کے بعد پتا چلا کہ وہ میرے ہی ضلع کے اور میرے ہم وطن تھے۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا کہ ان کے خالہ زاد بھائی مولانا فراہی، اسی اسٹیشن اور گاؤں کی طرف منسوب تھے، جسے پھریا کہا جاتا ہے اور جہاں ہم ٹرین سے اتر کر اپنے گھر جایا کرتے تھے۔

علامہ ایک فرد نہ تھے، بلکہ ایک ادارہ تھے، نیز ان کا کتنا بڑا ابدی کارنامہ ہے کہ آج بھی شبلی اکیڈمی سے "معارف" جیسا علمی رسالہ پابندی سے نکل رہا ہے، نیز بے شمار ادبی اور تحقیقی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ آپ نے بے شمار مرید اور شاگرد پیدا کئے، نیز مولانا سید سلیمان ندوی جیسی شخصیت کی تربیت کی، جو اپنی جگہ خود ایک دنیائے علم و فن رہے ہیں۔ آپ کے بھانجے سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب مرحوم، جو سال بھر پہلے ہم سے جدا ہو گئے، باوجود دائمی علالت کے زندگی بھر انتہائی لگن سے علامہ شبلی کے کارناموں کو اجاگر کرتے رہے۔ نیز اپنی تصنیفوں اور تالیفوں سے اردو، فارسی اور تاریخ کی دنیا کو مرہون منت اور ہمارے علمی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ اس ادارے کے دوسرے علما نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر نہایت خوش اسلوبی سے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اگر علامہ شبلی کے کارنامے عالم وجود میں نہ آتے، تو حافظ محمود شیرانی جیسی عظیم شخصیتیں بھی عالم وجود میں نہ آتیں۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ علامہ نے جو چراغ جلایا تھا، اس کی روشنی میں دوسرے چراغ جلے ہیں۔

دراصل ایران اور ہندوستان میں تحقیق کی روایت علامہ کے بعد عالم وجود میں آئی ہے۔ ایران میں علامہ قزوینی اور ہندوستان میں حافظ محمود شیرانی صاحب نے اس کی داغ بیل رکھی ہے۔ مرحوم قاضی عبدالودود صاحب، جہاں ایرانی محقق قزوینی اور ڈاکٹر محمد معین کے قائل تھے، وہاں ہندوستان میں حافظ صاحب اور ان کے عزیز شاگرد ڈار صاحب کے قائل تھے، نیز وہ مولانا آزاد، علامہ شبلی اور علامہ اقبال جیسی شخصیتوں سے مرعوب نہ تھے، بلکہ نظریاتی اور علمی حیثیت سے ان سب کے خلاف تھے۔

میں خود حافظ صاحب سے بہت دیر میں متعارف ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ میں اختر شیرانی کی رومانی نظمیں بڑے شوق سے پڑھا اور گایا کرتے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ حافظ صاحب انھیں کے

و الدہیں۔ مجھے ٹونک سے بڑا لگاو رہا ہے، جہاں حافظ صاحب آج بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ نیز جس کی یاد اختر مرحوم کو ستایا کرتی تھی، اور جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔

۱۹۸۱ء میں جب پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں حافظ صاحب کا سو سالہ جشن منایا گیا اور ایک سیمنار کا انعقاد ہوا، جس میں میں نے اور پروفیسر نذیر احمد صاحب نے شرکت کی تھی نیز مجھے اُن کے پوتے اور نواسے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور خورشید احمد خاں صاحب سے ملنے کا موقع ملا۔ اس سیمنار میں اُن کے عزیز اور معمّر شاگرد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے ایک پُر مغز اور مفصل مقالہ پڑھا تھا۔ یہاں ان کے دوسرے عزیز شاگرد پروفیسر بھاگوت سروپ صاحب سے اکثر حافظ صاحب کی سیرت اور بصیرت کے متعلق باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ نیز انھوں نے اپنے اُستاذ پر مقالات لکھے ہیں۔

میں نے "تنقید شعر العجم" کا ایک حد تک مطالعہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوا کہ دراصل علّامہ اور حافظ صاحب دونوں الگ الگ میدانوں کے شہسوار ہیں۔ علّامہ تنقید کے بادشاہ اور ہیرو پرست ہیں جب کسی کو وہ ہیرو بنا لیتے ہیں، تو اس کے لیے بڑی شان و شوکت کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ علّامہ اس قسم کے محقق نہ تھے اور نہ انھیں فرصت تھی، کہ لوگوں کا زائچہ دیکھتے اور اُن کی ولادت و وفات کا صحیح پتہ لگاتے، نیز اپنے ممدوحین کے نام و نسب وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے اور نہ وہ اس کے لیے پیدا ہوئے تھے، وہ تو شعر و ادب کے پرکھنے والے نقّاد تھے، نیز انھوں نے فارسی شاعری پر جو کچھ لکھ دیا، وہ آج بھی حرف آخر ہے۔ مولانا جامی کا یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزی نیست

ہم ان کے یہاں یہ نہیں دیکھتے کہ انھوں نے کیا لکھا ہے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ کیسے لکھا ہے، وہ ایک زبردست انشا پرداز تھے، نیز اُن کی تحریریں خود اپنی جگہ پر مستقل تخلیقی کارنامے ہیں۔

برخلاف اس کے، حافظ صاحب تحقیق کے مرد میدان ہیں، مگر ان کا دائرہ محدود ہے۔ انھوں نے فارسی ادب کی تحقیق کے متعلق جو کام کیا ہے، وہ ہمارے لیے شمع راہ ہے مگر

اسے حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔

"تنقید شعر العجم" کو پڑھ کر، غالب اور مولّف "برہان قاطع" یاد آجاتے ہیں، جس طرح غالب نے برہان قاطع کے مؤلف کو اپنا ایک فرضی دشمن تصوّر کرلیا اور گالیوں پر اتر آئے، اسی طرح حافظ صاحب نے "تنقید شعر العجم" میں کسی ذاتی دشمنی اور کینہ کا ثبوت دیا ہے۔ وہی بات جب دوسرے کہتے ہیں، تو تر دید کرتے ہوئے اسے برداشت کرلیتے ہیں، مگر علاّمہ کے خلاف ایک محاذ آرائی، طنز اور حقارت آمیزی کا لہجہ اختیار کیا ہے، جو علمی دنیا میں موزوں نہیں ہے۔

انگریزوں اور ایرانیوں سے اب بھی ہندوستانی علما غیر معمولی طور سے مرعوب رہتے ہیں، جو غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ اگر میرے استاد مرحوم سعید نفیسی کوئی چیز کہتے ہیں، تو اسے بڑی وقعت سے دیکھا جاتا ہے، مگر اگر وہی بات کوئی ہندوستانی کہے یا کرے تو اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

علاّمہ شبلی کے پاس، بلکہ اس زمانہ تک اتنا مواد نہ تھا، جتنا حافظ صاحب کو میسر ہوا تھا نیز علاّمہ نے اپنا وقت شعر کے پرکھنے اور اس کے حسن وخوبی کی دریافت میں صرف کیا، تحقیق کو ہاتھ نہیں لگایا، کسی کی زندگی کی جزئیات کے متعلق ان کا بیان بہت سرسری رہا ہے، نیز ہم ان کو محمد حسین آزاد اور خواجہ حسن نظامی کی طرح انشا پرداز کہہ سکتے ہیں۔

حافظ صاحب کی تحقیقی تحریریں ہم سب کے لئے قابل قدر، مگر علاّمہ کے خلاف جو لہجہ اختیار کیا ہے، وہ قطعاً قابل افسوس ہے، جو ایک عالم کے شایان شان نہیں ہے، نیز انھوں نے، جو موشگافیاں کی ہیں، وہ بھی ضرورت سے زیادہ ہیں۔ چاہے وہ مؤلف مجمع الفصحا ہوں یا صاحب آتش کدۂ آذر، چاہے وہ مصنّف لباب الالباب ہوں یا دولت شاہ سمرقندی، چاہے علاّمہ قزوینی ہوں یا دہخدا چاہے وہ علاّمہ شبلی ہوں یا حافظ محمود شیرانی سبھی نے ہم کو کچھ نہ کچھ دیا ہے۔ شمع سے شمع روشن ہوتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اگر دس جگہوں پر ہم اُن سے اختلاف کرتے ہیں، تو دوسری جگہوں پر انھیں کے کہنے پر اعتبار بھی کیا جاتا ہے، اگر اختلافات نہ ہوں تو محقق کا کام ہی کیا رہ جاتا ہے۔ پچھلے زمانہ کے علما کچھ تو روایتوں پر بھروسا کرتے تھے اور کچھ اپنے نظریہ کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ منصور حلاّج کے ماننے والوں اور مخالفین کی ہمیشہ محاذ آرائی رہتی

مگر ان کی شخصیت امر ہو کر آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ ایسی بے شمار شخصیتیں اور ہستیاں ہیں جن کے متعلق اختلافات برپا ہیں۔ اسی سے مذاہب اور صوفی سلسلے پیدا ہوتے ہیں، مگر آج ہمارا فرض ہے کہ ان سب کا پورا احترام کریں اور اُن سے اختلافات کے باوجود اُن کے نظریات کو ہمدردانہ انداز سے دیکھیں۔ حافظ صاحب نے بہت سی ایسی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو علامہ کے بعد لکھی گئی ہیں۔

حافظ صاحب شروعات تو اچھی طرح کرتے ہیں جب یہ فرماتے ہیں" کہ تنقید ہٰذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے، بلکہ محض احتجاج ہے، اس مروّجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں"۔۔۔

" فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علاّمہ نے شعر العجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اُردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعر العجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے[1]"

مگر فوراً دل کی بات کھلے لفظوں میں اس طرح کہتے ہیں کہ" شعر العجم کے مطالعہ کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوتی ہے کہ علاّمہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مؤرخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں۔ رطب و یابس جو کچھ اُن کے مطالعے میں آجاتا ہے، بشرطیکہ دلچسپ ہو، حوالۂ قلم کر دیتے ہیں۔۔۔ ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں، لیکن شعرائے عجم کے حالات میں اُن کے طاقتور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں"۔۔۔

" جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کی دسترس میں آسکیں انھیں پر قناعت کی، زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے اس حصۂ شعر العجم کے لئے ۔۔۔ مجمع الفصحا اور تذکرۂ دولت شاہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے ۔۔۔ میرے خیال میں لباب الالباب ۔۔۔ بزم آرا یا مخزن الغرائب

---

[1] ۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم (ص ۳،۱)، تنقید شعر العجم مع ضمائم، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، لاہور، مطبع عالیہ، لاہور، ۱۹۷۰ عیسوی

زیادہ مفید ہوتیں۔ پچھلی دونوں کتابوں سے مولانا واقف نہیں معلوم ہوتے۔ ا
البتہ لباب الالباب کا نام سرفہرست کتب میں سب سے اوّل ہے، جسے لب اللباب
عوفی یزدی ... کے نام سے یاد کیا ہے ... لیکن مولانا کی فہرست میں اس کا
ادخال زیادہ تر ایک اعزازی حیثیت رکھتا ہے ..." دولت شاہ سمرقندی
ایک نہایت ضعیف راوی ہے[1]"

مجمع الفصحا اور تذکرۂ دولت شاہ ممکن ہے بعض امور میں قابل اعتماد نہ ہوں، مگر انھیں
کی طرح لباب الالباب، مخزن الغرائب وغیرہ بھی اتنی ہی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ یہ تو محقق کا
کام ہے کہ وہ ضعیف روایت کی نشاندہی کرے، مگر عام منابع کا حتی الامکان مطالعہ ضروری ہے۔

رودکی[2] کے ذکر میں حافظ صاحب تحریر فرماتے ہیں" رودکی کی غزلوں کی مثال میں
علامہ شبلی نے یہ ابیات انتخاب کئے ہیں :

ای جان من از آرزوی رودی تو پژمان

....

یہ ابیات اصل میں قطران تبریزی[3] کے ایک قصیدے کی تشبیب سے لئے گئے ہیں، جو امیر ابو نصر
مملان کی مدح میں ہے[4]"

ایک عرصہ تک قطران تبریزی کا کلام رودکی کے نام سے مشہور رہا، اس لئے اگر علامہ
نے اس مشہور روایت پر عمل کرتے ہوئے اس نسبت کو صحیح سمجھا، تو ان کا کیا قصور ہے ؟

براؤن نے "تاریخ ادبیات" لکھ کر بہت بڑا فرض ادا کیا ہے ۔ مگر اسی کے ساتھ کہنا
پڑے گا کہ وہ شعری ذوق سے خالی تھے ۔ اسی لئے علامہ کو وہ بہت پسند نہیں آئے۔ براؤن

۱۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، (ص ۴، ۶، ۱۰)

۲۔ وفات : ۳۲۹ ہجری / ۴۱-۹۴۰ عیسوی

۳۔ وفات : ۴۴۵ ہجری / ۵۴-۱۰۵۳ عیسوی

۴۔ مقالات، ص ۲۶، ۲۷

کے نزدیک فردوسی دوسرے فارسی شعراء کے برابر بلکہ بعضوں سے کم درجہ کے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ مشہد کے بین الاقوامی فردوسی سیمنار میں میرے استاد ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی نے فرمایا تھا کہ شاہنامہ حرام زادہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں الحاقی کلام بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے اصل شاہنامہ گم ہوگیا ہے۔ آج سب سے قدیم شاہنامہ کا قلمی نسخہ وہ ہے، جو فردوسی کے مرنے کے تین سو سال بعد لکھا گیا، نیز کوئی دو نسخے ایسے نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔ اس طرح صرف محمود کی ہجو کو الحاقی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ تحقیق سے بے شمار حصے الحاقی نکلیں گے۔ جو کام سینکڑوں برس میں بھی ممکن نہیں ہے۔ یہی حال مثنوی مولانا روم، گلستاں، بوستان اور دوسرے قدیم متون کا ہے۔

میرے استاد مرحوم پروفیسر سعید نفیسی جب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر کے آئے تھے، تو اس موقع پر ایک مرتبہ وہ میرے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے کتب خانہ سے دیوان نظامی گنجوی کے قلمی نسخہ کو عاریتاً لے گئے اور کچھ دنوں کے بعد اسے واپس کر دیا۔ بہر حال ان کے مرتبہ دیوان نظامی میں اس نسخہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ حافظ صاحب نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۱۹۶۴ عیسوی کے دہلی میں منعقد بین الاقوامی مستشرقین کی کانگرس میں مجھ سے استاد نفیسی نے کہا تھا کہ اب تک اُن کی ایک سو پچاس کتابیں ہو چکی ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اتنا بڑا متنوع لکھا ڑ محقق نہیں ہو سکتا

مقالات حافظ محمود شیرانی میں احوال و اشعار رودکی (سعید نفیسی) دیوان عنصری (ڈاکٹر یحییٰ قریب، ۱۹۶۲ء) دیوان قطران تبریزی (تبریز، ۱۳۳۳ھ ش)۔ دیوان رودکی (تہران، ۱۳۱۵ھ ش) آثار ابوعبداللہ رودکی (استالن آباد، ۱۹۵۸ء) تاریخ سیستان (مرتبہ ملک الشعرا بہار)۔ تاریخ ادبیات در ایران (ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا)۔ دیوان منوچہری (محمد دبیر سیاقی، طہران، ۱۳۲۴ شمسی)۔ دیوان فرخی (علی عبدالرسولی، ۱۳۱۱ شمسی و دبیر سیاقی، طہران ۱۳۳۵ شمسی) تاریخ بیہقی کلکتہ)۔ احوال و آثار حکیم سنائی (خلیل اللہ خلیلی)۔ دیوان سنائی (مدرس رضوی)۔ دیوان انوری (سعید نفیسی)۔ دیوان قصائد و غزلیات نظامی (سعید نفیسی) وغیرہ ایسی کتابیں جو زیادہ تر علامہ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہیں، نیز بہت سی

تحقیقی تصنیفیں اور متون ایسے ہیں، جو حافظ صاحب کی وفات کے بعد عالم وجود میں آئے ہیں ، علاوہ ازیں ایران میں بے شمار کتابیں ایسی چھپی ہیں اور چھپتی رہتی ہیں، جن کا نام کبھی ہم تک نہیں پہنچتا اور فوراً ایک کر بازار سے غائب ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ہم علامہ اور حافظ صاحب دونوں کا الگ الگ احترام کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کے احترام میں کمی نہیں ہونے دیتے، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ علامہ شبلی ایک بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں ، جو حافظ صاحب کو حاصل نہیں ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے، مجھے میر انیس کے سلام کا یہ شعر یاد آیا ہے :-

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پروفیسر نذیر احمد

شیرانی کی تحقیقات پر ایک نظر

شیرانی صاحب نے تحقیقات کی ایک ایسی روایت قائم کی ہے جس کی بنیاد نئے مآخذ کی دریافت پر ہے چنانچہ انھوں نے سینکڑوں نئے مآخذ کی روشنی میں نئے نئے نتائج نکالے ہیں۔ تحقیقات کی اس روایت میں ہر لحظہ نئی نئی تبدیلیوں کے امکانات ہوتے ہیں اس لیے کہ نئے مآخذ کی دریافت پر انے خیالات و معتقدات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سینکڑوں سال پرانے واقعات کی تحقیق کے بے شمار مآخذ ہو سکتے ہیں، جن میں صرف معدودے چند محقق کے پیش نظر ہوتے ہیں، وہ اُن کی روشنی میں نتیجہ نکالتا ہے، جن میں بعد کے نئے مآخذ کی دریافت سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس طرح تحقیق کا عمل ماضی کے واقعات کے پرکھنے کے سلسلے میں برابر جاری رہتا ہے، اسی لیے محقق کو اپنی بات مشروط طور پر کہنا چاہیے اور نئے مآخذ کے پیش نظر اپنے موقف کے بدلنے میں کوئی عذر نہ کرنا چاہیے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باوجود مآخذ کی کمی کے محقق ایسے نتیجے پر پہنچتا ہے جو مستقبل میں نئے مآخذ کی دریافت سے زیادہ موکد ہو جاتا ہے، گویا باوجود اس کے کہ تحقیق نتیجے کے اعتبار سے درست ہے، لیکن اس کے لیے تحقیق کا عمل ختم نہیں ہو سکتا

اس سلسلے میں شیرانی کی ایک تحقیق پر نظر ڈالی جاتی ہے، شیرانی صاحب نے اپنے ایک مقالے میں اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ دیوان معین الدّین اجمیریؒ دراصل معین الدّین واعظ مسکین فراہی کی تصنیف ہے، معین الدّین اجمیریؒ کی نہیں۔ اُن کی ایک دلیل یہ ہے کہ تذکروں میں معین الدّین واعظ کے جو اشعار اُن کے نام سے درج ہیں، وہ سب دیوان خواجہ اجمیریؒ میں موجود ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ معین مسکین نے اپنی دیگر تصانیف میں اپنے نام سے ایسے سینکڑوں اشعار نقل کیے ہیں جو دیوان معین الدّین اجمیریؒ میں شامل ہیں، اور ایک جگہ نتیجے کے طور پر یہ بات لکھی ہے:

> "میں بخوف طوالت مضمون روز روشن کا مطالعہ ختم کرتے ہوئے گزارش کرتا ہوں کہ اس تذکرے کے اشعار کا مولانا معین الدّین کی تصنیف میں پایا جانا دلیل ہے اس دعوے کی کہ یہ اشعار مولانا معین الدّین کے ہیں، نہ خواجہ معین الدین کے۔" (مقالات شیرانی ۶: ۱۸۹۔ ۱۹۰)

دوسری جگہ پھر لکھتے ہیں:

> "اس سے زیادہ مثالیں بہم پہنچانا قارئین کرام کی زحمت کا موجب ہوگا، بیسیوں اور ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں مولانا معین الدّین کے ہاں اور موجودہ دیوان میں وہی اشعار موجود ہیں، بلکہ بعض وقت پوری پوری غزلیں عام ہیں جب اس دیوان کی اس قدر غزلیں مولانا معین الدّین کی ثابت ہوتی ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی طبع زاد نہ مانیں اور کُل دیوان کو اُنہی کی طرف منسوب نہ کریں جس کے حقیقت میں وہ جائز مستحق ہیں اب تک مولانا کی دو تالیفیں میری نظر سے گزری ہیں، پہلی یہی معارج النبوۃ اور دوسری اعجاز موسوی، بد قسمتی سے معارج النبوۃ کا کامل نسخہ بہم نہ پہنچا، صرف مقدمہ اور تین رُکن میری نظر سے گذرے ہیں باقی رکن چہارم اور خاتمہ مجھے

دستیاب نہیں ہوئے، ممدوح کثیر التعداد تصانیف کے مالک ہیں، اگر
اُن کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین
واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتا لگ
جائے گا بلکہ اس کے علاوہ اور سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان
کے حجم کو المضاعف کردیں گی ۔"
(ص ۱۹۳-۱۹۴)

شیرانی کی تحقیق کو آگے بڑھانے کے سلسلے کی ایک کوشش خود شیرانی صاحب
کے لائق شاگرد پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کی ہے، جنھوں نے امیر شیر علی نوائی کی مجالس
النفائس کے دونوں فارسی ترجمے اور ملا معین ہروی کی تفسیر "اسرار الفاتحہ" کے وسیلے سے
کی ہے، مجالس النفائس کے دونوں فارسی ترجموں میں معین ہروی کے مختصر حالات
کے علاوہ ایک مطلع بھی نقل ہے جو دیوان میں موجود ہے، اسرار الفاتحہ میں ۱۵ غزلوں
کے اشعار نقل ہیں، جو کُل کے کُل دیوان خواجہ معین الدین اجمیریؒ میں موجود ہیں، دوسری
کوشش راقم الحروف کی ہے، راقم نے ملا معین ہروی کی تین تالیفات کے قلمی نسخوں
کے سرسری مطالعے کے نتیجے کو نہایت اختصار کے ساتھ رسالہ سہ ماہی اُردو کراچی شمارہ
۴۵-۸۰ میں پیش کیا تھا، یہ تین مخطوطے حسب ذیل ہیں :

۱ - تفسیر سورۂ یوسف (نسخہ کتاب خانۂ دانش گاہ، علی گڑھ)
۲ - حالات حضرت موسیٰ بطریق سوال وجواب، (ایضاً، عبدالسلام کلکشن)
۳ - نعوت احمد (کتاب خانہ دانش گاہ، علی گڑھ شیفتہ کلکشن)

ان تینوں میں اپنے کافی اشعار معین ہروی نے درج کئے ہیں جن میں سے اکثر دیوان
خواجہ معین الدین اجمیریؒ میں پائے جاتے ہیں، تیسری کوشش پروفیسر محمد اسلم پنجاب
یونیورسٹی کی ہے، اُن کا اس سلسلے کا ایک مضمون مجلہ علوم اسلامیہ جلد ۱۳، شمارہ ۱، ۲
میں شامل ہوا، اس میں انھوں نے تین مآخذ کا ذکر کیا ہے جو اُن کے نزدیک کسی نے اُن
سے پہلے استعمال نہیں کیے، اور جس کی ان کو شکایت ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اُن کا صرف
ایک ماخذ ایسا ہے جو اب تک کسی کی نظر سے نہیں گذرا، اور وہ ہے اخلاق جہانگیری

جو معین ہروی کے پوتے کی تصنیف ہے اور جس میں مولف نے اپنے دادا کے اشعار "لمجذہ" کے عنوان سے درج کئے ہیں، شیرانی صاحب سے اُن کو یہ گلہ ہے کہ انھوں نے سوائے معارج النبوۃ کے معین ہروی کی کسی اور تصنیف کو مطالعے کا موضوع نہیں بنایا، وہ لکھتے ہیں:

"یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ جب شیرانی مرحوم نے یہ مضمون تحریر فرمایا تو انھوں نے معین الدین الواعظ کی تصانیف ماسوائے معارج النبوۃ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی تھی اسی طرح ابراہیم ڈار نے بھی اسرار سورۂ فاتحہ کے علاوہ ملا صاحب کی دیگر تصانیف نہیں دیکھیں اگر یہ بزرگ اخلاق جہانگیری کے علاوہ حقائق الحدائق اور اعجاز موسوی پر ایک نظر ڈال لیتے تو اُن کے مضمون کی شکل ہی بالکل مختلف ہوتی اور انھیں اپنی تائید میں داخلی شواہد کے علاوہ خارجی شواہد بھی مل جاتے۔" (ص ۱۴)

یہ بیان حقیقت سے دُور ہے، شیرانی صاحب کی نظر سے معارج النبوۃ کے علاوہ اعجاز موسوی بھی گزری تھی، اور انھوں نے اس آخرالذکر کتاب کے حوالے سے متعدد اشعار کی نشاندہی کی ہے، چنانچہ خود اپنے مقالے کے آخر میں واضح طور پر لکھا ہے کہ انھوں نے صرف دو کتابیں (معارج النبوۃ اور اعجاز موسوی) کا مطالعہ کیا ہے، علاوہ بریں مقالے کے ص ۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۱ پر اعجاز موسوی کا حوالہ ملتا ہے، مجلّہ علوم اسلامیہ کے مقالہ نگار کے غیر ذمہ دارانہ بیان پر افسوس ہوتا ہے، مزید برآں اُن کے بقول شیرانی صاحب اور ڈار صاحب دونوں کے یہاں خارجی دلیل کی کمی پائی جاتی ہے اور یہ نتیجہ بھی بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیرانی صاحب نے تذکرۂ روز روشن اور تذکرۂ حسینی میں مندرج اشعار کی نشاندہی کی ہے جو ملا معین ہروی کے ذیل میں نقل ہیں اور وہ دیوان خواجہ معین اجمیریؒ میں موجود ہیں، یہ خارجی دلیل نہیں تو اور کیا ہے، ڈار صاحب کے یہاں بھی ترجمہ مجالس النفائس کے فارسی ترجموں میں ایک مطلع کا ذکر ہے جو معین ہروی کے ذیل میں نقل ہے اور دیوان معین الدین اجمیری میں موجود ہے۔ غیر ذمہ دارانہ بیان کے مرتکب ہو کر

اسلم صاحب یہاں تک کہہ گئے ہیں :

"یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ شیرانی مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۲۴ء میں تحریر فرمایا اور تفسیر اسرار سورۃ الفاتحہ اس سے ۲۶ سال قبل ۱۸۹۸ء میں نول کشور کے اسی مطبع میں چھپ چکی تھی جس میں خواجہ صاحب کا دیوان چھپا تھا، تعجب ہے کہ ملا معین الدین کی یہ مطبوعہ کتاب اُن کی نظروں سے کیونکر اوجھل رہی، شیخ ابراہیم ڈار نے ملا معین الدین کی اس تصنیف سے استفادہ کیا ہے، انھیں یہ تفسیر کریمی لائبریری بمبئی میں ملی تھی، انھوں نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ انھوں نے اس کتاب کا مطبوعہ نسخہ دیکھا یا مخطوطہ۔ انھوں نے جس انداز سے اس تصنیف کا ذکر کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مطبوعہ کتاب نہیں دیکھی۔"

اگر شیرانی صاحب کی نظر سے اسرار سورۂ فاتحہ نہیں گذری تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے کوئی ضروری نہیں کہ ہر محقق کی نظر میں اس کے موضوع تحقیق کے سارے منابع آجائیں، عام بات یہی ہے کہ سارے مآخذ تک نظر نہیں جاتی، دُور کیوں جائیے خود مقالہ نگار کی نظر میرے مطبوعہ مقالہ "شیرانی" کی طرف نہ گئی جو پاکستان کے سہ ماہی رسالہ اُردو میں چھپا تھا، جس میں تین نئے مآخذوں کی طرف اشارہ تھا، جن میں دیوان میں شامل اشعار موجود تھے، اگر وہ دیکھ لیتے تو یہ نہ لکھتے کہ "حافظ محمود شیرانی، شیخ ابراہیم ڈار مرحوم اور راقم الحروف نے ملا معین کی تصانیف کے حوالوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے نام سے جو دیوان ... منداول ہے وہ دراصل ملا معین الواعظ الہروی کا کلام ہے۔" آخر میرے نام کی بے دخلی تو مضمون نگار کے عدم مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے ڈار صاحب پر بے بنیاد الزام تراشا ہے کہ انھوں نے اسرار سورۂ فاتحہ کا مطبوعہ نسخہ نہیں دیکھا ہے۔ ڈار صاحب نے صاف صاف لکھا ہے:

"اس تمہید کے بعد ہم ملا معین کی تفسیر اسرار الفاتحہ کا مطالعہ شروع

شروع کرتے ہیں، یہ تفسیر ۵۳۳ صفحات پر محیط ہے اور سنہ ۱۳۰۷ میں مطبع
نول کشور میں حلیۂ طبع سے آراستہ ہوئی ہے، سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ کتاب اخوند ملا خیر محمد پشاوری کی تحریک پر چھاپی گئی ہے اور افغانستان میں
مروّج رہی ہے۔" (مقالات شیرانی ج ۶، ضمائم ص ۵۹۳)

ڈاکٹر اسلم صاحب نے "حدائق الحقائق" کا تذکرہ اپنا کارنامہ سمجھا ہے اس کا ایک نسخہ
پنجاب یونیورسٹی میں ہے، اور شیرانی مرحوم کی اس مخطوطے تک نارسائی پر حیرت واستعجاب کا
اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی معذرت چاہوں گا کہ "حدائق الحقائق"
کا دوسرا نام تفسیر سورۂ یوسف ہے، اور میری اطلاع کے مطابق عرصہ ہوا چھپ چکی ہے، اس کے ایک
نسخے کا ذکر راقم اپنی یادداشت میں کر چکا ہے اور اُس کے حوالے سے کچھ اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں،
اور یہ سب اسلم صاحب کے مقالے کے پانچ چھ سال قبل، راقم کے اس مضمون کے نہ دیکھنے سے اسلم
صاحب نے یہ قیاس کیا کہ اس کتاب کا ذکر اس موضوع کی نسبت سے سب سے پہلے وہی کر رہے
ہیں، اس ضمن میں یہ اطلاع بھی مفید ہوگی کہ یہ کتاب تہران سے شائع ہو چکی ہے اور اس کا
ایک نسخہ راقم کی ملکیت میں ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ تحقیق جامد نہیں ہوا کرتی، اس کا عمل اس وقت تک جاری
رہتا ہے، جب تک کہ وہ اپنے نقطۂ کمال تک نہیں پہنچ جاتا، دیوان معین ہروی ہی کو لیجئے،
ابھی اس کے تعین کا مسئلہ اپنی آخری منزل تک نہیں پہنچا، یہ بات تو ضرور طے ہو گئی کہ
مطبوعہ دیوان خواجہ اجمیریؒ کا نہیں معین ہروی کا ہے، لیکن یہ بات ابھی طے کرنے
کی ہے کہ یہ دیوان کامل ہے، یا ناقص اور اگر ناقص ہے تو اس کا نقص کتنا ہے اور وہ
کیونکر دُور کیا جا سکتا ہے۔ یہی تصور تحقیق کی روایت جاری رکھنے کا موجب ہوتا ہے۔

شیرانی مرحوم نے شمس العلما عبدالغنی کی کتاب پر جو فاضلانہ تبصرہ کیا ہے اس کے
ضمن میں چند اہم کتابوں کا ذکر ہوا ہے جو عبدالغنی صاحب کی کتاب میں شامل ہونے سے
رہ گئی ہیں، یہ حصہ محققین کو خصوصیت سے دعوت مطالعہ دیتا ہے چنانچہ راقم نے ۱۹۸۱ء میں
اس سلسلے میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ شیرانی نے جن مآخذ کا تذکرہ

کیا ہے، اُن میں کافی اضافے کی گنجائش ہے اور اُن کے یہاں جس طرح کی کتابوں کے عدم شمول کا ذکر ہے، اس طرح کی متعدد کتابوں کے بارے میں اب معلومات حاصل ہو چکی ہیں، ان میں سے بعض کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں، میری یادداشت کو ۸ سال ہو رہے ہیں اس مدت میں بعض نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں، چنانچہ اس سلسلے کے چند امور کا سرسری طور پر ذکر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) شیرانی صاحب نے ایک قدیم بیاض کا جو ہندوستان میں مرتب ہوئی تھی کئی بار دستور الشعرا کے نام سے ذکر کیا ہے، راقم نے اپنے مضمون مشمولہ مجلّہ اُردو کراچی میں اس کا کسی قدر تفصیلی ذکر کیا تھا کہ اس کا نام مجموعۂ لطائف وسفینۂ ظرائف اور اس کا مرتب سیف جام ہروی ہے۔ اس کا وہ جز جو صنائع پر ہے، اس کے ذیل میں مرتّب نے لکھا ہے کہ "ایں کتاب من دستور الشعراست"۔ یہ مجموعہ ایک طویل مدت میں تیار ہوا تھا، اس لیے کہ مرتب ایک طرف فیروز شاہ تغلق (م ۷۹۰ھ) تو دوسری مبارک شاہ (م ۸۰۲ھ) کے لیے دعائیہ کلمات استعمال کرتا ہے، خلّد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ، بخوبی ممکن ہے کہ یہ مبارک شاہ کے نام پر ۸۰۳ھ میں مکمّل ہوئی ہو، لیکن اس تاریخ کے بعد بھی اس میں اضافے ہوئے، شیرانی صاحب کے پیش نظر برٹش میوزیم کا نسخہ (فہرست مخطوطات فارسی موزۂ برطانیہ تتمہ شمارہ ۴، ۲) رہا تھا، میں نے اس کا ایک دوسرا نسخہ کابل یونیورسٹی سے حاصل کیا اس بیاض میں ہندوستانی شاعروں کا کافی کلام ہے، اس سلسلے میں راقم نے کئی مضامین لکھے ہیں، اس میں حافظ شیرازی کا ایک نادر قصیدہ اور ۱۲۶ غزلیں شامل ہیں، چونکہ مرتب حافظ کا معاصر ہے، اور اس شاعر کے کلام کا انتخاب ۸۰۲ھ کے قریب ہوا۔ اس اعتبار سے حافظ کے کلام کے قدیم ترین منابع میں اس کا شمار ہوگا، اسی بنا پر راقم نے اس میں شامل ۱۲۷ منظومات کے اساس پر غزلیات کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا ہے، اس بیاض کی غزلوں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حافظ نے اپنے کلام پر بار بار تجدید نظر کی ہے، اس مجموعے کی غزلیں دیوان کی قدیم روایت کی نمائندہ ہیں۔

(۲) طرفۃ الفقہا :

شیرانی صاحب لکھتے ہیں : مولانا رکن الدین مرید شیخ نصیر الدین محمود، ایک فقیہہ اور مشاق شاعر ہیں جو فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی دور میں اپنی مثنوی طرفۃ الفقہا فقہی موضوع پر تالیف کرتے ہیں، اس مثنوی میں "تیس ہزار" سے زائد اشعار ہوں گے، اس تالیف کا ایک مخطوطہ جو بظاہر مصنف کے قلم کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے، میرے مجموعۂ کتب میں موجود ہے۔ (نمبر ۱۶۸۵)

ڈاکٹر بشیر حسین کی فہرست مخطوطات شیرانی ج ۲، ص ۲۹۳ میں یہ مخطوطہ زیر شمارہ ۱۶۲۶ شامل ہوا ہے، اس کتاب کا ایک نسخہ پاکستان کے موزۂ ملی میں موجود ہے، چنانچہ اس کے فہرست نگار سید عارف نوشاہی نے اس نسخہ کی بابت یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے :

طرفۃ الفقہا (منظوم) از مولانا رکن الدین، وہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م : ۷۵۷) کے مرید تھے، اور اس کتاب کو، شوال ۷۵۸ھ میں فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ - ۷۹۰) کے زمانے میں منظوم کیا ہے، اس میں شاعر کا نام اس طرح آیا ہے :

گو چنان باش تا فسانہ شود   نام رکن از علم نشانہ شود

اور کتاب کے آخر میں اپنے اور کتاب کے بارے میں اظہار خیال ہوا ہے :

اول از عمر خویش شرح دہم   پس بتاریخ نامہ خامہ نہم
سال پنجاہ و شش قلم راندم   پس نشستم تمام گرداندم
پنج سال اندرین شدم مشغول   ہر روایت کہ دیدمی مقبول
آن ہمہ اندریں درآوردم   نثر بود ست نظم من کردم
سی صد و سی و پنج شد نامہ   عدد ابیات آورد خامہ
جملہ شد پانزدہ ہزار و دو صد   ایں روایت ببیں بہ دل زعد
ختم کردم بہ ہفتمیں شوال   بود ہفتاد و پنج ہفصد سال "

(فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، موزہ ملی پاکستان، ص ۸۳۶)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ مثنوی طرفۃ الفقہا میں صرف ۱۵ ہزار دو سوابیات تھے، شیرانی نے تیس ہزار سے زائد لکھے ہیں، بظاہر یہ سہو ہے، اس کی تکمیل کی تاریخ شاعر کے بقول شوال ۷۸۵ھ ہے، یہ فیروز شاہ کی حکومت کا ۳۳ واں سال ہے، اور چونکہ بادشاہ کی وفات ۷۹۰ میں ہوئی اس لئے اس تصنیف کو اس کے دور اواخر کی سمجھنا چاہئے، اس بنا پر شیرانی صاحب کا یہ بیان کہ یہ مثنوی بادشاہ کے اوائل عہد کی یادگار ہے، درست نہیں۔

شاعر نے اپنی کتاب میں ۳۲۵ عنوانات کے تحت اشعار لکھے ہیں، جن کو وہ نامہ کہتا ہے؛ بعض عنوانات اس طرح پر ہیں :

۱ ۔ حمد

۲ ۔ نعت

۳ ۔ معراج

۴ ۔ مدح فیروز شاہ

۵ ۔ مدح شیخ نصیر الدّین محمود چراغ دہلی

۱۰ ۔ نواقض وضو

۲۰ ۔ نفاس

۳۰ ۔ امامت

۴۰ ۔ سجدۂ سہو

۵۰ ۔ دیباجۂ جنازہ

۶۰ ۔ زکوٰۃ گوسفند

۷۰ ۔ شکنندۂ روزہ

۸۰ ۔ واجبات وشرائط حج

۹۰ ۔ کفو

۱۰۰ ۔ مسائل متفرقہ

۲۰۰ ۔ بسمل ضروری

۳۰۰ - دیت

۳۴۵ - ستائش فرزندان خویش

آغاز : حمد ایزد نخست بر خوانم   نام پاکش سر زبان رانم

---

(۳) باراہ سنگتا

" عزالدین خالد خانی ایک شاعر ہے جو دلائل فیروز شاہی بادشاہ کے حکم سے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتا ہے، اسی طرح ایک اور سنسکرت تالیف "باراہ سنگتا" ہے جو اسی بادشاہ کے حکم سے عبدالعزیز شمس تھانیسری مؤلف تاریخ فیروز شاہی فارسی میں ترجمہ کرتا ہے، اس ترجمے کے دو نسخے میرے کتب خانے میں حاضر ہیں "

(ص ۱۶۳)

ڈاکٹر بشیر حسین نے فہرست مخطوطات شیرانی کی تیسری جلد (ص۴۹۱) میں اس ترجمہ کے دونوں نسخوں کا ذکر (زیر شمارہ ہای ۲۴۸۲، ۲۴۸۳) اس طرح کیا ہے،

ترجمہ کتاب باراہی

ترجمہ کتاب سانسکریت از براہمیر در نجوم و رمل

مترجم : عبدالعزیز شمس تھانیسری بفرمائش سلطان فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ - ۸۲۵)
نظر آقای ایتھے کہ این مترجم شمس سراج مؤلف تاریخ فیروز شاہی است، صحیح نیست ۔

اس ترجمہ کا ایک اہم اور قدیم نسخہ بھوپال میں مولانا آزاد سنٹرل لائبریری میں موجود ہے، اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ ترجمہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہوا، نہ کہ فیروز شاہ بہمنی کے، ڈاکٹر بشیر حسین کا قول درست نہیں، دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اصل کتاب کا نام "برہت سمہتا"[1] ہے

---

[1] یہ سنسکرت کتاب بِبلیوتھیکا انڈکا کے تحت کلکتہ میں ۱۸۶۴ - ۱۸۶۵ء میں چھپ چکی ہے، مصحح کتاب J.K.H. Kern ہے جس نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے (دیکھئے سٹوری ج ۲، ص ۳۸)

ب کہ فارسی ترجمہ میں اس کا نام بارا ہی ہے تیسری بات یہ ہے کہ مترجم کا نام عبدالعزیز بن شمس
ا نیسری ہے جو شمس عفیف سے الگ ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مترجم اور شمس عفیف دونوں کے نام
ے تاریخ فیروز شاہی ملتی ہے، لیکن یہ دونوں الگ الگ تاریخیں ہیں، ا یتھے کا یہ قول[1]، مترجم
شمس عفیف دونوں ایک ہی شخصیت ہیں، غلط ہے، سٹوری کا بھی یہی خیال ہے کہ مترجم
س عفیف نہیں[2] ہے۔

سرِ مکتوم

"اسی عہد میں (عہد شمسی) امام رازی کی عربی تالیف سرِ مکتوم کا ترجمہ رکن الدین فیروز
کے حکم سے فارسی میں لکھا جاتا ہے۔" (ص ۱۵۸)

اسٹوری کے بقول السّرالمکتوم نجوم و طلسمات وغیرہ پر ہے، اس کا ذکر حاجی خلیفہ ج ۳
ص ۵۹۶، براکلمان ج ا ص ۵۰۷، کراوس نے ص ۴۸۹ (۲) کیا ہے، سٹوری نے لکھا ہے کہ کسی
نامعلوم مترجم نے سلطان شمس الدین ایلتتمش (م: ۶۳۳) کے حکم سے امام فخر الدین رازی کی
اس عربی کتاب کو فارسی کا جامہ پہنایا اور سلطان اور اُس کے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کے نام معنون کیا،
ایلتتمش کی وفات پر یہی فیروز شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا تھا، مگر ایک سال کے بعد وہ فوت ہو گیا،
ظاہر ہے کہ ترجمہ سرِ مکتوم اس کی شاہزادگی کے ایام کا کارنامہ ہے، اُس کے دو نسخوں کا ذکر سٹوری کے
یہاں ہے: ایک بلوشہ کی فہرست میں دوسرا لینن گراڈ میں، یہ فارسی ترجمہ ۱۳۱۲ھ میں بمبئی میں جتر
بھات پریس میں طبع ہوا تھا، عربی میں بھی ملک الکتاب میرزا محمد شیرازی کے حکم سے طبع ہو چکی تھی،
عربی کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ ۷۰۸ھ میں عبدالملک بن اسد شیرازی نے کیا تھا۔

ترجمہ سرِ مکتوم کا ایک نسخہ خود شیرانی صاحب کے ذخیرہ میں موجود ہے، اس کا تعارف
ڈاکٹر بشیر حسین نے فہرست مخطوطات شیرانی ج ۳، ص ۹۰۴ پر نمبر ۲۴۸۰ کے ذیل میں کیا ہے۔

---

[1] دیکھیے سٹوری ج ۲، ص ۳۸) [2] ج ۲، ص ۳۸)

تحفۃ المجالس

"تحفۃ المجالس از برہان بن بدر، ترجمۂ رسالۂ امام غزالی در عہد سلطان محمود والی
مالوہ، اس کا ایک مخطوطہ نمبر ۷۔۱۶۰ میرے مجموعۂ کتب میں موجود ہے۔"
ڈاکٹر بشیر حسین نے فہرست مخطوطات شیرانی ج ۲، ص ۳۲۷۔۳۲۸ میں اس نسخہ کا تعارف
اس طرح کرایا ہے:

۷۹۰۔ تحفۃ المجالس
(در ذکر ملک عجم، خلفای راشدین و تدبیر مملکت وغیرہ)
بنا بہ نوشتۂ مؤلف ترجمۂ رسالہ نصیحت الملوک امام غزالی از عربی بفارسی (۱۱۔۱۳)
مترجمۂ برہان بن صدر الکرمانی الشیرازی (۱۵ ب) معروف بہ صدر بدر،
در عہد سلطان محمود شاہ (۷ ب) والی مالوہ (۹۱۶۔۹۳۷) در برہان پور"
(۱۳ ب)

ریو ۳۴ ۸۷ ب، باڈلین ۲۲۰۹ میں اس نام کے رسالے رسالۂ ہذا سے الگ رسالے ہیں
اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ تحفۃ المجالس بقول شیرانی رسالۂ عربی امام غزالی
کا فارسی ترجمہ ہے، اس اطلاع کی بنیاد خود شیرانی کا ذاتی مخطوطہ ہے، لیکن ڈاکٹر بشیر حسین
قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام غزالی کا یہ رسالہ نصیحت الملوک ہے جو عربی میں ہے، یہ اطلاع صحیح
نہیں، امام غزالی کا نسخہ نصیحت الملوک فارسی میں ہے، چنانچہ خود بشیر حسین صاحب نے فہرست مخطوطا
ج ۲ ص ۲۶۲ مخطوطہ نمبر ۱۴۵۳ میں نصیحت نامہ (نصیحت الملوک) کا اس طرح تعارف کرایا ہے
(فصلی ازیں رسالہ بنام شاگرد)
مکتوبہ: صدر الدین بن قطب شاہ در اوائل ربیع الاول ۸۶۰ھ ؛ ر ک ایتھے
۱۷۹۲؛ ایوانو ۴/۱۳۹۷۔
غرض یہ نصیحت نامہ فارسی میں ہے نہ عربی میں، ایتھے اور ایوانو نے فارسی ہی نصیحت الملوک
تعارف کرایا ہے، نہ عربی کے، مزید ڈاکٹر صفا نے واضحاً لکھا ہے کہ نصیحت الملوک غزالی فارسی ہے

بر زو بار طبع ہو چکا ہے، ایک بار پروفیسر بھگوت دیال ورما (پروفیسر پونہ یونیورسٹی) نے چھپوایا ہے دوسری بار تہران سے ۱۳۱۵ - ۱۳۱۷ شمسی میں آقای ھمائی کے مقدمہ و تصحیح کے ساتھ، یہ کتاب ۵۰۳ ھ میں سلطان سنجر کے لئے لکھی گئی تھی، غزالی کی تین فارسی تصانیف ہیں او رتینوں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں :

۱ - کیمیاے سعادت

۲ - نصیحت الملوک

۳ - مکاتیب فارسی

نصیحت الملوک نہایت معتبر و مقبول تصنیف ہے، چنانچہ یہ عربی اور ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہے عربی مترجم ابن مستوفی (۵۶۴ - ۶۳۷) ہے جس کے حالات ابن خلکان نے لکھے ہیں، ترکی میں تین بار ترجمہ ہو چکا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ ادبیات در ایران ج ۲ ص ۹۲۵)

واضح ہے کہ ڈاکٹر بشیر حسین کو شیرانی کے نسخے سے غلط فہمی ہوئی کہ وہ اس ترجمہ کو نصیحت الملوک کا ترجمہ قرار دیتے ہیں، بہر حال اصل مخطوطے کے مطالعے سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

مترجم کا نام شیرانی صاحب نے برہان بن بدر لکھا ہے، جبکہ بشیر حسین نے برہان بن صدر الکرمانی الشیرازی درج کیا جو صدر بدر کہلاتا تھا، یہی صدر بدر قنیۃ الفتیان کا بھی مرتب، قنیۃ الفتیان منظوم فرہنگ نامہ ہے جس میں مؤلف کا نام اس طرح آیا ہے :-

کرد انشا صدر بدر این قنیۃ الفتیان کہ ہست
در لغت نزدیک اہل فضل گنج شایگان

قنیۃ الفتیان کے مرتب "صدر بدر" اور تحفۃ المجالس کے مترجم صدر بدر کے ایک ہی شخصیت ہونے کی ایک اہم شہادت یہ ہے کہ قنیۃ الفتیان اور تحفۃ المجالس دونوں کے مؤلف یعنی صدر بدر کا تعلق سلطان محمود والی مالوہ (۹۱۶ - ۹۳۷) سے تھا۔ قنیۃ الفتیان کے متعدد نسخے ہندوستان اور بیرون ہند کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں منجملہ ان کے ۸ نسخے شیرانی کلکشن میں ہیں (۲۷۷۲ تا ۲۷۷۹)۔

ہدایت الرّمی

"ہدایت الرمی در تیراندازی از محمد بدہ عرف سید میر علوی بنام علاؤ الدّین
حسین شاہ والی جونپور نمبر ۱۵۹۱" ص ۱۶۶

اس رسالے کے متعدد نسخے ملتے ہیں، برٹش میوزیم، انڈیا آفس، کرزن کلکش بانکی پور، آصفیہ وغیرہ میں اس کے مخطوطے ہیں، مگر نام میں اختلاف اکثر نسخوں میں ہدایت الرامی ہے، اور ممدوح کا نام علاء الدین ابوالمظفر حسین شاہ والی بنگالہ (۹۰۴ - ۹۲۷ھ) ملتا ہے، ڈاکٹر بشیر حسین نے فہرست مخطوطات شیرانی ج ۳ ص ۷۵۵، شمارہ ۲۶۷۷ کے ذیل میں بادشاہ کو علاء الدین حسین شاہ حاکم بنگالہ لکھا ہے، بعض نسخوں میں مولف کا نام سید میر علی ملتا ہے۔

کفایۂ مجاہدیہ

"کفایۂ مجاہدیہ از منصور بن محمد بن احمد بن یوسف برائے سلطان زین العابدین
والی کشمیر"۔ (ص ۱۶۶)

اس کتاب کا دوسرا نام کفایۂ منصوری بھی ہے، بشیر حسین نے فہرست مخطوطات شیرانی ج ۲ ص ۹۹ میں دونوں نام دیئے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ یہ زین العابدین والی کشمیر (۸۲۶ - ۸۷۵) کے نام ہے لیکن نشریہ ۳ : ۳۲۲ میں زین العابدین کو حاکم فارس (۷۸۴ - ۷۹۳) قرار دیا گیا ہے۔ فہرست نسخہ ہای گنج بخش ج اوّل ص ۳۳۲ میں ہے کہ کفایۂ منصوری: کفایۂ مجاہدیہ، کا مصنف منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن الیاس شیرازی (م : ۹۰۸ھ) ہے جس نے اپنی کتاب مظفری خاندان کے مجاہد السلطنۃ زین العابدین شاہ شجاع مبارز الدین محمد (۷۸۶ - ۷۹۳) کے نام معنون کی تھی، یہ کتاب ۷۸۰ھ کے قریب لکھی گئی، بظاہر یہ بیان غلط ہے، کفایہ کشمیری حکمران کے نام سے ہے، یہ کتاب ۱۳۰۳ھ میں نول کشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی، دوبارہ ۱۹۲۸ء میں کانپور سے چھپی، فہرست مخطوطات دیال سنگھ ج ۳ ص ۳۹۱۔

مفرح القلوب

"مفرح القلوب ترجمۂ ہتپدیش از تاج الدین مفتی الملکی بفرمان ملک الملوک الشرق والغرب نصرۃ الدولہ والدین مقطع شق بہار۔"

ڈاکٹر بشیر حسین نے فہرست مخطوطات شیرانی میں اس کتاب کو دو جگہ متعارف کرایا ہے :-

ج ۳ ص ۳۳۴ پر اس طرح :

۲۲۸۵ مفرح القلوب

مجموعۂ داستانہای دلپذیر و آموزندہ از زبان طیور و وحوش، ترجمہ کتاب ہتوپدیش از سانسکرت بفارسی مولفہ تاج الدین مفتی الملکی بزمان ہمایون پادشاہ

(جلوس ۹۳۷ھ)

اسی جلد کے ص ۵۷۲ پر دوبارہ ان الفاظ میں : ۲۷۱۴ مفرح القلوب (در دوستی وجنگ کردن و پندہای ارزندہ از ہندی بفارسی

مترجمہ : تاج محمد مفتی بن معین الدین الملکی در حدود ۱۱۱۲ھ۔ در بعضی از کتب نام ایں رسالہ را اخلاق ہندی نیز نوشتہ اند کہ در ۱۸۰۳م در کلکتہ بہ طبع رسید۔

اس مخطوطے کی ابتدا وہی ہے جو اوّل الذکر مخطوطے کی ہے، مگر دونوں نسخوں کے درمیان تقریباً دو سو سال کے فرق کی طرف بشیر صاحب کی توجہ نہیں گئی۔ اس کے نسخے کئی ادر کتب خانوں میں موجود ہیں، بہرحال خواہ یہ ترجمہ ہمایوں کے عہد میں دسویں صدی میں ہوا یا اُس کے بعد اس کا شمار قبل مغلیہ عہد کے ادب میں نہیں ہونا چاہیئے، اور اس بنا پر اس جگہ اس کا ذکر برمحل نہیں، یہ موضوع مزید تحقیق چاہتا ہے۔

مقالے کے آخر میں شیرانی صاحب نے بعض لُغات کے نام لکھے ہیں، جو اس وقت تک مکشوف نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"ان کے علاوہ قنیۃ الطالبین از قاضی شاہ، موایدالفواید، فرہنگ شیخ زادہ عاشق

فوائد الفضلا، لسان الشعرا، طب حقائق الاشیا اور فرہنگ شیر خانی اس فن کی
دیگر تالیفات ہیں جن کے زمانوں سے ہم نا واقف ہیں۔" (ص ۱۶۹)

عرض یہ ہے کہ ان میں سے دو فرہنگیں مکشوف ہوگئی ہیں، ایک لسان الشعرا اور دوسری فرہنگ شیر خانی
"لسان الشعرا" کا نسخہ فلورنس کے کتب خانے میں ملا، اس کی ایک نقل روم یونیورسٹی کی ایک خاتون معلم
کے پاس ہے، وہ اس پر کام کر رہی ہیں، البتہ ابھی اس قدیم فرہنگ کے مولف اور زمانے کا قطعی تعیر
نہیں ہوا تھا، وہ فارسی لغت کے مسائل سے دلچسپی رکھتی ہیں اور لسان الشعرا کی تصحیح کے سلسلے میر
کچھ دنوں پہلے تک مجھ سے خط و کتابت بھی کی تھی انھوں نے میرے لیے ایک زیراکس کاپی کے فراہم کرنے کا وء
کیا تھا، مگر ابھی تک وہ کاپی نہیں ملی۔ مشرقی یورپ کے کتب خانوں میں اسلامی مخطوطات کے وج
سے ترکوں کی علمی خدمت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، دراصل ان ترکوں کی بدولت ہزاروں نسخے ا
خطوں میں پہنچے، فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کو یاد ہوگا کہ فارسی زبان کا سب سے قدیم مخطوطہ کتا
الابنیہ عن حقائق الادویہ کا واحد نسخہ ویانا کے کتب خانے میں مکشوف ہوا جس کی کتابت ۴۴۷ھ میں
ہوئی اور اس کا کاتب اسدی طوسی جیسا درجۂ اول کا ادیب و شاعر ہے، پراگ کے کتاب خانے میں
جہانگیر کے مرقع گلشن کی ایک نادر تصویر کی موجودگی ——— تصویر ابراہیم عادل شاہ بدست
فرخ بیگ ——— شاید اسی سلسلے کی کڑی ہو۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد، ایک اور فارسی لغت کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جس کا شیرانی صاح
کو علم نہ تھا، وہ فرہنگ شیر خانی ہے، ادھر اس کے چند نسخوں کا علم حاصل ہو چکا ہے، چنانچہ راقم ح
نے غالب نامہ ج ۴ شمارہ ۲ جولائی ۱۹۸۳ء میں اس فرہنگ پر ایک مفصل مقالہ شائع کیا ہے، خ
ہندوستان میں اس کے تین نسخوں کا مجھے علم ہے، ایک ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (فہرست نمبر ۳۳
دوسرا بانکی پور پٹنہ اور تیسرا نا تمام نسخہ نور الحسن صاحب کاندھلہ کی ملک ہے، برٹش میوزیم، انڈیا آ
باڈلیان میں بھی اس کے نسخے موجود ہیں، مدرسہ سپہ سالار تہران میں ایک مخطوطہ ہے، مگر فہرست نگا
فرہنگ شیر خانی کے بجائے فرہنگ بشیر خانی اور فرہنگ نگار کا نام بشیر خاں لکھا ہے، جو ایک غلط فہمی
نتیجہ ہے، دراصل مقدمہ میں "الملقب بہ شیر خاں" آیا ہے، اس فقرے میں بای جارہ کو انھوں نے شیر
کے ساتھ شامل کر کے بشیر پڑھ لیا ہے، فرہنگ نگار اس فرہنگ کو گیارہویں صدی کا بتاتے ہیں وہ

غلط فہمی کا نتیجہ ہے، فرہنگ شیرخانی کے مؤلف کا نام شیرخاں بر مزید سور ہے، جو شیر شاہ سور کے بیٹے اسلام شاہ کے عہد (۹۵۲ - ۹۶۱) کا ایک بڑا امیر تھا، وہ تین فرہنگوں کا مرتب ہے، فوائد الصنائع زبدۃ الفوائد اور فرہنگ شیرخانی، ان میں اوّل الذکر ناپید ہے، زبدۃ الفوائد کا نسخہ باڈلیان میں موجود ہے، شیرخانی زبدۃ الفوائد کی تلخیص ہے۔ آخر الذکر کی ترتیب ۹۵۵ سے ۹۵۹ کے درمیان اور شیرخانی کی اس کے کچھ بعد ہوئی۔ فرہنگ شیرخانی کا ایک نسخہ موزۂ ملی پاکستان میں ہے۔
(فہرست ص ۳۳۶)

دراصل میری گزارش کا مقصد اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ تحقیق کا عمل برابر جاری رہتا ہے شیرانی صاحب نے بڑا تحقیقی مواد فراہم کر دیا ہے، اور اُن کا یہ عمل تحقیق کی راہ کا نشان ہے۔ اس بنا پر اُن کی پیروی کرنا چاہئے۔ راقم نے لاہور کے شیرانی سیمنار میں ایک مقالہ پیش کیا تھا، اس میں شیرانی صاحب کے فراہم کردہ تحقیقی مواد پر کچھ نئے مواد کا اضافہ بھی کیا تھا، وہ مقالہ اگرچہ ضخیم تھا، حجم ۸۰ صفحات سے زیادہ ہے، لیکن بعض لحاظ سے سرسری تھا، دراصل منشا یہی تھا کہ شیرانی صاحب کے کام کو حرف آخر یا درجۂ تکمیل نہ سمجھنا چاہئے، وہ صرف نشان راہ ہیں، منزل ابھی دُور ہے، تحقیق کا عمل جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مقالے کو ۸ - ۹ سال ہو رہے ہیں، اس مدت میں تحقیقی مواد میں اضافہ ہوا، ان میں سے کچھ نئے مواد کی طرف اس مقالے میں اشارہ موجود ہے۔ غائر تحقیق سے اور مواد کا پتا چل سکے گا۔

شیرانی صاحب نے اُردو فارسی تحقیق میں ایک نئی روایت کو بڑی تقویت پہنچائی تھی، اس روایت کی بنیاد مخطوطات کی تلاش، اُن کی بررسی اور چھان بین، اور اُن کی جمع آوری پر تھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھایا جائے۔ بلا مبالغہ ہزاروں مخطوطات جو محفوظ ہیں، ان کا ابھی مطالعہ نہیں ہوا ہے، اور جو مخطوطات اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں وہ علیحدہ ہیں۔ ان نادر مواد کے مطالعے سے تاریخ و ادب کے ہزاروں گوشے روشن ہوں گے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغان   ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

نقد قاطع برہان

معہ ضمائم

پروفیسر نذیر احمد

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

محقّق شیرانی اور تاریخی حسیّت

تحقیق، صداقت شناسی اور حقیقت رسی کی امکانی کوشش ہے اور اس کا رشتہ حقائق کی اُس بازیافت اور عوامل و موثرات کے اس معروضی تجزیے سے اٹوٹ طور پر جڑا ہوا ہے جس کو تاریخی سچائیوں اور ہم زمانہ تہذیبی تقاضوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

یہ تاریخی سچائیاں اور ان سے وابستہ تہذیبی صداقتیں اپنی مختص جہتوں کے اعتبار سے دو بڑے دائروں میں تقسیم ہو جاتی ہیں، مشتہر حقائق PATENT FACTS اور مستتر حقائق LATENT FACTS مشتہر حقائق کی چھان تو یہ کہیے کہ سر تا سر خارجی شواہد کے تقابلی مطالعہ اور اخذ نتائج سے وابستہ ہے جس کے بعد واقعات کی منطقی ترتیب زیادہ مستحکم بنیادوں پر ممکن ہو جاتی ہے۔ مستتر حقائق تک ذہنی رسائی اور اُن کی دید و دریافت کا عمل بھی تاریخی صداقتوں سے الگ ہٹ کر اپنے طریق رسائی کا صحیح تعین نہیں کر سکتا۔ ادبی تحقیق میں تو بطور خاص تہذیبی تناظر کے ساتھ تاریخی حسیت ایک کلیدی رول ادا کرتی نظر آتی ہے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تحقیق میں مستند مآخذ کی جستجو اور دستاویزی منابع تک رسائی اساسی نوعیت رکھتی ہے۔ اسی خشتِ اوّل پر روشنی کی یہ دیوار اپنی بنیاد استوار کرتی ہے۔ اور اپنے نشانوں کی بلندی تک پہنچتی ہے جس کے ساتھ زمان و مکان سے اس کے رشتے عمل میں آتے ہیں۔ اگر اپنی مختص معنویت کے دائرہ میں یہ بات صحیح ہے کہ خیال بغیر مادہ کے پیدا نہیں ہوتا اور کوئی مادی حقیقت خلائے محض میں جنم نہیں لیتی تو واقعاتی سچائیوں کا رشتہ بھی ناقابلِ شکست طور پر خارجی ماحول اور تاریخی حقائق سے قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تحقیق کے اہم مسائل کا تصفیہ اور علمی نقطۂ نگاہ سے ان پر غور و فکر تاریخ سے پُر وثوق سطح پر استفادہ اور استناد کے بغیر ممکن نہیں

پروفیسر حافظ محمود شیرانی اردو میں ادبی تحقیق کے وہ معلّم اوّل ہیں جنھوں نے حقائق کے تجسس اور استخراجی و استقرائی نتائج کے اخذ و استنباط کے ہر مرحلہ میں تاریخی تناظر سے روشنی و رہنمائی حاصل کی اور معروضی طریق فکر کی دست گیری و نظر فروزی نے اُن کی تحقیقی عیار گیری کے پیمانے کو بلند رکھا اور زیادہ صحیح اور وقیع نتائج تک پہنچایا۔

ادبی بھول بھلیوں سے تاریخی سچائیوں کی طرف سوچ کا سفر ہفت خواں طے کرنے کے برابر ہوتا ہے اس میں محنت پژوہی اور ژرف نگہی کے ساتھ اہتمام تلاش جزئیات جملہ لوازمات سے ہے۔ بسا اوقات تاریخی سچائیاں خود ادب کے مستند حوالوں کی صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ قدیم تر اشاعتوں، معتبر دستاویزوں اور خطّی نسخوں کی صورت میں ان تک پہنچنے کی خواہش و کاہش اسی لیے ایک تحقیقی طریق رسائی کا ایک اہم تقاضہ بن جاتی ہے کہ ہم ترتیب حقائق کے جن مرحلوں سے گذرنا چاہتے ہیں تاریخ سے ہم رشتگی کے بغیر اُن کی تعیین ممکن ہی نہیں بین جہات ادھر سے اُدھر آتی یہ روشنی بے حد ضروری ہے۔

پروفیسر شیرانی کی عہد آفریں علمی فتوحات اور تحقیقی استنباط نتائج میں اُن کی

تاریخی بصیرت ہی ایک کارفرما عنصر کی حیثیت سے شریک نظر آتی ہے۔ انھیں قدرت کی طرف سے جو درّاک ذہن اور قوت حافظہ ملی ہوئی تھی اس کی آبیاری میں ان کا وسیع تر مطالعہ اساسی مآخذ پر اُن کی گہری نظر نے اُن کے غیر معمولی قوت استقرا کو مہمیز کیا۔

موصوف کے تحقیق ناموں کی سیر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ادبی حقائق کے عیارگیری میں تاریخ کے وسیع مطالعہ اور اس سے وابستہ فنون پر نظر داری سے (یہ کہئے کہ) اعلیٰ سطح پر کام لیا ہے ان میں سکّے کتبے اور معاصر علمی اکتشافات بھی شامل ہیں، سکوں سے پروفیسر مرحوم کو یوں بھی گہری دلچسپی تھی اور اُن کی فراہمی میں انھوں نے خصوصی شغف کا اظہار کیا تھا۔

ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ و تنقید سے متعلق پروفیسر مرحوم نے اپنے عالمانہ تبصروں اور مورخانہ نگارشوں میں جن حقائق سے رجوع کیا ان کا ایک نہایت اہم حصہ تاریخ کے صفحات اور نتیجہ خیز حوالوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس امر کی طرف اشارہ سنج ہے کہ ادب اور تاریخ کا جو گہرا رشتہ ہے اُس میں بہت سی باتیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تحقیق ناموں کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب کے تاریخی مآخذ اور خود تاریخ کے متبرع مصادر پر اگر تحقیق کا سلسلہ جاری رہے تو دونوں تاریخی اُمور تہذیبی سچائیوں کی بازیافت اور تعبیری حقائق میں غیر معمولی مدد مل سکتی ہے، جس کے وسیلے سے پُر وثوق سطح پر استفادہ اور استناد ممکن ہے۔

جن حقائق کا جائزہ لیتے ہوئے شیرانی مرحوم آگے بڑھے ہیں اُنھیں خطوط پر اگر دید و دریافت کا سفر جاری رہے تو ہمارے ملک میں فارسی ادبیات کے فروغ کی باقاعدہ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے جس کا دائرہ تقریباً آٹھ نو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح بہت سی ادھوری سچائیوں کو یکجا کر کے اور اُن کی گم شدہ کڑیوں کو ملا کر اگر دیکھا جائے تو ادبی بہت سے پہلو ہماری نظر داری کے مستحق ہو جاتے ہیں ان میں "خطوط و فرامین" بھی ہیں اور "سکہ جات و کتبات بھی" ایسی کسی تاریخ کا ایک بڑا حصہ تو شیرانی جیسے ہمارے بڑے عالموں اور محققوں کی نگارشات میں محفوظ ہے۔

"خزائن الفتوح" کے ضمن میں پروفیسر مرحوم کی تاریخی نکتہ سنجیاں بے حد اہم اور خیال آفریں ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے سکوں میں دار الضرب کے طور پر۔ دار الاسلام کا بھی نام آیا ہے۔ یہ راجستھان کے مشہور تاریخی قلعہ "رنتھنبور" کا وہ نام تھا جو سلطان نے اس تاریخی قلعے کے فتح کے بعد اسے دیا تھا۔ پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے۔ سن ۷۰۰ ہجری میں رنتھنبور فتح ہوتا ہے۔ علاء الدین کے مسکوکات پر دہلی اور دیوگری کے علاوہ ایک اور دار الضرب، دار الاسلام کا نام بھی ملتا ہے جس کے طلائی اور نقرئی سکہ سن ۷۰۲ ہجری سے شروع ہو کر آخرِ عہدِ علائی تک ملتے جاتے ہیں۔ سکہ شناس آج تک یہ معلوم نہ کر سکے کہ اس سے کون سا شہر مراد ہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ دہلی کا نام ہی دار الاسلام ہے۔ (یاد رہے کہ علاء الدین اپنے مفتوحہ علاقوں کا نام بدل دینے کا عادی ہے)۔

(مقالاتِ شیرانی جلد ششم ص ۲۱۷)

مرحوم نے اپنی تاریخی معلومات کی روشنی میں پروفیسر حبیب مرحوم کے اس نظریہ سے بھی اختلاف کیا کہ خزائن الفتوح سے پہلے فتح نامہ کے عنوان سے کوئی اور تاریخی دستاویز باقاعدہ طور پر مرتب ہو چکی تھی انھوں نے بتلایا نامہ ہائے فتح تو سلطان کے اپنے علانیہ خطوط ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی رعایا برایا کو اپنی فتوحات کی اطلاع دیتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ خزائن الفتوح کبیر الدین کے فتح نامے کا تکملہ ہے۔ کبیر الدین نے کوئی کتاب موسوم بفتح نامہ لکھی ہی نہیں۔

شیرانی مرحوم کے یہاں ایک ایسا ہی تاریخی نکتہ عہدِ رودکی سے متعلق دو شعروں کے ضمن میں سامنے آیا جن کے بارے میں ڈاکٹر اقبال حسین نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ان میں حروف ابجد کے اعتبار سے مستفاد تاریخ موجود ہے۔ ان دو شعروں کو پیش کرتے ہوئے شیرانی مرحوم نے یہ اہم تبصرہ بھی اپنے یہاں شامل کیا کہ اُس وقت تک اس قاعدے سے تاریخ نکالنے یا کہنے کی کوئی روایت قائم نہیں ہوئی تھی۔

مغلوں سے قبل ہندوستان میں فارسی ادب کے جائزے میں شہابی کی مثنوی "عروۃ الوثقیٰ" پر بھی شیرانی مرحوم نے جو جائزاتی تبصرہ کیا وہ مرحوم کے نہایت اہم

تحقیقی نوشتوں میں ہے۔

اس مثنوی کے قلمی نسخے میں بعض اجزار کے عدم دستیابی کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اس کا زمانۂ تالیف کیا ہے اور وہ ممدوح کون ہے جس کے لئے اسے ایک ادبی پیش کش بنایا گیا ہے۔ شیرانی مرحوم نے اس کے صفحات میں موجود کچھ داخلی شواہد پر نظر داری کے ساتھ بعض نہایت اہم تاریخی نتائج اخذ کئے ہیں اور لکھا ہے۔

> "شاعر نے جس عمارت کا ذکر کیا ہے وہ گویا اس عہد کا گھنٹہ گھر ہے جو رات دن کی ساعات شماری کے علاوہ نماز کے اوقات کی بھی تعیین کرتا ہے ان ایّام میں کچھ اس قسم کی گھڑیوں کا رواج تھا۔ ہمیں تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری سے مسلمان ایسے آلات بنا رہے تھے جن کا مقصد اوقات شماری تھا۔ مسجدِ دمشق کے سلسلے میں اس کا ذکر کئی سیّاحوں نے کیا ہے۔"

اس نوع کے تقابلی اور تاریخی مطالعہ کے ساتھ شیرانی مرحوم نے فنِ تعمیر کی بعض خوبیوں کے وسیلے سے بھی اس کتاب کے زمانۂ تالیف کے تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ایک اہم نکتہ اور بھی ہے جو اس موقع پر شیرانی مرحوم کے یہاں ملتا ہے وہ یہ کہ ممالک اسلامی میں ساعت شماری گھنٹوں کے حساب سے ہوتی تھی یعنی رات اور دن کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ شہابی چونکہ ہندوستانی ہے، اس لئے وہ ہندی طریقے کے مطابق رات دن کو آٹھ پہر اور چونسٹھ ساعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔

اگر اس طریقۂ رسائی کو اپنایا جائے تو ادبی تصانیف میں موجود بعض بہت سے حقائق کی توجیح اور تفہیم ممکن ہو سکتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ نصرتی اپنے قصائد میں مضمونِ جزخیات کا خصوصیت سے ذکر کرتا ہے اور نصرتی سے کئی صدی پہلے قصائدِ بدر چاچ میں یہ مضمون بطورِ خاص شامل ہے۔ اس طرح کے حوالوں پر اگر نظر رکھی جائے تو تاریخ و تہذیب کے وہ باہمی رشتے بھی سامنے آسکتے ہیں جو تحقیق میں غیر معمولی سطح پر معاون ہوتے ہیں اس کی گوناگوں مثالیں شیرانی

مرحوم کے علمی مقالات اور تحقیقی نگارشات میں موجود ہیں یہاں اُن میں سے چند باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

پروفیسر شیرانی نے منتخب التواریخ کے حوالے سے عہدِ اکبری میں ایک ایسے حوض کے تیار ہونے کا ذکر کیا ہے جس میں ایک کھڑکی کھلی رہتی تھی اور اُس کے ذریعہ اس پانی سے بھرے سے گزر کر ایک آراستہ و پیراستہ طاق میں جایا جا سکتا تھا اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعد کی داستانوں میں اس طرح کے حوض کا ذکر آیا ہے۔ اس بیان کی روشنی میں ہم بعض ایسے حقائق کی کھوج کر سکتے ہیں جو بظاہر افسانہ و افسوں سے زیادہ اہمیت رکھتے۔

پروفیسر شیرانی نے ادب اور تاریخ کے رشتے سے جو تحقیق نامے مرتّب کئے ہیں اُن کے ذیل میں آنے والی بہت سی ادبی سچائیاں آگے بڑھ کر تاریخ سے وابستہ ہو جاتی ہیں اُن کی ایک مثال داستانِ امیر حمزہ کے سلسلے میں مرحوم کا یہ فکر آفریں نگارشہ بھی ہے

داستانِ امیر حمزہ ایک قدیم تصنیف ہے جو پُرانی روایت کے مطابق سلطان محمود غزنوی کے واسطے لکھی گئی تھی۔ ہم اس روایت کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ داستان بہت قدیم ہے۔ ابتداءً اسمارِ حمزہ کے نام سے موسوم تھی۔ کسی نامعلوم عربی الاصل سے "الف لیلیٰ" اور دیگر قدیم افسانوں کی طرح وقتاً فوقتاً ایران، ترکی اور ہندوستان میں اس کی مختلف اشاعتیں تیار ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں اس کی ایک قدیم اشاعت، جو میری نظر سے گزری ہے، یقیناً آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ "بحر السعادت" (تالیف قرن ہشتم) میں اس قصّے کی صحت سے انکار کیا گیا ہے اور ابو الفضل کو اُس کا مصنّف بتایا گیا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی اور واقعات بابری میں داستانِ حمزہ کا نام لیا گیا ہے۔ اکبر کے عہد میں اُس کے بعض مصوّر اور پُر تکلّف نسخے تیار ہوئے ہیں۔ اُن میں سے ایک کپڑے پر لکھا گیا تھا۔ آئین اکبری میں اُس کا ذکر ہے۔

آگے چل کر پروفیسر مرحوم نے اس ضمن میں "فان ہمر" کی تاریخِ حشیشین طبع

۱۸۲۲ کے حوالے سے لکھا ہے۔

حمزہ نامہ ایک تقلیدی تالیف ٹھہرتی ہے جو شام کے باطنیوں کے بطل اعظم کے حمزہ نامی والیٔ قلعۂ شیلون کے شجاعانہ کارناموں کے تتبع میں تیار ہوئی ہے۔ جو شام کے اسمٰعیلیوں کا ایک ہیرو تھا اس حمزہ کو اُس کے ہم نام حضرتِ حمزہ عمِّ رسولؐ کے ساتھ خبط نہ کرنا چاہیے۔ نہ اس حمزہ کے ساتھ جو دروزی فرقہ کا بانی تھا۔

پروفیسر شیرانی مرحوم نے شعر العجم پر جو تنقیدیں کی ہیں۔ فردوسی پر جو مقالات اُن کی قلم سے نکلے ہیں۔ قصۂ چہار درویش سے متعلق انھوں نے جن حقیقتوں کا پتہ لگایا ہے۔ اُن میں کون سی ایسی ادبی سچائی اور تہذیبی بازیافت ہے جس کا رشتہ تحقیقی طور پر تاریخ سے نہیں ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کی روشنی اور رہنمائی کے بغیر تحقیق بہت سے مسائل اور معاملات میں فیصلہ دہی کی منزل سے بہت دور رہتی ہے۔ پروفیسر شیرانی نے "پرتھی راج راسا" پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ اُردو میں تحقیقی طریقۂ رسائی کے اعتبار سے ایک یادگاری کام MONUMENTAL WORK ہے۔ "راسا" کے لئے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ "چندر بردائی" کی تصنیف ہے جو پرتھوی راج کا کوئی درباری تھا۔ اسی بنا پر دیسی زبانوں یا جدید پراکرتوں میں اس کو سب سے قدیم کتاب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے راج پیتانے کے اکثر راجپوت خاندانوں کے زمانے اور نسب ناموں کے سلسلے میں وہ ایک نہایت قدیم مآخذ تسلیم کی جاتی ہے۔ والیانِ ریاست ہائے اُودے پور، جودھپور، جے پور، بوندی و سراہی۔ اس کے اعتبار پر اپنے اسلاف کا زمانہ حیات و ممات متعین کرتے ہیں۔ (دیباچہ)

جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی صورت میں ممکن ہے اس کا کوئی حصہ یا روایت چند کوی کی رچنا ہو۔ باقی تو جیسا کہ خود اب ہندی والے بھی تسلیم کرنے لگے ہیں یہ اور اس کے واقعات "گونج ماتر" ہیں۔ جسے صدائے بازگشت کہنا چاہئے۔ اس میں جو صدہا روایتیں اور حکایتیں ملتی ہیں اُن کی حیثیت دنت کتھاؤں سے زیادہ نہیں جو وقتاً فوقتاً اور زمانہ بہ زمانہ اس میں داخل کی جاتی رہیں۔ اور اس کے پرستاروں نے تاجِ محبوب میں

ہیرے جڑنے کی کوشش ایک زمانے تک جاری رکھی۔

پروفیسر شیرانی نے اس کتاب کے مندرجات کا بالاستیعاب جائزہ لیا اور یہ اُن تمام روایتوں اور کتھاؤں کو نقل کر دیا جو "پرتھی راسا" کے مشتملات کا حصہ ہیں بلکہ اُس کے ذہنی تار و پود کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں تاریخی حقائق کے ساتھ جو کھلواڑ روا رکھی گئی ہے وہ اپنے طور پر خود ایک مثالی حیثیت میں سامنے آتی ہے۔ جن ذہنوں نے ان کہانیوں کو اختراع کیا انھوں نے تاریخ کی طرف رجوع کو کبھی ضروری خیال نہیں کیا۔

پروفیسر شیرانی سے پہلے بھی "راسا" کی تاریخی حیثیت پر شبہ کیا جانے لگا تھا لیکن بہت سے خوش فکر و خوش فہم حضرات وہ بھی تھے جو اسے اس حد تک صحیح مانتے تھے کہ اُس کی روشنی میں خود اسلامی تاریخوں کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی کمزوریوں اور پرتھی راج کے ہاتھوں اُس کی مسلسل شکستوں کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے جو ان تاریخوں میں ملتی ہے۔

پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے "راسا" کے مرتبین نے تو راسا کے بیانات کے اعتماد پر مسلمان مورخین کو مطعون کیا کہ انھوں نے سلطان شہاب الدین کے زندگی کے ایسے تاریک پہلوؤں کو جو اُس کے خلاف جانتے تھے قلم انداز کر دیا ہے۔"

سیدھے سادے طریقے پر "راسا" کے بیان کردہ واقعات کی تغلیط کرنا یا ان کو من گھڑت ثابت کرنا مشکل نہ تھا۔ پروفیسر شیرانی نے اس میں بیانِ واقعات کے ذیل میں جن امورات کو پیش کیا گیا تھا اُن کو مستند تاریخی حوالوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ اور ایک ایک بات کو تاریخ و روایت کے تقابلی مطالعہ کو اس طرح پیش کیا کہ اخذِ نتائج کی منزل تک خود اُس کے قاری کا ذہن بآسانی پہنچ جائے۔

یہاں "سنی پرتھا" کی روایت کا سہارا لیتے ہوئے جو کچھ "چند کوی" نے لکھا تھا اور اس پر شیرانی مرحوم نے تنقید کی اُس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

"مصنّف کا عقیدہ ہے کہ مسلمان عورتیں اور کنیزیں اپنے آقاؤں اور خاوندوں کی لاش کے ساتھ زندہ دفن کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حسین کتھا (نویں داستان) "چتر لیکھا" میں حسین کی لاش کے ساتھ چتر لیکھا زندہ دفن ہوتی ہے"

آگے چل کر شیرانی مرحوم نے ایک اور واقعہ اور اُس سے وابستہ تہذیبی تصوّر کا سہارا لیتے ہوئے، "چند کوی" نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر تنقید کی ہے۔

" دھیر پنڈیر پرستاؤ" میں شہاب الدّین کا خواص گرفتاری کے وقت اپنی پیاری جان لے کر غزنی بھاگ جاتا ہے، جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اُس کی بیوی ملامت کے لہجے میں اُس سے کہتی ہے کہ اگر تو میدان جنگ میں قتل ہو جاتا اور میں تیری لاش کے ساتھ دفن ہوتی تو یہ بات مجھے جان بچانے سے زیادہ گوارہ ہوتی۔ یہ صدائے بازگشت ہے ستی کی رسم کی جو ہندوؤں میں رائج تھی یہ ہندو بھاٹ اس وہم میں مبتلا تھے کہ جہاں ہندو عورتیں زندہ جلادی جاتی ہیں وہاں مسلمان عورتیں زندہ دفن ہوتی ہیں۔

شیرانی مرحوم نے اصطلاحات اسماء، خطابات اور اسلحہ وغیرہ کے سلسلے میں بھی تاریخی بحثیں چھیڑی ہیں اور اُن کی بنیاد پر "راسا" کے ایک بہت بڑے حصّے کو جعلی قرار دیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ باتیں بہت بعد کے زمانے سے تعلّق رکھتی ہیں اور چند کوی کی فکر فرمائیوں سے اُن کا کوئی رشتہ نہیں۔

تحقیق کا ہر قدم آگے بڑھتا ہے لیکن اس آگے بڑھتے ہوئے قدم کے لیے جس روشنی اور رہنمائی کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے اور پڑ سکتی ہے وہ تاریخ ہے۔ شیرانی مرحوم نے اپنی تحقیق میں تاریخ سے مدد لے کر آئندہ آنے والوں کے لیے LAND MARK " نشانِ راہ" قائم کیا ہے۔

صاحبزادہ شوکت علی خاں

محمود شیرانی کا ایک نایاب مبیضہ "تاریخ ادب فارسی"

پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی اپنے وقت کے ایک جیّد عالم اور متبحّر فاضل تھے۔ قدیم و جدید علوم کا ان میں ایسا حسین امتزاج تھا کہ تحقیق و تنقید کے میدان میں آج بھی ان کا شمار یگانۂ وقت اور نابغۂ روزگار اصحاب میں ہوتا ہے۔ وہ زندہ رہے تو تاریخی کرداروں کو زندہ کرتے رہے اور مرے تو وہ تاریخی کردار آج ان کو زندہ کیے ہوئے ہیں وہ ماہرِ عتیقیات ہونے کے علاوہ مخطوطہ شناسی میں مدخلِ تام رکھتے تھے اور مسکوکات وکتبیات کے مطالعہ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

تنقید شعر العجم ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ وہ اپنے ٹونک کے قیام کے دوران اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ تنقید شعر العجم کا اگر جواب دیا گیا تو میرے پاس اس کا جواب الجواب تیار رہے۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے اس خیال سے کہ تنقید پر اعتراضات ہوں گے اور بحث چھڑے گی بعض جدید امور کے لیے اطلاع یا سند بغرض مدافعت محفوظ رکھ لی تھی"۔

بسمِل سعیدی کے والد ماجد حکیم سید احمد اسعد ٹونکی، شیرانی صاحب کے استاد

اپنے وقت کے مشہور طبیب اور ادبیات فارسی کے مسلّم الثبوت استاد تھے۔
صاحبزادہ عبدالشکور خاں صاحب ٹونکی اور صاحبزادہ یٰسین محمّد صاحب جو شیرانی صاحب کے بے تکلّف دوستوں میں تھے اور شیرانی صاحب کے تلامذۂ ارشد صاحبزادہ مبارک علی خاں اور صاحبزادہ مودود علی خاں شادآب بھی شاہد ہیں کہ شیرانی صاحب نے تنقید شعر العجم کا جواب الجواب لکھ لیا تھا۔ جب کہیں سے اس کا جواب شیرانی صاحب کو نہ ملا تو انھوں نے اپنے جواب الجواب اور مرتّب شدہ تعلیقات و استدراکات کو جمع کرنا شروع کر دیا۔
شیرانی صاحب اورنیٹل کالج لاہور سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۰ء میں واپس آکر ٹونک میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ یہیں انھوں نے تاریخ ادبیات فارسی کو تسوید ی شکل دینی شروع کی۔ انھوں نے اپنے گراں قدر مخطوطات کا ذخیرہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کو اور مسکوکات کا ذخیرہ کلکتہ کے سیٹھ جالان کو فروخت کر دیا تھا لیکن اس ذخیرے سے وہ کچھ نادر اور قیمتی مخطوطات اپنے ساتھ ٹونک لے آئے تھے، جن کی بنیاد پر وہ تاریخِ ادبیات فارسی کے تحقیقی منصوبے میں منہمک رہے۔
۱۹۴۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو اختر شیرانی اور ان کے گھر والے کچھ عرصہ بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔ اور محمود شیرانی کا مخطوطات و مسوّدات کا ذخیرہ جو منتخب روزگار تھا، جوہر صاحب ٹونکی کے پاس آگیا اور برسوں ان کے کتب خانے کی زینت رہا۔ بعد کو ان کے برادر عزیز صاحبزادہ حکیم عباد اللہ خاں کے توسّط سے عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک میں آکر محفوظ ہو گیا۔

اس ذخیرے میں تاریخِ ادب فارسی کے مبیّضہ کے علاوہ چند نایاب مخطوطات بھی تھے اور ان کے کچھ تعلیقات و مسودات بھی۔ فی الوقت مجھے شیرانی صاحب کے اُس نایاب تاریخ ادبیات فارسی کے مبیّضہ پر گفتگو کرنی ہے جو جوہر صاحب کے کتب خانے سے مجھے ملا۔ یہ نادر نسخہ حافظ محمود شیرانی کا خود نوشتہ ہے، جو ۹۸۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۸۸۰ شعرائے متقدمین و متوسطین و متاخرین کے سوانحی احوال اور نمونۂ کلام پر محتوی ہے۔ یہ فارسی ادب کا ایک غیر معمولی اور بہت مفید شاہکار ہے۔ ادب فارسی کی تاریخ میں جہاں

جہاں خلا تھا اور کھانچے رہ گئے تھے انھوں نے نہ صرف انھیں پُر کیا بلکہ فارسی ادب کے قدیم شعرا مروزی، حنظلہ، رودکی، فردوسی، منوچہری اور فرخی وغیرہم کی حیات وشاعری کے نظرانداز گوشوں کو بھی اجاگر کیا ہے، اور فارسی ادب العالیہ کے پاسخ نامے، گشتاسپ نامے، ارجاسپ نامے، شطرنج نامے جیسے نارسیدہ جواہر پاروں پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس تذکرے کی زبان اردو ہے۔ شیرانی صاحب کی تحریر مائل بقری، مائل بشکستہ ہے لیکن پڑھنے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی۔ تقطیع ۲۱ × ۲۲ سینٹی میٹر ہے۔ سطور کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ کسی صفحہ پر چودہ کسی پر سولہ اور کسی پر سترہ بھی سطور ہیں۔ اس تذکرے کا آغاز عباس مروزی متوفی ۲۰۰ھ کے حالات واشعار سے ہوتا ہے۔ رودکی جو شعرائے آلِ سامان میں سب سے قدیم شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کے حالات شروع کرنے سے پہلے اس تذکرے میں پانچ ایسے قدیم شعرا کے احوال حالات واشعار درج کیے گئے ہیں جنھیں رودکی سے تقدّم زمانی حاصل ہے، ان میں عباس مروزی کے بعد حنظلہ بادغیسی (متوفی ۲۱۹ھ)، محمود وراق (متوفی ۴۴۸ھ)، سال ہجری فیروز مشرقی (متوفی ۲۸۳ھ) اور ابوسلیک گرگانی ہیں۔ ان پانچ شعرا کے بعد رودکی سے، یحییٰ واعظ (متوفی ۱۳۰۴ھ) شاعر تک کے احوال پر یہ تذکرہ مشتمل ہے جن کے مکمل حالات مع نمونۂ کلام مراجع کے ذکر کے ساتھ دیے ہوئے ہیں۔ ان ۱۸۸۰ شعرا میں ۵۵۶ شعرا ایسے ہیں جن کے حالات اور کلام دونوں درج ہیں۔ ۴۱۶ ایسے شعرا ہیں جن کے نام اور نمونۂ کلام تو درج ہیں لیکن ظاہراً ان کے حالات لکھنے کا موقع انھیں نہ مل سکا۔ اور ۹۰۸ ایسے شعرا ہیں جن کے صرف نام مخطوطے میں لکھے ہوئے ہیں حالات واشعار درج نہیں۔

ان شعرا کے اسما ذیلی سرخیوں کے تحت اس طرح منقسم ہیں۔

(۱) اسمائے شعرائے آل سبکتگین: ان شعرا میں نو شاعر ایسے ہیں جن کے پورے نام مع نسب معلوم نہیں ہو سکے۔

(۳) شعرا آل سلجوق ماوراءالنہری: اس کے ذیل میں چھ شاعروں کے نام کا تذکرہ دیا گیا ہے۔

(۴) شعرائے آل سلجوق: اس کے ضمن میں دس شاعروں کے نام دیے گئے ہیں۔

(۵) شعرائے آل سلجوق: (غزنہ) اس میں ۱۲ شعرا کے نام دیے گئے ہیں۔

(۶) شعرائے آل سلجوق: (خراسان) اس سرخی کے ضمن میں ۲۲ شعرا کے نام دیے گئے ہیں۔

(۷) شعرائے ماوراءالنہر: اس سرخی کے ذیل میں ۱۵ شعرا کے نام درج ہیں۔

حسن اتفاق سے ۱۸۰ شعرا پر محتوی یہ نادر و نایاب تذکرہ اُس محقق اور فاضل اجل کی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے جو خود بھی ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ شیرانی مرحوم اگر یہ تذکرہ اپنے منصوبے کے مطابق مکمل کر لیتے تو یہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا، مواد کی فراہمی، مطالب کی وسعت اور شعرا کی تعداد کے لحاظ سے بھی۔

فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ جو آنند رام مخلص (متوفی ۱۱۶۴ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس ادارے میں محفوظ ہے۔ اس تذکرے میں ۲۸۱ شعرا کے احوال ملتے ہیں مخلص نے اپنے آپ کو مرزا عبدالقادر بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ) کا شاگرد بتایا ہے۔ اسٹوری نے مخلص کی دس تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس میں اس تذکرے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے یہ تذکرہ خاصا اہم ہے۔

ایک اور ضخیم تذکرہ نشترِ عشق بھی اس ادارے میں محفوظ ہے جو آغا حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی (متوفی ۱۲۳۳ھ) کا مرتبہ ہے جس میں ۱۴۷۰ شعرا کے احوال حروفِ تہجی کے اعتبار سے دیے گئے ہیں۔ یہ علی قلی خاں داغستانی واکہ کے تذکرے ریاض الشعرا پر اگرچہ مہتم بالشان اضافہ ہے۔ لیکن شیرانی صاحب کا مرتب کردہ تذکرہ نشترِ عشق سے بھی زیادہ ضخیم اور کثیر تعداد شعرا پر مشتمل ہے۔ شعرا کی تعداد سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ شیرانی مرحوم نے فارسی شعرا کے کلام پر جو عالمانہ تبصرہ کیا ہے اور ان کے شعری جواہر پاروں کا جو فاضلانہ محاکمہ کیا ہے وہ ان کی علمی اور ادبی افضلیت کا شاہد ہے اور اُس سے تاریخ و تحقیق میں جو نئے گوشے اُجاگر ہوتے ہیں وہ تاریخ ادب فارسی میں ایک گراں قدر

سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مرتب نے فارسی کے مستند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مراجع اور بنیادی اور عصری مآخذ کے غایر مطالعہ کے بعد اسے ترتیب دیا ہے۔ یہ نایاب تذکرہ مبیضہ کی شکل میں شیرانی صاحب کے اس غایر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ جو انھوں نے تنقید شعر العجم لکھتے وقت کیا تھا اور جواب الجواب کی غرض سے مستند اور قدیم مآخذ و مراجع سے مواد فراہم کیا تھا جن مراجع و مآخذ کا اس میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

ریاض الشعرا : از۔ علی قلی داغستانی متخلص بو آلہ
سرو آزاد : از۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی
لباب الالباب : از۔ نورالدین محمد عوفی
آتش کدہ : از۔ لطف علی المتخلص با ذر (۱۱۹۹ھ تک زندہ تھے۔
تحفۃ الکرام : از۔ میر علی شیر قانع تتوی (سال تصنیف ۱۱۸۰ھ)
مرآۃ الخیال : از۔ شیر خاں لودی (سال تصنیف ۱۱۰۲ھ)
ہفت اقلیم : از۔ امین احمد رازی (سال تصنیف ۱۰۰۲ھ)
خزانۂ عامرہ : از۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۱۹۹ھ)
گلزار ابرار : از۔ شیخ محمد غوثی مندوی
مجمع النفائس : از۔ سراج الدین علی خاں آرزو (متوفی ۱۲۱۹ھ، تصنیف ۱۱۶۴ھ)
تذکرۃ الشعرا : از۔ دولت شاہ سمرقندی (سالِ تصنیف ۸۹۲ھ)
تذکرۃ الشعرا : از۔ شیخ محمد بقا۔ متوفی ۱۰۹۴ھ
ہفت آسمان : از۔ مولوی آغا احمد علی بن آغا شجاعت علی ۱۸۷۳ء ۱۲۹۰ھ
کشف الظنون : از۔ حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۷ھ)
شرف نامہ : از۔ شرف بن شمس الدین (سال تصنیف ۱۰۰۵ھ)
مخزن الفوائد : از۔ حفیظ الدین احمد بردوانی (سال تصنیف ۱۲۵۱ھ)
تاریخ گزیدہ : از۔ حمداللہ مستوفی قزوینی۔ (۷۴۰ھ میں نزہۃ القلوب لکھی)

مجمع الفصحاء : از ۔ رضا قلی خاں ہدایت۔
بہارستان : از ۔ (جامی) نورالدین عبدالرحمٰن جامی ۔
المعجم فی معاییر اشعار العجم : از ۔ محمّد بن شمس قیس رازی ۔
مطلع السعدین : از ۔ عبدالرزاق سمرقندی ۔

شیرانی صاحب کا مرتب کردہ تذکرہ چونکہ مسودے کی شکل میں ہے اس لیے سیکڑوں شعرا کے صرف نام دیے ہوئے ہیں۔ بہت سے شعرا کے نام کے ساتھ صرف اشعار ہی دینے پر اکتفا کیا گیا ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرکے اس میں شامل کرنا چاہتے تھے ۔ یا ناموں کا صرف اس غرض سے اندراج کیا تھا کہ بعد کو مزید معلومات فراہم کرکے ان کی تکمیل کی جائے۔ بہرصورت تنقید شعرالعجم میں جن شعرا سے بحث کی گئی ہے ان کے احوال اور نمونۂ کلام اس نسخہ میں وافر مقدار میں ہیں۔ اور بہت سی نئی معلومات مستند تحقیقات، گمنام، نارسیدہ موضوعاتِ شعر و سخن کے دیگر اخبار و آثار اور ان کے مالۂ و ما علیہ سے مورخانہ اور محققانہ انداز سے بحث کی ہے جس کے ثبوت میں انھوں نے کہیں کہیں حواشی ، ور تعلیقات و منہیات بھی پیش کیۓ ہیں ۔ حواشی کے آخر میں انھوں نے جگہ جگہ "میم" لکھا ہے اور کہیں کہیں انگریزی میں "ایم، ایس، ایچ" رقم کیا ہے[1] ۔ جس سے محمود شیرانی مراد ہے۔ جن جن مراجع سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، ان کے نام بھی اکثر و بیشتر تحریر کر دیے ہیں۔ جن واقعات کی ان کو صحت نہ ہوسکی ۔ یا ان کو پایۂ تحقیق سے ساقط سمجھا اس کے آخر میں ' واللہ اعلم' لکھا ہے ۔ پورے نسخے پر اکثر و بیشتر تاریخی ناموں سے اور تاریخی مادوں سے بحث کی ہے ان میں جن نایاب نسخوں کا ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس کا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، یا انڈیا آفس لائبریری (انگلستان) میں محفوظ ہے ۔ مثلاً

---

[1] ایم ایس کے ساتھ ملا ہوا ایچ کہیں کہیں ایم۔ کے بھی پڑھا جاسکتا ہے جس سے محمود خاں مراد ہے وہ پہلے محمود خاں ہی لکھا کرتے تھے اور بعد میں شیرانی کہنے لگے تھے ۔

نزہتہ القلوب اور ظفر نامہ جن میں تاریخ مغل اور عرب وایران کا ذکر ہے اس کا نسخہ صرف برٹش میوزیم میں محفوظ ہونا ظاہر کیا ہے۔

قلم کی روش زیادہ تر خط شکستہ کی طرف مائل ہے۔ لیکن مشاقی و مہارت نامہ کی نشاندہی کر رہی ہے۔ "ہے" کو دو چشمی "ھے" سے لکھنا۔ "ی" کو شکستہ کشش سے لکھنا ان کی روش کا خاصہ ہے۔ جو ان کے قلمی خطوط شائع ہوئے ہیں اُن سے بعینہٖ مماثلت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ان کے خود نوشتہ "جنگ نامہ موہن گڑھ" کی فوٹو کاپی اس ادارے میں محفوظ ہے یہ فوٹو اسٹیٹ محمود شیرانی کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے دی تھی۔

اس قلمی جنگ نامہ موہن گڑھ کے مسوّدے کی اور شائع شدہ خطوط کی روش اور اس کی مبیضہ کی روش بالکل ایک جیسی ہے۔ تینوں تحریروں میں شانِ محمودی جلوہ گر ہے۔ قلم کے دور و دامن، جوف، میدان، شان و صفا اور نوک پلک کے ساتھ ایک دوسرے سے بالکل مماثل ہے۔ جنگ نامہ موہن گڑھ اور ان کے شائع شدہ خط میں مماثلت ہے لیکن ان کے شائع شدہ خط میں اور مبیضہ میں بالکل مشابہت ہے۔ ایک مثیل ہے دوسرا اصیل، ایک نظیر ہے دوسرا تصویر شیرانی صاحب کے قلم کی روش اور اس روش کے امتیازات و خصوصیات ہر ہر لفظ اس کے مراکز، کششیں، سطح اور کرسی بالکل ایک جیسی ہیں۔ مثلاً میم کے دنبالے، جیم اور ح، خ کے خمچے، عین اور غین کی اعناق و مناقیر اور دال، را اور واؤ کے پرّوں میں شکستہ آمیز نستعلیق کے اثرات نظر آتے ہیں۔ سین کو شیرانی صاحب نے ہمیشہ بڑے شین کی کشش سے لکھا ہے۔ جیسے، جس کی سلطان، عیسیٰ، جس کے وغیرہ۔ تینوں نسخوں میں "ہے"۔ "نہیں" اور "ہیں" کو شکستہ کشش سے ہی لکھا ہے گو اس مبیضہ کی روشِ قلم مائل بشکستہ ہے پھر بھی ما یُقرأ ہے۔ اس کے برعکس جنگ نامہ موہن گڑھ کی روش نستعلیق مائل بشکستہ ہے اور پڑھنے میں کہیں کہیں دشواری ہوتی ہے۔ اس تاریخ ادب فارسی کے مبیضہ پر اکثر کہیں کہیں انگریزی میں سنین اور اعداد مرقوم ہیں۔ اور اُس کے فٹ نوٹ مبیضہ کے حواشی پر دیے ہوئے ہیں۔

تاریخ ادب فارسی کا اسلوب اور لہجہ مقالات شیرانی کے اُسلوب و لہجہ میں ہم آہنگ ہے پروفیسر محمود شیرانی ذہین اور طبّاع ہونے کے ساتھ ساتھ ناقدانہ بصیرت اور تجزیاتی قدرت

کے حامل بھی تھے اور قرأت و املا کی خصوصیات کے ماہرِ فن منتہی بھی۔ جب وہ تحقیق کرتے تھے تو اندرونی شہادتوں کا اس جامعیت اور مانعیت سے تجزیہ کرتے تھے کہ مافی الضمیر سے کبھی انحراف کرتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ کسی بھی تحقیق کا تجزیہ کرتے وقت پہلے وہ نتیجات قائم کرتے تھے اور اس کی روشنی میں اس اختصاص، امتیاز اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ لکھتے چلے جاتے تھے، جو ان کا مخصوص انداز تھا۔ ان کی تحریر پُر وقار، باوزن، محققانہ ماہرانہ ہوتی تھی۔ وہ پیش نظر معلومات سے جو نتائج نکالتے تھے۔ وہ مُثبت اور مُسکت ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں حاکمانہ جلال، ادیبانہ جمال اور فاضلانہ کمال ہوتا تھا۔ اور وہ مخطوطہ کے غایر مطالعہ سے نہ صرف عہود و قرون ہی مشخص کرتے تھے بلکہ اس دور کی تاریخی اور لسانی اقدار بھی متعین کرتے ہوئے تاریخ کے گم شدہ اوراق بصیرت افروزی اور دقیق النظری سے ڈھونڈھ نکالتے تھے، جس سے قعر گمنامی میں پڑے ہوئے کردار اور واقعات دوبارہ زندہ ہو جاتے تھے۔ وہ مخطوطہ پڑھتے وقت مصنف اور مصنّف کے تمام و کمال متعلقات اور ذرّیات تنقیحی اور تنقیدی نظر سے مطالعہ بھی کرتے تھے۔ اور اخبار و آثار کی روشنی میں پیچیدہ مسائل کو حل بھی کرتے تھے۔ حالانکہ ان کا میدان بہت خشک تھا۔ لیکن وہ اپنے تبحّر علمی سے تحقیقی زبان میں کہیں کہیں عذوبت و حلاوت بھی پیدا کرتے تھے جو تاثیر خیز اور فکر انگیز ہوا کرتی تھی۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے۔

تاریخ ادب فارسی کا انداز بیان، جملوں کی ساخت و پرداخت، تحقیقی و تنقیدی زور بیان، متون و مواد کی بازیافت، دلائل و براہین سے شواہد و حقائق کی بحث اور تقابلی تبصرے بالکل اسی انداز کی ترجمانی کرتے ہیں جو مقالات شیرانی کا اسلوب و خاصہ ہے۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا یہ منفرد قلمی نسخہ تنقید شعر العجم کا بیش بہا ضمیمہ ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب فارسی کا ضخیم ترین صحیفہ بھی ہے اور ایک غیر معمولی اور لافانی شاہکار بھی۔

یہ اگر ضروری حواشی اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کر دیا جائے تو فارسی ادب کے تذکروں، نارسا مواد و متن، بازیافتہ تحقیقات اور گمنام شعراء، ادباء اور ان کے کلام منظوم و منثور کے تشخص و تفحص کے اعتبار سے ایک اہم بالشان کارنامہ ہوگا۔

عبد القیوم

حافظ محمود شیرانی — ایک نظر میں

محمود خاں شیرانی پانچ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو ریاست ٹونک راجپوتانہ میں پیدا ہوئے۔ اورینٹل کالج لاہور سے مفتی عبداللہ ٹونکی کی نگرانی میں منشی، منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحان پاس کیے۔ پھر انٹرنس پاس کر کے بیرسٹری کی تعلیم کی غرض سے ۱۹۰۴ء میں لندن روانہ ہو گئے۔ دو سال کا کورس مکمل کیا تھا کہ والد کے انتقال کے باعث تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے "لوزک اینڈ کمپنی لندن" میں بطور ماہر عتیقیات ملازم ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں وطن واپس آئے۔ ۱۹۲۲ء کے شروع میں اسلامیہ کالج لاہور میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں تدریسی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۹۴۰ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر واپس ٹونک چلے گئے جہاں فروری ۱۹۴۶ء میں ضیق النفس کے مرض سے انتقال کیا۔

اخلاقی اور علمی اعتبار سے شیرانی صاحب کی شخصیت نادرۂ روزگار کہی جا سکتی ہے۔ سادگی، انکساری، وضع داری اور مہماں نوازی ان کی سیرت کے نمایاں پہلو ہیں۔ علمی معاملات میں وہ سخت محنت کے عادی تھے۔ ذہن میں اعتدال اور توازن تھا۔ ان کا تحریری

کام وسیع بھی ہے اور رنگا رنگ بھی۔ انھوں نے لسانیات، تحقیق، تدوین، تنقید، تاریخ عروض، مسکوکات بہت سے میدانوں میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان مختلف موضوعات پر ان کے کام کو پرونے والی چیز پر ہند اسلامی تہذیب سے ان کی محبت کہی جاسکتی ہے جو ان کی تمام تحریروں میں جاری وساری دکھائی دیتی ہے۔

انھوں نے بہت سے غلط نظریات اور مسخ شدہ تاریخی حقائق کی درستی کا فریضہ کمال ذمہ داری سے انجام دیا۔ اوراس طرح ہماری ادبی تاریخ میں پائے جانے والے بہت سے خلا پُر کیے۔

اردو لسانیات کے میدان میں شیرانی صاحب کا بڑا کارنامہ ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" ہے انھوں نے سب سے پہلے اس پونے دو سو برس کے عرصے کی لسانی اہمیت اجاگر کی جو فتح دہلی سے پہلے مسلمانوں نے پنجاب میں گزارا تھا۔ اردو اور پنجابی میں قریبی مشابہت سے شیرانی صاحب نے یہ نظریہ اخذ کیا کہ اردو کی بنیاد اس بولی پر قائم ہوتی ہے جو دہلی کی فتح کے وقت مسلمان پنجاب سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

شیرانی صاحب سے پہلے ہماری ادبی تحقیق ابتدائی مرحلے میں تھی۔ انھوں نے اسے پایدار بنیادوں پر قائم کیا اور اس میں جدید مغربی اصولوں کو رواج دیا۔ حوالے درج کرنے میں ذمہ داری، مختلف ماخذوں سے ملنے والی معلومات پر جرح، بے عیب منطقی اصولوں پر مبنی استدلال اور مغالطوں سے گریز، شیرانی صاحب کے تحقیقی طریقِ کار کے بنیادی اصول ہیں انھوں نے ہمارے تحقیقی معیار کو بلند کرنے کے لئے اصلاحی تحقیق سے بڑا کام لیا۔ اس اعتبار سے ان کی "تنقید شعر العجم" اور "تنقید آب حیات" مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیرانی صاحب نے اپنی خدمات سے ہمارے علمی اور تحقیقی معیار کو پستی سے اٹھا کر بلندیوں سے روشناس کیا ہے۔

تدوین متن میں بھی شیرانی صاحب نے خاصہ کام کیا ہے۔ اس میدان میں ان کی اصل دلچسپی تحقیق متن سے تھی۔ مختلف کتابوں کے زمانۂ تالیف اور ان کے اصلی مالکوں کا تعیّن شیرانی صاحب کا خصوصی میدان ہے۔ جس میں انھوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام

دیے ہیں۔ وہ تاریخ کو محض سیاسی واقعات کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ پورے تہذیبی عمل کو اس کے دائرے میں شامل سمجھتے ہیں۔ ادبی تنقید میں شیرانی صاحب مشرقی کلاسیکی ادب کو پرکھنے میں مغربی ناقدین کو سند نہیں بناتے۔ ان کے نزدیک ادب پاروں کو ان کے سماجی اور روایتی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ علم عروض میں شیرانی صاحب کو بلند مقام حاصل تھا۔ انھوں نے عروض کو آسان بنیادوں پر استوار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ سکہ شناسی میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ نیلسن رائٹ جیسے ماہر مغربی سکہ شناس کی تالیف میں انھوں نے کئی فنی غلطیوں کے نشان دہی اور تصحیح کی جس پر مؤلف نہایت ممنون ہوا اور اس میدان میں شیرانی صاحب کی مہارت کا معترف بھی۔ کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل اور ان کے عہد بہ عہد ارتقا پر ان کی گہری نظر تھی۔ خطاطی اور کتابت سے واقفیت کا یہ عالم تھا کہ مخطوطات کے بوسیدہ اوراق کا گہری نظر سے جائزہ لے کر اس کا زمانۂ کتابت معلوم کر لیتے تھے۔ اپنی بلند پایہ تحقیقات کا سرمایہ پیش کرنے میں شیرانی صاحب نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ سادہ بھی ہے اور پرکار بھی۔ گو انھوں نے باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن "ٹیپو سلطان" جیسی نظموں اور بعض اردو فارسی غزلیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتے تھے۔ شیرانی صاحب ایک مثالی استاد تھے۔ وہ مشتاق اور محنتی طالب علموں کے لیے سراپا شفقت تھے اور ضرورت مند شاگردوں کی مالی امداد بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔

شیرانی صاحب نے مسلسل کوشش اور جستجو سے قلمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی مہیا کیا تھا۔ یہ نایاب مجموعہ اب "پنجاب یونی ورسٹی لائبریری" لاہور کی زینت ہے۔

شیرانی صاحب کو ہند و پاکستان کے علمی حلقوں میں تحقیق کا معلم اول مانا جاتا ہے۔ "غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی" قابلِ مبارک باد ہے کہ اُس نے اس مایۂ ناز علمی شخصیت پر بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کیا۔ میں "مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی" لاہور کی جانب سے غالب انسٹی ٹیوٹ کے کارپردازان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایک اہم پیشکش

دیوانِ غالب (کشمیری)

اسد اللہ خان غالب

ترجمہ کار

غلام نبی ناظر

غالب کے اردو دیوان کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ شائع ہوگیا ہے جس میں ایک صفحے پر کشمیری زبان میں ترجمہ اور مقابل کے صفحے پر اردو زبان میں اصل غزل ہے۔

فوٹو آفسیٹ طباعت، عمدہ سفید کاغذ مضبوط جلد اور دلکش سرورق کے ساتھ

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ : غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ

کی

سرگرمیاں

حافظ محمود شیرانی سمینار

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ایوانِ غالب نئی دہلی میں ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء بروز اتوار اُردو فارسی کے عظیم محقق حافظ محمود شیرانی سے متعلق ایک روزہ سمینار منعقد ہوا جس میں ملک کے مشہور مقالہ نگار حضرات نے شرکت کی جن میں جناب بھگوت سروپ (نئی دہلی)، ڈاکٹر غفار شکیل (میسور)، ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی) ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی (پاکستان)، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی (احمد آباد)، جناب شوکت علی خاں (ٹونک)، ڈاکٹر انصار اللہ (علی گڑھ)، ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)، پروفیسر سید امیر حسن عابدی (نئی دہلی)، پروفیسر مختار الدین احمد (علی گڑھ) وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اس تقریب کا افتتاح فرماتے ہوئے سمینار کے کنوینر پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ایک عالمانہ تقریر فرمائی تھی، جو مندرجہ ذیل ہے:

پروفیسر نذیر احمد کی افتتاحی تقریر

جناب صدرِ جلسہ

میں آپ حضرات کا پروفیسر حافظ محمود شیرانی سمینار میں خیر مقدم کرتا ہوں، ہم

آپ سب کے ممنون ہیں، خاص طور پر ان مہمانوں کے شکرگزار ہیں جو ہماری دعوت پر سفر کی تکلیف برداشت کرکے اس سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے تشریف فرما ہیں، ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اس جلسے میں حافظ محمود شیرانی کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی بھی تشریف رکھتے ہیں۔ موصوف حافظ صاحب کے اکلوتے بیٹے اختر شیرانی کے ہونہار فرزند ہیں جنھوں نے شیرانی کے مقالات اور مکاتیب شائع کیے ہیں، ان کی تحقیق کا موضوع بھی شیرانی کی ادبی خدمات کا جائزہ ہے۔

حافظ محمود شیرانی کا تعلق پٹھانوں کے ایک قبیلہ شیرانی سے تھا، ان کے اجداد میں کوئی ہندوستان آیا اور راجپوتانہ کے قصبہ کھاٹو میں سکونت پذیر ہوا، بعد میں اس خاندان والوں نے کھاٹو سے چند میل کے فاصلے پر ایک بستی بسائی جو شیرانیوں کی ڈھانی کہلائی اس بستی کا اب شیرانی آباد نام ہے۔

شیرانی کے دادا چاند خاں تھے، وہ سید احمد شہید بالاکوٹ کے رفقا میں تھے، جو بچ بچا کر راجستھان آئے اور کھاٹو میں سکونت اختیار کرلی، کچھ دنوں بعد وہ ٹونک آگئے، یہیں شیرانی کے والد محمد اسماعیل خاں کی پیدائش ہوئی اور یہیں نشوونما پائی، وہ ترقی کرکے نواب ٹونک کے اسٹیٹ منیجر اور مختار عام ہوئے، شیرانی بھی ۱۸۸۰ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے پہلے انھوں نے قرآن حفظ کیا، پھر جودھ پور بھیجے گئے جہاں سے ۱۸۹۸ میں مڈل کا امتحان پاس کیا، انھیں دنوں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج لاہور میں پڑھاتے تھے، شیرانی صاحب ان کے پاس بھیجے گئے، وہیں سے ۱۸۹۹ء میں عالم اور ۱۹۰۱ء میں فاضل اور پھر انٹرنس کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کے والد نے بیرسٹری پڑھنے کے لیے ولایت بھیجا، لیکن ابھی ان کے لندن کے قیام کو دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا، شیرانی صاحب ٹونک واپس آگئے، لیکن جلد ہی پھر لندن واپس گئے، دوبارہ وہ ۱۹۰۷ء میں لندن پہنچے تھے، والد کی وفات پر ان کو مالی دشواریوں کا سامنا ہوا تو انھوں نے کتابوں کے ترجمے اور لڑکوں کی تدریس سے خرچ کا بوجھ سنبھالا، قیام لندن میں وہ اپنا فارغ وقت وہاں کے کتب خانوں کے قلمی خزائن سے استفادہ کرنے میں صرف کرتے، ۱۹۰۹ء میں انھوں

نے لندن یونیورسٹی میں فارسی کا امتحان پاس کیا، پھر لوزک کمپنی میں جو عتیقہ فروش کمپنی تھی
ملازمت کرلی، ۱۹۱۰ - ۱۹۱۱ء میں ہنری اسٹب کی کتاب "RISE AND PROGRESS OF
MAHOMETANISM" ایڈٹ کرکے شائع کی، لندن میں انھیں سید علی بلگرامی جسٹس
امیر علی، سر عبداللہ سہروردی، سر عبدالقادر، علامہ سر محمد اقبال، پروفیسر آرنلڈ وغیرہ
فضلائے روزگار کی صحبت میسّر آئی۔

۱۹۱۴ء میں لوزک کمپنی کی طرف سے قدیم کتابوں، تصویروں، کتبوں، اور دوسری
عتیقیات کی تلاش اور فراہمی کے لیے ہندوستان بھیجے گئے، اس موقع سے انھوں نے بڑا فائدہ اٹھایا
راجپوتانہ، گجرات اور دوسرے خطوں کی سیاحت کی اور سینکڑوں ہزاروں قدیم قیمتی اشیا ر
تک ان کی رسائی ہوئی، ۱۹۱۸ء میں ٹونک کے انگریز ایجنٹ کو فارسی پڑھانے پر مامور ہوئے
لیکن انگریز ایجنٹ سے یہ اختلاط نواب صاحب کی بدگمانی کا موجب ہوا، اس کی وجہ سے شیرانی
صاحب کو ٹونک چھوڑنا پڑا، وہ شیرانیوں کی ڈھانی چلے گئے، ۱۹۲۱ء میں اختر شیرانی کو
اورینٹل کالج لاہور میں داخلے کے لئے لے گئے، یہاں علامہ اقبال، سر عبدالقادر اور دوسرے
پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی جن کی کوشش سے وہ اسلامیہ کالج لاہور میں لکچرر مقرر
ہو گئے، ۱۹۲۸ء میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر اردو ہوا، ۱۹۴۰ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش
ہوئے، ۱۹۴۱ء میں ٹونک واپس آگئے اور یہیں ۱۹۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شیرانی صاحب گئے تھے بیرسٹری پڑھنے، مگر اس میں ان کا جی نہ لگا البتہ وہ وہاں سے
ایسے فاضل ہو کر لوٹے کہ علم کی دنیا میں شہرت دوام کے مالک ہوئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے
کہ ہمارے ملک کے دوسرے عظیم محقق قاضی عبدالودود کے پاس بیرسٹری کی سند تھی مگر
پریکٹس میں ان کا جی نہ لگا، وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے اور دنیائے تحقیق میں لازوال شہرت
حاصل کی۔

پروفیسر شیرانی عظیم مورخ و محقق تھے، ان کی کوششوں سے تحقیق نے ایک فن کی
شکل اختیار کرلی، وہ میدان تحقیق کے تنہا شہسوار تھے جنھوں نے مخطوطہ شناسی، سکہ شناسی
کاغذ، سیاہی، نقاشی، خطاطی وغیرہ کی شناخت میں بے پناہ دستگاہ بہم پہنچائی تھی انھوں

نے فارسی اور اردو زبان وادب کے اہمات مسائل پر قلم اٹھایا، اور اپنی ہمہ گیر اور محیط تحقیق و کاوش سے ان عقدوں کو حل کیا اور ان مغالطوں کو دور کیا جن پر صدیوں سے بے خبری کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، انھوں نے ادبی و علمی دنیا میں اوہام ومفروضات کے پچاسوں بت توڑے ہیں۔ فردوسی کی طرف یوسف زلیخا کا انتساب، فردوسی کی ہجو محمود، فارسی دیوان کا حضرت معین الدین چشتی کی طرف انتساب، انتساب پرتھی راج راسا بہ چند بردائی، مصیبت نامہ منسوب بہ عطار، خالق باری منسوب بہ خسرو وغیرہ موضوعات پر انھوں نے جس دقت نظری سے بحث کی ہے، وہ تحقیقی دنیا کے شاہکار ہیں، ان کے علاوہ بعض متداول کتابوں پر انھوں نے جیسا عادلانہ محاکمہ کیا ہے ان سے ان کی وسعت مطالعہ ودقیق نظری کا بخوبی ثبوت ملتا ہے، اس سلسلے میں ان کی تنقید شعر العجم، ترجمہ خزائن فتوح، تنقید آب حیات سرفہرست ہیں، بعض کتابوں پر ان کے بے لاگ تبصرے ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں، پروفیسر عبدالغنی کی کتاب "قبل مغل فارسی ادب" اور ڈاکٹر اقبال حسین کی تصنیف "ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا" پر انھوں نے جس انداز سے تبصرہ کیا ہے اس سے فن تبصرہ نگاری کے اصول مرتب ہوسکتے ہیں۔

شیرانی صاحب نے اردو وفارسی زبان وادب اور ہندوستانی تہذیب وثقافت وغیرہ کے سینکڑوں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ہر موضوع پر جتنا نیا اور اچھوتا مواد فراہم کر دیا ہے اس سے ادبی وثقافتی تاریخ مالامال ہوگئی ہے، وہ ایک تاریخ ساز محقق و ادیب تھے، ان کا دائرۂ عمل بھی کافی وسیع ہے، زبان، ادب، لسانیات، عتیقہ شناسی سکہ شناسی، مخطوطہ شناسی کے علاوہ ہندوستانی تاریخ وتہذیب پر نئے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے، اس کی بنا پر یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ مشرق میں اس پایہ کا کوئی اور محقق نہیں ملتا جس نے اتنے اہم موضوعات پر ایسی محتتم گفتگو کی ہو۔ ایران کے نامور محقق مرزا محمد قزوینی تاریخ وتہذیب اسلام ادبیات عربی وفارسی کے بلاشبہ معروف ترین دانشور ومحقق ہیں، جن کی مثال عالم اسلام میں اس دور میں نظر نہیں آتی، لیکن فارسی زبان وادب کے تعلق سے انھوں نے اتنا گراں قدر سرمایہ نہ چھوڑا، جتنا شیرانی کا ہے۔

پروفیسر شیرانی کی تحقیقات کے سلسلے کے چند قابل ذکر امور حسب ذیل ہیں :

(۱) اسناد تحقیق کی شناخت میں انھوں نے بے پناہ دستگاہ حاصل کرلی تھی، اسناد میں مخطوطے، تصاویر، خطاطی کے نمونے، عتیقہ شناسی کے اسناد سبھی شامل ہیں، اسی غیر معمولی دستگاہ کی بنا پر ان کی تحقیق میں بڑا وقار اور ان کے دلائل میں بڑا وزن ہوتا، اور اسی خاصیت کی وجہ سے وہ ایک منتخب کتابخانے کی تشکیل میں کامیاب ہوئے جس میں مخطوطات دستاویزات، تصاویر، نقاشی، خطاطی وغیرہ کے بیش بہا نمونے موجود تھے، اس کے علاوہ ان کے پاس مسکوکات کا پُر ارزش ذخیرہ بھی جمع ہوگیا، ان کے ذاتی کتابخانے میں ۲۱۰۰ قلمی اور ۱۷۰۰ مطبوعہ کتابیں تھیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اکثر کتابیں فارسی کی ہیں اور فارسی کی ورکنگ لائبریری کا مقصد ادا کرتی ہیں، میں نے یہ کتابیں ایک ہندوستانی علم پرست کے نقطۂ نظر سے جمع کی ہیں جن میں ہندوستانی تالیفات اور ہندوستانی خط قدیم پر ایک خاص نگاہ رکھی ہے۔ بعد خرابی بسیار میں نے اس خط کا پتا لگایا ہے اور میری آرزو ہے کہ میں اس خط کی جو مغلوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں رائج تھا، رام کہانی سناؤں ... انشا کے فن پر میں نے خاص کوشش کرکے ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے، یہی حالت بچوں کے تعلیمی نصابوں کی ہے، ان تینوں امور میں کوئی لائبریری میرے حقیر مجموعے کا مقابلہ نہیں کرسکتی، لغات، ادب، تاریخ، تذکروں، انشا اور بیاضوں میں میرا مجموعہ دوسری لائبریریوں سے کسی حال میں کم نہیں۔

۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء میں پروفیسر محمد اقبال کو اپنی بیماری کے سلسلے میں ایک خط لکھا جس میں یہ ہدایت کی ہے کہ قدیم دستاویزات، اسناد اور خالصہ دربار کے مکاتیب لائبریری کو قیمتاً دے دیں، خطاطی کے نمونے، مرقع تصاویر اور پتھر اپنی تحویل میں لے لیں۔ شیرانی کے مجموعۂ مسکوکات میں کوئی پونے دو سو سونے، پانچ ہزار چاندی کے اور تین ہزار سے اوپر تانبے کے خاص سکے تھے، یہ خزانہ پٹنے کے ایک مارواڑی سیٹھ رادھا کرشنا جالان نے تیئیس ہزار روپے میں خرید اور اپنا قیمتی کتب خانہ تیرہ ہزار روپے پر پنجاب یونیورسٹی کے پہلے ہی حوالے کرچکے تھے۔ اپنی عزیز چیزوں کو کوڑیوں کے مول میں دے دینے

کا ان کو جتنا قلق تھا اس کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے، لیکن صحت کی تباہی ک
سے ان کی ناداری بڑھ رہی تھی، اور اس سے مجبور ہو کر انھوں نے ان متاع عزیز
جدائی گوارا کی۔

(۲) شیرانی کی تحقیقات کی ایک نمایاں خصوصیت "داخلی شہادت" یا شہاد
کلام کی اہمیت کا اثبات ہے، اس سلسلے میں شاہنامے کی داستان بیژن و منیژہ کا مطا
قابلِ ذکر ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ داستان سب سے پہلے نظم ہوئی، اس کی سب سے م
دلیل شہادت کلام سے پیش کی ہے، داستان بیژن و منیژہ کی زبان بقیہ شاہنامے کی زبا
سے متفاوت ہے اور یہ تفاوت تقدم و تاخر زمانی پر دال ہوتا ہے، اس داستان میں ا
زائدہ کا استعمال کثرت سے ہے جو شاہنامہ میں تدریجاً کم ہوتا گیا ہے، یہاں تک کہ بالکل
متروک ہو گیا ہے، شاہنامہ ۳۵ سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس مدت میں فا
زبان میں بھی تحول و تغیر رونما ہوا، یہی تغیر شاہنامہ کی ابتدائی اور آخری حصے کی نظمو
باہمی مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے، اسی تفاوت کی ایک شکل ابتدائی نظموں میں الف زائد
استعمال اور عدم استعمال ہے، الف کا استعمال داستان بیژن و منیژہ میں ۲۷ موقعوا
ہوا ہے جو بجائے خود ایک قابل حیرت معاملہ ہے، باقی شاہنامے میں ایسے الف کی مثا
۱۵ سے زیادہ نہیں ملیں گی، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ داستان بیژن شاہنامے کے ب
حصے سے پہلے کی ہے، جب کہ فردوسی اپنا انداز خاص قائم نہیں کر چکا تھا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا شیرانی صاحب کے تقریباً ۲۳-۲۴ سا
بعد اپنی مشہور کتاب "حماسہ سرائی در ایران" میں اسی نتیجے پر پہنچے ہیں، اگر صفا صاحب
شیرانی کی تحریریں نہیں دیکھیں تو اس کو توارد خیال کی حیرت انگیز مثال سمجھنی چاہیے، بہرحا
صفا صاحب لکھتے ہیں:

داستان بیژن و گرازان میں فردوسی نے جو سبک اختیار کیا ہے اس کی تحقیق
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ داستان جوانی میں نظم ہوئی، مثلاً اس داستان کا شاہنامے کے دوس
حصوں سے مقابلہ کریں تو دیکھیں گے کہ الف اطلاقی کا کثرت سے استعمال جو کبھی کبھی مخ

فصاحت بھی ہے علی التواتر ہے چنانچہ اس داستان کے ایک حصے کی نوے ابیات میں ن
الف اطلاقی ہے یعنی دس فی صد ابیات میں الف زائدہ کا قافیہ استعمال ہوا ہے، یہ با
شاہنامے کے دوسرے حصوں میں نہیں پائی جاتی، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر اس ابتد
حصے میں وہ بے مثل مہارت حاصل نہیں کرسکا ہے جو اس کو بعد میں حاصل ہوئی
اسی طرح کی داخلی شہادت سے شیرانی صاحب نے ثابت کر دکھایا ہے کہ یوسف
زلیخا فردوسی کی تصنیف نہیں، یوسف زلیخا کی نسبت فردوسی کی طرف ایسی مسلمہ حقیقت
بن چکی تھی جو ہر شک وشبہ سے پاک تھی، نولدکی، براؤن وغیرہ جیسے مغربی دانشوروں
نے اس کو فردوسی کی تصنیف قرار دینے میں ادنی تامل کا اظہار نہیں کیا تھا، یہی نظریہ
ایرانی محققین کا بھی تھا، لیکن ہندوستان کے اس دانشور نے ۱۹۲۲ء میں محکم اندرو
دلائل سے ثابت کر دیا کہ فردوسی کی یہ تصنیف نہیں ہوسکتی، اس کا طرز، اس کی زبان
فردوسی سے مختلف ہے، اس میں سینکڑوں الفاظ، محاورات، فقرات ایسے ہیں جو فردوسی
کے زمانے کے بعد وجود میں آئے، شیرانی کے سترہ سال بعد ایرانی محقق عبدالعظیم قریب نے
پہلی مرتبہ فردوسی کی طرف اس مثنوی کا انتساب غلط قرار دیا لیکن ان کی نتیجہ گیری کی بنیاد
اتنے محکم دلائل پر نہ تھی، خلاصہ یہ کہ شیرانی نے شہادت کلام کی روایت کو پختہ سے پختہ تر کر دیا
(۳) شیرانی کی تحقیقات کا ایک قابل ذکر وصف یہ ہے کہ زبان واسلوب بیان کی
شناخت میں غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے انھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں اور
اسی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ شہادت کلام کے برمحل استعمال سے ان کے دلائل نہایت محکم ہو گئے
شاہنامہ کی داستان بیژن ومنیژہ، اور مثنوی یوسف زلیخا کے تعلق سے ان کے نتائج اسی وصف
پر مبنی ہیں، علاوہ بریں دیوان انوری میں ساتویں صدی ہجری کے ایک ہندوستانی شاعر
تاج الدین ریزہ کے کلام کی نشاندہی، مثنوی مصیبت نامہ کا عطار نیشاپوری کی طرف اور
دیوان معین ہروی کا خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی طرف انتساب ایسے موضوعات ہیں جن پر
شیرانی کا محاکمہ ان کی زبان فارسی وسبک ادبی کے تحول وارتقا میں بے پناہ درک کا
نتیجہ ہے۔

(۴) شیرانی صاحب نے زبان و ادب کے امہات مسائل پر قلم اٹھایا ہے، فردوسی عطار، انوری وغیرہ شعرائے فارسی کے کلام کی تحقیق میں انھوں نے جس طرح کے نتائج نکالے ہیں وہ اب فارسی ادب کی ایسی مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ کسی کو اس سے انکار کا موقع نہیں اردو زبان کی ابتدا، خسرو کی طرف منسوب خالق باری جیسے اہم موضوعات پر ان کی تحقیق ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھی جائے گی، میری معلومات کی حد تک کسی ہندوستانی محقق نے اس طرح کے مسائل پر گفتگو نہیں کی ہے۔

(۵) اردو کی ابتدا کے بارے میں ان کے خیال سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اس بات پر کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اس موضوع پر ان کی تحقیق کی وسعت و پہنائی قابل داد ہے انھوں نے اپنے موضوع کے لیے دور مغلیہ کے قبل کے فارسی ادب کا نہایت گہرا مطالعہ کیا، البیرونی، ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان، عثمان مختاری سنائی غزنوی، تاج ریزہ، منہاج سراج، امیر خسرو، ضیاء برنی، سید محمد بن مبارک کرمانی، شمس سراج عفیف، محمد بن قوام بلخی کرئی، اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف سے اردو الفاظ، محاورات فقرے اور دوہرے جمع کیے اور یہ ثابت کیا کہ اردو ساتویں صدی ہجری میں گھروں کی زبان بن چکی تھی انھوں نے مزید فارسی فرہنگوں سے اردو کی ابتدا کی تحقیق میں کافی استفادہ کیا ہے، اس سلسلے میں دستور الافاضل، زفان گویا، بحر الفضائل، شرف نامہ منیری، موید الفضلاء، اور آثار حکیم یوسفی (۹۰۶ - ۹۴۲) وغیرہ لغات ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے ان میں سے سوائے ایک کے بقیہ سب غیر مطبوعہ شکل میں تھیں، شیرانی صاحب نے فرہنگ قواس سے بھی اردو الفاظ چنے ہیں، لیکن اس کا قلمی نسخہ انھوں نے نہیں دیکھا تھا بلکہ موید الفضلاء کے اقتباسات سے انھوں نے استفادہ کیا، اردو زبان کی ابتدا سے بحث کرنے والے کسی محقق کی تحقیق میں یہ وسعت و عمق نہیں جو شیرانی کے یہاں پائی جاتی ہے۔

(۶) شیرانی صاحب ہندوستانی فارسی کے بڑے مداح اور فارسی ادب کی ترقی میں ہندوستانیوں کے خدمات کے بڑے مبلغ تھے، یہ بات عام ہے کہ ایرانیوں کی نظر میں ہندوستانی فارسی کی وہ وقعت نہیں جس کی وہ عموماً مستحق سمجھی جاتی ہے، فارسی لغات جو ہندوستان

میں لکھی گئیں ان کے ذکر کے بعد شیرانی لکھتے ہیں: اور یہی ایرانی آغا جو ہر موقع پر ہم ہندیوں پر ناک بھوں چڑھاتے رہے ہیں۔ ضرورت کے وقت ان ہندی لغات نگاروں سے استفادہ کرتے ہیں خواہ وہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ہوں یا ملک الشعرا بہار یا کوئی اور، فی الحقیقت ہم ہندیوں کے واسطے یہ بجا فخر کا موقع ہے کہ مغرور ایرانی خود اپنی زبان کے بارے میں ہمارا منت کش ہے، اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ کا ذکر کرنا ہوا جو پروفیسر براؤن سے تعلق رکھتا ہے، ان کو فارسی محاورہ بہند رفتن حنا کا اصلی مفہوم معلوم کرنے کی ضرورت ہوئی جب ان کے ایرانی دوستوں سے مایوسی ہوئی مجبوراً انھوں نے ہندوستانی پروفیسر محمد شفیع پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی سے دریافت کیا، پروفیسر ممدوح نے اس محاورے کے صحیح معنی، اس کا محل استعمال اور اساتذہ کے کلام سے شواہد اُن کو بھجوا دیے جس سے ان کی تسلی ہوگئی۔

(۷) شیرانی کی تحقیقات میں اسناد کی بڑی اہمیت ہے، اور اسناد کے سلسلے میں نئے مآخذ کی دریافت کافی اہم ہوتی ہے۔ تحقیقات کی اس روایت میں نئے مآخذ کی دریافت سے تبدیلیوں کے امکانات ہوتے ہیں اس لئے کہ نئے مآخذ پرانے خیالات و معتقدات پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، سینکڑوں ہزاروں سال کے واقعات کی تحقیق کے ہزاروں مآخذ ہو سکتے ہیں، جن میں سے چند محقق کے پیش نظر ہوتے ہیں، وہ ان کی روشنی میں نتیجہ نکالتا ہے۔ جن میں بعد کے نئے مآخذ کی دریافت سے تبدیلی کے بخوبی امکانات ہوتے ہیں، اس طرح ماضی کے واقعات کے پرکھنے میں تحقیق کا عمل برابر جاری رہتا ہے، اس سے واضح ہوا کہ تحقیق جامد نہیں ہوا کرتی، دیوان معین الدین چشتی کو لیجیے، شیرانی صاحب نے بڑے محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ دیوان معین الدین فراہی کا ہے، اور بعد میں کچھ اور مآخذ مطالعے میں آئے، ان سے یہ خیال موکد ہوگیا کہ مروجہ دیوان فراہی ہی کا ہے، خواجہ معین چشتیؒ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ باوجود اس کے کہ انتساب دیوان کا مسئلہ حل ہوگیا، لیکن ابھی یہ طے کرنا باقی ہے کہ دیوان فراہی کامل ہے یا ناقص اور آخرالذکر صورت میں اس کا نقص کتنا ہے اور کیونکر دور ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ماضی کے واقعات کی جانچ میں

ق کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔

۸) شیرانی نے اپنی تحریروں سے اس عام خیال کو زائل کر دیا کہ محقق کا طرزِ بیان
ب اور بے کیف ہوتا ہے، ان کی تحریر شگفتہ اور دل نشیں ہے، دلنشیں طرزِ بیان
ل تحقیق کے خلاف نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ شیرانی صاحب کی تحقیق راہِ ہدایت کی شمع ہے۔ انھوں نے موجود
ں کے لیے کافی سامان اکٹھا کر دیا ہے، ان اور ان کے رفقا نے تحقیق کی جو روایت
ا کی ہمارا فرض ہے کہ ہم اس روایت کو آگے بڑھائیں۔ ان کی تحریروں میں بعض اشارے
، ان اشاروں پر کام کرنے کی ضرورت ہے، مثلاً انھوں نے بعض فارسی فرہنگوں
ہندوستانی الفاظ کا انتخاب کیا ہے، شیرانی کے زمانے میں اکثر فرہنگیں قلمی شکل
تھیں، اب ان میں سے اکثر چھپ گئی ہیں، ان مطبوعہ فرہنگوں کا ویسا ہی مطالعہ کرنا چاہیے
ا شیرانی صاحب نے قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا تھا۔

شیرانی کی تحقیقات کے سلسلے میں بعض امور کا اجمالی ذکر کر چکا ہوں، محققین و
ہدین جو یہاں تشریف فرما ہیں، بعد کے اجلاس میں ان امور پر تحقیقی نظر ڈالیں گے
ران کے مطالعات ہی سے شیرانی کی حیثیت ایک بڑے محقق کے اعتبار سے
م ہو سکے گی۔

آخر میں پھر ہم حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے تعاون کے بغیر
بلسہ کامیاب نہ ہوتا۔

شکریہ

SV02

140126
1-5-91